رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے اُفق

کراچی

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول
مدیرہ
انجم انصار
معاون
آمنہ حماد

اداریہ

افسانے

مکمل ناول



سلسلے وار ناول





پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

ناولٹ



خصوصی مضامین

مستقل عنوانات



شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: مہوش.......... میک اپ: روز بیوٹی پارلر.......... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 40 • شمارہ 12 • مارچ 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
MEMBER APNS CPNE



مجھے کچھ کہنا ہے......!

بات ہے تو عجیب مگر صداقت کی حامل ہے کہ جب آپ کو حال کے بجائے ماضی دلکش نظر آنے لگے، مستقبل میں کوئی دلچسپی نہ رہے...... تو جان لیجیے کہ آپ پر پیرانہ سالی کا سایہ منڈلانے لگا ہے...... آپ پر بڑھاپا طاری ہو رہا ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ ضعیف اور بوڑھے لوگ نہ تو کبھی حال کی باتیں کرتے ہیں اور نہ ہی مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہیں بلکہ اپنے خوب صورت ماضی کی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں۔

اور جب لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ان کا ماضی ان کے حال سے زیادہ بہتر تھا تو ان میں زندہ رہنے کی لگن اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے اور وہ گزرے ہوئے ماضی کی جانب رجوع کرتے رہتے ہیں اور وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

اور آج مجھے آپ سے یہی کہنا ہے کہ ماضی کی سمت دیکھنا ترک کر دیجیے اور یاد ماضی کو عذاب نہ بنائیے۔

ماہرین عضویات کا اندازہ ہے کہ جوانی کی عمر 28 سال میں تمام ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جسمانی زوال پزیری شروع ہو جاتی ہے، تخلیقی فکر، جو انسانی زندگی کا حقیقی دھارا ہے، 40 برس کی عمر میں پختگی حاصل کرتی ہے۔ آرٹسٹ اپنی بہترین تخلیق پچاس برس کی عمر میں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنی صلاحیتوں کے عروج کو 45 برس کی عمر کو پہنچتے ہیں، وکیل اور ماہرین قانون 57 برس کی عمر میں۔

کسی دانش مند کا یہ قول ہے 40 برس کی عمر جوانی کا بڑھاپا ہے اور 50 برس کی عمر بڑھاپے کی جوانی ہے۔

مگر بات صرف اتنی سی ہے...... جب آپ کے پاس کچھ کرنے کو نہ رہے اور آپ وقت کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیں اور بستر سنبھال لیں تو آپ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھتے ہیں...... بے شک آپ جوان ہی کیوں نہ ہوں کہ بہاریں ان گھروں میں ہی نظر آیا کرتی ہیں...... جہاں بیج بوئے جاتے ہیں اور پنیری لگانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

مدیرہ

انجم انصار

اے ایمان والو (اپنے) عہدوں کو پورا کرو (دیکھو) تمہارے لیے (سب) چوپائے جانور حلال کردیے گئے سوان (جانوروں) کے جوتم پر (کتاب اللہ میں) پڑھے جائیں گے (اور) تم حالت احرام میں شکار کو جائز کرنے والے نہ ہو بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے (۱) اے ایمان والو اللہ کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو اور نہ ماہ حرام کو اور نہ قربانی کو اور نہ (قربانی کے جانور) پٹے والوں کو اور نہ کعبہ (جانے) کا قصد کرنے والوں کو جو اپنے پروردگار کا فضل اور (اس کی) خوشنودی چاہتے ہیں اور جب تم احرام سے باہر ہو جاؤ تو (تمہیں اجازت ہے کہ) شکار کرو اور کسی قوم کی یہ عداوت کہ تمہیں انہوں نے کعبے (جانے سے روکا تمہیں اس جرم کا مرتکب نہ بنائے کہ تم (ان پر) زیادتی کرنے لگو اور (تم زیادتی کیسے کر سکتے ہو تمہیں تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ) باہم (ایک دوسرے کی) نیکی اور پرہیزگاری پر اعانت کرو اور گناہ اور ظلم پر (کسی کی) اعانت نہ کرو اور اللہ (کے عذاب) سے بچو بے شک اللہ (بڑا) سخت عذاب والا ہے (۲) (اور) تم پر حرام کر دیا گیا کہ مردہ (جانور) اور خون اور سور کا گوشت اور وہ چیز جس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے اور وہ گلا گھونٹا ہوا اور چوٹ سے مرا ہوا اور گرنے (کے صدمے) سے مرا ہوا یا سینگ مارے سے (مرا ہوا) اور وہ (جانور) جسے درندے نے کھایا ہو سوا اس کے جسے تم ذبح کر لو اور وہ جانور جو بتوں پر ذبح کیا گیا اور یہ کہ تم (پانسے کے) تیروں سے حصہ تقسیم کرو (غرض یہ سب چیزیں تم پر حرام ہیں کیونکہ) یہ سب بری (چیزیں) ہیں اب کافر تمہارے دین سے (پھر جانے سے) ناامید ہو گئے پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ (ہی) سے ڈرو آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو میں نے پسند کر لیا پس جو کوئی بھوک میں مجبور ہو جائے (اور) وہ گناہ پر مائل نہ ہو تو (اسے مذکورہ بالا محرمات کا کھانا جائز ہے کیونکہ) اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۳)

(سورۃ المائدہ آیت نمبر ۱ تا ۳)



آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ

3۔ صحیحین میں ہے کہ محشر میں جب شفاعت کے لیے آپ ﷺ تشریف لے جائیں گے تو آپ ﷺ پر خدا کی حمد وثنا کا دروازہ کھول دیا جائے گا جو اس سے پہلے کسی پر نہیں کھولا گیا تھا۔ پس سب انبیا حماد ہیں اور ان حمادوں میں آپ ﷺ احمد ہیں۔

4۔ امام ابن القیمؒ نے کتاب جلا الافہام، میں تحریر کیا ہے کہ علما کے ایک گروہ کا قول ہے اور ان میں ابوالقاسم سہیلی وغیرہ ہیں کہ آپ ﷺ کا اسم مبارک احمد ﷺ پہلے رکھا گیا اور اسم مبارک 'محمد ﷺ' بعد میں رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح کی بشارت میں حضور ﷺ کا اسم مبارک 'احمد ﷺ' واقع ہوا ہے۔

5۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ پہلے احمد ﷺ تھے پھر محمد ﷺ ہوئے کیونکہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے خدا کی تعریف کی پھر آپ ﷺ کے بعد مخلوق نے آپ ﷺ کی تعریف کی۔ اسی طرح محشر میں سب سے پہلے آپ ﷺ خدا کی حمد کریں گے۔ جب آپ ﷺ کی سفارش سے حساب شروع ہو جائے گا پھر اہل محشر آپ ﷺ کی حمد کریں گے۔ اس لیے آپ ﷺ پہلے احمد ﷺ ہیں اور بعد میں محمد ﷺ بلحاظ وجود بھی آپ ﷺ پہلے احمد ﷺ ہیں اور بعد میں محمد ﷺ۔

(فتح الباری)



7۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ حمد ہمیشہ آخر میں ہوتی ہے۔ کھانے پینے کے بعد، سفر ختم کرنے کے بعد ہم خدا کی حمد کرتے ہیں۔ اس طرح جب دنیا کا طویل سفر ختم کر کے جنت میں داخل ہوں گے تو خدا کی حمد کریں گے وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ اس دستور کے مطابق جب سلسلۂ رسالت ختم ہو تو یہاں بھی آخر میں خدا کی حمد ہو۔ اس لیے جو نبی سب سے آخر میں ہوا ان کا نام (احمد) رکھا گیا۔ قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

امانت

رفعت سراج

قسط 3

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کر دیتی ہیں۔

امانت وخیانت کو واضح کرتی ایک پُردرد مگر خوب صورت تحریر



کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی...... بہت چپ تھی اس کا موڈ بہت خراب دکھائی دے رہا تھا۔

''خیریت تو ہے بیٹا...... آج کیا چپ کا روزہ رکھا ہے......؟'' شاہ عالم چند لمحے تو گاہے گاہے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر کار بول ہی پڑے۔

''کچھ نہیں دادا جان آپ آرام سے کھانا کھائیں۔'' وہ خفا خفا انداز میں شاہ عالم کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی۔

''لیکن بیٹا موڈ خراب ہونے کی کوئی وجہ بھی تو ہوناں...... مجھے تو بہت ٹینشن ہو جاتی ہے، میں تو اپنی بیٹی کو ہمیشہ ہنستا کھیلتا اور talky doll کے طور پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ویسے تو میں نے تمہارا نام بچپن میں talky doll ہی رکھ دیا تھا۔'' انہوں نے شگفتہ انداز میں کہا۔

کائناز نے ایک گہری سانس لی، چمچ پلیٹ میں رکھ دیا...... جیسے بہت اہتمام سے بات کرنے جا رہی ہو۔ ''بتائیں بے چاری روما کی بھی کوئی زندگی ہے۔ ایک میں ہی اکیلی اس کی دوست ہوں اور اس کی اماں جان کو اس واحد دوستی پر بھی اعتراض ہے۔'' وہ دل گرفتہ تھی۔

''ارے بیٹا بری بات ہے، ذرا ذرا سی باتوں پر موڈ خراب نہیں کرتے، بہر حال وہ روما کی ماں ہیں، زیادہ بہتر جانتی ہیں، ان کو دوستی پر اعتراض نہیں ہوگا، اصل میں روما کے مارکس کم آ گئے ہوں گے تو اس لیے انہوں نے پابندی لگائی ہوگی...... کہ پہلے اپنی پڑھائی پر دھیان دو بعد میں دوستیاں کرنا۔'' دادا نے اسی لطیف انداز میں کائناز کو بہلانے کی کوشش کی۔

''چھوڑیں دادا جان، ایسی کوئی بات نہیں ہے، بہت اچھے مارکس لیتی ہے وہ...... مجھ سے تو ہمیشہ اچھے ہی لیتی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اب وہ نہیں پڑھے گی اور وہ جان بوجھ کر ایسا کرے گی...... اس کی اماں جان، ان کا بس نہیں چلتا...... کہ آتی جاتی سانسوں کی بھی counting کریں۔ اب وہ انہیں تنگ کرے گی...... اور کرنا بھی چاہیے۔ بتائیں وہ اپنی دوست سے بات کرے تو اسے سزائیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں یعنی کہ حد ہو گئی زیادتی کی......'' کائناز بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

''بری بات ہے بیٹا...... اپنے دوستوں کو ان کی ماں کے خلاف نہیں کرتے...... یہ ایک بہت بڑا اخلاقی جرم ہے......'' کائناز نے روٹھے، روٹھے انداز میں شاہ عالم کی طرف دیکھا۔

''بس دادا جان...... سب اس کی اماں جان ہی کی حمایت کریں گے اس لیے کہ سب کو حقیقت کا پتا ہی نہیں ہے، وہ تو اس کی سگی ماں ہی نہیں لگتیں......'' یہ کہہ کر طوہاً کرہاً اس نے کھانا کھانا شروع کر دیا۔

شاہ عالم نے بھی جیسے اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

☆☆☆

اصیل خان لان میں عشا کی نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ بہت انہماک سے اللہ کی عبادت میں مصروف تھا مگر مین گیٹ پر اتنی زور سے ہارن بجا کہ اس کا انہماک بری طرح سے ٹوٹا تھا۔ اس نے جلدی جلدی رکعات پوری کیں...... سلام پھیرا اور گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

گارڈ گیٹ کھول چکا تھا ایک luxurious land cruiser گیٹ سے داخل ہوئی تھی۔

اصیل خان اس لینڈ کروزر کی طرف بہت غور سے دیکھنے لگا۔ پہلے دو گن مین گاڑی سے نیچے اترے پھر

انہوں نے بیک ڈور کھولا ڈور کھلتے ہی جو شخص گاڑی سے باہر آیا اسے دیکھ کر اصیل خان کی آنکھیں جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''سہراب خان۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا تھا۔ پھر ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بڑی تیزی سے سہراب خان کی طرف آیا تھا۔

سہراب خان اپنی دُھن میں اندر جانے کے لیے اپنے قدم بڑھا چکا تھا۔ اس نے اصیل خان کو اپنی طرف آتے دیکھا...... تب بھی نہیں رکا اس لیے کہ وہ شاید اسے پہچانا نہیں تھا۔ اصیل خان نے جیسے دوڑ لگا کر اس کا راستہ روکا...... تب سہراب خان کو اس کی اس غیر معمولی حرکت پر توجہ دینا پڑی، وہ اپنی جگہ پر رک گیا...... اور الجھی الجھی نظروں سے اصیل خان کی طرف دیکھنے لگا...... پھر اس کی نظروں میں پہچان کے رنگ نمایاں ہوئے...... اس نے بہت حیرت اور تعجب سے سر سے پاؤں تک اصیل خان کو دیکھا۔

''اصیل خان...... کیا واقعی تم اصیل خان ہو؟'' وہ بولا تو اصیل خان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آہستہ بات کرنے کے لیے کہا اور فکر مند انداز بلکہ محتاط انداز میں اِدھر اُدھر نظر بھی دوڑائی۔

سہراب خان اس کی طرف اسی طرح حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اصیل خان نے اپنے دونوں ہاتھ سہراب خان کے سامنے جوڑ دیے۔

''خدا کے لیے سہراب خان جن قدموں سے اس گھر میں داخل ہوئے ہو انہی قدموں سے واپس چلے جاؤ۔'' اصیل خان کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی اور وہ سہراب خان سے التجا کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کوئی پاپ کے دلدل میں دھنسنے کے بعد ضمیر کی ملامت سے نڈھال ہو کر دیوتا کے سامنے اپنے وجود کو ریت کی طرح بچھا رہا ہو۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو اور یہ تم نے کیا حال بنایا ہوا ہے، میں تو تمہیں پہلی نظر میں پہچانا ہی نہیں...... اصیل خان ہی ہو نا؟'' سہراب خان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت الجھی الجھی کیفیت میں سوال کر رہا تھا۔

''سہراب خان تم میرے حال پر نظر نہ کرو، مجھے مت دیکھو...... تم ظلم کے اس راستے سے پلٹ جاؤ...... ظلم کسی کو راس نہیں آتا، وہ بہت کم عمر اور معصوم ہے......'' اصیل خان جیسے گڑگڑایا تھا۔

''مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آ رہی...... بلکہ مجھے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی...... تمہیں کیا ہوا ہے......؟ تم نے اپنا کیا حال بنایا ہوا ہے؟'' سہراب خان بہت بہترین اور قیمتی ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا اس کے اور اصیل خان کے حال میں زمین اور آسمان کا فرق تھا...... اصیل خان تو کسی خریدے ہوئے غلام سے بھی بدتر حلیے میں تھا۔ اس سے بیشتر کہ اصیل خان کے منہ سے کچھ نکلتا...... ڈاکٹر مہر جان ذرا فاصلے پر آ کھڑی ہوئیں...... انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیا تھا بلکہ اصیل خان اور سہراب خان کے آخری جملے وہ سن چکی تھیں۔

اصیل خان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ مہر جان کے اندر اس وقت طوفانی آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔ تھکی ہاری وحشتیں از سرِ نو تازہ دم ہو گئی ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کے منہ سے کچھ نکل نہیں پا رہا تھا...... مگر وہ پوری قوت سے چیخنا چاہ رہی تھیں۔ ابھی تک سہراب خان کی نظر مہر جان پر نہیں پڑی تھی اس لیے وہ اصیل خان سے مخاطب تھا۔

''اصیل خان تم کیوں میری منتیں کر رہے ہو؟ میں خود سے نہیں آیا...... بلکہ میں تو تمہاری بات سن کر پریشان ہو گیا ہوں۔''

اسی وقت ڈاکٹر مہر جان خود کو سنبھال کر پوری قوت مجتمع کر کے بلند آواز سے سہراب خان سے مخاطب

ہوئی تھیں......ان کے انداز میں حکم بھی تھا اور آواز میں گرج بھی۔

''سہراب خان وہاں کیوں رک گئے......اندر کیوں نہیں آئے؟'' اصیل خان......مہر جان کی آواز سن کر بری طرح سٹپٹا گیا تھا اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی......سہراب خان نے اصیل خان کو نئے سرے سے سر سے پاؤں تک گھورا اور مہر جان کی طرف قدم بڑھا دیے......مہر جان شعلہ بار نظروں سے اصیل خان کو گھورتی ہوئی سہراب کو لے کر اندر جا رہی تھیں۔

اور اصیل خان یوں کھڑا تھا......جیسے اچانک طوفانی بارش میں بھیگنے لگا ہو......اور آس پاس اس بارش سے بچنے کے لیے کوئی چھپّر سایہ نہ ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان، سہراب خان کو لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی تھیں۔ سہراب خان بہت الجھی الجھی کیفیت میں مہر جان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مہر جان جیسے اس کی نظروں کا سوال سمجھ رہی تھیں۔

''دیکھو سہراب خان تم اس وقت میری بیٹی کے رشتے کے لیے آئے ہو، ہم نے بہت ساری تفصیلات طے کرنی ہے۔ اس سے ہٹ کر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوگی۔'' انہوں نے ایک دم ہاتھ اٹھا کر سہراب خان سے کہا تھا۔

سہراب خان ان کی یہ بات سن کر بہت زیادہ الجھ گیا مگر مہر جان کا انداز اتنا قطعی اور فیصلہ کُن تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ بولنے کی جیسے اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

ایک کنواری، خوب صورت کم عمر لڑکی......ڈاکٹر مہر جان اسے اس کے نکاح میں دینے کے لیے تیار تھیں۔ اس کا دماغ خراب تھا جو وہ ڈاکٹر مہر جان کا موڈ خراب کر کے پورا ماحول خراب کر دیتا۔

''ہاں، ہاں مہر جان......میں وہی بات کروں گا جو بات کرنے آیا ہوں۔''

''تم سے اب اس گھر کا بڑا مضبوط رشتہ استوار ہو رہا ہے......بہت مضبوط رشتے داری بن رہی ہے......تمہارا اس گھر میں آنا جانا ہوتا رہے گا......جو جس حال میں نظر آ رہا ہے......اسے دیکھ کر ایسے انجان بن جاؤ، جیسے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ آہستہ آہستہ پردے اٹھیں گے مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں رابی کے علاوہ پردے اٹھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' مہر جان بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو مہر جان......مجھے اٹھتے جھکتے پردوں سے کوئی دلچسپی نہیں......میں تو کافی دیر پہلے پہنچ چکا ہوتا......مگر ایک فون آگیا تھا......بہت اہم فون تھا، تقریباً ایک گھنٹا اس سے بات چیت میں لگ گیا......پتا ہی نہیں چلا۔'' سہراب خان، مہر جان کی یہ بات سن کر مسکرا دیا۔

مہر جان کسی خیال میں گم صم سہراب خان کی طرف دیکھ رہی تھیں......وہ ذہنی طور پر کہیں اور پہنچی ہوئی تھیں۔ جیسے سہراب خان کی بات یا وضاحت سنی ہی نہ ہو......بس اُن کے منہ سے دھیرے سے......''ہوں'' نکلا تھا۔

سہراب خان چند لمحے مہر جان کی طرف دیکھتا رہا......پھر خود کو آخر کار سنبھال لیا......وہ اصیل خان سے اپنا ذہن ہٹا کر مطلب کی بات کرنا چاہتا تھا......لیکن جانے کیوں بار بار اصیل خان سامنے آ کھڑا ہو رہا تھا۔

''آپ مجھے بتائیں کہ اب کیا کرنا ہے......؟ بات تو تقریباً طے ہے، کچھ روایات نبھانے کی نیت سے حاضر ہو گیا ہوں۔ میری طرف سے تو سب کچھ اوکے ہے......اور کوئی شرط بھی نہیں......البتہ جو شرائط آپ نے

طے کی ہیں میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ سب کی سب پوری کروں۔''

''مجھے پتا ہے سہراب خان تم کیا کر سکتے ہو......اور کیا نہیں کر سکتے۔ میں تو اپنی بیٹی کی بات پکی ہو جانے کے بعد بہت سارے لوگوں کو مٹھائی بانٹ دینا چاہتی ہوں۔ اطلاع دے دینا چاہتی ہوں......کہ میری بیٹی کا رشتہ ایک بہت بڑے خاندان، بہت اونچے خاندان میں ہو گیا ہے۔ اور میرا داماد......اس ملک کے گنے چنے رئیسوں میں سے ایک ہے۔ جس کا بہت بااثر لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔'' مہر جان اسی طرح معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

سہراب خان بڑے فخر اور غرور سے مہر جان کی طرف دیکھ کر مسکرایا......جیسے مہر جان کی تعریفوں نے اُسے سر سے پاؤں تک نہال کر دیا ہو۔

''مٹھائی تو میں لے آیا ہوں، گاڑی بھری پڑی ہے، کم پڑے تو بتایئے گا......مٹھائی بہت......''

''چلو مٹھائی تو دوسروں کے لیے ہے، میری بیٹی کے لیے کیا لائے ہو؟'' مہر جان دھیرے سے ہنس دیں۔

سہراب خان ان کی بات سن کر مسکرایا......اس نے اپنا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا......پھر ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر پہلے خود کھولی......انگوٹھی پر ایک نظر ڈالی......اور پھر مہر جان کی طرف وہ ڈبیا بڑھا دی۔

''اس میں سات ڈائمنڈز لگے ہیں، مہر جان اسپیشلی اس انگوٹھی کی وجہ سے میں نے اپنا روٹ چینج کیا۔ ہالینڈ سے خریدی ہے۔'' سہراب خان بڑے فخریہ انداز میں کہتے ہوئے مہر جان کے چہرے پر ان کے تاثرات جانچنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔

مہر جان نے ایک پُرشوق نظر انگوٹھی پر ڈالی......پھر مسکرا کر سہراب خان کی طرف دیکھا۔

''بس ایک ہیرے کی انگوٹھی......ارے میں تمہیں اپنا کوہِ نور......ہیرا دے رہی ہوں۔'' انہوں نے انگوٹھی دیکھ کر سہراب خان سے کہا۔

سہراب خان نے یہ سن کر قہقہہ لگایا۔

''ڈاکٹر صاحبہ! یہ تو بسم اللہ ہے، شگون ہے، آپ کی بیٹی کو سونے میں تول دوں گا......یہ میرا وعدہ ہے۔''

ڈاکٹر مہر جان نے یہ سن کر انگوٹھی پر دوبارہ ایک تفصیلی نظر ڈالی اور پھر ڈبیا بند کر کے سہراب خان کی طرف دیکھنے لگیں۔

''چلیں دیکھ لیں گے، فی الحال تو میں نے تمہارے لیے بہت شاندار ڈنر کا اہتمام کیا ہے۔ باقی باتیں ہم ڈائننگ میں کریں گے۔'' یہ کہہ کر ڈبیا اپنی مٹھی میں دبا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

سہراب خان بھی ان کی تقلید میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

گل جان بڑے عجلت بھرے انداز میں کپڑے ہینگر کر کے وارڈ روب میں لٹکا رہی تھی۔

رابی اپنے بیڈ پر لیٹی کوئی کتاب پڑھنے میں محو تھی۔ گل جان نے ایک نظر رابی پر ڈالی......پھر اس کے برابر میں پڑے ہوئے ہینگر شدہ کپڑوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بیٹا! میں ڈائننگ میں جا رہی ہوں، کھانا لگ گیا ہے۔ بی بی جان نے بلایا ہے، تم ذرا یہ دو تین سوٹ ہیں وارڈ روب میں لٹکا دینا......ٹھیک ہے؟''

''اچھا۔'' رابی نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر بیزاری سے جواب دیا تھا۔

"خالہ جانی آپ جائیں، مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"بی بی جان نے صرف مجھے بلایا ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر رابی کی طرف دیکھا...... پھر آہستہ سے بولی۔

"کیا مطلب ہے خالہ جانی...... آج اماں نے ہمارا حقہ پانی بھی بند کر دیا ہے؟ اب کھانے پر بھی نہیں بلائیں گی۔" رابی نے ایک دم چونک کر اپنے چہرے کے سامنے سے کتاب ہٹائی اور گل جان کی طرف دیکھا۔

"یہ بات نہیں ہے بیٹا، مہمانوں کے ساتھ کھانا کھا رہی ہیں، شاید مہمانوں کے سامنے تمہیں بلانا نہیں چاہتی ہوں۔" گل جان کے چہرے پر ایک دکھ کی کیفیت لمحے بھر کو نمودار ہوئی مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔

"مہمان؟ اچھا پھر کوئی آ گئے ہوں گے...اماں کے خاص رشتے داروں میں سے، میرا مطلب ہے کولیگ وغیرہ...... کیونکہ اماں کے کولیگز ملنے جلنے والے ہی اُن کے رشتے دار ہیں، ہمارے رشتے دار تو اس گھر میں آتے نہیں......" رابی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"سہراب خان آیا ہے، رابی۔" گل جان نے جاتے جاتے پلٹ کر رابی کی طرف دیکھا۔

رابی پر جیسے کوئی آسمان سا ٹوٹا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر گل جان کی طرف دیکھا۔

"سہراب خان؟ اسے آج اماں نے ڈنر پر بلایا ہے؟"

"ہاں، وہ ایسا گیا گزرا نہیں کہ بِن بلائے ڈنر پر آ جائے، ظاہر ہے بی بی جان...... نے ہی بلایا ہوگا۔" گل جان یہ کہتے ہوئے آگے بڑھی۔

"ٹھیک ہے خوب ڈنر کرائیں سہراب خان کو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا...... مجھے جو کرنا ہے وہ میں کر کے دِکھا دوں گی۔"

"بس بیٹا! بس اس سے آگے نہ بولنا...... تم بولتی ہو تو میرے پورے وجود پر لرزا طاری ہو جاتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے گر پڑوں گی۔" گل جان جو تقریباً دروازے سے باہر نکل چکی تھی، بڑی تیزی سے پلٹ کر رابی کے قریب آئی اور اس نے رابی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی بے بسی کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کھانے پر جائیں خالہ جانی اور مجھ سے مزید کوئی بات نہ کریں کیونکہ آپ بات کریں گی تو پھر میں بھی بات کروں گی۔" رابی نے بڑی پُرسکون مسکراہٹ کے ساتھ بلکہ بڑے اعتماد سے گل جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ رابی کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے گل جان کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان بڑے پُراخلاق انداز میں سہراب خان کو ڈشز پیش کر رہی تھیں اور معنی خیز لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"سہراب خان گھر کی بھیدی ہوں، کم از کم تمہیں سوال جواب نہیں کرنے چاہئیں۔" وہ ابھی اتنا ہی بول پائی تھیں کہ ان کی نظر ڈائننگ میں داخل ہوتی گل جان پر پڑی۔

"آؤ، آؤ گل جان بہت دیر کر دی تم نے...... ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"السلام علیکم۔" گل جان نے نظر جھکا کر آہستہ سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام...... کیسی ہو گل جان؟" سہراب خان نے گل جان کو بڑی معنی خیز نظروں سے سر سے پاؤں

تک تولا تھا۔ گل جان کی نظریں اسی طرح جھکی ہوئی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں، آپ کھانا شروع کیجیے۔" یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر مہر جان کی برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"گل جان۔" مہر جان نے گل جان کی طرف دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"جی بی بی جان۔" گل جان جانے کس دھیان میں تھی...... اچانک چونک پڑی۔

"سہراب خان رابی کے لیے انگوٹھی لایا ہے، بہت خوب صورت انگوٹھی ہے، ایسی انگوٹھی جو کوئی رئیس، کسی رئیس کی بیٹی کو پیش کر سکتا ہے، مجھے تو بہت پسند آئی۔"

"شکریہ......" سہراب خان بہت جلدی سے بولا تھا۔ ساتھ ہی اس نے گل جان کی طرف بھی دیکھا۔

"لگتا ہے گل جان کو اس خوش خبری سے خوشی نہیں ہوئی۔"

مہر جان ایک بڑا طنزیہ قہقہہ لگا کر ہنس دی تھیں۔

"نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... بی بی جان کی خوشی میری خوشی ہے، میں...... میں بہت خوش ہوں۔" گل جان نے یہ کہہ کر ایک ڈش اٹھائی اور مہر جان کے سامنے رکھ دی۔

ڈاکٹر مہر جان نے ڈش پر ایک نظر ڈالی اور بہن کی طرف دیکھا۔

"یہ میری بہن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو چکی ہے، اس کی طرف سے مجھے کوئی خوف اور خطرہ نہیں...... اور یہ میری کسی بات سے اختلاف نہیں کرتی۔" وہ سہراب خان سے مخاطب تھیں۔

"بہت اچھی بات ہے اور بڑے کمال کی بات ہے۔ بلکہ کمال حیرت کی بات ہے کہ گل جان آج بھی آپ کے ساتھ ہے۔" سہراب خان کے لہجے کی معنی خیزی دونوں بہنوں نے پوری شدت کے ساتھ محسوس کی۔

"یہ ہمیشہ میرے ساتھ تو رہے گی...... اس وقت تک جب تک میں زندہ ہوں یا یہ زندہ ہے۔" ڈاکٹر مہر جان ڈش سے سالن اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"مہر جان آپ جیسی بہن کی مثال نہیں ملتی۔" سہراب خان نے فورک میں ایک فش کا ٹکڑا پھنساتے ہوئے تعریفی نظروں سے مہر جان کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی بات سن کر ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ ان کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے...... جیسے ذہن کی اسکرین پر بڑی تیزی سے منظر بدل رہے ہوں۔

"جن حادثوں سے ہم گزرے ہیں سہراب خان وہ حادثے بھی ہر کسی کا مقدر نہیں ہوا کرتے...... ہماری ہی طرح بے مثال کہہ لیجیے......" مہر جان بول رہی تھیں...... اور گل جان کے سینے میں دل یوں کانپ رہا تھا جیسے موسلا دھار بارش اچانک شروع ہو گئی ہو اور سہمی ہوئی چڑیا کانپتی جا رہی ہو۔

☆☆☆

روما اپنے کمرے سے نکلی تو اسے ڈائننگ ٹیبل سے برتنوں کے کھنکنے کی آواز سنائی دی...... وہ چونک پڑی۔

"شاید کوئی مہمان آیا ہے، اسی لیے ڈائننگ میں آج ہمیں نہیں بلایا گیا......" وہ یہ سوچتی ہوئی رابی کے کمرے میں صرف یہ جاننے کے لیے چلی آئی تھی کہ آج کون مہمان آیا ہے؟ اتنی سی بات ہے، روٹین سے ہٹ کر معاملہ تھا...... مدتیں ہو گئی تھیں وہ دونوں بہنیں خالہ اور ماں کے ساتھ ہی رات کا کھانا کھاتی تھیں...... اور آج کھانا ان کے بغیر ہو رہا تھا۔

"یہ ڈائننگ سے چمچوں اور پلیٹوں کی آوازیں آ رہی ہیں، لگتا ہے کوئی خاص مہمان آیا ہے، اسی لیے آج ہمیں ڈائننگ میں نہیں بلایا گیا۔" روما...... رابی کے کمرے میں بولتے ہوئے داخل ہوئی۔

رابی اپنی وارڈروب میں کپڑے لٹکا کر پلٹی تو اوراس نے سر سے پاؤں تک روما کا جائزہ لیا۔

''اچھا، تمہیں بھی کھانے پر نہیں بلایا اماں نے...... تم تو سہراب خان کے سامنے جاسکتی تھیں!'' روما نے آنکھیں پھاڑ کر رابی کی طرف دیکھا۔

''او گاڈ آپا...... سہراب خان آیا ہے؟'' پھر ایک دم اس نے اپنی آواز خود ہی بغیر کسی تنبیہ کے دھیمی کرلی۔

''کیا بارات لے کر آیا ہے؟''

رابی اپنے بیڈ کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

''وہ بارات لے کر آئے یا باراتیں...... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

روما دھپ سے اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''کیوں......؟ مجھے کیوں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے آپا...... آپ میری بہن ہیں، میں پریشان نہیں ہوں گی تو کوئی کالا چور پریشان ہوگا۔''

رابی اسی طرح کھڑے کھڑے روما کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہاں...... کالے چور کو ہی پریشان ہونے دو...... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... میں تو اس بات پر پریشان ہوں کہ اماں نے تمہیں ڈائننگ میں کیوں نہیں بلایا...... چلو مجھے نہ بلانے کی وجہ تو سمجھ آتی ہے۔''

روما کے چہرے پر ایک دم خفگی کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔

''اچھا ہوا نہیں بلایا...... وہ بلاتیں بھی تو کون سا میں چلی جاتی۔'' اس نے آف موڈ میں جواب دیا تھا۔

''کیوں، تمہیں بھوک نہیں لگی؟'' رابی نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''آپا پتا ہے میں کیوں پریشان ہوں؟'' اس نے بھوک کی شدت کو نظر انداز کرتے ہوئے بہن سے کہا۔

''بتادو کیوں پریشان ہو...... ویسے تم پریشان کبھی ہوتی نہیں، آج کیا ہوا؟''

''میں تو اس وجہ سے پریشان ہوں آپا...... کہ آپ پریشان نظر نہیں آرہیں...... سہراب خان آج گھر میں آکر بیٹھ گیا ہے، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، آپ کہتی ہیں کہ میں شادی نہیں کروں گی...... اور وہ ہمارے یہاں کھانے کھا رہا ہے؟''

رابی یہ سن کر مسکرائی...... چند لمحے روما کی طرف دیکھتی رہی...... پھر ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ بڑ اعجیب سا قہقہہ تھا...... جیسے کوئی ہوش وخرد سے بیگانہ ہوکر...... دنیا ومافیہا سے بے خبر جانے کس دُھن میں چلا جا رہا ہو۔

روما نے گھبرا کر رابی کی طرف دیکھا...... مگر وہ کچھ بول نہیں پائی...... رابی اتنا ہنسی کے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے چھلک پڑے۔ اس نے ہنستے ہنستے اپنی انگلی کی پور سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے صاف کیے اور گہری سانس لے کر روما کی طرف دیکھا۔

''بے وقوف...... میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ صرف پریشان ہوکر اپنی توانائیاں ضائع کروں...... مجھے پتا ہے مجھے کیا کرنا ہے، یہ تو طے ہے کہ میری شادی سہراب خان سے نہیں ہوگی...... اب تم جاؤ اور نوکر سے کہو کہ وہ تمہیں تمہارے کمرے میں ہی کھانا پہنچادے...... آج تو ہمارے گھر میں سہراب خان کی دعوت ہے، بڑے مزے کی چیزیں تیار ہوئی ہوں گی۔ جاؤ، مزے لے کر دعوت اڑاؤ۔'' رابی اتنا کہہ کر کھڑکی کی طرف بڑھ گئی اور پردے سرکانے لگی۔

روما اپنی جگہ پر سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ درحقیقت اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

''روما کی اماں بہت ظالم ہیں، اب انہوں نے لیٹ آورز میں ہمارے فون کرنے پر بھی پابندی لگادی ہے، آگے آگے دیکھیں مجھے تو یہ ڈر ہے کل کو سانسیں لینے پر پابندی نہ لگادیں۔'' کائناز منہ پُھلائے شاہ عالم کے کندھوں سے سر لگائے ان کے کمرے میں ان کے بیڈ پر بیٹھی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''بیٹا دوستوں میں، سہیلیوں میں، پیار محبت ہوتا ہے اور اچھی بات تو یہ ہے کہ پیار اور خلوص سے ہی دوستی مضبوط ہوتی ہے اور چلتی ہے لیکن جس طرح سے تم اور روما ایک دوسرے کے لیے سوچتی ہو پاگل ہو، یہ دوستی سے زیادہ انتہا پسندی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سب سے بہترین راستہ درمیانی راستہ ہے، ہر چیز میں اعتدال ہونا چاہیے۔'' شاہ عالم بڑی شفقت سے اسے سمجھانے لگے۔

''اچھا اب بس بھی کریں، آپ تو پھر نصیحتیں لے کر بیٹھ گئے۔ میں کیا کروں، دادا جان میں اپنے دل کے سامنے مجبور ہوں، میرے دل میں تو ہر وقت روما کا خیال رہتا ہے۔ جب میں اکیلی بیٹھی ہوتی ہوں ناں تو ایسا لگتا ہے کہ روما میرے ساتھ بیٹھی ہے، میں جب بھی اسے یاد کرتی ہوں تو وہ مجھے اپنے بالکل قریب محسوس ہوتی ہے بلکہ اکثر تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ بول رہی ہو، میں سن رہی ہوں۔''

شاہ عالم نے اتنا سنا اور اپنا ہاتھ بڑی زور سے پیشانی پر مارا۔

''لاحول ولاقوۃ...... بھئی دوستیاں تو ہم نے بہت دیکھیں...... بڑی بڑی مثالی دوستیاں...... لیکن یہ پاگلوں والی دوستی آج تک نہیں دیکھی...... بس اسی تجربے کی کمی تھی ہماری زندگی میں...... الحمدللہ وہ بھی پوری ہوگئی......'' وہ مزاحیہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

''دادا جان میں سیریس ہوں، مذاق نہیں کررہی ہوں۔'' کائناز نے خفا خفا نظروں سے دادا کی طرف دیکھا۔

''تو بیٹا میں بھی مذاق نہیں کررہا ہوں، سمجھا رہا ہوں، بہت سمجھدار ہوگئی ہو، عقل، سمجھ سے کام لو، اسی طرح تم اپنی سہیلی کے عشق میں مبتلا رہیں تو تمہاری اسٹڈیز بھی متاثر ہوں گی...... اور تم جانتی ہو ناکہ تمہیں اپنے ٹارگٹ تک جانا ہے، میں تمہیں انجینئر کے روپ میں دیکھتا ہوں...... ایک کامیاب انجینئر۔'' شاہ عالم نے اپنے کندھے پر اس کا رکھا سر بڑی محبت سے تھپتھپانے لگے۔ ''بیٹا حقیقت پسند لوگ زندگی میں بہت آرام سے جی لیا کرتے ہیں اور جو لوگ تصورات اور خوابوں میں کھوئے رہتے ہیں وہ قدم قدم پر دکھ اٹھاتے ہیں، ہرٹ ہوتے ہیں۔'' وہ ایک مرتبہ پھر اسے سمجھانے لگے۔

''آخر ہرج ہی کیا ہے اگر میں اور روما ایک دوسرے سے سچا پیار کرتے ہیں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا پیار کسی کو تکلیف تو نہیں دیتا ناں۔'' کائناز کا موڈ اب بھی اسی طرح تھا۔

''بیٹا میں نے کہا ناں پیار، محبت، بہت اچھی بات ہے لیکن انتہا پسندی ہمیشہ سے غلط سمجھی جاتی ہے اور ہمیشہ غلط سمجھی جاتی رہے گی...... اب تم دونوں چھوٹی بچیاں تو ہو نہیں۔ بڑی ہوچکی ہو، پہلے میں تمہاری ان بے سبب باتوں کا نوٹس نہیں لیتا تھا۔ سمجھاتا بھی نہیں تھا...... لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں روک ٹوک کی ضرورت ہے۔''

کائناز نے ان کے کندھے سے سر اٹھا کر ایک نظر ان کی طرف دیکھا پھر دوبارہ وہیں سر رکھ کر آنکھیں موندلیں۔

''یہ نصیحتیں میرے اوپر کوئی اثر نہیں کریں گی دادا جان۔ دل تو ہر وقت روما، روما پکارتا ہے۔''

ان کے چہرے پر بڑی عجیب سی بے بسی تھی مگر وہ مسکرا رہے تھے۔ جیسے کائناز کی معصومیت نے سب کچھ بھلا دیا ہو، وہ کیا کرتے پوتی تو انہیں جان سے زیادہ پیاری تھی...... کہ متاعِ حیات تھی، ان کی جمع پونجی تھی، کُل کائنات تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہرجان اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی ان کے چہرے سے لگتا تھا جیسے اندر قیامتیں برپا ہوں ان کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ ان کے ٹہلنے کے انداز میں بڑی بے قراری تھی۔ اسی وقت اصیل خان دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوا۔

مہرجان اپنے دھیان سے چونک کر پلٹیں۔ اصیل خان آگے بڑھنے کے بجائے جس قدر اندر آیا تھا بس اسی جگہ رک گیا۔ ''آپ نے یاد کیا ڈاکٹر صاحبہ؟''

''اصیل خان تم اپنی کمٹ منٹ سے پھر رہے ہو۔'' مہرجان نے اس کی بات سن کر جیسے اپنی پھنکاروں پر قابو پانے کی کوشش کی۔

اصیل خان جیسے لرز کر ان کی طرف دیکھا۔ ''بھول ہوگئی ڈاکٹر صاحبہ معاف کر دیں۔'' مہرجان یہ سن کر مزید بھڑک اٹھیں۔ انہوں نے پوری قوت سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

''تم بہت شاطر ہو اصیل خان اور انتہائی ناقابلِ اعتبار بھی سب کچھ کر جاؤ گے...... ایک مرتبہ پھر سب کچھ کر جاؤ گے اور معصوم بن کر...... معصوم شکل بنا کر مجھ سے معافی مانگنا شروع کر دو گے مگر میں قیامت تک تمہیں معاف نہ کرنے کا اپنے آپ سے عہد کر چکی ہوں۔'' ڈاکٹر مہرجان کے لہجے میں جیسے شعلے بھڑک رہے تھے۔

''میں پھر بھی آپ سے معافی مانگتا رہوں گا۔ سنا ہے پتھر پر پانی کا قطرہ مسلسل گرتا رہے تو پتھر میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔ کیا خبر ایسی کون سی نیک گھڑی نصیب میں لکھی ہو کہ آپ مجھے معاف کر ہی دیں۔''

''بند کرو یہ تقریر......'' ڈاکٹر مہرجان دہاڑیں۔ ''تم سہراب خان کے سامنے آئے ہی کیوں؟''

''میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ! بس پتا نہیں مجھے کیا ہوا، یقین کریں...... میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا آپ خود سوچیں مجھے تو خود اس بات کا احساس ہے کہ مجھے سہراب خان کے سامنے کسی بھی صورت میں نہیں آنا چاہیے۔ نہ جانے مجھے ایک دم سے کیا ہوا۔ آپ یقین کریں میں کسی پلاننگ سے یا سوچ سمجھ کر اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔''

مہرجان اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر آگے بڑھیں، اور ایک زور کا تھپڑ اصیل خان کے گال پر رسید کیا۔

''سب بے بس ہیں۔ سب کی مجبوریاں ہیں، ایک میں ہی خود مختار اور آزاد ہوں، میرے پاؤں کی طرف دیکھو...... دیکھو میرے پاؤں کی طرف۔'' وہ زور سے چلائیں...... اصیل خان سر جھکائے نیچے ہی دیکھ رہا تھا۔

''میں آپ کے پاؤں کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا۔ ڈاکٹر صاحبہ...... سنا ہے پاؤں تو دشمن کے دیکھے جاتے ہیں۔''

یہ سن کر مہرجان ایک جھٹکے سے اس سے پیچھے ہٹ گئیں۔ وہ غصے سے بری طرح کانپ رہی تھیں۔ غصے کی شدت کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ بول نہیں پا رہی تھیں۔

''دشمن...... تو کیا ہم بھی دوست تھے؟ لعنت ہے تم پر، آج بھی دوستی دشمنی کا فلسفہ بگھارتے ہو، میں تمہیں اپنے پاؤں کی طرف دیکھنے کے لیے اس لیے کہہ رہی تھی کہ شاید تمہیں میرے پاؤں میں پڑی ہوئی وہ بھاری بھاری زنجیریں دکھائی دیں۔ تم سب بے بس اور مجبور ہو اور میں ان بھاری بھاری زنجیروں کے ساتھ آزاد اور

خود مختار ہوں۔ دفع ہو جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے، پتا نہیں میں نے تمہیں کیوں باندھ رکھا ہے، جی چاہتا ہے کہ تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصت کر دوں لیکن اگر تمہیں اس گھر سے رخصت کر دیا تو میرے اندر کی بھڑکی ہوئی آگ کبھی نہیں بجھے گی۔ چلے جاؤ یہاں سے، غرق ہو جاؤ یہاں سے۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے اپنا چکراتا ہوا سر تھاما اور لڑکھڑاتی ہوئی اپنے بیڈ کی طرف بڑھیں۔

اصیل خان اسی طرح مودبانہ انداز میں ان کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

صابرہ نے ناشتا لگا دیا تھا۔ جابر علی یونیفارم میں ملبوس اپنے کندھوں پر میڈل سجائے بڑے افسرانہ انداز میں ناشتا کرنے میں مشغول تھا۔

صابرہ اپنے محدود بجٹ میں پوری کوشش کرتی تھی کہ جابر علی کو روزانہ ناشتے میں ورائٹی ملے کیونکہ وہ اس کی بیوی ہونے کے ناتے بخوبی جانتی تھی کہ وہ کھانے کی اچھی چیزیں دیکھ کر ذرا نرم پڑ جاتا ہے اور آج تو اس نے ستارہ کی سفارش کرنی تھی اس لیے انڈوں کا حلوا، آملیٹ اور اس کی پسندیدہ نمکین سویاں بھی بنائی تھیں۔ جو وہ اکثر فرمائش کر کے بنواتا تھا۔

''وہ میں کچھ کہہ رہی تھی، سن رہے ہیں؟'' صابرہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

جب سے جابر علی نے ستارہ کے کالج جانے پر پابندی لگائی تھی صابرہ کی راتوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔ وہ سیدھی سادی عورت تھی مگر اتنا سمجھتی تھی کہ آج کل کے زمانے میں لڑکیوں کی پڑھائی، لکھائی کتنی ضروری ہو گئی ہے۔

''ہاں، بولو بہرہ...... نہیں سن رہا ہوں......'' جابر علی نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے بڑی ناگواری کی کیفیت میں کہا تھا۔

''دیکھیں، غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔'' صابرہ نے ڈرتے ڈرتے بہت مختصر الفاظ میں اپنا عندیہ پیش کیا تھا۔

''لڑکیوں کی پڑھائی کوئی اتنی ضروری نہیں ہوتی، کیا نوکریاں کروائے گی۔ ابھی اتنا پڑھایا ہے تو اتنی زبانیں چل پڑی ہیں، تھوڑا سا اور پڑھ جائے گی تو وہاں چوراہے پر ہمیں بیچ کر کھا جائے گی۔ بس جو میں نے ایک دفعہ کہہ دیا تو کہہ دیا۔'' جابر علی نے یہ کہہ کر نوالہ منہ میں ڈالا اور چائے کے کپ کی طرف گھورنے لگا۔ جیسے وہ شعوری طور پر صابرہ کی طرف دیکھنے سے پرہیز کر رہا ہو۔

''اب یہ تو مقدر کی باتیں ہیں، میں تو بس سوچتی ہوں کہ لڑکی تھوڑی بہت پڑھی لکھی ہو تو گھر کو ذرا اچھی طرح چلاتی ہے۔'' جابر علی نے اب بیوی کو شعلہ باز نظروں سے گھورا۔

''بے وقوف عورت، ارے وہ گھر کو کیا چلائے گی، اس نے تو ابھی سے ہمیں چلانا شروع کر دیا ہے، احتجاج کرنا آ گیا ہے اسے۔ میں خطرے کی گھنٹی سن رہا ہوں، تم اپنے کانوں پر اور آنکھوں پر پردے ڈال کر آرام سے سوتی رہو۔'' اتنا کہہ کر جابر علی نے چائے کا کپ اٹھایا...... اور سُڑپ سُڑپ کی آواز کے ساتھ دو تین گھونٹ بھرے۔

''ٹھیک ہے ایک دفعہ غلطی ہو گئی ہے، دوسرا موقع تو دیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔'' صابرہ بہت صلح جو انداز میں اور بڑے صبر و ضبط سے کہہ رہی تھی۔ ''میں گارنٹی دیتی ہوں۔'' اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ جابر علی نے ہاتھ بلند کیا اور اسے مزید بات کرنے سے روک دیا۔

"نہیں چاہیے کوئی گارنٹی وارنٹی...... اور جو خود دوسروں کی گارنٹی دیتا ہے، وہ تو ان سے بھی بڑا بے وقوف ہے۔ آج عقل سے کام نہیں لوگی تو کل سر پکڑ کر روؤ گی۔"

"ستارہ میری اولاد ہے اور ایک ماں اپنی اولاد کو اچھی طرح جانتی اور سمجھتی ہے۔"

"اچھا تو پھر یہ تمہاری ہی ٹریننگ ہوگی، خوب جان کر سمجھ کر اس کو ٹرین کر رہی ہو۔" جابر علی نے چائے کا کپ رکھ کر اب نیا نوالہ توڑا اور ساتھ ہی پتھر بھی پھوڑے...... صابرہ نے جان لیا تھا کہ اب اس کا بولا گیا کوئی اور نیا جملہ ایک قیامت برپا کردے گا وہ جیسے ہار مان کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

جابر علی نے اس کو اٹھتا پا کر اس کی طرف دیکھنے کا تصور بھی گوارا نہیں کیا...... اتنی محنت سے ناشتا بنا کر دینے والی بیوی اس کی نظر میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتی تھی کہ وہ ایک نگاہِ غلط بھی اس پر ڈال لے۔

☆☆☆

برہان اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے کی طرف آرہا تھا کہ اس کے کانوں میں ماں کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر رکا اور سننے کی کوشش کرنے لگا کہ صبح صبح اس کی ماں کس موضوع پر باپ سے بات کر رہی ہے تاکہ وہ اسی حساب سے اپنا موڈ بنا کر باپ کے سامنے آئے جب اس نے سنا کہ ستارہ کے مسئلے پر بات ہو رہی ہے تو وہ آگے بڑھنے کے بجائے چپ چاپ ستارہ اور شبینہ کے مشترکہ کمرے میں چلا آیا۔

ستارہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ شبینہ کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ستارہ بھائی کو دیکھ کر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی...... برہان بولے بنا چپ چاپ ایک طرف پڑی کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"خیریت تو ہے بھائی؟" شبینہ نے بڑی غائر نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، ہاں خیریت ہے وہ امی...... ابا جان سے ستارہ والے مسئلے پر بات کر رہی ہیں، میں نے سوچا اس طرف جانے کے بجائے تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جاؤں۔ فضول میں کوئی بات نکل گئی تو ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔" پھر ستارہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابا جان کا غصہ ٹھنڈا ہو جانے دو پھر میں خود بات کروں گا... فی الحال وہ جیسا کہتے ہیں تم ویسا کرو۔"

"مجھے نہیں پڑھنا بھائی، بس رہنے دیں۔ جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔"

"دیکھ رہے ہیں بھائی؟ اس کی وجہ سے گھر میں مسئلے چل رہے ہیں اور اس کے طور طریقے وہی ہیں۔" شبینہ نے بھائی کی طرف دیکھا۔

برہان نے گہری سانس لی اور ستارہ کی طرف دیکھ کر بڑے صبر و تحمل سے گویا ہوا۔ "دیکھو ستارہ ہر انسان سے غلطی ہو سکتی ہے، ہو جاتی ہے لیکن باپ کے سامنے انا، ضد فضول چیزیں ہیں، ماں، باپ آخر ماں، باپ ہوتے ہیں، کوئی غلطی ہو جائے تو معافی مانگ لینی چاہیے۔" وہ سمجھانے کے انداز میں کہہ رہا تھا اور ستارہ کا غصہ جیسے سوا نیزے کو چھونے لگا۔ اس نے بڑے بھائی کے احترام میں ایک دم پھٹ پڑنے کا انداز اختیار نہیں کیا مگر پھر بھی خاصی برہمی سے گویا ہوئی۔

"غلط بات کروں گی تو سو دفعہ معافی مانگوں گی، میں نے کیا غلط بات کی ہے، چوری کی ہے ڈاکا ڈالا ہے؟"

"آہستہ بولو، پتا ہے کیا ہو رہا ہے، اس کے باوجود۔" شبینہ نے ایک دم گھبرا کر ستارہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔ "پھر کوئی فضول بات ابا جان نے سن لی تو چیخیں گے۔"

"شبینہ ٹھیک کہہ رہی ہے، اچھی بات نہیں کر سکتیں تو خاموش رہو۔" برہان نے بھی ستارہ کو ٹوک دیا۔

"ابا جان کب نہیں چیختے، ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے ہماری صبح تو بس، چیخ و پکار سے ہی ہوتی ہے۔ سب کچھ ابا کی مرضی سے ہوتا ہے پھر بھی انہیں ہر وقت غصہ آتا رہتا ہے۔" ستارہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

"تمہیں کہہ رہے ہیں ناں ستارہ خاموش ہو جاؤ...... ابا جان کو گھر سے جانے دو، اس کے بعد تمہارے دل میں جو آئے بول لینا اور اس طرح سے بولنا کہ پھر آئندہ یہ باتیں دہرانے کی گنجائش نہ رہے۔ میں فی الحال اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔" برہان بھی ناراضی سے کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

ستارہ ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔ شبینہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا...... پھر جیسے ٹھنڈی سانس بھری چپ چاپ کتابیں اٹھائیں اور کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان اور گل جان دونوں ناشتے کی ٹیبل پر تھیں...... ڈاکٹر مہر جان چائے کا کپ اٹھاتے اٹھاتے ایک دھیان سے جیسے چونک پڑیں، انہوں نے گل جان کی طرف دیکھا۔

"گل جان، روما آج کالج نہیں جا رہی؟ رابی کی تو خیر لیٹ ہی جاتی ہے۔ روما کا تو ٹائم ہو رہا ہے۔ اس نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا؟" گل جان نے اپنا جھکا ہوا سر ایک لمحے کے لیے اٹھایا اور دوبارہ جھکا لیا۔

"بی بی جان روما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ کہہ رہی ہے کہ مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔ آج میں کالج نہیں جاؤں گی۔"

"خیریت ہے، کیا ٹمپریچر ہے اسے؟" ڈاکٹر مہر جان کے چہرے پر ایک دم گہری فکرمندی کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔

"پتا نہیں، میں نے پوچھا تھا کہ کالج کیوں نہیں جا رہیں تو بس یہی بولی کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" گل جان نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"تو رابی کیا کر رہی ہے، اسے تم نے بتایا نہیں کہ میں نے کہا ہے کہ جب میں گھر پر ہوتی ہوں تو میرے ساتھ ناشتا، کھانا ہوگا۔ جاؤ جا کر دیکھو اسے وہ کیا کر رہی ہے۔"

"وہ بی بی جان میں نے رابی سے پوچھا تھا، وہ کہہ رہی ہے میں صرف دودھ پیوں گی، اس نے رات دیر سے کھانا کھایا تھا اسے بھوک نہیں ہے۔"

ڈاکٹر مہر جان نے یہ سن کر ایک گہری سانس لی اور سلائس پر بٹر لگانے لگیں پھر بڑی رسانیت اور حیران کن نرمی سے گل جان کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "ٹھیک ہے آج مجھے ویسے بھی اسے شاپنگ کے لیے لے کر جانا ہے، کوشش کرو کہ اس کا موڈ ٹھیک رہے۔"

"شاپنگ کے لیے؟" گل جان نے چونک کر مہر جان کی طرف دیکھا۔

"ہاں اس کی پسند سے کچھ کپڑے وغیرہ لے لیتی ہوں، باقی تو مجھے کوئی تیاری نہیں کرنی...... سب کچھ سہراب خان خود ہی کر رہا ہے اور میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ میں جہیز میں ساز و سامان نہیں دوں گی بس کچھ کیش دوں گی...... اور ایک DHA میں پلاٹ ہے وہ دے دوں گی۔" مہر جان اب سلائس کا ایک بائٹ لے کر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے گل جان کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

گل جان انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"وہ DHA والا پلاٹ...... ؟ بی بی جان وہ تو بہت بڑا ہے اور بہت قیمتی ہے سہراب خان کو زمین جائداد

کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے اپنے پاس بہت کچھ ہے۔'' لاشعوری طور پر گل جان کے لہجے میں ایک محسوس ہونے والی تلخی ابھر آئی تھی۔ جو مہر جان جیسی حساس عورت کے لیے بہت چونکا دینے والی تھی۔

مہر جان نے گھور کر گل جان کی طرف دیکھا۔

''تو کیا بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت کر دوں....؟ جتنے تماشے بننے تھے بن چکے..... جو میں کر رہی ہوں مجھے کرنے دو، مجھے تمہارے مشوروں کی ویسے بھی ضرورت نہیں ہے۔'' مہر جان کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بچے کو ڈانٹ رہی ہوں۔

''بی بی جان...... جیسی آپ کی مرضی...... منہ سے ایسے ہی نکل گیا تھا۔'' گل جان نے اپنی ناشتے کی پلیٹ مزید آگے سرکائی اور آہستہ سے بولی۔

''یہ دل اور زبان اگر سنبھالے نہیں جائیں تو بڑے مسئلے ہو جاتے ہیں۔ یہ نصیحت نہیں ہے اس لیے کہ اب تم نصیحت کی حدود سے باہر آ گئی ہو، میری طرح تجربہ کار ہو۔'' مہر جان نے اس کی طرف دیکھا اور طنزیہ مسکرائیں۔ اتنا کہہ کر مہر جان چائے کے گھونٹ بھرنے لگیں۔

گل جان نے جیسے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔

☆☆☆

روما اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ وہ جاگ رہی تھی اور خیالات میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا تو اس نے چونک کر کروٹ بدلی...... ماں کو سامنے دیکھ کر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر مہر جان اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ٹمپریچر ہے؟'' یہ کہہ کر مہر جان نے آگے بڑھ کر روما کی پیشانی چھوئی پھر الجھن بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''تمہارا ٹمپریچر تو نارمل ہے۔ پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''وہ میرے سر میں درد ہے، اماں جان... اور آج پتا نہیں کیوں بستر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا......''

''سر میں کیوں درد ہے۔ زیادہ پڑھ رہی ہو؟'' مہر جان کے لہجے میں عجیب سی محسوس ہونے والی تلخی اتر آئی۔ ''صرف سر کے درد کی وجہ سے تم کالج کی چھٹی کرو گی۔ یہ سکھایا ہے میں نے تمہیں؟ میں تمہیں شروع سے بتاتی آئی ہوں کہ ٹمپریچر بھی ہو تو ناغہ نہیں ہونا چاہیے۔ ناغے کے لیے کوئی بہت بڑی بات ہونی چاہیے۔''

روما نے یہ سن کر ماں کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ ''بہت بڑی بات ہونی چاہیے۔ مثلاً قیامت ہونی چاہیے، گھر میں آگ لگ جانی چاہیے۔'' وہ دل ہی دل میں کھولتے ہوئے سوچ رہی تھی مگر مجال نہیں تھی کہ وہ یہی جملے زبان پر لے آتی۔

''اماں آج چھٹی کرنے دیں، آئندہ نہیں کروں گی۔''

''آخر کوئی وجہ بھی تو ہو، ضرور کوئی وجہ ہے، بتاؤ مجھے، کیا مسئلہ ہے؟'' مہر جان جیسے راشن پانی لے کر چڑھ دوڑی تھیں۔

''اماں جان کوئی مسئلہ نہیں ہے، ریئلی میرے سر میں درد ہو رہا ہے، اس وجہ سے میرا دل نہیں چاہ رہا اور کوئی بات نہیں ہے۔''

''یہ دل کیا ہوتا ہے، تم اسٹوڈنٹ ہو، تمہیں اپنی اسٹڈی سے ہٹ کر کچھ نہیں سوچنا چاہیے۔'' مہر جان نے گھور کر روما کی طرف دیکھا تھا۔

"تو کیا اسٹوڈنٹ انسان نہیں ہوتے، ان کا دل نہیں ہوتا؟" بلا ارادہ بے اختیار روما کے منہ سے نکل گیا تھا۔
مہر جان ہکا بکا سی ہو کر روما کی طرف دیکھنے لگیں کیونکہ روما جی ہاں سے زیادہ ان سے بات ہی نہیں کرتی تھی۔ آج تو با قاعدہ اس نے پورا قاعدہ پڑھ دیا تھا۔
"کیا ہوا ہے تمہیں، کس وجہ سے تمہارا دل نہیں چاہ رہا...... میرا مطلب ہے تمہارے دل کو ہوا کیا ہے؟"
"میں بھی انسان ہوں اماں، بس کبھی کبھی نہیں چاہتا دل۔" روما نے بہت آہستگی سے جواب دیا۔
"تو کیا میں نے تمہیں بکریوں کے چھپر کے نیچے رکھا ہوا ہے، ہر طرح کی facilities دی ہوئی ہیں اور کیا چاہیے تمہیں؟" مہر جان کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی کیونکہ روما نے پہلی بار ان کے سامنے ان کی بات کے سامنے کوئی بات کی تھی۔
روما سر جھکائے بیٹھی رہی کچھ نہیں بولی۔
"تم برسوں بھی محنت کرو تو وہ عزت نہیں پا سکتیں جو تمہیں ڈاکٹر مہر جان کی بیٹی کی حیثیت سے حاصل ہے۔"
مہر جان نے بڑی ذہانت کے ساتھ صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے اپنی ٹون بدلی لیکن ان کی آنکھوں سے جھلکتی حیرت کم ہونے کے بجائے بڑھ رہی تھی۔ وہ مسلسل پلکیں جھپکائے بغیر روما کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔
"مجھے یہ عزت وزت نہیں چاہیے۔ میں انسان ہوں، میرا بھی ایک دل ہے اور پھر اماں جان ایک قانون سب کے لیے نہیں ہوتا......" مہر جان جو ابھی ایک حیرت سے چھٹکارا نہیں پا سکی تھیں ان کی آنکھیں مزید پھٹ کر رہ گئیں...... یہ روما بول رہی تھی؟ روما جس کے منہ سے آج تک جی اماں، جی اماں کے علاوہ انہوں نے کوئی دوسرا لفظ نہیں سنا تھا...... ان کی تو جیسے اوپر کی سانس اوپر...... اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔
"بہت بڑی بڑی باتیں کر رہی ہو، کیا مسئلہ ہے؟" روما بول تو گئی تھی پھر جیسے اسے خود ہی احساس بھی ہو گیا تھا کہ اس نے گویا اپنی شامت کو بلایا ہے، وہ بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی کہ جب مہر جان کے سامنے کوئی زبان کھولتا ہے تو پھر اس کے بعد مہر جان جو اس کا حشر کرتیں اسے عجیب سے خوف نے آلیا...... اگرچہ اس نے اپنے دل کی بات بہت ادب اور تہذیب سے کی تھی، بدتمیزی یا غصے کے عنصر کو ہر ممکن چھپانے کی کوشش کی تھی...... مگر بہرحال اس نے ماں کی بات کے سامنے اپنی بات تو رکھی تھی ناں اسے اب پچھلا تاثر مٹانے کے لیے کچھ اس طرح بات کرنی تھی کہ مہر جان کا آسمان کو چھوتا ہوا غصہ ٹھنڈا ہو جائے...... وہ بڑی آہستگی سے بولی۔
"اماں ہم آپ کی ہر بات مانتے ہیں، آپ جو حکم دیتی ہیں ویسا ہی کرتے ہیں لیکن ہماری اپنی بھی تو زندگی ہے، ہمیں اپنی زندگی جینے دیں۔"
مہر جان چند لمحے ششدر سی روما کی شکل دیکھتی رہیں پھر جیسے اُن کے پورے وجود میں آگ بھڑک اٹھی اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ روما کے داہنے رخسار پر جڑا تھا۔ روما بری طرح خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا تھپڑ تھا۔ مہر جان نے کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ شروع ہی سے بہت خاموش طبع اور سہمی سہمی سی بچی تھی، ایسا کچھ کرتی ہی نہیں تھی کہ ایسی نوبت آتی۔
"یہ سب تم نے کہیں سے سیکھا ہے۔ زبان تمہاری ہے مگر الفاظ کہیں اور سے آ رہے ہیں، یہ تمہارے خیالات نہیں ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں کالج بھیج کر اور کائناز سے دوستی کی اجازت دے کر بہت بڑی غلطی کر رہی ہوں، تمہارے گلے میں پھندا ڈالا ہوا ہے، میں نے تمہارا جینا مشکل کیا ہوا ہے، اپنی عمر دیکھو، اس عمر میں لڑکیوں کو اپنا اچھا برا پتا نہیں ہوتا۔ یہ ان کے ماں، باپ بتاتے ہیں، ان کے گارجین بتاتے ہیں کیونکہ انسان تجربہ ایک دم حاصل نہیں کرتا۔

روزانہ کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے جو انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ تمہیں اپنی زندگی جینے سے کون روکتا ہے مگر پہلے جینے کے انداز تو سیکھ لو، لوگوں کو سمجھنا تو شروع کرو، میں تمہیں گائے، بھیڑ، بکریوں کی طرح انسانوں کے ہجوم میں نہیں پھینک سکتی۔ میں تمہیں جس طرح کہتی ہوں اسی طرح کرو فی الحال یہی تمہارے تجربات ہیں۔" اتنا کہہ کر مہر جان بڑی تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔ روما ابھی تک اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے دم بخود کیفیت میں بیٹھی تھی۔

☆☆☆

جابر علی اپنے سینئر شیر زمان خان کے کمرے میں داخل ہوا اور پیشانی تک ہاتھ لے جا کر اسے سلیوٹ کیا۔
"سر آپ نے یاد فرمایا...... ایمرجنسی ہو گئی ہے؟"
شیر زمان خان نے جابر علی کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر اپنی سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔
جابر علی بڑے مؤدبانہ انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور نظریں اٹھائیں جن میں سوال ہی سوال تھے۔
"بھئی جابر علی ایمرجنسی تو زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔ اس کو ایک طرف ہٹا کر مجھے صرف اتنا بتاؤ تم نے اپنی بیگم سے بات کی۔" جابر علی نے الجھن بھری نظروں سے شیر زمان خان کی طرف دیکھا۔
"وہ سر ابھی ایسا موقع نہیں ملا......" آہستگی سے سر جھکا کر بولا۔
"یار بیوی سے بات کرنے کے لیے بھی موقع نکالتے ہو۔" شیر زمان خان قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
"نہیں سر وہ ایسا ہے کہ میں گھر کافی لیٹ پہنچ رہا تھا اور تھکاوٹ کی وجہ سے لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے۔"
"خیر کوئی بات نہیں۔" شیر زمان خان مسکرا کر جابر علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"آج بات کرنے کی کوشش کرو، دیکھو بہت اچھا رشتہ ہے کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے......"
"جی سر، آپ نے بہت تعریف کی ہے، آپ ماشاءاللہ دنیا کو پہچانتے ہیں، بھانت بھانت کے لوگ آپ سے ملتے ہیں، آپ کہہ رہے ہیں تو وہ رشتہ اچھا ہی ہوگا، مجھے کوئی شک نہیں۔"
"ہاں جابر علی، ایسے رشتے بڑی قسمت سے ملتے ہیں، بندہ تمہارے مطلب کا ہے، نمازی، پرہیزگار، عابد و زاہد، ساری زندگی اس نے بڑی احتیاط سے گزاری ہے کیونکہ اس شہر میں نیا نیا ہے، لوگوں سے جان پہچان نہیں ہے۔ برادری میں شادی نہیں کرنا چاہتا، اس لیے اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کروں اور بلکہ اس نے مجھے تاکید کی ہے کہ کسی دین دار گھرانے کی لڑکی کا انتخاب کروں۔"
"سر یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا...... میں کہاں کا دین دار، بس کوشش کرتا ہوں کہ کلمہ پڑھا ہے تو کچھ حق بھی ادا کروں۔" جابر علی یہ سن کر جیسے خوشی سے کھل اٹھا۔
"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔" شیر زمان خان نے یوں سبحان اللہ کہا جیسے کسی بہترین شعر پر داد دے رہا ہو۔ "تمہاری یہی عاجزی اور انکساری تو مجھے اچھی لگتی ہے۔ جابر علی بس یوں سمجھو پورے ڈیپارٹمنٹ میں صرف ابھی تک ایک بندے سے متاثر ہوا ہوں اور وہ تم ہو......" اپنی اتنی تعریف اور مداح سرائی سن کر جابر علی کا سر یوں جھک گیا جیسے پھلوں، پھولوں کے بوجھ سے ڈالی جھکی جاتی ہو۔
"یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے شریف، نیک، نمازی پرہیزگار داماد ملے اور اس سے زیادہ تو میں سوچتا بھی نہیں ہوں اور سر بندہ نماز نہ پڑھے تو کیا زندگی ہے۔" جابر علی نے اب سر اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے بات کی۔ اس کے لہجے میں شکر گزاری کا تاثر بہت گہرا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو جابر علی...... تمہیں دیکھ کر تو میں بھی تمہارے زیرِ اثر آ گیا...... پہلے میں نماز پڑھتا تھا لیکن بس کبھی پڑھ لی کبھی چھوڑ دی لیکن اب تو میں...پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں۔" شیر زمان خان نے بہت اعتماد سے جابر علی کی طرف دیکھ کر قدرے فخریہ انداز میں کہا۔

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ سر بہت خوشی ہوئی سن کر ہم نے تو یہی سنا ہے کہ نماز جنت کی کنجی ہے۔" جابر علی تو جیسے مارے عقیدت کے دُہرا ہو گیا۔

"جنت کا تصور بڑا خوشگوار ہے۔ جابر علی سنا ہے کہ وہاں حوریں ہوں گی، دودھ کی نہریں ہوں گی، بس ہر طرف امن ہی امن، چین ہی چین ہوگا۔" شیر زمان خان معنی خیز انداز میں مسکرا کر جابر علی کی طرف دیکھنے لگا۔

"جی سر یہ دنیا تو مسائل کا گورکھ دھندا ہے، جنت میں جا کر ہی سکون ملے گا۔" جابر علی نے ایک نظر اپنے سینئر کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر بولا۔

ایس پی نے نہ جانے کیوں ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔

"جابر علی لوگ مرنے کے بعد مُردے کے لیے کہتے ہیں کہ اللہ اسے جنت نصیب کرے اور مجھے تو دنیا ہی میں پتا چل رہا ہے کہ تم جنتی آدمی ہو...... پورے ڈیپارٹمنٹ میں تمہارے جیسا بندہ نظر نہیں آتا......" جابر علی...... اتنی تعریف سن کر پھر شرمندہ ہو گیا۔ شاید اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی زیادہ تعریف سنی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی...... حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔

"آپ کی محبت اور عزت افزائی ہے سر ورنہ بندہ کس قابل ہے۔"

"بس اب دیر نہ کرو جابر علی...... ایک اچھا انسان تمہاری ہاں کا منتظر ہے، یوں سمجھو کہ وہ تمہاری کی گئی کسی نیکی کا بہت خوب صورت صلہ ہے۔ تمہاری بیٹی کی زندگی سنور جائے گی۔" ایس پی نے جیسے جابر علی کے اندر جوش و جذبات بھڑکانے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی اور اس کا وار خالی نہیں گیا۔

"میں آج ہی بات کرتا ہوں سر۔ آپ فکر نہ کریں، میری گھر والی میری بات کے سامنے اپنی بات نہیں رکھتی پھر بھی وہ بچی کی ماں ہے، اس کے ساتھ بھی بات چیت کرنا ضروری ہے۔" جابر علی اپنے اندر بڑی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بڑے وثوق اور اعتماد سے کہا۔

"ہاں، ہاں جابر علی، وہ تمہاری بیوی ہے، تمہارے بچوں کی ماں ہے، اس کے بڑے حقوق ہیں، جب تم اسے یہ سب کچھ بتاؤ گے تو وہ یقیناً تمہاری ہاں میں ہاں ملائے گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

جابر علی اٹھا اور بڑے جوش و خروش سے ایس پی کو سلیوٹ کیا اور ایڑیوں کے بل گھوم کر کمرے سے باہر چلا گیا...... ایس پی شیر زمان خان اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں صرف مسکراہٹ کی چمک نہیں تھی بلکہ آنکھوں سے ایک شاطرانہ چال چلنے والے کا بھرپور عکس جھلک رہا تھا۔

☆☆☆

رابی آئینے کے سامنے کھڑی اپنے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی بلکہ اپنی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ اس کا چہرہ کسی بُت کے مانند بالکل جذبات سے عاری تھا۔ سپاٹ، سرد، کسی سنگی مجسمے کی طرح پتھریلا...... اسی وقت اس کے بیڈروم کے دروازے پر دستک ہوئی وہ بری طرح چونک کر پلٹی تھی۔

"کون ہے؟" اس نے پوچھا، چہرے کی طرح اس کی آواز بھی سپاٹ تھی۔ دروازے کا ہینڈل حرکت میں آیا۔ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مہر جان اندر داخل ہوئیں۔ ماں کو سامنے پا کر رابی ایک دم سنبھل گئی اور اس نے اپنے چہرے اور لہجے دونوں میں شعوری طور پر نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"آیئے اماں...... آج آپ لیٹ ہو گئیں؟"

"ہاں، ہاں لیٹ ہو گئی...... لیکن تم بھی تو لیٹ ہو۔" وہ رابی کو سر سے پاؤں تک تول رہی تھیں۔

"نہیں، میں لیٹ نہیں ہوں اماں۔ آج میں نہیں جا رہی...... روزانہ پریکٹیکل کی وجہ سے اتنی دیر ہو جاتی تھی کہ بس ٹھیک سے سو نہیں پائی۔ سوچ رہی ہوں آج ریسٹ کروں۔"

"چلو ٹھیک ہے، یہ بھی اچھا ہے تم ریسٹ کر لو، دو ڈھائی بجے کے قریب میں تمہارے لیے گاڑی بھیجوں گی۔"

"گاڑی......؟" رابی نے چونک کر مہر جان کی شکل کی طرف دیکھا۔

"ہاں، ہاں مجھے تمہیں ساتھ لے کر کچھ شاپنگ کرنی ہے، تمہاری پسند کے کچھ ڈریسز وغیرہ لینے ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کچھ نہ کچھ تو تیاری کرنا ہوگی...... شادی میں اب زیادہ دن نہیں ہیں۔" رابی کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یوں لگا ہر طرف سے بے ترتیب آوازیں سماعتوں کو نڈھال کر رہی ہوں۔ اس نے کمالِ مہارت سے اپنے تاثرات چھپائے اور ایک بڑی خوب صورت مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا لی اور مہر جان کو تقریباً حیرت زدہ کر دیا۔

"ٹھیک ہے اماں، آپ جب گاڑی بھیجیں تو مجھے ایک کال کر دیجیے گا۔"

"تم نے تو مجھے حیران کر دیا رابی...... اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ماں کا فیصلہ قبول کر لیا۔ اچھی بات ہے، وہ تو تمہیں کرنا ہی تھا۔" مہر جان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھرپور خوشی کے جذبات کے ساتھ گویا ہوئی تھیں۔ مہر جان ایک دم بہت زیادہ ریلیکس نظر آنے لگیں۔

"اماں جان آپ تو ہماری ماں ہیں، ظاہر ہے ہمارے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا۔" رابی نے خالی خالی نظریں اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا اور بہت مؤدبانہ انداز میں بولی۔

"شاباش فیصلہ تو تمہیں میرا ماننا ہی تھا لیکن تم نے اپنے دل کی آمادگی کے ساتھ اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ یہ بہت اچھی بات ہے، میں تم سے بہت خوش ہوں رابی ویسے بھی ماشاء اللہ تم بہت سمجھدار ہو۔" مہر جان آگے بڑھیں اور انہوں نے رابی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جی اماں جان! آپ کی تربیت ہی ایسی ہے، سب لوگ مجھے اسکول اور کالج میں بوڑھی روح کہتے ہیں کہ میں اپنی عمر سے بہت بڑی بڑی باتیں کرتی ہوں، بہت سیریس ہوں۔" رابی بظاہر بہت نرم اور محبت بھرے لہجے میں ماں سے مخاطب تھی لیکن جو کچھ اس کے اندر تھا مہر جان کے فرشتے بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے رابی، ٹھیک ڈھائی بجے گاڑی تمہیں لینے آ جائے گی۔ تیار رہنا، میں تمہاری پسند کے ڈریس دلواؤں گی اور میچنگ جیولری، شوز وغیرہ تم جس چیز پر ہاتھ رکھو گی، وہ چیز تمہاری ہوگی، آخر میں دن رات محنت کرتی ہوں تو تم دونوں بہنوں کے لیے ہی کرتی ہوں۔" مہر جان اب بہت خوشگوار موڈ میں رابی سے بات کر رہی تھیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے رابی کے سر پر اپنا ہاتھ پھر سے رکھا دھیرے سے دبایا پھر اس کا گال چھو کر آہستہ خرام چلتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں...... رابی مسکرا رہی تھی۔ بڑی عجیب پُراسرار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

''باپ کے پاؤں چھو کر معافی مانگ لو۔'' صابرہ، ستارہ کو سمجھا رہی تھی ستارہ کے چہرے پر خفگی بلکہ شدید خفگی کے تاثرات تھے۔ جس سے صابرہ کو بہت خوف آتا تھا۔

''لیکن امی یہ بتا دیجیے کس بات کی معافی مانگوں؟'' صابرہ نے گھور کر ستارہ کی طرف دیکھا۔

''پھر وہی ہٹ دھرمی...... وہ باپ ہے تمہارا، معافی مانگنے سے ناک نہیں کٹ جائے گی تمہاری۔''

''لیکن میں نے کیا ہی کیا ہے؟ مجھے پتا تو چلے نا تاکہ میں معافی مانگ لوں۔''

''بہت زبان چلتی ہے تمہاری، کچھ تو بولا ہوگا جو وہ سن کر غصے میں آگئے۔'' صابرہ نے ناراض نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''انہیں غصہ کب نہیں آتا امی؟ ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے باپ کو ٹھوکر سے دروازہ کھولتے دیکھا ہے۔''

''پھر وہی بدتمیزی، ارے وہ اس گھر کے مالک ہیں، ان کی عزت ہماری عزت ہے، دن رات محنت کر کے ہمارے دوزخ بھرتے ہیں۔'' صابرہ نے اب اپنی جگہ سے اٹھ کر ہاتھ بلند کیا۔ جیسے وہ ستارہ کو تھپڑ لگانا چاہتی ہو۔

''لوگوں کے باپ تو نہ جانے کیا، کیا کرتے ہیں۔ کاریں، کوٹھیاں، عیش آرام دیتے ہیں، ابا جان اگر تین وقت ہمارا پیٹ بھر دیتے ہیں تو کون سی بڑی بات ہے، فرض ہے ان کا۔''

صابرہ تو جیسے اس کی بات سن کر بری طرح چکرا کر رہ گئی۔ اتنی لمبی زبان کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آنکھیں پھاڑ کر وہ چند لمحے بیٹی کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے یوں لگا اس کا علاج غصہ نہیں ہے، اس کو تو بڑی مہارت سے سنبھالنا ہوگا۔ اس نے بڑی سمجھداری سے خود کو سنبھال کر ستارہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''شکر کرو بیٹا، اللہ نے ہمیں حلال روزی دی ہے، ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے، کسی کا حق مار کر نہیں کھاتے......'' ستارہ پر صابرہ کی نرمی اور پیار بھرے لہجے کا رتی برابر اثر نہیں ہوا۔

''آپ کرتی رہیں شکر...... میرا تو اس گھر میں اب دم گھٹتا ہے، ہر وقت کی چخ چخ......''

صابرہ یہ سن کر مزید خوف زدہ ہوگئی۔ اسے یوں لگا جیسے بس ایک قیامت ہے جو برپا ہو چکی ہے، ان کے خاندان میں شاید کسی لڑکی نے ماں، باپ کے سامنے اتنے دلائل دے کر بات نہیں کی ہوگی، بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور بڑے وقار سے گویا ہوئی۔

''دیکھو بیٹا، اب یہ بات دوبارہ نہ دُہرانا، اچھی اور نیک بچیاں وہ ہوتی ہیں جو اپنے ماں باپ کے بتائے ہوئے راستے پر خوشی خوشی چلتی ہیں، سوال جواب نہیں کرتیں۔ سوال، جواب کرنا تو بدتمیزی ہے اور وہ کہتے ہیں ناں کہ باادب بانصیب۔ بے ادب بے نصیب۔''

''امی! قانون اور محاورے سب کے لیے ایک جیسے نہیں ہوتے، آپ تو اتنی ادب تمیز والی ہیں پھر آپ کی شادی......''

صابرہ نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بڑے صبر و تحمل سے گویا ہوئی۔ ''ستارہ آگے کچھ نہ بولنا بیٹا...... جو بیٹی اتنا بولتی ہے تو الزام ماں پر آتا ہے۔ بیٹا، ماں کی ساری عمر کی محنت برباد نہ کرنا۔ بس چپ ہو جاؤ، اب میں کچھ نہیں سنوں گی۔'' صابرہ اندر سے بری طرح ٹوٹ رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی اولاد ایک دن اسے اتنی بڑی آزمائش میں ڈالے گی۔

☆☆☆

شبینہ اور فائزہ کینٹین میں بیٹھی کولڈ ڈرنک پی رہی تھیں۔ فائزہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔

''شبینہ پرسوں ماما، پاپا کی Anniversary ہے۔ بہت دھوم دھام سے منا رہے ہیں۔ اس لیے کہ میری ایک فرسٹ کزن دبئی سے آرہی ہے۔ اصل میں تو یہ سارا پروگرام اسی نے بنایا ہے ورنہ ہم تو ہر سال چپ چاپ ممی، پاپا اور بھائی کے ساتھ منا لیتے ہیں۔ بھائی بھی کہتے ہیں یار پیرنٹس کو سال میں ایک بار تو تمیز سے وش کرنا چاہیے۔''

شبینہ یہ سن کر جیسے گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی اور بالکل خاموش ہوگئی تھی۔

''کہاں پہنچ گئیں میں تو اینورسری کی بات کر رہی ہوں۔ تم پتا نہیں کہاں چلی گئیں۔ کیا کہتی ہو آؤ گی ناں؟'' فائزہ نے ٹیبل پر انگلی سے جیسے دستک دے کر اسے چونکایا۔

''وہ...... فائزہ، اصل میں تمہیں تو پتا ہی ہے ناں کہ ہمارے ابا جان یہ دوستوں کے ہاں آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے میں تم سے پرامس نہیں کر سکتی۔ البتہ امی سے بات کر کے دیکھتی ہوں کیونکہ امی ہی ابا جان سے اجازت دلوا سکتی ہیں اور جو انہوں نے انکار کر دیا تو نہ میں اصرار کر سکتی ہوں اور نہ امی۔''

''لو بتاؤ میں تو اتنا خوش ہو رہی تھی کہ میری ساری فرینڈز مل کر اس مرتبہ Anniversary سیلی بریٹ کریں گی۔ اتنا مزہ آئے گا۔ خوب ہلا گلا ہوگا اور میری بیسٹ فرینڈ تو تم ہی ہو۔ تم نے تو میرا سارا مزہ ہی خراب کر دیا، اچھا ایسا کرتی ہوں کہ میں خود شام کو آکر آنٹی سے اجازت لیتی ہوں۔''

''نہیں، نہیں اصل میں پہلے مجھے بات کرنے دو پتا نہیں ابا جان گھر میں ہوں۔ ان کو اچھا نہ لگے پہلے مجھے بات تو کر لینے دو۔'' شبینہ نے گھبرا کر فائزہ کی طرف دیکھا اور بہت سہمے سہمے خوفزدہ انداز میں کہا۔

فائزہ نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ دل تو اس کا بھی بہت چاہ رہا تھا کہ وہ فائزہ کی اس خوشی میں شریک ہو، وہ تو تقریبات کو ترستی تھی۔ خاندان کی بہت قریبی شادیوں میں ماں کے ساتھ ہی جانے کی اجازت ملتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں پکنک اور پارٹی کا تصور ہی نہ تھا اور ابھی تک اس نے فائزہ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ستارہ کے کالج نہ آنے کی کیا وجہ ہے۔ فائزہ نے اس سے پوچھا تھا اس نے یہی بتا دیا کہ اس کی طبیعت

ٹھیک نہیں ہے۔ بخار کی وجہ سے نہیں آپا رہی۔ اس نے مصلحتاً یہ جھوٹ اس لیے بولا تھا کہ شاید دو تین دن میں جابر علی کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ خود ہی ستارہ کو کالج جانے کا کہہ دیں۔

''یعنی تم مجھ سے پکی بات نہیں کر رہی ہو؟'' فائزہ نے پیار بھری خفگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں جھوٹے وعدے بھی تو نہیں کر سکتی ناں تم سے۔ فی الحال میں تمہیں کوئی آس نہیں دلا رہی ہوں۔ جب تک میری امی سے بات نہیں ہو جاتی۔ کل صبح بتا دوں گی میں تمہیں۔''

''نہیں، نہیں تم مجھے رات کو فون کر کے بتا دینا۔'' فائزہ نے فوراً اس کی بات کاٹ کے کہا تھا۔

''فون......؟'' شبینہ اب پہلے سے بھی زیادہ گھبرا گئی۔ ''وہ میں رات کو فون نہیں کر سکتی۔ وہ ابا جان گھر پہ ہوتے ہیں۔''

''یا اللہ میری توبہ، تمہارے ابا جان پولیس آفیسر ہیں۔ ان کو پتا ہے کہ وہ نیٹ کے زمانے میں رہ رہے ہیں۔ کالج میں تو بلکہ آج کل تو اسکول میں لڑکیوں کے پاس موبائل ہوتے ہیں اور وہ تمہیں پی ٹی سی ایل لائن پر بات نہیں کرنے دیتے۔ کمال ہے یار......'' فائزہ نے اپنی ڈرنک ٹیبل پر رکھی اور بڑے زور سے دونوں ہاتھ اپنے سر پر مارتے ہوئے حیرت اور افسوس سے بولی۔ شبینہ خاموشی سے سر جھکائے اسٹرا ہونٹوں میں دبائے ڈرنک کے گھونٹ لے رہی تھی جو کچھ اس نے فائزہ سے کہہ دیا تھا اس کے بعد اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ باقی بچا نہیں تھا۔

☆☆☆

ایس پی شیر زمان خان اپنے شریک کاروبار وارث علی کے ساتھ بہت خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہا تھا۔

''جابر علی کو قابو میں کر لیا ہے وارث علی، اب انشاء اللہ تعالیٰ تمہارا کام بہت جلد ہو جائے گا۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم بہت نمازی پرہیز گار ہو۔ آج سے بس تم نمازیں پڑھنا شروع کر دو اور وہ بھی جماعت سے۔''

''سرکار کہیں سچ مچ نیک نہ ہو جاؤں۔'' وارث علی نے معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔

ایس پی نے اس کی بات سن کر ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

''ارے بھئی تمہارے خمیر میں ایسا کوئی ہنر نہیں ہے، تم جس راہ پر چل رہے ہو وہی تمہاری راہ ہے، تمہارے جیسے لوگ اتنی آسانی سے راہیں نہیں بدلتے۔ یار بال وال ٹھیک سے ڈائی کروالو، مونچھوں کی نوکیں کاٹو، مالش والش کرو۔'' ایس پی شریر انداز میں مسکراتے ہوئے وارث علی کو مشورے دے رہا تھا۔

''سرکار شریفوں کے گھر گئے ہوئے زمانے گزر گئے، بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ تو ساتھ چلیں گے ناں؟'' وہ مصنوعی گھبراہٹ طاری کر کے بات کر رہا تھا۔

''یار ان پھولوں کی تو کچھ عزت کرو، ایک معمولی سے کام کے لیے میں اپنے جونیئر کے گھر جاؤں؟ اس کی بیٹی کے لیے رشتہ بھجوا رہا ہوں۔ اس کے لیے اس سے زیادہ کیا عزت کی بات ہو گی۔'' ایس پی نے اس کی بات سن کر اپنے کندھوں پر لگے ہوئے میڈل کی طرف اشارہ کیا۔

''تو پھر کیا مجھے اکیلے جانا ہو گا؟'' وارث علی نے اب سنجیدگی سے پوچھا۔ ''اماں تو ہے نہیں اور باقی گھر والے اب ساتویں شادی میں میرا ساتھ نہیں دیں گے۔''

''یار آہستہ آواز میں بات کرو، سنا نہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ساتویں شادی بھئی تم نے سات شادیاں کی ہیں، بیوی ایک بھی نہیں ہے تمہارے پاس، سب کو فارغ کر دیا تم تو اکیلے ہو، تنہا بالکل ایسے ہی جیسے

کوئی کنوارا لڑکا۔ اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کرو۔'' ایس پی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آہستہ بولنے کے لیے کہا اور پھر خود بھی سرگوشی میں سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''کیسے سمجھاؤں، وہ سب تو مجھ سے بہت ناراض ہیں، کہتے ہیں تمہارا بس یہی کام ہے۔''

''ویسے یار گھر والے تمہارے کہتے تو ٹھیک ہیں، تمہارا یہی کام ہے کیا؟'' ایس پی نے دونوں کہنیاں ٹیبل پر جما کر وارث علی کی آنکھوں میں جھانکا اور شریر مسکراہٹ لیے بولا۔

وارث علی مسکرا کر ایس پی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ماضی کے کچھ مناظر چل رہے تھے۔ آنکھیں اس کی ایس پی کے چہرے پر تھیں لیکن دماغ کہیں اور پھر ایک دم اپنے ہی دھیان سے چونک کر گویا ہوا۔

''سرکار ہم نے آج تک وہ شادی ہی کب کی ہے جو گھر بسانے کے لیے کی جاتی ہے ابھی تک ساری شادیاں کاروباری تھیں، کاروباری فائدہ ہوا مطلب نکلا شادی ختم ہو گئی اور پھر جتنے مطلبی ہم تھے اتنی ہی مطلبی وہ تھیں۔ جنہوں نے نکاح نامے پر اپنے خوب صورت ہاتھوں سے دستخط فرمائے تھے۔'' وارث علی کے لہجے میں صاف خباثت جھلک رہی تھی۔ ایس پی شیر زمان اس کی باتوں کو بہت انجوائے کر رہا تھا۔

''یار شادی تو تمہاری یہ بھی کاروباری ہے۔'' ایس پی شیر زمان نے کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''شیر زمان صاحب اس شادی سے فائدہ تو کافی لوگ اٹھائیں گے لیکن فی الحال الٹی چھری اس بکرے کی گردن پر چل رہی ہے۔'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن سب سے اونچی چھلانگیں بھی یہی بکرا مارے گا کیونکہ اصل بزنس تو تمہارا ہی ہے۔'' شیر زمان بولا۔

''چلو خیر مان لیتے ہیں اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ زندگی بھر تمہارا احسان یاد رکھیں گے۔ سر پولیس ڈپارٹ منٹ میں اتنا زیادہ ایماندار بندہ ہونا ہی نہیں چاہیے۔ پتا نہیں کتنوں کے راستے کھوٹے کرتا ہے۔'' وارث علی کو اس کی ایمانداری کھل رہی تھی۔

''یار یہ شخص اتنے کارنامے انجام دے چکا ہے، اتنا زیادہ ہائی لائٹ ہو چکا ہے اپنی ایمانداری اور کارناموں کی وجہ سے کہ میں تو جبراً اس کا ٹرانسفر بھی نہیں کرا سکتا۔ میرے مخبر نے بتایا ہے کہ میرے سینئر اس سے ڈائریکٹ انفارمیشن لیتے ہیں اگر ان کو ہمارے کاروبار کی ذرا بھی بھنک مل گئی تو ففٹی پرسنٹ حصہ ان کو پہنچانا

ہوگا۔اس لیے سینئر از سینئر۔ ففٹی پرسنٹ اگر ان کو پہنچا دیں گے تو ہماری اتنی محنت کرنے کا فائدہ کیا؟“
”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ بس اس ایماندار شخص کی بیٹی کو گھر میں آنے دیں پھر یہ شیر گیدڑ بن جائے گا۔ اپنے داماد کو اپنے ہی ہاتھوں کوئی پھانسی نہیں دلواتا۔ کسی میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا۔“ وارث علی نے شاہ زمان کی بات سن کر بہت اعتماد سے کہا تھا۔
ایس پی بھی آنے والے خوب صورت دنوں کے تصور میں کھو چکا تھا۔ اسے چاروں طرف نیلے، ہرے، نئے، کورے کرنسی نوٹ بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔
”وارث علی آنکھ کتنی ہی بڑی ہو، پلک سے بال ٹوٹ کر آنکھوں میں چلا جائے تو بہت تنگ کرتا ہے۔ نکالو اس بال کو۔“
”آج ہی نکالتا ہوں سر......“ وہ مودبانہ انداز میں کھڑے ہوکر بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
”اور ہاں سنو......عشا سے پہلے چلے جانا اس کے گھر اور اذان سن کر فوراً کھڑے ہو جانا کہ جماعت کا وقت ہو گیا ہے۔ جماعت نکل جاتی ہے تو رات بھر نیند نہیں آتی۔“ شیر زمان نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔
وارث علی نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر بڑی تابعداری سے سر جھکایا۔
”سر میں نے سبق یاد کر لیا۔ نہیں بھولوں گا، اب مجھے اجازت۔“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں کیا یہ بھی بول دوں کہ مجھے جلدی ہے گھر جانے کی۔ صبح نفلی روزہ بھی رکھنا ہے۔“ ایس پی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔
”تمہاری صحت دیکھ کر اسے یقین نہیں آئے گا فی الحال نماز تک رکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے وارث علی کا بڑھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑی گرم جوشی سے دبایا۔

☆☆☆

فائزہ اور احمر دونوں بہن، بھائی گرم گرم پوپ کارن جو ابھی ابھی لے کر احمر گھر میں داخل ہوا تھا کھاتے ہوئے ایل سی ڈی پر ایک دلچسپ فلم دیکھ رہے تھے۔
فائزہ کیونکہ شروع سے دیکھ رہی تھی اس کی دلچسپی گہری تھی جبکہ احمر درمیان میں شامل ہوا تھا۔ اس لیے ابھی تک وہ فلم کی طرف پوری طرح سے متوجہ نہیں ہو پایا تھا اور صرف فائزہ کی خاطر وہاں بیٹھ گیا تھا۔ فلم دیکھنے کا موڈ ہی نہیں تھا اس لیے اس نے وہ بات شروع کر دی جو بات کرنے کے لیے وہ موقع کی تاک میں تھا۔ شبینہ اسے بہت منفرد اور آج کی لڑکیوں سے بہت مختلف دکھائی دی تھی۔ وہ اسکول سے لے کر یونیورسٹی لیول تک کو ایجوکیشن میں ہی پڑھتا رہا تھا اور اس نے ان تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی جہاں پوش ایریاز سے لوگ آتے تھے۔ جن میں نوے فیصد برگر فیملیز سے تعلق رکھتے تھے۔
”وہ فائزہ یار! ایک بات تو بتاؤ؟“ اس نے فائزہ کی توجہ اسکرین سے ہٹانے کے لیے بڑے اہتمام سے بات شروع کی۔
”سن رہی ہوں بولیے ناں۔“
”وہ جو ایک دیہاتن سی لڑکی تمہارے ساتھ آئی تھی، وہ کہاں ملی تمہیں۔ وہ تمہاری دوست کیسے بن گئی؟“ اس نے فائزہ کو بالآخر چونکا ہی دیا تھا۔
”شبینہ کی بات کر رہے ہیں بھائی کیونکہ وہی آئی تھی اس کے بعد تو میری کوئی دوست نہیں آئی۔“ اس کی

توجہ فوراً اسکرین سے ہٹ گئی۔ اس نے حیرت سے احمر کی طرف دیکھا تھا۔
''پتا نہیں بھئی وہ شبینہ ہی ہوگی، میں نے نام تو نہیں پوچھا تھا ناں۔ بس دور سے ہی دیکھا تھا۔''
''تو آپ کو کیا مطلب ہے اس دیہاتن لڑکی سے؟'' فائزہ نے شریر انداز میں احمر کی طرف گھور کر پوچھا۔
''ارے نہیں، نہیں، مجھے کیا مطلب ہونے لگا۔ بھئی، میں تو صرف دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ تمہاری تو ساری دوستیں ماڈرن ڈریسنگ کرتی ہیں اسے دیکھ کر ایسا لگا تھا جیسے کون سے گاؤں گوٹھ سے اٹھ کر آگئی ہو۔''
فائزہ نے حیرت سے احمر کی طرف دیکھا۔
''کیوں، اس نے کون سے دیہاتی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ تو یونیفارم میں تھی۔''
''ہاں۔ لیکن چہرہ تو یونیفارم میں نہیں تھا ناں۔'' احمر نے کھسیا کر سر کھجاتے ہوئے کہا۔
''بی کیئرفل' پولیس افسر کی بیٹی ہے وہ۔'' فائزہ نے اب وارننگ کے انداز میں شریر مسکراہٹ چھپا کر احمر کی طرف گھورا۔
''اُف...... اُف پ... پ پولیس یعنی کہ بادشاہوں کی اولاد ہے۔'' احمر نے خوفزدہ ہونے کی بھرپور کوشش کی اور جیسے ہکلاتے ہوئے بولا۔
''بادشاہوں کی نہیں صرف بادشاہ کی۔'' فائزہ نے زور سے احمر کے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔
''مروا دیا...... شکر ہے میں نے کوئی الٹی سیدھی کوئی بات نہیں کی اس کے سامنے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے؟'' احمر نے اسی طرح اداکاری کرتے ہوئے کہا۔
''پہلے پوچھا کیوں نہیں تھا؟'' فائزہ نے برجستہ کہا پھر ایک دم گھور کر بولی' بلکہ اب بھی کیوں پوچھا، کیا مسئلہ ہے، کیوں یاد کر رہے ہیں اسے؟'' احمر نے مسکرا کر فائزہ کے سر پر ایک چپت لگائی۔
''ارے بھئی میں کیوں پوچھنے لگا، میرا دماغ خراب ہے؟ وہ تو مجھے کافی مختلف لگی اس لیے پوچھ لیا۔ بھئی چینج نظر آیا تھا ناں۔'' فائزہ نے اب لمبی سی ہوں، منہ سے نکالی تھی پھر مسکرا کر احمر سے پوچھنے لگی۔
''ویسے بھائی کیوٹ تو ہے ناں؟'' احمر نے فوراً اپنے ہاتھوں سے کانوں کی لوؤں تک کو چھوا۔ جیسے توبہ تلّا کر رہا ہو۔
''میں کچھ نہیں بولوں گا، یار اس کا باپ پولیس افسر ہے، مجھ پر تم نے اچھی خاصی دہشت بٹھا دی ہے۔''
احمر کی ایکٹنگ دیکھ کر فائزہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اس کے ساتھ احمر بھی ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

سہراب خان کی دی ہوئی ڈائمنڈ کی انگوٹھی رابی کی درمیانی انگلی میں چمک رہی تھی اور وہ بہت غور سے انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جانے کس دھیان میں تھی کہ اسے کمرے میں گل جان کی آمد کا بھی پتا نہیں چلا۔ گل جان اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ رابی بہت غور سے انگوٹھی کو دیکھ رہی تھی۔ رابی کے چہرے کے تاثرات تو وہ سمجھ نہیں پائی لیکن اسے تھوڑا تجسس ضرور ہوا۔
''رابی انگوٹھی کو اتنی غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رابی کے قریب آئی اور بڑی نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رابی ایک دم چونک پڑی۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
''او خالہ جان! ارے آپ کب آگئیں مجھے تو پتا ہی نہیں چلا!''
''کس دھیان میں ہو، یوں لگتا تھا جیسے تم کہیں دور پہنچی ہوئی ہو، کیا سوچ رہی تھیں؟'' رابی نے ایک گہری

سانس لی اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہت خوب صورت انگوٹھی ہے، اتنی خوب صورت انگوٹھی کہ بس جو بھی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔ آپ نے دیکھی ہے؟" رابی نے اپنا ہاتھ اونچا کر کے انگوٹھی گل جان کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

"ہاں، بی بی جان نے دکھائی تھی مجھے...... بہت خوب صورت ہے اور بہت قیمتی بھی۔"

"خالہ جان! اتنے سارے ڈائمنڈز لگے ہیں اس میں، قیمتی تو لازمی ہوگی۔ ویسے میں نے سنا ہے اگر ہیرا پیٹ میں چلا جائے یا ہیرے کی کنی بھی پیٹ میں چلی جائے تو بندہ فوراً مر جاتا ہے۔"

"خبردار آئندہ ایسی بات مت کرنا۔ دیکھو بیٹا تم کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کر بیٹھنا۔" گل جان نے فوراً خوفزدہ ہو کر رابی کی شکل دیکھی۔ وہ اس کے لہجے سے کچھ نہیں سمجھ پائی تھی۔

"توبہ توبہ خالہ جانی، آپ تو ڈر رہی ہیں، خودکشی تو بزدل لوگ کرتے ہیں اور میں بزدل نہیں ہوں۔" رابی ایک دم سے ہنس دی۔

"شاباش، بیٹا جینے کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہے، ہر انسان کی زندگی کے امتحان مختلف ہوتے ہیں۔" گل جان نے جیسے سکون کی گہری سانس لی۔

"میں تو انگوٹھی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں، سہراب خان نے میری کتنی عزت افزائی کی ہے، کتنی قیمتی انگوٹھی لے کر آیا میرے لیے...... آگے تو پتا نہیں کیا کیا انتظامات کیے ہوں گے۔ اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔" رابی بول رہی تھی اور گل جان آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رابی نے جیسے گل جان کی فلسفیانہ بات یکسر نظر انداز کر دی تھی۔

"رابی بیٹا کیا واقعی تم بہت خوش ہو؟" اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ رابی گل جان کی بات سن کر جیسے ہنس دی۔

"خالہ جانی اتنی خوش، اتنی خوش ہوں کہ میں بتا نہیں سکتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ دل کھول کر قہقہے لگاؤں، ہر کسی کو بتاؤں کہ مجھے دیکھو کہ میں کتنی خوش ہوں، اتنی خوش ہوں کہ مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہی کہ آخر میں اتنی خوش کیوں ہوں۔" ہنستے ہنستے رابی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ گل جان نے تڑپ کر رابی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"مجھ سے تو سچ بولو بیٹا۔ میں تو تمہاری بات دیواروں سے بھی نہیں کرتی۔ بیٹا میرے سامنے یہ سب کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے...... میرے سامنے تو صرف اپنے دل کی بات کیا کرو، مجھے تو تمہاری ہنسی سے بہت خوف آ رہا ہے۔" رابی جبراً گل جان کے سینے سے الگ ہوئی اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں خالہ جانی، میں بہت خوش ہوں، میری ماں سے زیادہ میری خوشی کا خیال کوئی رکھ ہی نہیں سکتا۔ میں نے یقین کر لیا۔" گل جان دم بخود سی رابی کی شکل دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت الجھ گئی تھی۔ رابی کے لب و لہجے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس کی صداقت اور سچائی پر گل جان آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی۔ رابی نے تو اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔

☆☆☆

صابرہ گہری نیند سو رہی تھی لیکن جابر علی جاگ رہا تھا وہ کئی مرتبہ اپنے بستر سے اٹھا خود ہی اپنی عادت کے برخلاف جگ میں سے پانی نکال کر گلاس میں ڈالا اور پیا۔ گلاس رکھنے کے بعد اس نے پھر ایک ٹہل لگائی اور اس کمرے کی طرف بڑھا۔ جہاں صابرہ سو رہی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور صابرہ کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اتنی گہری نیند سوئی ہوئی بیوی کو اٹھائے یا رہنے دے۔ اس کے ذہن

میں آج ایس پی سے ملاقات کی پوری فلم چل رہی تھی۔ وہ آمادہ ہونے کے باوجود الجھا ہوا تھا۔ اسے ایک اندیشہ ستا رہا تھا کہ لڑکے کی عمر زیادہ ہے شاید صابرہ اس بات پر احتجاج کرے...... یا سننے سے انکار کر دے، ویسے تو اسے خود پر یقین تھا کہ وہ اپنی بات منوا لیتا ہے لیکن پہلی بار اسے صابرہ کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ ماں ہے، اپنی بیٹی کے لیے اس کے سامنے کھڑی ہو سکتی ہے، اس سے لمبی لمبی بحث کر سکتی ہے۔ اب وہ وقت نہیں رہا۔ جہاں وہ صابرہ کو طلاق کی دھمکی دے کر خاموش کر کے ایک کونے میں بٹھا دے۔ اب وہ جوان بیٹے کی ماں تھی اور اس نے محسوس کیا تھا برہان اپنی ماں پر تنقید پسند نہیں کرتا۔ ایک دو بار اس نے لب کشائی بھی کی...... بس اسی وجہ سے وہ بہت زیادہ الجھا ہوا تھا...... سوچتے سوچتے جب دماغ شل ہو گیا تو بالآخر اس نے صابرہ کو جگانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ صابرہ کے قریب آیا۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے کو چھونا چاہا پھر ایک دم سیدھا ہو گیا...... اور وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ شبینہ اور ستارہ تو یقیناً سو چکی ہوں گی لیکن برہان ضرور جاگ رہا ہوگا اگر صابرہ نے بحث شروع کی تو یقیناً برہان بھی آ سکتا ہے اور وہ چاہتا تھا کہ دونوں میاں بیوی کی بات چیت کے دوران برہان مداخلت نہ کرے، وہ چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا پھر جیسے اپنا ارادہ خود ہی بدل ڈالا اور تھکے تھکے انداز میں اپنے بستر کی طرف چل دیا۔

آج کا دن پھر گزر گیا تھا اور رات بھی گزرنے والی تھی۔

☆☆☆

انتہائی رات گزر چکی تھی۔ ڈاکٹر مہر جان کے سر میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں۔ انہوں نے ٹیبلٹ کھانے کے بجائے گل جان کو اپنے کمرے میں بلوایا۔

"گل جان میرے سر میں بہت اچھا سا مساج کرو۔ پتا نہیں کیوں لگ رہا ہے جیسے دماغ پھٹ جائے گا۔" گل جان تو یہ سنتے ہی افتاں و خیزاں دوڑی ہیئر ٹانک کی شیشی اٹھا لائی تھی اور بہت پیار سے مہر جان کے سر میں مساج کرنے لگی۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی تھی، یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیا آج کام بہت زیادہ تھا جس کی وجہ سے سر میں آج شدید درد ہے۔ وہ بالکل گونگی، بہری بنی تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔

"تم مساج کرتی ہو گل جان تو میرے روم روم میں ایک تراوٹ سی اتر جاتی ہے۔ تم سے اچھا مساج تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔" ڈاکٹر مہر جان نے بالآخر گہری خاموشی کو توڑا۔

"بہت بہت شکریہ بی بی جان۔" گل جان بس یہی کہہ سکی اور پھر خاموش ہو گئی۔

"گل جان میں اب بہت ہلکی پھلکی ہو چکی ہوں، میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے، نہ جانے پھر بھی کیوں سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"آپ کئی دن بہت زیادہ تھک جاتی ہیں اور مصروفیت کی وجہ سے کھانے پینے کا خیال بھی نہیں رکھتیں۔ اس وجہ سے سر میں درد ہو جاتا ہوگا۔" دونوں بہنوں کے درمیان پھر ایک بے معنی سی خاموشی حائل ہو گئی رات کے اس پہر گل جان اپنی طرف سے کوئی بات چھیڑنے یا کہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی کیونکہ مہر جان کے موڈ کا دم بھر کا بھروسا نہیں تھا۔ ایک دم سے ایسا پلٹا کھاتی تھیں جیسے اچانک سورج گرہن کے باعث رات ہو گئی ہو اور روشن چمکتا دن پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا ہو۔

"گل جان!" مہر جان نے اس کو بڑی کھوئی کھوئی سی کیفیت میں مخاطب کیا۔

"جی بی بی جان۔" گل جان کے انداز میں بہت احتیاط تھی۔

"یہ تم ہر وقت ایسی کیوں نظر آتی ہو، جیسے بہت سارا رو کر اپنے کمرے سے نکلی ہو، کیا واقعی تم ہر وقت روتی رہتی ہو؟" گل جان کے ہونٹوں پر بڑی اداس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بی بی جان وہ کہاوت ہے ناں کہ روتے کیوں ہو، کہا صورت ہی ایسی ہے، ایسی کوئی بات نہیں، ہم آپ کی خوشی میں خوش ہیں۔" ڈاکٹر مہر جان نے ایک دم گردن گھمائی اور بڑی شک بھری نظروں سے بہن کا چہرہ دیکھا۔

ہم، ہم سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" گل جان ان کے انداز پر ایک دم شپٹا گئی۔

"وہ میرا مطلب ہے میں اور رابی ٹھیک ہیں، خوش ہیں، آپ کو بھی اندازہ ہو گیا کہ اب رابی بالکل سیٹ ہو چکی ہے اور جیسا آپ چاہ رہی ہیں وہ اس پر خوش ہے۔"

ڈاکٹر مہر جان اسی طرح گردن موڑے ہوئے گل جان کو بڑی حیرت بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔" یہ تم ایک دم سے رابی کا ذکر بیچ میں کیوں لے آئیں، میں نے تو رابی کی کوئی بات نہیں کی۔"

"وہ میں آپ کو تسلی دینا چاہ رہی تھی ریلیکس کرنا چاہ رہی تھی تا کہ آپ کو اطمینان ہو جائے کہ رابی نے آپ کا فیصلہ بڑی خوشی سے قبول کر لیا ہے۔" گل جان نے جلدی سے گھبرا کر وضاحت کی...... مہر جان کے چہرے پر گہری سوچ کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ پیشانی پر موجود موہوم سی لکیریں گہری ہو گئیں۔

"لیکن گل جان جانے کیا بات ہے، رابی کا خوش ہونا مجھے خوش نہیں کر رہا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی بی بی جان؟" گل جان جیسے ایک دم سے بھونچکا سی رہ گئی۔

"بھئی سیدھا سا مطلب ہے یہ جو ایک دم سے رابی کے اندر تبدیلی آئی ہے وہ بڑی پُراسرار لگ رہی ہے۔ میرا مطلب ہے حیران کن لگ رہی ہے۔ کہاں تو وہ ہتھے سے اُکھڑی ہوئی تھی۔ کہاں بالکل جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ یقین کرو آج جب میں اسے شاپنگ کے لیے لے کر گئی اس نے اتنی خوشی سے آگے بڑھ بڑھ کر اپنے لیے ڈریسز اور میچنگ کی چیزیں سلیکٹ کیں کہ میں خوش ہونے کے بجائے حیرت زدہ ہو رہی تھی۔" مہر جان الجھے الجھے لہجے میں بولتی جا رہی تھیں اور گل جان اندر ہی اندر واقعی پریشان ہو رہی تھی لیکن اس نے پھر بھی وہ بات کی جو اس کے دل میں نہیں تھی اور مہر جان کو بہلانے لگی۔

"تو بی بی جان یہ پریشان ہونے والی بات تو نہیں ہے، یہ تو خوشی کی بات ہے کہ رابی کو آخر یقین آ گیا کہ آپ اس کی بہتری چاہتی ہیں۔ جو کچھ کر رہی ہیں اس میں اُسی کا بھلا ہے۔"

"ہاں لیکن اس خوشی کے بیچ کچھ کچھ ہے، بس مجھے کچھ محسوس ہو رہا ہے میں اسے الفاظ نہیں دے پا رہی۔" مہر جان اسی طرح کھوئی کھوئی کیفیت میں گویا ہوئیں۔

گل جان اب کچھ نہیں بولی تھی کیونکہ اس کی خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بڑی بہن کی اس بات کے جواب میں کیا کہے۔ مہر جان نے چند لمحے توقف کے بعد پھر متوجہ کیا۔

"گل جان تمہیں ایک بات بتاؤں......"

"جی بی بی جان۔" وہ بڑے احترام سے بولی۔

"تمہیں پتا ہے میں رابی کے نکاح پر اس کے باپ کا کیا نام لکھواؤں گی؟" گل جان جیسے پتھر کی بن گئی تھی۔ بات کرنے کے قابل نہیں رہی تھی...... چند لمحے گہرا سناٹا طاری رہا۔ وہ مہر جان کی طرف ٹکٹکی باندھے سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

جاری ہے

آئیڈیل

شائستہ انجم



وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ اس کا تعلق نسبتاً مذہبی اور روایتی گھرانے سے تھا۔ خوش مزاج، کھلے دل اور دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ مجھ سے اسکول میں ایک جماعت آگے تھا۔ مگر شام کو

ساتھ کھیلنے اور گھر کے قریب رہنے کی وجہ سے ہماری دوستی تھی۔ میں بذاتِ خود اس کی شخصی خوبیوں کا بہت بڑا معترف تھا اور فارغ وقت اس کے ساتھ گزار کر مجھے بہت خوشی ہوتی۔ وہ پڑھائی میں بھی میری مدد کرتا۔

اس کے گھر کا ماحول ہمارے گھر سے بہت مختلف تھا۔ میری امی کالج میں پڑھاتی تھیں اس لیے ہمیں ہر روز صبح ناشتے میں ڈبل روٹی کھانی پڑتی کیونکہ امی کے پاس صبح سویرے لمبا چوڑا ناشتا بنانے کا ٹائم نہیں ہوتا تھا مگر امی ہمیں چھٹی کے دن پراٹھوں کا ناشتا کراتیں بلکہ میری آنکھ ... ہی پراٹھوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے کھلتی...... اگرچہ امی نے دُہری ذمے داریاں اٹھا رکھی تھیں مگر بہت خوش اسلوبی اور اعتدال کے ساتھ تمام گھریلو معاملات اور جاب بہ حُسن خوبی انجام دے رہی تھیں۔ خاص طور پر وہ ہماری تعلیمی کارکردگی پر کڑی نگاہ رکھتیں۔ ہماری اعلیٰ تعلیم میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس سلسلے میں وہ ہم سب بہن بھائیوں کو ایک برابر سمجھتی تھیں کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی بچہ بھی تعلیمی میدان میں پیچھے رہ جائے اور اس کا مستقبل خدانخواستہ تاریک ہو جائے۔ جبکہ افتخار کے گھر کا ماحول ...ہمارے گھر سے بالکل الٹ تھا۔ ان کے گھر کی خواتین نہ صرف پردہ کرتیں بلکہ کمپیوٹر اور موبائل بھی ان کی دسترس سے کوسوں دور تھے۔ میں بھی اندازہ نہ کر سکا کہ برقع میں ملبوس اس کی امی ہیں یا کوئی بہن۔

ہم تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے آخری سال میں آ گئے، وہ ہمیشہ کہتا مجھے ماڈرن خواتین بالکل پسند نہیں۔ خاتون کو گھریلو ہونا چاہیے۔ گھر کا سکون اسی میں ہے کہ عورت گھر سنبھالے۔ اس کے گھر میں گھریلو کاموں میں خواتین کا ہاتھ بٹانا مردوں کی توہین سمجھا جاتا تھا۔ چاہے کتنی ہی اشد ضرورت کیوں نہ ہو جبکہ ہم دونوں بھائی اپنی بہنوں کے ساتھ گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتے اور ایسا کرنے کی عادت امی جان نے بچپن سے ڈالی تھی اور ہمیں زیادہ تر کام خود کرنے کی تربیت دی تھی۔

گریجویشن کے بعد میں یونیورسٹی چلا گیا اور افتخار بیرونِ ملک ...... میں افتخار کے خیالات سے کسی حد تک متاثر تھا۔ اسی لیے شادی تو میں نے امی کی مرضی سے پڑھی لکھی لڑکی سے کی مگر اسے جاب کی اجازت ہرگز نہ دی اور یوں مجھے اپنی مرضی کا گھریلو ماحول بنانے کا موقع ملا۔

آج میری بیٹی کی تیسری سالگرہ تھی اور میں اس کی سالگرہ کا کیک لینے بیکری گیا۔ وہاں مجھے ایک صحت مند خوش شکل اور خوش مزاج شخص مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ میرے قریب آیا۔

”اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو؟“ اس نے اتنا کہا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

”اوہ تم!“ مجھے یاد آ گیا وہ تو میرا عزیز دوست افتخار تھا۔

”واہ جناب آج تو دُہری خوشی ملی۔ ایک تو میری بیٹی کی سالگرہ کا دن اور پرانے یار سے اتنے عرصے بعد ملاقات......“

اس سے رسمی حال احوال پوچھ کر رابطہ نمبرز کا تبادلہ کر کے میں گھر روانہ ہو گیا مگر اگلے ہی روز جب میں باربر شاپ سے نکل رہا تھا تو اس نے میری ایک نہ سنی اور وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اپنے گھر لے گیا اور میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس لیے کہ کل بھی وہ مجھے گھر لے جانے کی شدید ضد کر رہا تھا۔ اس کا گھر نفیس، صاف ستھرا، ترتیب و سلیقے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ مجھے یقین ہو گیا اس کی بیوی سگھڑ اور حد درجہ گھریلو ہے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور خود اندر چلا گیا شاید بیوی کو چائے کا کہنے گیا تھا مگر پانچ منٹ بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں دو کپ تھے ایک اس نے مجھے پکڑا دیا۔

”لو کافی پیو میرے ہاتھ کی۔ بہت اچھی کافی بناتا ہوں۔“ اور واقعی کافی بہت مہارت سے بنائی گئی تھی جبکہ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے گپ شپ کرتا رہا۔ بیرون ملک کے قصے اور اپنی بیوی بچوں کے بارے میں پھر مجھ سے میرا احوال پوچھنے لگا۔ کافی ختم ہوتے ہی اس نے مجھ سے کپ لیے اور مجھے بھی کچن میں لے گیا کیونکہ گھر میں کوئی تھا ہی نہیں شاید بیوی میکے گئی ہو۔

پھر اس نے نہایت سلیقے سے دونوں کپ دھونے کے بعد ریک میں رکھ دیے۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ باتیں کرتا رہا... پھر فریزر سے شاید چکن نکالا جس پر مسالا لگا تھا چکن اس نے اوون میں رکھ دی اور اسے آن کر دیا۔ اور ساتھ ہی وقت دیکھا۔ اتنے میں اس کے موبائل پر کال آ گئی۔ آواز باہر تک آ رہی تھی۔

”بچوں کو اسکول سے لے آئے؟ کھانا تیار ہے؟ اور گیس کا بل آج بھی جمع کرایا یا نہیں؟“ موبائل پر کوئی خاتون تحکمانہ انداز سے پوچھ رہی تھی اور وہ بڑی تابعداری سے جواب دیتا رہا۔

”بیوی تھی یار آفس میں جاب کرتی ہے۔ دراصل جب سے بیرونِ ملک سے آیا ہوں جاب کا کچھ سلسلہ نہیں، وہ تو شکر ہے... بیوی پڑھی لکھی ہے۔ اس کی جاب سے گزارہ ہو رہا ہے۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے بتایا۔

”یار اب زمانہ بدل گیا ہے۔ بس ہم دونوں میاں بیوی نے خاموش سمجھوتا کر لیا ہے اس نے آفس اور میں نے گھر سنبھال لیا ہے۔ الحمدللہ ہنسی خوشی وقت گزر رہا ہے۔“ میں شدید حیرت کا مجسمہ بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔

ناولٹ

کہیں دیپ جلے کہیں دل

قیصرحیات

چھٹا حصہ

اگلے روز وہ کالج پہنچا تو سب سے پہلے وہ پرنسپل آفس میں گیا۔ پرنسپل کے چہرے پر قدرے خفگی کے تاثرات تھے مگر انہوں نے اپنے آپ کو نارمل رکھتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا اور اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''کالج مینجمنٹ نے بہت سوچنے اور آپس میں ڈسکشن کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو ایک چانس دیا جائے اور ایک چانس کا مطلب ہے صرف ایک



چانس...... اب یہ آپ پر ہے کہ آپ اس چانس کو کیسے avail کرتے ہیں۔ زندگی انسان کو اس لیے نہیں ملتی کہ اسے تجربوں اور چانسز میں گزار دے بلکہ زندگی گزارنے کے لیے کسی حتمی ٹارگٹ کا ہونا ضروری ہے۔ والدین کے پیسے پر عیش کرنا بہت آسان ہے مگر کبھی یہ سوچا کہ اس طرح کی عیاشی کتنے دن ساتھ دے سکتی ہے؟ جو لوگ زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ سمجھ کر اسے گزارتے ہیں صرف وہی کامیاب ہوتے۔ آپ نے اپنے باپ کے پیسے سے کامیابی حاصل کرنا چاہی تو نتیجہ دیکھ لیا۔ دوسروں کے سہاروں پر چلنے والا انسان کبھی کبھی ایسا لڑکھڑا کر گرتا ہے کہ اس کے اپنے قدم بھی اس کا بوجھ نہیں اٹھا پاتے۔ آپ اپنے ذہن کو بدلیں۔ آپ کے مقابلے میں مس یمنیٰ چیمبر کے پریذیڈنٹ کی بیٹی ہیں جو اس کالج کے سب سے بڑے ڈونر بھی ہیں لیکن مس یمنیٰ نے اپنے فادر سے کسی بھی قسم کا فیور لینے سے انکار کر دیا اور اس لڑکی میں اتنا پوٹینشل ہے کہ وہ ہر مشکل کا سامنا بہ آسانی کر سکتی ہے۔ وہ ایک لڑکی ہو کر اتنی پُرعزم اور مضبوط ہے تو آپ مرد ہو کر اتنے کمزور کیوں...... بی اسٹرونگ۔" پرنسپل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اوکے، سر...... آئندہ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" آذر نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"گڈ...... مجھے امید ہے کہ آپ ایک اچھے اور کوآپریٹو اسٹوڈنٹ ثابت ہوں گے۔" پرنسپل نے اسے ہمت دلاتے ہوئے کہا۔

"آف کورس سر۔" آذر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"گڈ لک۔" پرنسپل نے مسکرا کر کہا۔

"تھینک یو ویری مچ سر۔" آذر نے شکریہ ادا کیا اور آفس سے باہر نکل آیا۔ جواد آفس کے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"پرنسپل نے کیا کہا؟" جواد نے بے صبری سے پوچھا۔

"وہی جو ایسے موقع پر کہا جاتا ہے کہ آئندہ یہ نہیں کرنا، وہ نہیں کرنا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"ہاں یار...... اب تمہیں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ تم اپنا attitude چینج کر کے سب کے ساتھ اچھا پیش آنے کی کوشش کرو۔ بی فرینڈلی۔" جواد نے کہا۔

"یمنیٰ کے ساتھ بھی؟" آذر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ہاں، اس کے ساتھ بھی۔ اس نے تمہارے ساتھ کیا برا کیا ہے بلکہ ہو سکے تو اس سے معافی مانگ لینا۔" جواد نے کہا۔

"معافی......!" آذر نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں...... معافی، کسی کی نظرِ کرم حاصل کرنے کا پہلا اسٹیپ ہے۔ انسان جب کسی کے سامنے سرنڈر کرتا ہے تو پھر وہ اس کے دل میں پہلا قدم رکھتا ہے اور پھر اس پر عنایتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔" جواد نے مسکرا کر کہا تو آذر نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"یار...... پلیز۔" جواد نے اس کے کندھے کو دباتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں کلاس روم کی طرف جانے لگے۔ حمنہ اور یمنیٰ دوسری جانب سے باتیں کرتی ہوئی آرہی تھیں۔ یمنیٰ نے بلیو جینز کے ساتھ سفید پرنٹڈ کرتہ پہن رکھا تھا اور اس میں اس کی سیاہ رنگت مزید سیاہ لگ رہی تھی۔ دونوں نے چونک کر آذر کی طرف دیکھا۔

"یمنیٰ کو سوری بول دو۔" جواد نے آذر کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔ آذر نے غصے سے جواد کو گھورا اور خاموشی سے یمنیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے چلتا رہا۔

"یار، بول دو سوری۔" جواد نے پھر کہا اور جیسے ہی وہ کلاس روم کے قریب پہنچے تو آذر نے یمنیٰ کی طرف بغور دیکھا اور اپنے گلاسز اتارتے ہوئے

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"آئی ایم سوری مس یمنیٰ۔" آذر نے جلدی سے کہا تو جواد مسکرا دیا۔ یمنیٰ نے چونک کر اس کی طرف اور پھر حمنہ کی طرف دیکھا۔ آذر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تو یمنیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملا لیا تو حمنہ اور جواد بھی مسکرا دیے۔

☆☆☆

روحیل اپنے کمرے میں صوفے پر نیم دراز موبائل پر باتیں کرنے میں مصروف تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ماں جی اس کے کمرے میں آئیں تو روحیل نے ہڑبڑا کر موبائل آف کر دیا۔

"میں آپ کو بعد میں کال کرتا ہوں۔" روحیل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور ماں کی طرف دیکھ کر نظریں چرانے لگا۔

"کیا تم ردا سے بات کر رہے تھے؟" ماں جی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ماں۔" روحیل نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"کیسی لگی وہ؟" ماں جی نے اس کے پاس بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں، اچھی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کا انتخاب ہے ناں، اسی لیے کہہ رہی ہیں۔" روحیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور میرا انتخاب لاجواب ہے۔" ماں جی خوش ہو کر بولیں۔ "مجھے پوری امید ہے کہ ردا مجھے کبھی مایوس نہیں کرے گی۔ وفا، سچائی اور خلوص نیت جن لڑکیوں میں ہوتی ہے وہ بہت اچھی طرح تمام رشتے نبھاتی ہیں۔" ماں جی نے خوش ہو کر کہا۔

"مما، آپ کی زندگی دیکھ کر تو میں بہت ہی مایوس ہو گیا تھا۔ میاں، بیوی کے رشتے پر میرا اعتبار ہی نہیں رہا تھا۔ میں شادی صرف آپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ مجھے اس میں کوئی انٹرسٹ نہیں رہا تھا۔" روحیل ماں کو دل کی بات بتا رہا تھا۔

"بیٹا دنیا کے ایک انسان کی قسمت کبھی دوسرے جیسی نہیں ہوتی۔ اس لیے مفروضوں پر یقین کر کے اپنی زندگی خراب نہیں کرنی چاہیے۔ ردا بہت اچھی لڑکی ہے اسے بھرپور محبت اور اعتبار دینا۔ اس کی محبت میں کسی اور کو شامل مت کرنا تو زندگی اچھی گزرے گی۔" ماں جی نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" روحیل نے بھی دل سے دعا کی۔

"بیٹا دوستی سے لے کر شادی تک ہر رشتہ اعتبار اور خلوص سے چلتا ہے۔ ردا پر اپنے اعتبار کو کبھی کم نہ ہونے دینا اور وہ ہے ہی اتنی معصوم اور پیاری کہ اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنے کو دل چاہتا ہے۔" ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ماں جی، آپ کو تو بس ہر طرف ردا ہی دکھائی دیتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے ماں سے کہنے لگا۔

"کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوتا؟" ماں جی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی۔" روحیل نے شرماتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بس اسی طرح خوش رہو اور مسکراتے رہو۔" ماں جی نے دعائیہ انداز میں کہا اور وہ دونوں مسکرانے لگے۔

☆☆☆

زاہدہ کچن میں ٹرالی پر چائے کے ساتھ لوازمات رکھ رہی تھی۔ اس نے ٹرالی بہت اہتمام

سے سجا رکھی تھی۔ شمیلہ کچن میں داخل ہوئی اور چونک کر زاہدہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ کس کے لیے اتنے اہتمام سے چائے لے کر جا رہی ہو؟" شمیلہ نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"ردا بی بی کی دوست کے لیے۔" زاہدہ نے آہستہ سے بتایا۔

"اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" شمیلہ نے مٹھائی کی پلیٹ سے گلاب جامن اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا تو زاہدہ نے خفگی سے اسے دیکھا اور بس منہ بنا کر رہ گئی۔

"زاہدہ، تم ابھی تک چائے لے کر نہیں گئیں۔ ردا کی دوست کیا کہے گی اتنی دیر سے بیٹھی ہے اور ابھی تک چائے پینے کو نہیں ملی۔" خدیجہ نے کچن میں آ کر زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی جا رہی ہوں۔" زاہدہ نے ٹرالی لے کر جاتے ہوئے کہا تو شمیلہ کے چہرہ پر خفگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

"چلو، بیٹا، تم بھی اُن کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی لو۔" خدیجہ نے بہو کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں۔ کباب میں ہڈی بننے کا۔ ویسے بھی اس گھر میں میری جو حیثیت ہے، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" شمیلہ نے خفگی سے ناک چڑھا کر کہا۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟" خدیجہ ایک دم چونک کر بولیں۔

"کیا آپ کو کچھ بھی نہیں پتا۔ فہام کی ذات سے لے کر اس گھر کی ہر شے پر تو آپ کا اور ردا کا قبضہ ہے، میں تو کہیں ہوں ہی نہیں۔" شمیلہ نے نہایت درشتگی سے کہا تو خدیجہ ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"تم اس گھر کی بڑی بہو ہو۔ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔" وہ بری طرح بوکھلا کر رہ گئیں۔

"ہونہہ...... بہو صرف نام کی۔" وہ طنزیہ مسکراہٹ سے ساس کو دیکھتے ہوئے بولی اور کچن سے چلی گئی اور خدیجہ پریشان پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

خدیجہ کا بی پی ایک دم بہت ہائی ہو گیا تھا۔ وہ بیڈ پر بے سُدھ لیٹی تھیں۔ تینوں بیٹے انتہائی پریشان حالت میں ان کے پاس بیٹھے تھے۔ شمیلہ ایک جانب خاموش کھڑی تھی جبکہ ردا ماں کے سرہانے بیٹھی مسلسل خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ فہام بی پی آپریٹس پر خدیجہ کا بی پی چیک کر رہا تھا اور سب پریشانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"بی پی بہت زیادہ ہائی ہے۔" فہام بی پی چیک کرنے کے بعد بڑبڑایا۔

"مما کو ابھی اسپتال لے جاتے ہیں۔ اتنا ہائی بی پی بہت خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔" حاتم نے قدرے فکرمندی سے کہا۔

"عاصم، ایمبولینس کو کال کرو۔" فہام نے عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی فہام بھائی۔" عاصم نے جلدی سے کمرے سے جاتے ہوئے کہا۔

"مما، آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ تو بالکل ٹھیک تھیں۔" ردا نے روتے ہوئے ماں کے ہاتھ کو پکڑ کر کہا۔

"آج گھر میں کوئی ٹینشن کی بات تو نہیں ہوئی؟ مما کا اتنا ہائی بی پی پہلے کبھی نہیں ہوا۔" فہام نے فکرمندی سے پوچھا تو شمیلہ نے آنکھیں گھما کر خاموشی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"آج رشنا آئی تھی اور مما بہت زیادہ خوش تھیں۔ اس کے جانے کے بعد ایک دم ان کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں

آ گئیں۔ بات تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔" ردا اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ زاہدہ کمرے میں ردا کا بجتا ہوا موبائل لے کر داخل ہوئی۔

"ردا بی بی، آپ کا فون بہت دیر سے بج رہا ہے۔" ردا نے موبائل پر نمبر دیکھا اور بوکھلا کر جلدی سے کال ریجکٹ کر کے موبائل ہی آف کر دیا۔ حاتم اور فہام نے چونک کر اسے دیکھا مگر خاموش رہے۔

"ایمبولینس آ رہی ہے۔" عاصم نے جلدی سے آ کر بتایا تو ردا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ردا، پلیز ہمت کرو میری جان۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس مما کے لیے دعا کرو۔" فہام نے محبت سے اسے چپ کرواتے ہوئے کہا تو شمیلہ ہونٹ سکوڑ کر منہ بناتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

"خالہ جان ٹھیک ہو جائیں گی ردا۔ پلیز حوصلہ کرو۔" شمیلہ نے بھی ہمدردی جتائی۔

☆☆☆

روحیل اپنے کمرے میں موبائل پکڑے قدرے خفگی سے چکر لگا رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ردا کا نمبر ڈائل کیے جا رہا تھا۔

"ردا، میری کال کیوں نہیں لے رہی!" وہ خفگی سے بڑبڑایا اور پریشانی سے پھر اس کا نمبر ملانے لگا تو کافی بیلز کے بعد ردا نے اس کی کال ریجکٹ کر دی۔

"ردا نے میری کال ریجکٹ کر دی...... میری کال۔" روحیل نے ایک دم غصے سے چلاتے ہوئے کہا اور طیش میں آ کر موبائل زور سے بیڈ پر پھینکا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

وہ ہمیشہ سے ہی بہت پوزیسو رہا تھا۔ وہ ردا کے بارے میں بھی آہستہ آہستہ بہت پوزیسو ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے خیال میں ردا کو ہمیشہ اس کی کال اٹینڈ کرنی چاہیے۔ چاہے حالات کچھ بھی ہوں۔ وہ اس کی ذرا سی بے اعتنائی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

☆☆☆

فراز چلا گیا تھا پر رشنا ابھی سسرال میں ہی تھی۔ نجمہ بیگم کے جانے سے وہ خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کبھی کبھی ردا کے گھر چلی جاتی تھی۔ اس روز بھی وہ اداس لیٹی ہوئی تھی جبھی اس کا فون بجا۔ اس نے فون ریسیو کیا۔

"ہائے توقیر بھائی، آپ...... کیسے ہیں؟" رشنا نے قدرے پُرجوش انداز میں کہا۔

"آئی ایم فائن، بھئی تم کہاں گم ہو۔ شادی کے بعد تم بہت بدل گئی ہو۔" توقیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فراز عجیب دھانسو قسم کا بندہ ہے۔ جتنے دن رہا مجھے کسی سے بھی بات نہیں کرنے دیتا تھا۔ اب وہ چلا گیا ہے تو میں فری ہوں۔ اب ہم ہر روز بات کریں گے۔" رشنا بھائی کی آواز سن کر بہت خوش ہوئی۔

"حیرت ہے تم فراز کے رعب میں آ گئیں؟" توقیر نے ہنستے ہوئے اُسے چھیڑا۔

"کیا کروں شوہر جو ہے اور وہ بھی نیا، نیا۔ اسے اپنے ناز نخرے اٹھوانے کا بہت شوق ہے۔ میں بھی خاموش رہی کہ چلو چند دنوں کی بات ہے۔" رشنا نے ہنستے ہوئے کہا تو توقیر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"آج آپ بہت دنوں بعد یوں ہنس رہے ہیں۔" رشنا نے خوش ہو کر پوچھا۔

"تم باتیں ہی ایسی کر رہی ہو اور سناؤ سب لوگ کیسے ہیں۔ آئی مین تمہاری فرینڈز وغیرہ؟" توقیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، توقیر بھائی آپ کو ایک نیوز بتانا تو میں بھول ہی گئی۔ پتا ہے ردا کی انگیجمنٹ ہو گئی ہے۔" رشنا نے خوش ہو کر کہا۔ تو توقیر کو ایک دم جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا دل بند ہو رہا ہو۔

”ردا..... کی..... انگیج..... منٹ..... ک.....
کب؟..... کس کے ساتھ؟“ توقیر نے بوکھلا کر رک رک کر پوچھا۔

”روحیل کے ساتھ۔ بہت ہینڈسم اور اسمارٹ لڑکا ہے۔“ رشنا نے مسکرا کر کہا۔

”ک..... کون ہے وہ؟“ توقیر نے آہ بھر کر پوچھا۔

”فہام بھائی کے فرینڈ کا فرینڈ۔ روحیل کی ماں جی نے ردا کو ایک شادی پر دیکھا اور بس فدا ہو گئیں اور ردا کو بہو بنا کر ہی چین لیا۔“

”کیا..... ردا خوش ہے؟“ توقیر نے متجسس ہو کر پوچھا۔

”ہاں..... بہت زیادہ۔“ رشنا نے مسکراتے ہوئے کہا تو توقیر نے بغیر کچھ کہے فون رکھ دیا۔

”شاید کال ڈراپ ہو گئی۔“ رشنا ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی۔

☆☆☆

سب لوگ آئی سی یو کے باہر انتہائی پریشان کھڑے تھے۔ ردا فہام کے ساتھ لگی مسلسل رو رہی تھی۔

”پلیز ردا، اب خدا کے لیے رونا بند کرو اور اللہ سے دعا کرو۔ خالہ جان ٹھیک ہو جائیں گی۔“ شمیلہ نے ردا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”بھائی، مما کب سے آئی سی یو میں ہیں اور ڈاکٹر بھی کچھ نہیں بتا رہا۔“ ردا نے روتے ہوئے شمیلہ سے کہا۔

”پلیز فہام بھائی آپ اندر جا کر پتا کریں میری مما.....“ ردا نے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”مما کو کچھ نہیں ہوگا۔ حوصلہ رکھو۔“ اس نے محبت سے ردا کو اپنے ساتھ لگایا۔

”میں خود مما کو دیکھ کر آتی ہوں۔“ وہ گھبرا کر اپنا آپ چھڑا کر آئی سی یو کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

”تم..... تم..... رکو میں دیکھتا ہوں۔“ فہام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ ردا کا خیال رکھو۔ میں اندر جا کر مما کو دیکھتا ہوں۔“ وہ آئی سی یو میں جانے لگا کہ ایک ڈاکٹر اندر سے باہر آیا۔

”ڈاکٹر صاحب، ہماری مما کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ فہام نے گھبرا کر پوچھا۔

”تھینکس گاڈ، اب وہ بہت بہتر ہیں۔ شکر ہے کہ آپ انہیں ٹائم پر لے آئے اور ان کا بی پی کنٹرول ہو گیا ورنہ برین ہیمرج بھی ہو سکتا تھا۔“ ڈاکٹر نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”کیا.....؟“ فہام نے گھبرا کر کہا۔

”لیکن اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور واپس اندر چلا گیا۔

”اللہ نے تمہاری دعائیں سن لی ہیں۔ مما ٹھیک ہیں، عاصم تم، شمیلہ اور ردا کو گھر لے جاؤ۔ میں اور حاتم مما کے پاس ہی ٹھہرتے ہیں۔“ فہام نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں..... میں نہیں جاؤں گی۔“ ردا اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”تم بہت تھک گئی ہو گی۔ جاؤ گھر جا کر ریسٹ کرو۔ شمیلہ اسے گھر لے جاؤ۔“ فہام نے محبت سے سمجھاتے ہوئے ردا سے کہا تو شمیلہ اس کا بازو تھام کر عاصم کے ہمراہ اسے وہاں سے لے کر چلی گئی۔ ردا سارا راستہ روتی رہی۔

⁂⁂⁂

رات کافی گزر چکی تھی۔ ردا انتہائی تھکی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سوجن کی وجہ سے بہ مشکل کھل رہی تھیں۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے جلدی سے اپنا موبائل آن کیا اور روحیل کا نمبر ملانے لگی۔ بہت زیادہ بیلز کے بعد بھی روحیل نے اس کی کال اٹینڈ نہیں کی۔ ردا کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

”روحیل فون نہیں اٹھا رہے۔ شاید ناراض ہو گئے ہیں۔“ ردا گھبرا کر خود سے بولی۔

”روحیل، پلیز مجھ سے بات کریں۔ میں بہت پریشان ہو رہی ہوں۔“ اس نے میسج لکھا اور وہ میسج سینڈ کرنے کے بعد پھر روحیل کا نمبر ملانے لگی۔

دوسری جانب روحیل بیڈ پر نیم دراز تھا۔ ردا کی کالز پر کالز آ رہی تھیں مگر وہ ایک نظر دیکھ کر رہ جاتا۔ اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے تاثرات تھے۔ بیلز کے بعد ردا کا میسج آیا تو میسج پڑھ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر موبائل فون رکھ دیا۔ دوبارہ ردا کی کال آئی تو روحیل نے اب کی بار اس کی کال لے لی۔

”ہیلو.....!“ ردا قدرے ڈرے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

”ردا آئندہ آپ نے میری کال ریجکٹ کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ روحیل نے قدرے غصے سے ڈانٹتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

”کیا.....؟“ ردا بری طرح بوکھلائی۔ روحیل کی بات سن کر اسے ایک دم جھٹکا لگا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور روحیل اس کے سسکنے کی آواز سن کر چونکا۔

”کیا آپ رو رہی ہیں؟“ روحیل نے قدرے گھبرا کر پوچھا۔ جواب میں ردا نے سسکی بھری تو روحیل اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

”پلیز ردا..... اسٹاپ ویپنگ۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ ایکچوئیلی میں آپ سے بہت محبت کرنے لگا ہوں اور اپنی محبت میں کسی بھی قسم کی بے اعتنائی اور اگنورنس ..... برداشت نہیں کر سکتا۔“ روحیل خود کو نارمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے آپ کی کال جان بوجھ کر تو ریجکٹ نہیں کی تھی۔ اس وقت مما کی طبیعت بہت خراب تھی اور بھائی انہیں اسپتال لے کر جا رہے تھے۔“ ردا نے سسکی بھر کر معصومیت سے جواب دیا۔

”کیا..... آنٹی بیمار ہیں؟“ روحیل نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

”ہاں، وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں اور میں بھی ابھی اسپتال ہی سے آ رہی ہوں۔“ ردا نے سسکی بھرتے ہوئے بتایا۔

”اوہ..... آئی ایم سوری۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ نے اس لیے کال ریجکٹ کی لیکن آپ مجھے میسج تو کر سکتی تھیں۔“ روحیل نے شرمندہ ہو کر ذرا نرم لہجے میں کہا۔

”کیسے کرتی، اس وقت ہم سب بہت پریشان تھے۔“ ردا نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اب آنٹی کیسی ہیں؟“ روحیل نے پوچھا۔

”کچھ بہتر ہیں لیکن اسپتال میں ہی ہیں۔“ ردا نے رنجیدہ لہجے میں بتایا۔

”آئی ایم سوری، میں اچانک ہائپر ہو گیا۔ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا؟“ اس نے رک رک کر پوچھا۔

”نہیں کیونکہ آپ اصل بات جانتے نہیں تھے ناں۔“

”دیٹس گڈ۔ آپ سچوئیشن کو بہت اچھی طرح سمجھ جاتی ہیں اور یہ آپ کا پلس پوائنٹ ہے۔“ روحیل نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرانے لگی۔

”آپ پریشان ہیں؟“ روحیل سرگوشی میں بولا۔

”میں..... مما کی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہوں۔“ ردا کی آواز بھرا گئی۔

”آئی سی، آپ بہت تھکی ہوئی ہوں گی۔ اب آپ ریسٹ کریں اور اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ آئی لو یو ڈارلنگ پلیز ٹیک کیئر۔ میں صبح ہی اسپتال جاؤں

گا۔'' روحیل نے خوش دلی کے ساتھ اس سے کہا تو ردا نے بھی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

''روحیل میری محبت میں اتنے زیادہ ایموشنل اور پوزیسو ہونے لگے ہیں، یقین نہیں آرہا۔'' ردا نے حیرت سے سوچا اور ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلنے لگی اور وہ یونہی آنکھیں بند کر کے بیڈ پر لیٹ گئی۔

☆☆☆

خدیجہ کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی مگر ابھی اسپتال میں ہی تھیں۔ تینوں بیٹے باری باری ان کی تیمارداری کرتے۔ اس وقت فہام انہیں سیب کاٹ کر کھلا رہا تھا اور حاتم آہستہ آہستہ اُن کا سر دبا رہا تھا۔ جبھی روحیل ہاتھ میں خوب صورت گلدستہ پکڑے اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم آنٹی، اب آپ کیسی ہیں؟'' روحیل نے خدیجہ کے قریب ٹیبل پر گلدستہ رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہوں بیٹا۔ تم نے کیوں تکلیف کی؟'' خدیجہ ایک دم خوش ہو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''تکلیف کیسی؟ ماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ وہ بھی میرے ساتھ آنے کو تیار تھیں۔'' روحیل نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''ارے بیٹا، اب میں ٹھیک ہوں۔''

''ہاں، ڈاکٹر نے ڈسچارج کر دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر تک ہم گھر جا رہے ہیں۔'' فہام نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔

''تھینک گاڈ، آنٹی آپ صحت یاب ہوگئی ہیں۔'' روحیل نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں، اللہ کا شکر ہے۔ بی پی نارمل ہو گیا ورنہ ہم لوگ بہت اپ سیٹ تھے۔'' حاتم نے کہا۔

''ہاں...... ردا بتا رہی تھی۔'' روحیل نے بے ساختہ کہا تو دونوں بھائیوں نے اسے چونک کر دیکھا مگر خاموش رہے۔

''اب میں چلتا ہوں۔ آفس کے لیے لیٹ ہو رہا ہوں۔'' روحیل نے مسکرا کر رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

''خوش رہو، آباد رہو۔'' خدیجہ اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے بولیں۔ وہ سب کو خدا حافظ کر کے چلا گیا۔

''روحیل بہت نائس ہے۔'' فہام مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... پرسنالٹی بھی بہت اچھی ہے۔'' حاتم نے تعریفی انداز میں کہا۔

''ہاں، مجھے بھی بہت اچھا لگا ہے۔ اس لیے انکار کرنے کو دل نہیں چاہا۔ اب اللہ ان دونوں کے نصیب اچھے کرے۔'' خدیجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''الٰہی آمین۔'' دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ کہا۔

''میں نے تو ردا کو ہی سمجھایا ہے کہ روحیل اور اس کی ماں کی محبتوں کی قدر کرے۔ بیٹا جب بہو سسرال اور شوہر کی محبت اور چاہت کی قدر نہیں کرتی تو دل کتنا ٹوٹتا ہے بتا نہیں سکتی۔'' خدیجہ نے نم آنکھوں سے کہا تو دونوں نے چونک کر ماں کو دیکھا۔

''کیا مطلب........ اور آپ اس بات پر اتنی سیریس کیوں ہوگئیں؟'' فہام نے چونک کر پوچھا۔

''بس یونہی بیٹا، آج کل ہر طرف یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ردا کو سمجھانا میرا ہی فرض ہے ناں اس لیے اسے سمجھاتی رہتی ہوں۔'' خدیجہ نے بات سنبھالتے ہوئے کہا اور زبردستی مسکرانے لگیں تو دونوں بیٹے بھی مسکرانے لگے۔

☆☆☆

توقیر اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھا ایک پرانی البم دیکھنے میں مصروف تھا اور اس البم میں رشنا کے

ساتھ ردا کی کچھ تصویریں بھی تھیں۔ ان تصویروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے توقیر کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''تمہاری اپنی کوئی چوائس نہیں تھی اور تم نے ارینج میرج ہی کرنی تھی تو میرے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔'' توقیر نے ایک سرد آہ بھر کر سوچا۔

''میرے دل میں آپ کے لیے..... محبت پیدا نہیں ہو رہی تو میں اپنے دل کو کیسے مجبور کروں۔'' توقیر کے کانوں میں ردا کے الفاظ گونجنے لگے۔

''ہاں، اگر میں تمہارے نصیب میں ہوتا تو تمہارا دل مجھے ضرور قبول کرتا۔'' وہ بہت دل گرفتہ ہو رہا تھا اس کا فون مسلسل بج رہا تھا مگر اسے شاید سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

خدیجہ اسپتال سے آچکی تھیں۔ تینوں بیٹے اور بیٹی ردا ماں کا ہر ممکن خیال کر رہے تھے۔ شمیلہ بھی فہام کی وجہ سے ساس کی خدمت کرنے پر مجبور تھی۔

''خالہ جان جوس پی لیں۔'' شمیلہ اُن کے لیے تازہ پھلوں کا جوس نکال کر لائی تھی۔

''مما کچھ تو بتائیں کہ آپ نے کس بات کی اتنی ٹینشن لی کہ آپ کا بی پی اتنا شوٹ کر گیا اور آپ کو اسپتال جانا پڑا؟'' فہام جو ماں کی طبیعت کے باعث زیادہ تر گھر پر رہتا تھا آج ماں سے پوچھ بیٹھا۔ شمیلہ نے ایک دم گھبرا کر ساس کی طرف دیکھا۔

''یقیناً ردا کی ٹینشن لی ہوگی کہ وہ ان سے جدا ہونے والی ہے۔'' شمیلہ جلدی سے بولی تو وہ اسے ہکا بکا دیکھتی رہ گئیں۔

''لیکن ابھی تو صرف ردا کی منگنی ہوئی ہے۔ وہ کیسے جدا ہو رہی ہے۔'' فہام نے چونک کر کہا۔

''رشتہ طے ہوتے ہی بیٹیاں پرائی ہو جاتی ہیں اور ماؤں کو اندر ہی اندر جدائی کی فکر لگنے لگتی ہے۔'' شمیلہ نے بڑے بوڑھوں کے انداز میں کہا تو خدیجہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مما کیا آپ نے واقعی اسی بات کی ٹینشن لی ہے؟'' فہام نے محبت سے پوچھا۔

''ہاں۔'' خدیجہ نے آہستہ آواز میں کہا۔

''اس میں ٹینشن والی کیا بات ہے، اسے ایک نہ ایک دن تو اپنے گھر جانا ہے۔'' اس نے مسکرا کر محبت سے کہا۔

''ہاں۔'' انہوں نے آہ بھر کر سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''مما آپ ٹھیک طرح سے بات کیوں نہیں کر رہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ ٹینشن اب بھی آپ کے اندر ہے؟'' فہام نے حیرت سے پوچھا۔

''فہام آپ خالہ جان کو کیوں تنگ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں آرام کرنے کو کہا ہے۔'' شمیلہ جلدی سے بولی اور سائڈ ٹیبل کی دراز سے میڈیسنز نکالنے لگی۔

''خالہ جان، آپ یہ دوا کھالیں اور آرام کریں۔ فہام آپ بھی چلیں، خالہ جان کو سونے دیں۔'' شمیلہ نے خدیجہ کو دوا دیتے ہوئے کہا اور فہام کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

یمنیٰ اور آذر میں رفتہ رفتہ دوستی ہونے لگی تھی۔ آذر نے اپنے آپ کو ایک دم بدل دیا تھا۔ اس میں یہ چینج دیکھ کر اس کے دوست بہت حیران تھے۔ فرخ اور اسامہ کو تو بالکل یقین نہیں آرہا تھا اور وہ اسے اس کا کوئی نیا روپ کہتے مگر جواد بہت کونفیڈنٹ تھا، اس کے خیال میں اس نے آذر کا برین واش کیا تھا اور آذر نے اس کی باتوں کا اثر لیا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے آپ کو بدلا تھا اور حمنہ کے خیال میں یمنیٰ کے اچھے رویّے نے اسے بدلا تھا اور یمنیٰ کا خیال تھا کہ کالج میں اسے دوبارہ چانس ملا تھا اسی لیے اس نے اپنے آپ کو سدھارا تھا۔ جو بھی تھا سب اس تبدیلی پر خوش تھے۔ آذر نے اپنے آپ کو بہت ریزرو کر لیا

تھا۔ وہ ہر اک سے نہ تو زیادہ باتیں کرتا اور نہ ہی کسی پر کمنٹس پاس کرتا۔ اپنی پڑھائی کے بارے میں بھی قدرے سیریس ہوگیا تھا۔ وہ یمنیٰ اور حمنہ سے اکثر اسٹڈیز کے بارے میں ڈسکشن کرتا۔ یمنیٰ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر فوراً مسکراہٹ سی پھیل جاتی اور حمنہ اس کی اس مسکراہٹ کو کوئی نام دیتی تو یمنیٰ چونک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ جاتی۔

''یار، یہ تمہارا ذہن کیسی کیسی باتیں سوچتا ہے۔ ایک بات سے کتنی باتیں نکال لیتی ہو۔ تمہاری منگنی کیا ہوئی سب کی منگنیاں کروانا چاہتی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے کزن ہائر اسٹڈیز سے کب لوٹیں گے؟''

''ہاں اسٹڈیز تو مکمل ہوجائیں۔'' حمنہ نے آنکھوں میں ڈھیروں خواب لے کر اسے بتایا۔

''یار، عمر کی کوئی تصویر تو دکھاؤ۔'' یمنیٰ نے اس سے کہا تو اس نے جھٹ اپنے بیگ میں سے ایک چھوٹی سی البم نکالی اور اسے دکھانے لگی۔ وہ بھی حمنہ کی طرح بے حد خوب صورت اور اسمارٹ تھا۔

''تم بہت لکی ہو، عمر بہت اسمارٹ لڑکا ہے۔'' یمنیٰ نے رشک بھرے لہجے میں اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... وہ تو میں ہوں۔ عمر واقعی بہت اچھا انسان ہے اور بہت محبت کرنے والا بھی۔ یمنیٰ میری دعا ہے کہ خدا تمہیں بھی عمر جیسا ہسبینڈ دے۔ وہ اس قدر لونگ اور کیئرنگ ہے، کیا بتاؤں۔'' حمنہ کی آنکھیں عمر کے ذکر سے چمکنے لگیں اور قدرے جذباتی ہوکر اس نے اپنا نقاب نیچے کرلیا۔ اس کے گال خوشی سے سرخ ہورہے تھے۔ یمنیٰ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''لگتا ہے تم عمر سے بے انتہا محبت کرتی ہو؟'' یمنیٰ نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں...... ہاں، بہت زیادہ اور وہ ہے ہی محبت کے قابل۔'' حمنہ نے لہجے میں ڈھیر سارا پیار سمویا۔

''کون...... کس قابل ہوتا ہے۔ یہ ہم کیسے decide کرسکتے ہیں؟'' یمنیٰ نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''جب کوئی اپنی ذات کی نفی کرکے کسی دوسرے کے لیے بہت کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ عمر نے کس کس موقع پر میرے لیے sacrifice کیا۔ اس نے ہمیشہ اپنی اچھی چیزیں مجھ سے شیئر کیں۔ ہر موقع پر میری طرفداری کی۔ تم ہی بتاؤ کیا میں اس شخص سے بے پناہ محبت نہ کروں؟'' حمنہ نے قدرے جذباتی انداز میں اس سے پوچھا۔

''ہاں بھئی، وہ تمہاری پرخلوص محبت ڈیزرو کرتا ہے۔'' یمنیٰ نے مسکرا کر جواب دیا اور دونوں باتیں کرتی ہوئی کیفے ٹیریا چلی گئیں۔ جہاں پر آذر اور جواد پہلے سے ہی موجود تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر آذر نے ہاتھ ہلایا تو یمنیٰ مسکراتی ہوئی ان کی ٹیبل پر جابیٹھی۔ حمنہ اکثر جواد اور آذر کے ساتھ بیٹھنے سے ہچکچاتی تھی۔ حمنہ لڑکیوں کی ایک ٹیبل پر بیٹھ گئی۔

''یار یمنیٰ، یہ تمہاری دوست کو ہم سے کیا پردہ ہے؟ مجھے اور آذر کو دیکھتے ہی فوراً پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اب ہم اتنے برے بھی نہیں۔'' جواد نے منہ بنا کر کہا۔

''جواد جو اپنے لیے اچھا سمجھتا ہے وہ وہی کرتا ہے اور ہم کسی کو فورس تو نہیں کرسکتے کہ وہ ہماری مرضی سے act کرے۔ وہ تم لوگوں کے ساتھ بیٹھنا مناسب نہیں سمجھتی تو یقیناً اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ ویسے بھی اس کا تعلق ایک انتہائی religious فیملی سے ہے۔'' یمنیٰ نے کہا۔

''اگر وہ اتنی religious ہے تو پھر کوایجوکیشن میں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' جواد نے

قدرے خفگی سے کہا۔

''اس کالج میں ایڈمیشن اس نے اپنے منگیتر کی خواہش اور کوشش پر لیا ہے۔ اس نے حمنہ کے گھر والوں کو راضی کیا تھا۔'' یمنیٰ نے بتایا۔

''منگیتر!'' جواد انتہائی حیرت سے بولا۔

''ہاں، وہ یوکے گیا ہوا ہے، ہائر اسٹڈیز کے لیے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔'' یمنیٰ نے اپنی ہی لے میں بتایا تو جواد کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

''یار تمہیں کیوں اتنا دکھ ہورہا ہے۔ کیا اس کی تمہارے ساتھ کوئی کمٹمنٹ تھی؟'' آذر نے معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں یار، مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔'' جواد نے سادگی سے بتایا۔

''ا...... و...... ہ......!'' آذر نے قدرے اونچی آواز میں شرارتی لہجے میں کہا تو وہ بھی ہنسنے لگی۔

''یہ ہنسنے کا نہیں رونے کا مقام ہے۔ میں جس بھی لڑکی کی طرف محبت سے ہاتھ بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ نکل آتا ہے'' جواد نے بے چارگی کے ساتھ کہا۔

''واقعی یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے لیکن کیا کیا جائے شاید تمہاری قسمت میں ہی کوئی گڑبڑ ہے۔'' آذر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ان کاموں میں انوالو ہونے کے بجائے اپنی اسٹڈیز میں سیریس ہونا چاہیے۔'' یمنیٰ نے اسے مشورہ دیا۔

''ہماری ساری قوم کے پاس دوسروں کے لیے بہت مفت مشورے ہیں لیکن کسی کے لیے کرنے کو کچھ نہیں۔'' جواد نے خفگی سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

''اوہ...... اس نے تو مائنڈ ہی کرلیا۔'' یمنیٰ نے قدرے پریشانی سے کہا۔

''جانے دو، تھوڑی دیر بعد خود ہی آجائے گا۔'' آذر نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا کھاؤ گی، میں تمہارے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔'' آذر اٹھتے ہوئے بولا۔

''کولڈ ڈرنکس کے ساتھ کچھ بھی۔'' یمنیٰ نے جواب دیا۔

''کیا میری پسند چلے گی؟'' آذر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''چلے گی۔'' یمنیٰ نے بھی مسکرا کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔ آذر وہاں سے چلا گیا تو یمنیٰ اٹھ کر حمنہ کے پاس آئی۔ حمنہ ایک لڑکی کے ساتھ مسکرا کر باتیں کررہی تھی۔

''یمنیٰ، ان سے ملو یہ کومل رانا ہیں۔ اسٹیٹس سے آئی ہیں۔ انہوں نے آج ہی ہمارا کالج جوائن کیا ہے۔'' حمنہ نے کافی خوب صورت، قدرے صحت مند گول چہرے والی لڑکی سے تعارف کروایا جو بار بار آنکھیں جھپکا رہی تھی۔

''ہیلو، آئی ایم یمنیٰ جمال۔'' یمنیٰ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اس سے مصافحہ کیا۔ کومل نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ اتنی دیر میں آذر اس کے لیے کولڈ ڈرنکس، سینڈوچز اور فرنچ فرائز لے آیا اور اپنی ٹیبل پر رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یمنیٰ کو حمنہ سے باتیں کرتے دیکھ کر اس نے سیٹی بجائی تو یمنیٰ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یمنیٰ نے اسے ہاتھ ہلا کر رکنے کا اشارہ کیا اور کومل کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ آذر جھنجلاتا ہوا اس کی جانب آیا۔

''یار میں کب سے انتظار کررہا ہوں۔'' آذر نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''آذر، یہ مس کومل رانا ہیں، ہماری کلاس میں نیو ایڈمیشن۔'' یمنیٰ نے آذر کا کومل سے تعارف کروایا۔

''ہائے۔'' آذر نے قدرے روکھے لہجے میں کہا۔ کومل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور

مسکرا دی۔
"اب چلیں۔" آذر نے منہ بنا کر یمنیٰ سے کہا تو وہ اس کے ساتھ چل دی۔ ٹیبل پر اتنی زیادہ کھانے کی چیزیں دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔
"اتنی زیادہ چیزیں.....کیا میں یہ سب کھاؤں گی؟" یمنیٰ نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔
"نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ۔" آذر نے مسکرا کر جواب دیا تو یمنیٰ بھی مسکرا دی اور اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگی۔ فرنچ فرائز کھاتے ہوئے آذر اس کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھ رہا ہوں۔
"نہ جانے کیوں، تم اب مجھے بہت اچھی لگنے لگی ہو۔ دل چاہتا ہے کہ تم ہر وقت میرے سامنے رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں۔" آذر نے محبت بھرے لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔
"کیوں، کیا اب میرا کالا رنگ تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟" یمنیٰ نے مسکرا کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔
"کم آن یار ڈونٹ ریمائنڈ می، پلیز فارگیٹ ایوری تھنگ۔" آذر نے شرمندگی سے کہا۔
"میں تو یونہی بات کر رہی تھی۔" یمنیٰ نے سینڈوچ کھاتے ہوئے جواب دیا۔
"سچ بتاؤں۔ اب مجھے نہ تم skiny لگتی ہو اور نہ ہی black۔" آذر نے مسکرا کر جواب دیا۔
"کیوں؟" یمنیٰ نے مسکرا کر سوال کیا۔
"شاید میری آنکھوں کو اب تم صرف اچھی لگنے لگی ہو۔ جیسے مجنوں کو لیلیٰ کبھی کالی دکھائی نہیں دیتی تھی۔" آذر نے مسکرا کر کہا۔
"وہ دونوں تو ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔" یمنیٰ نے معنی خیز انداز میں کہا۔
"کیا.....تمہیں میری آنکھوں میں اپنے لیے کچھ دکھائی نہیں دیتا؟" آذر نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں.....کچھ خاص دکھائی نہیں دے رہا۔" یمنیٰ نے جان بوجھ کر اس کی آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے انجان بننے کی ایکٹنگ کی۔
"اس کا مطلب ہے مجھے تمہیں کسی آئی سرجن کے پاس لے کر جانا چاہیے جو تمہاری آنکھوں کا علاج کرے اور تمہیں سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی آنکھوں میں صاف صاف کچھ دکھائی دینے لگے۔" آذر نے مسکرا کر کہا۔
"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔ کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔" یمنیٰ نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا اور بیگ کندھے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔
"اوہ یار.....میتھس کی اس کلاس سے میری جان نکلتی ہے۔ مجھے یہ بہت مشکل سبجیکٹ لگتا ہے۔" آذر نے ناگواری سے کہا۔
"کیا مطلب، تم کلاس میں نہیں جاؤ گے؟" یمنیٰ نے پوچھا۔
"نہیں، میرا موڈ نہیں۔" اس نے منہ بنایا۔
"کیا تم کلاس بنک کرو گے، اٹس ویری بیڈ۔ چلو اٹھو آئندہ کبھی کلاس بنک کرنے کا سوچنا بھی نہیں ورنہ....." یمنیٰ نے معنی خیز انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ورنہ کیا؟"
"پھر میں تم سے کبھی بات نہیں....." اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔
"نہیں.....نہیں، تم ایسا کچھ مت کرنا۔ میں کلاس میں جا رہا ہوں۔" آذر جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا تو یمنیٰ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور اس کے سفید دانت، کالے چہرے پر عجیب طرح سے نمایاں ہونے لگے۔ اس کی آنکھوں میں پھیلا سیاہ کاجل آنکھیں نم ہونے سے اردگرد پھیلنے لگا۔ آذر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا اور وہ دونوں مسکراتے ہوئے کیفے ٹیریا سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

جمال احمد فیکٹری میں بہت زیادہ مصروف تھے۔ انہوں نے ایک بہت بڑی شپ منٹ جرمنی بھیجنی تھی۔ وہ دن رات مال تیار کروانے کی فکر میں تھے۔ نہ انہیں کھانے کا ہوش تھا اور نہ پینے کا۔ یمنیٰ کی بھی کئی روز سے باپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آرڈر تیار کروا کر وہ رات کے تین بجے گھر آئے تو بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ یمنیٰ گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ بار بار ایک خواب دیکھ کر بڑبڑا رہی تھی پھر وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی باپ کے کمرے میں گئی۔ وہ ابھی چینج کر کے واش روم سے باہر نکلے تھے۔ ایمن گہری نیند سو رہی تھیں۔ یمنیٰ گھبرا کر جمال احمد کے ساتھ لگ کر بولی۔
"ڈیڈی.....ڈیڈی۔" یمنیٰ نے گھبرا کر کہا۔
"ہاں.....ہاں بولو بیٹا، کیا بات ہے؟" جمال احمد نے بھی گھبرا کر پوچھا۔
"ڈیڈی.....آپ یہ شپ منٹ مت بھیجیں۔ میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے۔" یمنیٰ نے گھبرا کر کہا۔
"کیا مطلب.....یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں کئی ماہ سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ کروڑوں کا پروجیکٹ کیسے میں خود اپنے ہاتھوں سے برباد کر دوں؟" جمال احمد نے پریشانی سے کہا۔
"ڈیڈی.....کیا آپ کے کسٹمر کا نام ایس سے شروع ہوتا ہے؟" یمنیٰ نے پوچھا۔
"نہیں ایم سے وہ maxon آرنلڈ ہے۔" جمال احمد نے جواب دیا۔
"نہیں ڈیڈی، آپ investigate کروائیں۔ اس کا نام ایس سے شروع ہوتا ہے اور وہ ٹھیک آدمی نہیں۔ وہ آپ کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پلیز آپ اسے شپ منٹ مت بھیجیں۔" یمنیٰ نے فکر مندی سے کہا تو جمال صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے۔

"ٹھیک ہے، تم جا کر سو جاؤ۔ میں کچھ سوچتا ہوں۔" انہوں نے یمنیٰ کو تسلی دیتے ہوئے اس کے کمرے میں بھیج دیا مگر خود پریشان ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

☆☆☆

رشنا اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی لیپ ٹاپ کے ساتھ بزی تھی۔ اسکائپ پر نجمہ آن لائن تھیں اور بہت پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

"جی مما کیسی ہیں آپ؟" رشنا اسکائپ پر ماں سے بات کر رہی تھی، بیٹی کی آواز سن کر نجمہ بری طرح سسکنے لگیں۔

"مما کیا ہوا، آپ کیوں رو رہی ہیں؟" رشنا نے گھبرا کر پوچھا۔

"توقیر بہت بیمار رہا ہے۔ اسپتال میں ایڈمٹ تھا۔" نجمہ نے سسکی بھر کر کہا۔

"ک..... کب؟ کچھ روز پہلے تو میری ان سے بات ہوئی تھی۔ وہ تو بہت خوش تھے۔ انہیں کیا ہوا ہے؟" رشنا نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہارٹ اٹیک۔" نجمہ روتے ہوئے بولیں۔

"کیا..... ہارٹ اٹیک۔ اوہ..... نو۔" رشنا نے بری طرح گھبرا کر کہا۔

"اس نے ہمیں نہیں بتایا تھا، میں جب بھی فون کرتی تھی اس کا موبائل آف مل رہا تھا۔ تمہارے ڈیڈی نے آسٹریلیا میں اپنے ایک دوست کو اس کا ایڈریس دیا تو انہوں نے یہ سب بتایا۔" نجمہ نے ہچکی بھرتے ہوئے کہا۔

"اب توقیر بھائی کیسے ہیں اور کہاں ہیں؟" رشنا نے پریشانی سے پوچھا۔

"اپنے فلیٹ میں ہے مگر زیادہ بات نہیں کر رہا۔" ماں نے رنجیدہ ہو کر کہا تو رشنا کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

"نہ جانے توقیر بھائی نے اپنے دل کو کیا روگ لگا لیا ہے۔" رشنا تقریباً روتے ہوئے بولی۔

"روگ تو اس لڑکی نے اسے لگایا ہے۔" نجمہ نے دلدوز انداز میں کہا۔ "اگر میرے توقیر کو کچھ ہو گیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" انہوں نے قدرے جذباتی ہو کر کہا۔

"مما، آپ کیا کر سکیں گی۔ بس آپ توقیر بھائی کی صحت کے لیے دعا کریں۔" اس نے ماں کو تسلی دی۔

"میں توقیر کے پاس آسٹریلیا جا رہی ہوں۔" نجمہ نے اپنا پروگرام بتایا۔

"ک..... کیوں؟" رشنا نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

"میں اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نہ جانے میرا بیٹا کس حال میں ہوگا؟" وہ سخت پریشان تھیں۔

"مما، آپ جا کر کسی نہ کسی طرح انہیں شادی پر راضی کر لیں۔ کم از کم ان کی دیکھ بھال کے لیے بیوی تو پاس ہوگی ناں۔" رشنا نے ماں کو سمجھایا۔

"ہاں، کچھ کرتی ہوں۔ تم بھائی کے لیے بہت دعا کرنا۔ بہنوں کی دعائیں بھائیوں کو ضرور لگتی ہیں۔"

"مما آپ پریشان نہ ہوں۔ بھائی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے میرا رواں رواں ان کے لیے دعا گو رہتا ہے۔" رشنا نے گلوگیر ہو کر ماں کو تسلی دی۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم جب سے گھر آئی تھیں کسی فکر میں الجھی ہوئی تھیں۔ اب بھی وہ کسی سوچ میں تھیں کہ ردا ان کے کمرے میں پھلوں کی ٹوکری لے کر آئی اور ان کے پاس بیٹھ کر پھل کاٹنے لگی۔

"نہ جانے اب کیا ہونا ہے؟" خدیجہ بیگم اسے دیکھ کر مایوسی سے کہنے لگیں۔

"یہ آپ اتنی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔ اگر آپ نے ایسی باتیں کیں تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔" ردا نے منہ بنا کر کہا۔

"اچھا نہیں کرتی۔ چلو تم ایک کام تو کرو بیٹا یہ

الماری کھولو اور اس کی دراز میں گھر کی ساری چابیاں ہیں، وہ میرے پاس لے آؤ۔" خدیجہ نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں مما؟" ردا نے حیرت سے پوچھا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ میری طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی تو میں گھر کا سارا انتظام اور ذمے داری شمیلہ کو سونپ دوں۔" شمیلہ جو کسی کام کا پوچھنے ان کے کمرے میں آ رہی تھی اپنا نام سن کر وہیں دروازے پر رک گئی۔

"مگر کیوں مما؟" ردا نے چونک کر پوچھا۔

"وہ اس گھر کی بڑی بہو ہے اور اس کا یہ حق بنتا ہے کہ میں سب کچھ اس کے حوالے کر دوں۔" خدیجہ بڑے سنجیدہ لہجے میں بولیں تو یہ سن کر شمیلہ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"اور کل کو حاتم بھائی اور عاصم بھائی کی بیویاں آ گئیں تو پھر آپ کیا کریں گی۔ کیا تب بھی سارا اختیار شمیلہ بھابی کے ہاتھ میں رہے گا؟" ردا نے حیرت سے پوچھا تو باہر شمیلہ کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

"ان دونوں کے لیے میں پہلے علیحدہ گھر بنواؤں گی پھر شادیاں کروں گی، ہر کوئی اپنے گھر کی مالکن ہوگی۔" خدیجہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔ شمیلہ مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ردا نے چابیاں نکال کر ماں کو دے دیں۔

شمیلہ اپنے کمرے میں مسکراتی ہوئی آئی اور دروازہ بند کر کے خوشی سے بازو پھیلا کر کمرے میں گھومنے لگی۔

"اب سب کچھ میرا ہوگا۔ میں ہی اس گھر کی مالکن ہوں گی۔ میں جو چاہوں گی وہی ہوگا۔ ہاں..... سب کچھ میرا ہوگا، صرف میرا۔" شمیلہ چھت کی طرف دیکھ کر بڑبڑا رہی تھی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور اس نے ایک دم چونک کر دروازے کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو زاہدہ کھڑی نظر آئی۔

"کیا بات ہے زاہدہ؟" شمیلہ نے خود کو نارمل کرتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"تم چلو میں آ رہی ہوں۔" شمیلہ جلدی سے بولی اور اس کے جانے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"اوہ..... شمیلہ بیگم، اس گھر کی مالکن۔" شمیلہ نے اپنے آپ کو دیکھ کر کہا اور قہقہہ لگا کر کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

فہام، ماں کے پاس کرسی پر بیٹھا فون پر کسی سے بات کر رہا جبکہ ردا بیڈ پر بیٹھی چابیوں کے گچھے سے کھیل رہی تھی۔ شمیلہ کمرے میں داخل ہوئی تو فہام نے موبائل آف کر دیا۔

"آؤ شمیلہ بیٹے، یہاں بیٹھو میرے پاس۔" خدیجہ نے بہو کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ اندر کی خوشی چھپا کر قدرے سنجیدہ موڈ میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"بیٹا، آج سے اس گھر کی مالکن تم ہو۔ اب ساری ذمے داریاں تمہیں ہی نبھانی ہیں۔ یہ لو اس گھر کی چابیاں۔" خدیجہ نے چابیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"مما یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" فہام نے ایک دم چونک کر کہا۔

"بیٹا، میری طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے۔ زندگی کا کچھ پتا نہیں، اس لیے میں اپنی زندگی میں ہی سب کچھ شمیلہ کو سونپنا چاہتی ہوں۔" انہوں نے رسانیت بھرے لہجے میں بیٹے کو دیکھ کر کہا۔

"مگر میری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔ جب کوئی ماں اپنے اختیارات بچوں کو سونپتی ہے تو اس گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور ماں کی حیثیت گھر میں

پڑی پرانی چیز سے زیادہ نہیں رہتی۔" فہام نے چابیاں انہیں واپس کرتے ہوئے کہا تو شمیلہ نے بھی ایک دم چونک کر شوہر کی طرف دیکھا اور جلدی سے موڈ بدل کر فہام کے ہاتھ سے چابیاں لے کر انہیں واپس کر دیں۔

"فہام بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں خالہ جان۔ اس گھر کی مالکن آپ ہیں اور آپ ہی رہیں گی۔ میں اس قابل کہاں کہ اتنی بڑی ذمے داری نبھا سکوں۔" شمیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو خدیجہ نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

"مما، شمیلہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" فہام نے شمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خالہ جان! اللہ آپ کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے، آپ کو زندگی اور صحت دے، آپ ہی گھر کی ذمے داریوں کو نبھائیں۔" شمیلہ نے مسکرا کر خدیجہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تو خدیجہ نے بے یقینی سے بہو کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئیں۔

"مما! آپ کی بہو کتنی سعادت مند ہے، مجھ سے زیادہ اسے آپ کا خیال ہے، اسے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں۔ شمیلہ میں تم سے بہت خوش ہوں۔" فہام نے اس کی طرف دیکھ کر تعریفی انداز میں کہا تو خدیجہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"میں ان کی بہو نہیں، ان کی بیٹی ہوں اور ماں کا خیال بیٹیاں ہی رکھتی ہیں۔" شمیلہ نے خدیجہ کے ساتھ لگ کر ان کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے کہا تو خدیجہ نے پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور زبردستی مسکرا کر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ فہام نے مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ ردا حیرت سے کبھی بھاوج اور کبھی ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

اسے شمیلہ کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا جو شوہر کے سامنے انتہائی میٹھی زبان میں باتیں کر رہی تھی مگر اکثر ردا کے ساتھ ساس کے بارے میں کتنے تلخ الفاظ استعمال کر چکی تھی۔ شمیلہ کے اس بدلتے ہوئے روپ کو دیکھ ردا بری طرح چونکی تھی مگر اک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ خدیجہ بھی بے بسی سے شمیلہ کی طرف دیکھ رہی تھیں مگر فہام مسکرا مسکرا کر بیوی کو دیکھ رہا تھا اور وہ اسی بات سے بہت خوش ہو رہی تھی کہ وہ فہام کے دل میں گھر کر رہی ہے۔

☆☆☆

ایک جونیئر افسر نے مکمل انکوائری کے بعد حیدر کو فرحان کے بارے میں تمام رپورٹ لا کر دے دی۔ حیدر نے فائل کا مطالعہ بغور کیا اور پھر فہام کو فون ملایا۔ فہام اپنے آفس میں تھا۔ حیدر کی کال دیکھ کر اس نے جلدی سے اٹینڈ کی۔

"حیدر! کیسے ہو یار......؟" فہام نے اس کا حال احوال پوچھا۔

"فائن...... تمہیں ایک گڈ نیوز سنانی تھی، تمہیں جس پر شک تھا وہی اصل مجرم ہے۔" حیدر نے اسے بتایا۔

"رئیلی...... کیا وہ پکڑا گیا ہے؟" فہام چونک کر پوچھنے لگا۔

"نہیں...... اس نے بہت ہوشیاری سے یہ کام کیا ہے کہ کسی کو اس پر شک نہ ہو۔" حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا...... مطلب؟" فہام چونک کر بولا۔

"وہ ایک انٹرنیٹ کیفے کا مالک ہے اور اس میں کام کرنے والی مختلف لڑکیوں سے وہ میسجز کرواتا تھا۔ موبائل سروسز کمپنیوں سے جب ان لڑکیوں کا ڈیٹا مانگا تو وہ سب مختلف علاقوں کی تھیں۔ پھر میں نے اپنے سپاہی اس کام پر لگائے، انہوں نے فرحان کو ٹریس آؤٹ کیا اور ان سب لڑکیوں کے نام اور ایڈریس نوٹ کیے گئے۔ میں بہت جلد اسے اریسٹ کر لوں گا۔" حیدر نے تفصیل سے بات کرتے ہوئے کہا۔

"یار...... کیا وہ مان جائے گا کہ اس نے ہی یہ گھٹیا حرکت کی ہے؟" فہام نے فکر مندی سے پوچھا۔

"نہیں...... میں اسے اس کیس میں اریسٹ نہیں کروں گا۔ ایکچوئیلی اس کی انکوائری کرنے پر پتا چلا کہ وہ ایک ڈرگ مافیا کے ساتھ بھی کام کرتا ہے۔ اس جیسے کسی کیس میں انوالو کر کے اس سے سارا کچھ اگلواؤں گا، تم بے فکر رہو۔ تمہاری عزت میری عزت ہے یار...... ٹرسٹ می......" حیدر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"تھینک یو ویری مچ۔" فہام نے خوش ہو کر کہا۔

"یاروں کو تھینکس نہیں بولتے......" حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"او کے...... سر۔" فہام ہنسنے لگا۔

"لیکن فی الحال تم اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا...... جب تک وہ اریسٹ نہ ہو جائے۔" حیدر نے کہا۔

"او کے......" فہام نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اب تم بالکل فکر نہ کرنا، تم لوگوں کو کوئی میسجز نہیں آئیں گے اور نہ ہی کوئی بلیک میل کر سکے گا۔" حیدر نے وثوق سے کہا۔

"مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تم سے پہلے کونٹیکٹ کیوں نہیں کیا۔" فہام نے پچھتاوا ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے...... لوگ پولیس پر ٹرسٹ ہی نہیں کرتے، اٹس اے بگ ٹریجڈی...... او کے یار...... میں تھوڑا بزی ہوں پھر بات ہو گی' بائے۔" حیدر نے موبائل آف کرتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے یہ ٹینشن تو ختم ہوئی۔ اب مجھے مما کو راضی کرنا چاہیے کہ وہ ردا کو یونیورسٹی میں پڑھنے دیں...... بعد میں اس کی شادی کریں۔ اب مجھے اس کی اسٹڈیز کے لیے اسٹینڈ لینا چاہیے۔" فہام نے کچھ سوچا اور مطمئن ہو گیا۔

خدیجہ لاؤنج میں ماں جی اور فضیلت کے ہمراہ بیٹھی باتیں کر رہی تھی نزدیک ہی شمیلہ بھی بیٹھی تھی۔ زاہدہ ٹیبل پر چائے کے ساتھ مختلف لوازمات رکھ رہی تھی۔

"ردا کہاں ہے؟" خدیجہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے انہیں بتایا ہے بس وہ آ رہی ہیں۔" زاہدہ نے جلدی سے جواب دیا۔ اسی لمحے ردا وہاں آ گئی اور نزدیک جا کر ماں جی سے ملی۔ ماں جی نے انتہائی محبت سے اس کا سر، چہرہ اور ہاتھوں کو چوم کر صوفے پر بٹھایا۔ ماں جی کے چہرے پر انتہائی خوشی کے تاثرات تھے۔ وہ بار بار ردا کو اپنے ساتھ لگا رہی تھیں۔ شمیلہ زبردستی مسکرا کر مگر اندر سے حسرت بھری نگاہوں سے ماں جی اور ردا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فضیلت بھی ردا کو پیار کر رہی تھی۔

"بہن...... آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی اور میری بھی...... اس لیے میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد ردا کو بہو بنا کر اپنے گھر لے جاؤں۔ میں آج شادی کی تاریخ لینے آئی ہوں۔" ماں جی نے مسکراتے ہوئے خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا تو ردا شرما کر وہاں سے چلی گئی۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن میں اپنے بیٹوں سے مشورہ کیے بغیر کیسے تاریخ دے دوں۔" خدیجہ نے ایک دم چونک کر کہا۔

"ہاں تو آپ ان سے مشورہ کر لیں۔" ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا جبھی فہام لاؤنج میں داخل ہوا۔

"لیجیے...... فہام بیٹا تو آ گیا ہے۔" ماں جی نے مسکرا کر کہا تو فہام بھی مسکرا کر سب سے سلام دعا کرنے لگا اور ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"شمیلہ بیٹے! حاتم اور عاصم گھر میں ہیں تو انہیں بھی بلا لاؤ۔" خدیجہ نے شمیلہ سے کہا۔

"جی...... خالہ جان!" وہ سعادت مندی سے کہتی ہوئی اٹھ گئی۔

''روحیل کی ماں جی...... شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آئی ہیں۔'' خدیجہ نے فہام کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا اتنی جلدی......؟'' فہام نے ایک دم ہڑ بڑا کر کہا اسی لمحے چھوٹے دونوں بھائی بھی وہاں آگئے۔

''بیٹا...... آپ سب لوگ یہاں جمع ہیں، میں اس ماہ ردا کی اور روحیل کی شادی کرنا چاہ رہی ہوں، ڈیٹ آپ لوگ بتا دیجیے۔'' ماں جی نے سب کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا، وہ لوگ چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''آنٹی...... کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ کچھ وقت دے دیں، اصل میں میری خواہش ہے کہ ردا یونیورسٹی میں پڑھ لے۔'' فہام کے کہنے پر خدیجہ سمیت سب لوگوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''بیٹا! اس بات پر تو بات ہو چکی ہے۔ ردا شادی کے بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لے گی۔'' ماں نے یقین سے کہا۔

''بہن ہمیں تھوڑا سا ٹائم تو دیں...... شادی کی تیاری میں وقت بھی چاہیے۔'' خدیجہ ملتجیانہ انداز میں بولیں۔

''نہیں بھئی، میں جہیز تو بالکل نہیں لوں گی۔'' ماں جی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''شکریہ...... لیکن ردا ہماری اکلوتی بیٹی ہے، میں اسے خالی ہاتھ نہیں بھیج سکتی...... اپنے سارے ارمان پورے کر کے اسے رخصت کروں گی۔'' خدیجہ نے مسکراتے ہوئے انہیں کہا مگر شمیلہ کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ اسے اپنی شادی کا وقت یاد آگیا۔ اس نے گھور کر ساس کو دیکھا اور بہانے سے ٹرے میں برتن رکھ کر وہاں سے چلی گئی۔

''لیکن؟'' ماں جی نے کہا۔

''پلیز...... ہمیں اس بات سے نہ روکیں......'' خدیجہ نے ایک دم بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی...... لیکن اب ڈیٹ میری مرضی کی ہوگی، اس ماہ کی پچیس تاریخ کیسی رہے گی۔'' ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی......'' فہام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''سب کو مبارک ہو۔'' ماں جی مسکراتے ہوئے بولیں تو سب مسکرانے لگے۔ شمیلہ انتہائی غصے میں اپنے کمرے میں آگئی اور زور سے دروازہ بند کر کے انتہائی غصے میں ماں کو فون ملانے لگی مگر بہت زیادہ بیلز کے بعد بھی ریحانہ نے فون نہیں اٹھایا۔

''اب مما! بھی میرا فون نہیں اٹھا رہیں۔ ایک بار فون اٹھائیں تو میں انہیں اُن کی بہن کے کرتوت بتاؤں، جو کہتی کچھ ہیں اور کرتی کچھ ہیں۔'' شمیلہ نہایت غصے سے بڑبڑائی۔ فون کا جواب نہ پا کر اس نے طیش میں آکر موبائل اٹھا کر بیڈ پر پھینک دیا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں تھکے ہوئے انداز میں بیڈ پر بیٹھی تھیں اور آہستہ آہستہ اپنے پیروں کو بیڈ پر سیدھا کر رہی تھیں اور ساتھ ہی درد سے کراہنے لگیں۔ فہام ماں کے کمرے میں آیا... انہیں دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ کر ان کے گھٹنوں کو دبانے لگا۔

''بیٹا! بس کرو، یہ دردیوں دبانے سے کہاں کم ہوگا۔'' خدیجہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن کچھ تو آرام ملے گا ناں۔'' وہ گھٹنے دباتے ہوئے بولا تو خدیجہ آہستہ سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''مما! آپ ردا کی شادی میں کچھ زیادہ عجلت نہیں کر رہیں؟'' فہام نے بالآخر ماں سے کہہ دیا، اس کا دل ردا کی اتنی جلدی شادی کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

''میں خود بھی نہیں چاہتی تھی لیکن شاید خدا کو یہی منظور ہے۔ اس نے حالات ہی ایسے بنا دیے

ہیں۔'' خدیجہ نے جیسے ہارتے ہوئے کہا۔

''مما جس وجہ سے آپ شادی میں جلدی کر رہی تھیں، اب وہ وجہ بھی نہیں رہے گی۔'' فہام نے ماں کی طرف بغور دیکھ کر کہا تو خدیجہ نے فہام کو چونک کر دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' انہیں بات سمجھ نہ آئی۔

''مما! فرحان کو بہت جلد پولیس اریسٹ کرے گی...... ہماری اس ساری پریشانی کا ذمے دار وہی ہے۔ بہت ہی خبیث انسان ہے وہ۔'' فہام دانت پیس کر بولا۔

''کیا واقعی...... فرحان نے ہی یہ سب کچھ کیا ہے؟'' خدیجہ نے انتہائی حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''ہاں...... اور پولیس کے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔'' فہام نے ماں کو بتایا۔

''یقین نہیں آرہا کہ اپنے ہی رشتے دار اتنی گری ہوئی حرکت بھی کر سکتے ہیں۔ میری معصوم بچی کے کردار پر حملہ کرتے ہوئے اسے ذرا بھی تو شرم نہ آئی۔'' خدیجہ اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے بولیں۔

''دل تو چاہتا ہے کہ اسے جا کر وہ سبق سکھاؤں کہ ساری زندگی یاد رکھے لیکن صرف یہ سوچ کر خاموش رہ جاتا ہوں کہ جب بات کھلے گی تو اس میں ردا کا بھی ذکر آئے گا اور میری بہن کا نام کوئی غلط انداز سے لے میں کبھی برداشت نہیں کر سکوں گا۔'' فہام نے دانت پیس کر کہا۔

''بس بیٹا! شاید یہی واقعہ ردا کی شادی کا باعث بننا تھا۔ اللہ کی حکمتیں وہی جانتا ہے۔'' خدیجہ نے بیٹے کو تسلی دی۔

☆☆☆

جمال صاحب نے خپ منٹ روک دی تھی...... فیکٹری کے سب لوگ حیران بھی ہو رہے تھے اور پریشان بھی...... کروڑوں کا پروجیکٹ جمال صاحب نے بغیر کسی وجہ کے کیوں روک رکھا تھا۔ وہ خود بھی شش و پنج کا شکار تھے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ ٹھیک تھا یا نہیں...... مگر ایک بات کا انہیں پکا یقین تھا کہ یمنیٰ انہیں جب بھی کسی بات سے روکتی تھی اس کے پیچھے ضرور کوئی اہم وجہ ہوتی تھی...... اور ایسا اس کے بچپن سے ہی ہوتا آرہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کھیل، کھیل میں ہی اچانک کوئی ایسی بات کہتی جو فوراً پوری ہو جاتی...... اور جمال صاحب گھنٹوں اس سے پوچھتے رہتے تھے کہ اس نے وہ بات کیوں کہی تھی...... یمنیٰ کو اس بات کی کوئی خبر ہی نہیں ہوتی اور وہ مکمل لاعلمی کا اظہار کرتی...... یمنیٰ نے پانچ سال کی عمر سے ایسی باتیں کرنا شروع کی تھیں اور تب سے جمال صاحب اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یمنیٰ کے ساتھ ضرور کوئی غیر معمولی ماورائی قوت تھی اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک روحانی بزرگ سے بھی کیا تھا۔ انہوں نے چونک کر جمال کی طرف دیکھا اور کہنے لگے۔

''ایسے بچے نصیب والوں کو ملتے ہیں کیونکہ انہیں خدا اپنی خاص عطاؤں سے نوازتا ہے، آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے گھر ایسی بچی نے جنم لیا ہے، آپ اس کا بہت خیال رکھا کریں۔'' بزرگ نے کہا تو جمال صاحب نے چونک کر انہیں دیکھا۔ جمال صاحب کے لیے تو وہ پہلے ہی بہت بڑی نعمت تھی کیونکہ تین مُردہ بچوں کے بعد وہی تو زندہ سلامت بچی تھی۔ بزرگ کے کہنے پر وہ کچھ اور زیادہ اس کا خیال رکھنے لگے۔ اس کا کہا کبھی نہیں ٹالتے تھے۔ ویسے بے جا ضد وہ بھی نہیں کرتی تھی۔

اس کے اندر بچپن سے ہی قناعت پسندی اور دوسروں کے لیے بہت زیادہ ہمدردی تھی۔ اکثر اپنی قیمتی چیزیں ملازموں کو دے دیتی تھی۔ جس پر ایمن بیگم اکثر اس سے ناراض بھی ہوتی تھیں مگر جمال صاحب نے ایمن کو کبھی اسے ڈانٹنے کا حق نہیں دیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنسو تو کیا ذرا سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی عادات بچپن سے

ہی بہت اچھی تھیں۔ اس کی سیاہ کالی رنگت کے باوجود اس میں خاص کشش تھی۔ جس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف ضرور متوجہ ہوتے تھے۔ یہ جمال صاحب کا ہی کمال تھا کہ انہوں نے اس کی سیاہ رنگت کو اس کا کمپلیکس نہیں بننے دیا تھا۔ اس میں اتنا اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ انتہائی خوب صورت لوگ بھی اس کے سامنے سرنڈر کر دیتے تھے اور یہ بات اندر ہی اندر اسے تقویت بھی دیتی۔ جمال صاحب خوش تھے کہ ان کی بیٹی خوب صورت نہ سہی مگر ایک اچھی اور طاقتور انسان تھی۔ جسے زمانہ آسانی سے کبھی شکست نہیں دے سکے گا۔ یمنیٰ کا ظاہر و باطن ایک کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھا۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ جھوٹ اور دھوکا بازی سے اسے کتنی نفرت تھی۔ آفس میں بیٹھے گھنٹوں وہ اس سوچ میں گم رہے کہ وہ اس پروجیکٹ کا کیا کریں۔ فیکٹری کا ایک، ایک ملازم انہیں آ کر سمجھانے کی کوشش کرتا کہ تیار مال کو یوں روکے رکھنا بہت بڑی حماقت ہے۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ فیکٹری میں جب ان کے بارے میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں تو انہوں نے یمنیٰ سے تفصیل سے بات جاننے کی کوشش کی۔ ایک رات یمنیٰ اپنے کمرے میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی کچھ نوٹس تیار کرنے میں مصروف تھی۔ جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور اس کے قریب بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ باتیں کرتے ہوئے وہ ایک دم رکے اور چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''یمنیٰ بیٹے آپ نے وہ کیا خواب دیکھا تھا۔ میری شپ منٹ کے بارے میں؟'' انہوں نے اچانک سوال کیا۔

''ڈیڈی میں نے آپ کو فیکٹری میں آپ کے بہت زیادہ سامان کے ساتھ دیکھا اور پھر دیکھا کہ اچانک آپ کے سامان کو آگ لگ گئی ہے اور ایک بہت بڑے بورڈ پر s لکھا دکھائی دیا اور کہیں سے آواز آئی کہ اس شخص کو سامان نہیں بھیجیں۔'' یمنیٰ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''ڈیڈی آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' یمنیٰ نے ان کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس شخص کے بارے میں جو ہمارا کسٹمر ہے، میں اس کے بارے میں پہلے ہی کچھ مشکوک تھا کیونکہ وہ جن ٹرمز اور کنڈیشنز پر ہمارے ساتھ بزنس کر رہا تھا وہ بہت unusual تھیں مگر اس کا نام بہت کنفیوز کر رہا تھا کیونکہ s نام کا کوئی بھی کسٹمر فی الحال ہماری بزنس لسٹ میں نہیں۔'' جمال صاحب قدرے تشویش سے بولے۔

''ڈیڈی آپ کسی سے اس شخص کے بارے میں انویسٹیگیشن کیوں نہیں کروا لیتے۔'' یمنیٰ نے رائے دی۔

''کس سے کراؤں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ بولے۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے، کسی جرمن detective سے...... contact کریں آپ کو فوراً ساری انفارمیشن مل جائے گی۔'' یمنیٰ نے کہا تو انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''یس یو آر رائٹ...... تمہارا یہ پوائنٹ مجھے click کر رہا ہے۔ میں آج ہی کسی سے contact کرتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر یوں بولے جیسے ان کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

''نیٹ پر آپ کو بہت سے detectives مل جائیں گے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔'' یمنیٰ نے مسکرا کر کہا۔

"no thanks dear, I dont wantodistrub you more"

انہوں نے مسکرا کر کہا اور کمرے سے باہر چلے گئے اور یمنیٰ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

کومل رانا جب سے کلاس میں آئی تھی۔ کلاس کی فضا کافی خوشگوار ہو گئی تھی۔ وہ لڑکے لڑکیوں سب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور مذاق کرنے سے باز نہیں آتی تھی۔ اس کے مذاق ہمیشہ برجستہ اور ہنسا دینے والے ہوتے تھے۔ جن پر سب اکثر کھلکھلا کر ہنستے اور کوئی اس کی باتوں کو مائنڈ بھی نہیں کرتا۔ حمنہ اور یمنیٰ کے ساتھ اس کی دوستی روز بروز گہری ہوتی جا رہی تھی اور لڑکوں میں سب سے زیادہ وہ آزر سے متاثر تھی۔ آزر اسے قدرے مغرور لگتا جو یمنیٰ کے علاوہ کم ہی کسی لڑکی کو لفٹ کراتا تھا۔ وہ جتنا خوب صورت تھا۔ یمنیٰ اس کے بالکل برعکس تھی۔ دونوں میں دوستی تھی یا محبت اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اکثر یمنیٰ سے مذاق میں پوچھتی تو وہ ہنس کر ٹال دیتی۔

''یار یمنیٰ یہ راکٹ تمہارے ارد گرد بہت منڈلاتا رہتا ہے۔ عقیدت میں تمہارا طواف کرتا ہے یا پھر محبت میں کوئی چکر بازیاں لگاتا ہے؟'' کومل نے قدرے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''کم آن یار...... تم کیسی باتیں کر رہی ہو، ہم سب فرینڈز ہیں اور کچھ نہیں۔'' یمنیٰ نے منہ بنا کر اسے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے، میں راکٹ سے خود ہی پوچھ لیتی ہوں۔ آج تو راکٹ ویسے بھی پھٹنے کے موڈ میں آیا ہے۔'' کومل نے ہنس کر آزر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو ریڈ کلر کی شرٹ پہنے، بالوں کا خاص اسٹائل بنائے اور گلاسز لگائے کلاس روم میں داخل ہوا تھا۔ کومل ہمیشہ مذاق میں آزر کو راکٹ کہہ کر بلاتی تھی اور اکثر آزر کے سامنے بھی وہ ایسا کہتی تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آتا مگر باقی سب ہنستے رہتے۔ کلاس شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ آزر مسکراتا ہوا ان کے پاس آیا۔

"hello guys!" آزر نے مسکرا کر کہا۔

''آزر...... یار بہت عجیب سی پرابلم میں ہم پھنس گئے ہیں۔'' کومل نے آنکھیں گھما کر معنی خیز انداز میں اس سے پوچھا۔

''کیسی پرابلم......؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''کوئی کسی کی طرف جب گہری نظروں سے دیکھتا ہے تو اس کے پیچھے کیا بات ہوتی ہے محبت یا دوستی؟'' کومل نے مسکرا کر پوچھا۔

''ایک نظر دیکھا جائے تو دوستی...... بار بار دیکھا جائے تو محبت۔'' آزر نے کہا۔

سب نے مسکرا کر یمنیٰ کی طرف دیکھا۔ آزر اسی کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ یمنیٰ ایک دم جھینپ گئی اور پہلی بار سب نے اسے کنفیوز ہوتے دیکھا۔

''یار یمنیٰ...... تم کیوں اتنی کنفیوز ہو رہی ہو...... یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی راکٹ سیدھا تمہیں لگا ہو۔'' کومل نے ہنستے ہوئے کہا تو آزر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ اچانک راکٹ کہاں سے آ گیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''راکٹ...... راکٹ...... راکٹ...... کہیں سے بھی آ سکتا ہے۔'' کومل نے قہقہہ لگا کر کہا تو وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اچانک پروفیسر شبیر حسین کلاس روم میں داخل ہوئے تو سب لوگ اپنی اپنی چیئرز پر بیٹھ گئے مگر کومل بار بار یمنیٰ کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتی رہی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر یمنیٰ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

جمال صاحب اپنے آفس میں بیٹھے کسی سے فون پر بات کر رہے تھے اور ان کے چہرے کے تاثرات مسلسل بدل رہے تھے۔ بات ختم کر کے انہوں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور گہری سانس لیتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر دل ہی دل میں اللہ کا

شکرادا کرنے لگے۔
''یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تو نے مجھے اتنے بڑے نقصان سے بچالیا۔'' اسی لمحے ان کے اسسٹنٹ منیجر فدا حسین آفس میں داخل ہوئے۔
''سر آپ نے مجھے بلایا؟'' فدا حسین نے ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''ہاں...... Mr.maxon کے بارے میں latest انفارمیشن ملی ہیں وہ یہ کہ وہ ہمارے ایک رائیول (رقیب) جان اسمتھ کے behalf پر ہم سے یہ شپ منٹ منگوا رہا تھا اور مسٹر اسمتھ کے ساتھ ہمارے بزنس ٹرمز ماضی میں کیسے رہے ہیں یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس شخص نے ہمیں پہلے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکا تھا اور اب maxon کے ذریعے اس نے جس consignment کے سلسلے میں deal کرنے کی کوشش کی تھی اگر وہ اس میں کامیاب ہوجاتا...... تو یقین مانو ہمیں اتنا بھاری نقصان ہوتا کہ شاید یہ فیکٹری ہی بند کرنی پڑجاتی۔'' جمال صاحب نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے آفس کے در و دیوار کی طرف دیکھ کر کہا۔
''سر آپ اللہ کا کروڑ دفعہ شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کو اتنے بڑے نقصان سے بچالیا ہے۔'' منیجر نے خوش ہو کر کہا۔
''ہاں...... میں اللہ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس نے مجھ پر بہت کرم کیا ہے۔'' جمال صاحب نے متشکرانہ لہجے میں کہا۔
''اور یہ بھی صرف آپ کی نیک نیتی اور غریبوں سے رحم دلی کی وجہ سے ہے کہ وہ آپ کو آنے والے خطرات سے پہلے ہی آگاہ کردیتا ہے۔ وہ بہت مہربان ہے جو اپنے بندوں کی ہر موقع پر مدد کرتا ہے۔'' منیجر فدا حسین نے کہا۔
''ہاں...... یہ اس کی کرم نوازی ہے کہ اس نے اپنی بہت بڑی نعمت سے مجھے نوازا ہے۔'' ان کی آنکھوں کے سامنے یمنیٰ کا چہرہ گھومنے لگا۔
''سر آپ کو اس کی بہت مبارک ہو، اب میں جاؤں؟'' فدا حسین نے جانے کی اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔
''ہاں...... اور Mr.maxon کو mail send کردیں کہ اب ہم ان کے ساتھ کوئی بزنس deal نہیں کریں گے۔'' جمال صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔
''رائٹ سر۔'' وہ کہہ کر آفس سے باہر چلا گیا اور جمال صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ انہوں نے فوراً یمنیٰ کا نمبر ملایا...... وہ کار ڈرائیو کررہی تھی اور اس کے ساتھ آزر تھا۔
''ہیلو یمنیٰ بیٹے...... تم کہاں ہو، تمہیں ایک گڈ نیوز سنانی ہے۔ Mr.maxon کے بارے میں انفارمیشن ملی ہے اور تمہارا خواب بالکل سچ نکلا ہے۔'' جمال صاحب نے خوش ہو کر بتایا۔
''اوہ...... رئیلی ڈیڈی!'' وہ حیرت سے چلاتے ہوئے بولی۔
''یس مائی ڈیئر...... اینڈ تھینکس اے لاٹ...... میں بہت بڑے نقصان سے بچ گیا۔'' انہوں نے خوش ہو کر کہا۔
''یو مسٹ بی تھینک فل ٹو گاڈ۔'' یمنیٰ نے مسکرا کر کہا۔
''یس آف کورس بیٹا۔'' وہ مسکرا کر بولے اور یمنیٰ بھی مسکرانے لگی اور خدا حافظ کہہ کر اس نے موبائل آف کردیا۔
آزر ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔
''کیا تم اپنے ڈیڈ سے بہت اٹیچڈ ہو؟'' آزر نے پوچھا۔
''ہاں...... کیا تم اپنے ڈیڈ سے نہیں؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''ویری فارمل...... میرے مما، پاپا دونوں ہی اپنی اپنی دنیا میں بزی رہتے ہیں، میرے لیے ان کے پاس بہت تھوڑا ٹائم ہوتا ہے۔ اور جو ٹائم ہم اکٹھے spend کرتے ہیں، وہ زیادہ تر ایک دوسرے کو criticise کرنے میں ہی گزر جاتا ہے۔
I am sick of them and never like to be with them!"
آزر نے ناگواری سے کہا۔
''یہ کتنا عجیب relationship ہے کہ تم اپنے parents کے بارے میں ایسی باتیں کررہے ہو۔'' یمنیٰ نے حیرت سے کہا۔
''تمہارے اور میرے parents میں بہت فرق ہے۔'' آزر نے عجیب انداز میں کہا۔
''کیسا فرق......؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔
''بہت سی باتوں کا اور میں ابھی انہیں ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ ناگواری سے بولا۔
''اوکے، اپنا موڈ مت آف کرو۔'' یمنیٰ نے کہا تو آزر زبردستی مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔
''اب بتاؤ...... کہاں جانے کا موڈ ہے؟'' یمنیٰ نے پوچھا۔
''مجھے میرے فلیٹ ڈراپ کردو۔'' وہ بیزاری سے بولا۔
''ایک بات بتاؤ...... کیا تم شروع سے ہی فلیٹ میں رہتے ہو؟ آئی مین...... اپنے پیرنٹس کے ساتھ بھی؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔
''نہیں...... ڈیفنس میں ہمارا گھر ہے...... مگر مما، پاپا آج کل امریکا گئے ہوئے ہیں تو گاؤں سے گرینڈ پا کو میرے پاس چھوڑ گئے اور وہ اتنے سخت انسان ہیں، ہر بات میں مجھ سے الجھنے لگے تھے۔ میں انہیں وہیں چھوڑ کر فلیٹ میں شفٹ ہوگیا۔'' آزر بتانے لگا تو وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔
''اٹس امیزنگ...... گرینڈ پا کی وجہ سے تم نے گھر چھوڑ دیا۔'' یمنیٰ نے شدید حیرت کا اظہار کیا۔
''ہاں...... میں اپنی لائف میں کسی کی بھی انٹر فیرنس برداشت نہیں کرسکتا۔''
''چاہے وہ تمہاری وائف ہی کیوں نہ ہو؟'' یمنیٰ نے مسکرا کر پوچھا۔
''یس آف کورس......'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔
''پھر تو تم بھی بہت ریجڈ ہسبینڈ ہوگے۔'' یمنیٰ نے ٹرن لیتے ہوئے کہا۔
''ہاں...... مگر میں بدل بھی سکتا ہوں اگر اس میں اتنی پوٹینشل ہوئی تو۔'' وہ اس کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔
''کیا مطلب......؟'' اس نے جان بوجھ کر پوچھا۔
''اب تمہاری وجہ سے میں کالج میں بھی تو چینج ہوگیا ہوں ناں اگر وہ بھی تم جیسی ہوئی تو پاسبل ہے۔'' آزر نے مسکرا کر کہا تو یمنیٰ بھی مسکرانے لگی۔
''یمنیٰ...... یو آر ویری نائس پرسن۔ تم میں بہت زیادہ گٹس ہیں۔'' آزر نے کہا۔
''رئیلی...... مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔'' یمنیٰ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
''مذاق نہیں کررہا...... اٹس ٹرو...... بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' آزر نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔
''اوکے...... اگر تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
''تم میرا گھر دیکھنا چاہو گی؟''
''کہاں ڈیفنس میں؟'' یمنیٰ نے پوچھا۔
''ہاں...... اگر تم چاہو تو؟'' آزر نے کہا۔
''اوکے......'' یمنیٰ نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اپنی رسٹ واچ دیکھ کر کہا۔ ''بائی داوے، تم

مجھے اپنا گھر کیوں دکھانا چاہتے ہو؟" یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

"بس ...... یونہی ...... دل چاہ رہا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اسے راستہ بتانے لگا اور وہ ان راستوں پر گاڑی چلاتے ہوئے ایک بہت عالیشان اور خوب صورت کوٹھی کے سامنے آرکی۔

"کیا یہ تمہارا گھر ہے؟" یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ...... تم نیچے اترو، میں تمہیں لیے چلتا ہوں۔" آزر نے کہا تو یمنیٰ گاڑی سے نکل کر اس کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ ایک موٹا سا، بڑی بڑی مونچھوں والا چوکیدار گیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے جلدی سے آزر کو سلام کیا مگر آزر نے اس کے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"دادا ابا کہاں ہیں؟" آزر نے چوکیدار سے پوچھا۔

"وہ تو گاؤں چلے گئے۔" چوکیدار نے جواب دیا۔

"کب؟"

"پچھلے ہفتے ...... گاؤں میں کوئی بیمار ہوگیا تھا۔ فون آیا تو فوراً چلے گئے۔ شاید واپس آجائیں اور شاید نہ آئیں۔" چوکیدار بہت سی باتیں کرنے کے موڈ میں تھا مگر آزر اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے یمنیٰ کے ہمراہ پورچ کی طرف جانے لگا ......

پورچ کے دونوں اطراف میں انتہائی وسیع، سرسبز و شاداب، خوب صورت لان تھا۔ کوٹھی کی اندرونی اور بیرونی آرائش قابلِ دید تھی۔ ماربل ٹائلز اور انتہائی خوب صورت وڈ ورک سے ہی مکین کی امارت کا پتا چل رہا تھا۔ یمنیٰ کا اپنا گھر بھی بہت خوب صورت تھا اور دو کنال پر محیط پُرآسائش گھر ڈیفنس میں تھا ...... مگر اس کے ڈیڈی پیسے کے زیاں کو ناپسند کرتے تھے ...... پیسہ انسان کی ضرورت کے لیے ایک نعمت ہے مگر بے جا خرچ کرنا اور وہ بھی نمود و نمائش کے لیے کہ جن کے بغیر بھی انسان کا گزارہ ہوسکتا ہو انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایمن کی طبیعت میں بھی زیادہ نمود و نمائش نہیں تھی اور یمنیٰ کو تو ویسے ہی ان چیزوں سے کوئی زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ اس نے اپنے لیے کبھی بے تحاشا چیزیں نہیں خریدی تھیں۔ اسے ان آرائشی چیزوں سے کیسے دلچسپی ہوسکتی تھی مگر وہ آزر کے گھر کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ہر، ہر چیز ...... عام اور معمولی شے سے لے کر بڑی تک سب امپورٹڈ تھیں۔ ڈیکوریشن پیسز، کرٹنز، کارپٹس اور کرسٹل کے vases اور ان میں لگے فلاورز اور بیلیں تک سب امپورٹڈ تھے اور ان سب میں taste اور میچنگ کا زبردست خیال رکھا گیا تھا۔

"ویری بیوٹی فل ہوم ...... کیا تمہاری مما نے اسے ڈیکوریٹ کیا ہے؟" یمنیٰ نے پہلی بار کسی گھر سے اتنا مرعوب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ...... مما کا اتنا taste کہاں ...... یہ تو انٹیریئر والوں کا کمال ہے۔ پاپا نے پانچ کروڑ میں یہ گھر ڈیکوریٹ کروایا ہے۔" آزر نے بتایا۔

"رئیلی ...... ! اٹس امیزنگ یار ...... میرے ڈیڈی تو کبھی ایسے پیسہ ضائع نہیں کریں۔" یمنیٰ نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں ......؟" آزر نے چونک کر پوچھا۔

"he is very contended (قناعت پسند) man" یمنیٰ نے جواب دیا۔

"اور میرے پیرنٹس تو ہر سال گھر کا انٹیریئر چینج کراتے ہیں۔"

"کیوں ......؟" یمنیٰ نے تعجب بھرے لہجے میں پوچھا۔

"اپنے کمپلیکسز چھپانے کے لیے۔" آزر نے صاف گوئی سے اسے بتایا۔

"کیسے کمپلیکسز ......؟" یمنیٰ نے حیرت سے

پوچھا۔
''اپنی اپنی کلاس کو چھپانے کے...... دونوں نے غربت سے امارت کا جو سفر کیا ہے مگر نہ ان کے چہروں سے دھبے مٹ سکے نہ ان کی پرسنالٹی سے ماضی کی پرچھائیاں...... دونوں ابھی تک un groomed لگتے ہیں۔'' آزر نے نہایت بدتمیزی سے کہا تو یمنیٰ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے عجیب سی حیرت تھی۔

''کیا ہوا...... تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟'' آزر نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔

''آزر...... are you sadist؟'' یمنیٰ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''وہاٹ...... sadist'' آزر کے ماتھے پر بل پڑے۔

''ہاں تم ہر کسی کو ناپسند کرتے ہو...... ہر شخص سے خائف ہو۔ اینڈ آئی ایم شیور...... تم دوسروں کو ٹارچر بھی کرتے ہوگے۔'' یمنیٰ نے صاف گوئی سے کہا تو آزر نے بغور اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ اسے غصہ آنے لگا مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنے موڈ پر قابو پا کر زبردستی مسکرا کر اسے دیکھا۔

''لیکن...... تمہارے معاملے میں تو میں sadist نہیں...... آؤ میں تمہیں اپنا کمرا دکھاتا ہوں......'' وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ انتہائی بڑا اور قدرے رومینٹک بیڈ روم تھا۔ جس میں اسٹائلش فرنیچر کے ساتھ کمرے کی ہر چیز ایکسپینسیو اور میچنگ کی تھی۔ تمام دیواروں پر آزر کی بڑی بڑی اسٹائلش تصویریں آویزاں تھیں۔ خوب صورت ویلوٹ کے دبیز پردوں کے نیچے نیٹ کے خوب صورت پرنٹڈ پردے لٹک رہے تھے۔ کمرے میں عجیب طرح کی خاموشی اور گہرا سکوت تھا۔ یمنیٰ نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔

''کیا دیکھ رہی ہو......؟'' آزر نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر مسکرا کر پوچھا۔

''اوں...... کچھ نہیں......'' وہ ایک دم ہڑبڑا کر بولی۔

''تمہیں کیسا لگا میرا روم ......؟'' آزر نے اردگرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اٹس اوکے!'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب...... تمہیں اچھا نہیں لگا......؟'' آزر نے حیرت سے پوچھا۔

''یہاں مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔'' یمنیٰ نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

''کیسا احساس ......؟'' آزر نے چونک کر پوچھا۔

''آئی ڈونٹ نو...... بٹ اٹ از ناٹ...... پلیزنٹ ......'' یمنیٰ نے صاف گوئی سے بتایا۔

اچانک یمنیٰ کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے جلدی سے موبائل کان سے لگایا تو دوسری جانب ایمن تھی۔

''بیٹا! تم کہاں ہو، کافی دیر ہوگئی ہے، تم ابھی تک گھر نہیں آئیں؟'' ایمن نے فکرمندی سے کہا۔

''مما! آئی ایم جسٹ کمنگ ......'' یمنیٰ نے بات کر کے موبائل آف کر کے آزر کی طرف دیکھا۔

''آزر آئی ایم گوئنگ...... مما ویٹ کر رہی ہیں۔'' یمنیٰ جلدی سے مڑنے لگی۔

''سنو......'' آزر نے اسے پیچھے سے آواز دی تو یمنیٰ نے اسے مڑ کر دیکھا۔ وہ محبت پاش نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم میرے اس گھر میں آنا پسند کرو گی؟'' آزر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''تم میرے دل میں تو سما ہی چکی ہو کیا میرے گھر میں بھی؟'' آزر آگے بڑھا اور اس کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر ایک جذب کے عالم میں

کہنے لگا۔
''یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے اپنا آپ چھڑا...... کر مڑنا چاہا۔
''کیا تمہیں یقین نہیں آ رہا...... سنو...... میرے دل کی دھڑکنوں میں اپنا نام۔'' آزر نے اسے زبردستی اپنے سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔ آزر اتنا اچانک اس کے ساتھ سب کچھ کر رہا تھا کہ اسے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
''let me go now'' اس نے اپنے آپ کو اس سے چھڑاتے ہوئے کہا مگر اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔
''او کے جاؤ...... مگر میری محبت کے احساس کے ساتھ جانا۔ آئی لو یو سوچ...... یمنیٰ...... اتنی محبت شاید ہی کوئی تم سے کرتا ہو۔'' آزر نے محبت بھرے لہجے اور مست آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ یمنیٰ نے اسے یک ٹک دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے سیڑھیاں اترتے ہوئے باہر نکل گئی۔ وہ بھی پیچھے پیچھے چلتا باہر تک آیا۔
گاڑی میں بیٹھ کر یمنیٰ نے گہری سانس لی۔ اس کی سانس بری طرح اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ وہ بہت بولڈ اور کونفیڈنٹ تھی مگر محبت کا یہ احساس اسے پہلی بار کسی نے دلایا تھا۔ اس کی لڑکوں سے بھی دوستیاں رہی تھیں مگر ایک حد تک مگر آزر نے کیسے خود بخود لمٹس کراس کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو کسی لڑکے کی ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتی تھی اور اس نے آزر کو کتنی آزادی دے دی کہ اس نے نہ صرف کھل کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا بلکہ اسے اپنے ساتھ بھی لگا لیا اور یمنیٰ نے اسے سب کچھ کرنے دیا...... کیا واقعی وہ بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر کچھ دیر کے لیے رکھے اور اپنے آپ کو نارمل کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے نکل گئی۔ اسے ابھی تک اپنے آپ آزر کے کلون اور پرفیوم کی خوشبو آ رہی تھی۔ کندھوں پر اس کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔
وہ گھر پہنچی تو شام ڈھلنے کو تھی۔ ایمن اور صاحب نے پریشانی سے اسے چونک کر دیکھا۔
''بیٹا! سب ٹھیک تو ہے، تم کچھ بدحواس رہی ہو؟'' جمال صاحب نے اس کے گھبرا چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''آئی ایم فائن ڈیڈی......'' وہ بہ مشکل بو
''ضرور کوئی سگنل توڑا ہوگا......'' ایمن طنزیہ کہا۔
''نہیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں...... میں کمرے میں جا رہی ہوں۔'' وہ جلدی سے وہاں جاتے ہوئے بولی۔
''بیٹا...... کیا ہوا؟ میں ابھی ڈاکٹر کو فون ہوں۔'' جمال صاحب نے فکرمندی سے کہا۔
''نہیں ڈیڈی...... آئی نیڈ ریسٹ...... جلدی سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ دو اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

وہ رات بھر ٹھیک طرح سے نہ سو سکی تھی۔ بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ آزر کی محبت بھری سرگوشی اور لمس کا احساس اس کی روح تک میں اتر چکا تھا۔ احساس دلفریب بھی تھا اور عجیب بھی۔ اسے سکو بھی دے رہا تھا اور مضطرب بھی کر رہا تھا۔ وہ اٹھتی پھر بیٹھتی...... کمرے میں چکر لگاتی...... عجیب بے چینی اس کے رگ و پے میں سما گئی تھی۔ آج کچھ ہوا تھا وہ کوئی خواب تو نہیں تھا۔
''نہیں...... آزر واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے، اس کی آنکھیں جھوٹ نہیں بول سکتیں۔'' آزر کہے ہوئے الفاظ ''آئی لو یو سوچ''...... سرگوشیوں صورت میں بار بار اس کے کانوں میں گونج ر

تھے۔اسے ایک دم آزر سے شدید محبت محسوس ہونے لگی۔اس کے اندر اس کی طلب بڑھنے لگی۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آزر سے بات کرے......وہ بار بار موبائل کی طرف ہاتھ بڑھاتی مگر پھر رک جاتی۔

اچانک اس کا موبائل بجنے لگا تو اس نے چونک کر دیکھا۔آزر کا نام جگمگا رہا تھا۔اس کا دل یوں بے قابو ہو کر دھڑکنے لگا جیسے پہلی بار آزر سے بات کرنے جا رہی ہو...... وہ کبھی اتنی بدحواس اور نروس نہیں ہوئی تھی۔اس نے کانپتے ہاتھوں سے بٹن دبایا اور آہستہ آواز میں ہیلو کہا۔

''کیا کر رہی ہو...... ابھی تک سوئی نہیں؟'' آزر نے سرگوشی میں پوچھا۔

''ن......نہیں......سونے کی کوشش کر رہی ہوں'' اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''مگر نیند نہیں آ رہی تھی' یمنیٰ میری حالت بھی تمہارے جیسی ہو رہی ہے۔نہ جانے کیا ہوتا ہے اس محبت میں......انسان کو کتنا دیوانہ بنا دیتی ہے اور بے چین بھی......سچ مجھے تو کسی پل چین نہیں آ رہا......کیسا سحر ہے تم میں......میرا سب کچھ چھین کر لے گئی ہو، دل بھی' نیند بھی' سکون بھی اور قرار بھی۔'' وہ مدہوش آواز میں بول رہا تھا اور یمنیٰ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اس کی باتیں سن رہی تھی مگر اس کی آنکھیں انجانی خوشی سے چمک رہی تھیں۔اس کے دل کی دھڑکنیں بہت بے ترتیب ہو رہی تھیں مگر آزر کی باتیں اس کے اندر یوں اتر رہی تھیں جیسے برستی پھوار تپتی ریت میں جذب ہوتی ہے اور ہلکی ہلکی ہوا اس منظر کو مزید خوشگوار بناتی ہو۔یمنیٰ مسکرا رہی تھی۔خوش ہو رہی تھی مگر ظاہراً خاموش تھی۔

''تم کچھ بولتی کیوں نہیں...... کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟'' آزر نے پوچھا تو یمنیٰ نے ایک دم گھبرا کر موبائل کی طرف دیکھا۔

''بولو یمنیٰ...... بولو...... پلیز کچھ تو کہو......میری محبت کے جواب میں کچھ تو کہو۔'' آزر نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا تو وہ موبائل سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی ہمت یکجا کرنے لگی۔گویا آزر اسے نظر آ رہا ہو۔

''پلیز...... یمنیٰ میں کچھ سننا چاہتا ہوں۔'' آزر بولا۔

''کیا......؟'' یمنیٰ نے پوچھا۔

''تمہارے دل کی آواز...... کیا اس تک میری آواز پہنچی ہے یا نہیں؟'' آزر نے دلگیر لہجے میں پوچھا۔ یمنیٰ سوچ میں پڑ گئی اور پھر یک دم کچھ کہنے والی تھی کہ آزر بول اٹھا۔

''ٹھیک ہے اگر تم کچھ نہیں کہہ سکتیں تو میں موبائل بند کرنے لگا ہوں۔'' آزر نے مصنوعی خفگی دکھائی۔وہ صرف یمنیٰ کو آزما رہا تھا۔

''نہیں......میں......وہ۔'' یمنیٰ رک رک کر بولی۔

''ہاں......کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟'' وہ نرم لہجے میں بولا۔

''آئی لو یو ٹو۔'' وہ سرگوشیانہ انداز میں بول اٹھی۔

''تھینکس، تھینکس ...... میں یہی سننا چاہتا تھا۔'' آزر جلدی سے خوش ہو کر بولا......اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''میں جیت گیا...... آئی ایم دی ونر......'' انتہائی خوش ہو کر پُرجوش انداز میں کہہ رہا تھا۔یمنیٰ مسکرا رہی تھی۔آزر اس سے خوش دلی سے باتیں کر رہا تھا اور اس کی باتیں سنتے ہوئے یمنیٰ کے چہرے کے تاثرات مسلسل بدل رہے تھے۔گو کہ محبت کا یہ اظہار اچانک نہیں ہوا تھا۔گزشتہ کئی ماہ سے اشاروں، کنایوں میں آزر اپنے دل کا پیغام اس تک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی مستقل نظر انداز کیے جا رہی تھی۔اس کی فرینڈز بھی اسے یہ احساس دلاتی رہتیں کہ آزر اس سے محبت کرنے لگا ہے مگر وہ ان کی باتوں کو بھی ٹال

جاتی...... آزر محبت کا جواب محبت سے نہ پا کر زِچ ہونے لگا تھا اور بالآخر اسے موقع مل گیا کہ جب وہ کوئی مدافعت نہ کر سکی اور اس نے آزر کی محبت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔آزر کے لیے یہ بہت بڑی فتح تھی۔وہ بے حد خوش تھا۔

☆☆☆

جب سے شمیلہ نے ساس سے سنا تھا کہ اپنی حیثیت کے مطابق وہ ردا کو جہیز ضرور دیں گی اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی، اس وقت بھی وہ ماں سے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی جبھی ردا کسی کام سے بھاوج کے کمرے میں آئی مگر یہ باتیں اس کے کان میں پڑیں تو وہ وہیں رک گئیں۔

''میری شادی پر تو خالہ جان نے جہیز لینے سے انکار کر دیا اور اب اپنی بیٹی کی دفعہ اپنے ارمان پورے کرنے کو کہہ رہی ہیں۔کتنی منافق، چالاک اور مکار عورت ہے آپ کی بہن۔'' شمیلہ غصے سے بولی تو ردا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اسے شدید طیش آ گیا۔

''شمیلہ بھابی......آپ میری مما کے بارے میں کیسی باتیں کر رہی ہیں؟'' ردا نے کمرے میں داخل ہو کر غصے سے چلّاتے ہوئے کہا۔

''میں ......وہ......وہ؟'' شمیلہ بری طرح بوکھلا گئی تھی اور اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

''میری مما نے آپ کے ساتھ کیا برا کیا جو آپ یوں ہیں؟'' ردا سسکی بھر کر بولی تو شمیلہ خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی' ردا روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

''بہت برا ہوا۔ خدا جانے اب کیا فساد برپا ہوگا۔'' شمیلہ پریشانی کے عالم میں سر پر ہاتھ مار کر...بڑبڑائی تو ریحانہ کا فون آنے لگا۔

''شمیلہ......تم نے فون کیوں بند کر دیا؟'' وہ پوچھنے لگیں۔

''مما ردا نے میری ساری باتیں سن لی ہیں۔'' شمیلہ نے گھبرا کر کہا۔

''اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا...... میں تمہیں اسی لیے منع کرتی تھی۔'' وہ ایک دم پریشان ہو کر بولیں۔

''اب نصیحتیں کر کے مجھے اور پریشان مت کریں۔'' شمیلہ نے غصے سے کہا اور موبائل آف کر دیا۔

☆☆☆

ردا روتی ہوئی شمیلہ کے کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو سامنے سے فہام آ رہا تھا۔اسے روتے دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گیا۔

''ردا تم......تم رو کیوں رہی ہو...... کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟'' فہام نے پریشان ہو کر پوچھا تو ردا نے

نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور سسکیاں بھرنے لگیں۔
''ارے میری جان، کچھ تو بتاؤ، کیا ہوا ہے...... کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟'' فہام نے پھر پوچھا۔
''نہیں......'' ردا نے نم آنکھوں سے بھائی کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔
'' تو پھر تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں؟'' فہام نے اس کے قریب آکر اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے پوچھا۔ اتنے میں شمیلہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ فہام اور ردا کو باتیں کرتے دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئی۔
''فہام...... ایکچوئیلی اس کی شادی ہو رہی ہے ناں !'' شمیلہ نے جلدی سے ان کے قریب آکر ردا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''اسی وجہ سے یہ کچھ اپ سیٹ ہے۔'' اس نے کہا تو ردا نے چونک کر بھاوج کی طرف دیکھا۔
''ارے ...... میری گڑیا...... یہ دن تو تمہاری زندگی میں آنا ہی تھا۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔'' فہام نے بڑے پیار سے بہن کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو ردا ہکا بکا دونوں کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

وہ دونوں ڈھیر ساری شاپنگ کرکے ابھی لوٹے تھے۔ روحیل نے تھکے ہوئے انداز میں شاپنگ بیگز لاؤنج میں رکھے اور قدرے ہانپتا ہوا وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔
''کیا تم ابھی سے تھکنے لگے ہو......؟ ابھی تو تمہیں بہت زیادہ کام کرنا ہے۔'' ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہاں ماں جی...... میں بہت زیادہ تھک گیا ہوں۔ اب مجھ سے یہ سب کام اور نہیں ہوگا۔'' روحیل نے پریشان ہو کر دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
''لیکن میں حیران ہوں، آپ بالکل نہیں تھکیں۔'' روحیل نے ماں جی کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔
''بیٹا! جب انسان دل کی خوشی سے کوئی کام کرتا ہے تو وہ خوشی ہی اسے تھکنے نہیں دیتی۔'' ماں جی نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''اور آپ کی خوشی کا اندازہ میں آپ کو شاپنگ کرتے دیکھ کر لگا رہا تھا۔''
''بیٹا...... اتنے عرصے بعد ہمیں خوشی مل رہی ہے تو ہم اسے کیوں نہ انجوائے کریں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے ردا کو رونمائی میں کیا دینا ہے، تم نے کچھ تو سوچا ہوگا۔'' ماں جی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''آپ کا ہیرے جیسا بیٹا اسے مل رہا ہے اسے اور کیا چاہیے۔'' روحیل نے آنکھیں گھما کر شرارتی لہجے میں کہا۔
''ہیرا تو وہ خود ہے، بس تم اس کی قدر کرنا اور ہاں میں نے تو اپنی بہو کے لیے گولڈ کی رِنگ خریدی ہے۔'' ماں جی نے اپنے بیگ میں سے ایک ڈبیا نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔
''واؤ...... ایکسیلنٹ...... بہت اچھی ہے۔'' روحیل رِنگ دیکھ کر تعریفی لہجے میں کہنے لگا۔
''نہیں...... یہ تب اچھی لگے گی۔ جب ردا اسے پہنے گی۔'' ماں جی نے مسکرا کر محبت سے کہا۔
''ماں جی...... آپ ردا سے یوں محبت کرنے لگی ہیں۔ جیسے وہ آپ کی سگی بیٹی ہو۔'' روحیل نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر بغور دیکھتے ہوئے کہا اور پھر دونوں مسکرانے لگے۔

☆☆☆

ردا لاؤنج میں بہت اداس اور خاموش بیٹھی تھی۔ خدیجہ اپنے کمرے سے باہر آئیں اور اس کی طرف بغور دیکھ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔
''بیٹا...... کیا بات ہے، جب سے تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی ہے تم اداس لگ رہی ہو؟''

خدیجہ نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔
''کچھ نہیں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی اسی وقت شمیلہ کچن سے نکل کر باہر آئی اور دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی۔
''کہیں ردا خالہ جان کو سب کچھ نہ بتا دے۔'' اس کے دل کو دھڑکا ہوا۔ وہ جلدی سے گھبرا کر ان کی طرف آئی اور ردا کے پاس بیٹھ گئی۔
''خالہ جان! ہم نے ردا کی شاپنگ کب شروع کرنی ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو ردا نے چونک کر اسے دیکھا۔
''بس بیٹا! بہت جلد...... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں...... اب بھی میں اپنی میڈیسنز لینے آئی تھی۔ یہیں رکھ کر کہیں بھول گئی ہوں۔'' خدیجہ نے بتایا تو شمیلہ جلدی سے اٹھ کر میڈیسنز ڈھونڈنے لگی۔
''یہ یہاں پڑی ہیں۔'' اس نے سائڈ ٹیبل سے میڈیسنز اٹھا کر انہیں دیتے ہوئے کہا اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
''ردا آئی ایم سو سوری...... اس دن غلطی سے میرے منہ سے بہت غلط باتیں نکلیں...... پلیز...... تم خالہ جان اور فہام کو کچھ نہ بتانا۔ ورنہ فہام مجھ سے بہت ناراض ہوں گے۔'' شمیلہ، ردا کے پاس بیٹھتے ہوئے اس سے معافی مانگ رہی تھی۔
''آپ مما کے بارے میں ایسا کیوں سوچتی ہیں؟'' اس نے نم آنکھوں سے پوچھا۔
''ردا میری بھی بہت خواہش تھی کہ اچھا جہیز لیتی...... اپنی پسند کی چیزیں لیتی...... لیکن خالہ جان نے مجھے کچھ بھی نہیں لینے دیا اور تمہیں وہ سب کچھ دینا چاہ رہی ہیں۔ اب وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں اگر تم میری جگہ ہوتیں تو تم کیا سوچتیں۔ بس خالہ جان کے اس رویّے سے مجھے غصہ آ گیا۔'' شمیلہ نے جلدی سے آنکھیں آنسوؤں سے بھر کر کہا۔ ردا نے چونک کر دیکھا اور اسے روتا دیکھ کر اس کا دل نرم پڑنے لگا۔
''پلیز...... آپ مت روئیں......'' ردا جلدی سے بولی۔
''جو کچھ ہوا...... پلیز اسے بھول جاؤ اور کسی کو کچھ مت بتانا۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' شمیلہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی کے انداز میں کہا۔
''نہیں...... نہیں پلیز آپ ایسے مت کریں، میں، میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔'' ردا گھبرا کر بولی۔
''تھینک یو...... ویری مچ......'' شمیلہ نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا تو ردا بھی مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔
''لیکن اب میں اپنے سارے ارمان تم پر پورے کروں گی۔ تمہارے لیے اپنی پسند کی چیزیں خریدوں گی۔'' شمیلہ نے اسے چومتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

رشنا لان میں چیئر پر بیٹھی ردا کی شادی کا کارڈ دیکھ کر مسکرائی اور ٹیبل پر سے اپنا موبائل اٹھا کر اس کا نمبر ملانے لگی۔ کافی بیلز کے بعد ردا نے فون اٹھایا۔
''یار...... مجھے ابھی تمہاری شادی کا کارڈ ملا ہے۔ تم تو خوب چونکا رہی ہو، پہلے اچانک منگنی کر لی اور اب شادی بھی......'' رشنا مسکراتے ہوئے بولی۔
''میں کیا کہہ سکتی ہوں...... روحیل کی ماں جی کو ہی جلدی ہے۔'' ردا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''تمہیں اور روحیل کو تو بالکل جلدی نہیں ناں!'' رشنا نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔
''یار...... میں تو پڑھنا چاہتی تھی...... رشنا سچ بتاؤں...... مجھے شادی سے بہت خوف آتا ہے۔'' ردا نے سنجیدگی سے کہا۔
''کیسا خوف؟'' رشنا چونک کر پوچھنے لگی۔
''یار...... ذمّے داریوں سے...... سنا ہے ہسبینڈ کے کام ٹائم پر نہ کیے جائیں تو وہ ناراض ہوتے ہیں۔'' ردا نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں......اور مار پٹائی بھی کرتے ہیں۔" رشنا بھرپور قہقہہ لگا کر بولی۔

"رئیلی......؟ کیا فراز بھائی بھی تم سے ناراض ہوتے تھے۔" ردا ایک دم گھبرا کر بولی۔

"ہاں...... بالکل۔" رشنا مسکراتے ہوئے بولی تو ردا پریشانی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"ارے یار...... ایسا کچھ نہیں ہوتا...... مذاق کررہی ہوں۔ فراز مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہوئے مگر روحیل بھائی کا پتا نہیں۔" رشنا نے کہا۔

"وہ بھی بہت اچھے ہیں۔" ردا شرما کر بولی۔

"اچھا جی......" رشنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم مہندی کی رسم سے ایک دن پہلے ہی میری طرف آجانا۔" ردا نے جلدی سے کہا۔

"یار...... آ تو جاؤں مگر مما آج کل بہت اپ سیٹ ہیں۔ میں مسلسل ان سے رابطے میں رہتی ہوں۔ ان کا دھیان بٹاتی ہوں، ان سے باتیں کرتی ہوں۔" رشنا نے اتنا ہی کہا۔

"کیوں......؟" ردا نے چونک کر پوچھا۔

"توقیر بھائی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا...... وہ اسپتال میں ایڈمٹ رہے اس وجہ سے۔" رشنا نے فکر مندی سے بتایا۔

"ہارٹ اٹیک...... کب......؟" ردا نے یک دم گھبرا کر پوچھا۔

"اس روز تو اچھی خاصی باتیں کررہے تھے۔ بہت ہنس رہے تھے، میں تمہاری منگنی کا بتا رہی تھی۔ بہت خوشگوار موڈ میں باتیں کررہے تھے پھر کئی روز بعد مما کا فون آیا انہوں نے بتایا کہ توقیر بھائی کو ہارٹ اٹیک ہوگیا ہے۔" رشنا...... اپنی ہی لے میں بولے گئی اور ردا پر کپکپی طاری ہونے لگی۔

"رشنا مجھے مما بلا رہی ہیں۔ میں تمہیں بعد میں کال کرتی ہوں۔" ردا ایک دم گھبرا کر بولی تو رشنا نے اچھا کہہ کر فون بند کردیا۔ رشنا سے بات کر کے وہ موبائل آف کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آئی ایم شیور...... توقیر میری وجہ سے بیمار ہوا ہے۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو اس کی ذمے دار میں ہوں گی۔ نہیں، نہیں میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔ یااللہ توقیر کو ٹھیک کردے۔" ردا نے سسکی بھری اور گڑگڑا کر دعا کرنے لگی تبھی دروازے پر دستک ہوئی اور زاہدہ اندر داخل ہوئی۔ ردا نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"ردا بی بی...... آپ رو کیوں رہی ہیں۔" زاہدہ نے چونک کر پوچھا۔ "کیا میکا چھوڑنے کا دل نہیں چاہ رہا۔ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب کچھ چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔" زاہدہ نے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔ "اٹھیں...... باہر آپ کو فہام بھائی بلا رہے ہیں۔" زاہدہ نے اپنی چادر سے نم آنکھوں کو رگڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں......؟" ردا گھبرا کر بولی۔

"خود ہی چل کر پوچھ لیجیے۔" زاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

شمیلہ اور فہام شاپنگ کر کے لوٹے تھے۔ لاؤنج میں ہر طرف شاپنگ بیگز پڑے تھے۔ ردا اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے زاہدہ کے ہمراہ لاؤنج میں آئی۔

"آؤ میری گڑیا...... دیکھو تمہارے لیے کیا کچھ لایا ہوں۔" فہام نے مسکراتے ہوئے ردا کی طرف دیکھ کر کہا تو ردا نے نم آنکھوں سے فہام کی طرف دیکھا اور یک دم پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے فہام کے گلے لگ گئی۔

"فہام بھائی مجھے شادی نہیں کرنی۔" وہ رو رہی تھی۔ سب ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

(باقی آئندہ)

اس نے سر اٹھا کر صاف شفاف نیلے آسمان کی طرف دیکھا جہاں پرندے اپنے پروں کو پھیلائے گروہ در گروہ اُڑے جا رہے تھے۔ بجلی کے تاروں پر لائن سے کوّے بیٹھے کائیں کائیں کا شور مچا رہے تھے اور جو کوئی ایک بھولا بھٹکا کبوتر وہاں آ بیٹھتا تھا اسے ٹھونگے مار کر بھگا دیتے تھے۔

"ہائے اللہ میاں...... کاش میں بھی کبھی ایسے ہی اُڑتی ہوئی کسی دور دیس جا پہنچتی۔" زمین نے

نوٹ بک

نشاط خان



کتاب بند کر کے سینے سے لگاتے ہوئے کہا اور اپنی پشت گیلری کی دیوار سے ٹکا کر نظریں اُڑتے پرندوں پر گاڑ دیں۔

"اچھا ان چیلوں اور کوّوں کی طرح؟" ندا نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری نظر محدود ہے ندا بیگم اور میری نظریں دور آسمانوں پر ہیں۔ وہ دیکھو وہ ہوائی جہاز کتنا پیارا اور خوب صورت دکھائی دے رہا ہے۔" اس نے ڈوبتے سورج کی روشنی میں دور سے آسمان پر سبک رفتاری سے اڑتے جہاز کی طرف اشارہ کیا۔ جو اپنے پیچھے دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا جا رہا تھا۔

"تو کیا محترمہ کا ارادہ پائلٹ بننے کا ہے؟ میرا خیال ہے خالہ، خالو تمہیں اس کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ تم نے بی اے کر لیا۔ اب تو بیاہ ہوگا۔" ندا نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا بیاہ کر لیں گے......" زمین کی نظریں اب بھی آسمان پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"تو پھر تمہارے پرندوں کی طرح اُڑنے والے خوابوں کا کیا ہوگا۔ یہاں تو بیاہ ہوا اور گئے سارے خواب چولھے میں۔" ندا کا انداز دل دہلا دینے والا تھا مگر زمین پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنی خوب صورت آنکھیں پوری طرح کھول کر ندا کو دیکھا اور اپنی پلکوں کو شرمانے کے انداز میں جھکاتے ہوئے انگلی کو دانتوں تلے دبا کر شرمانے کی ایکٹنگ کی۔

"ہم ایسے بندے سے شادی کریں گے جو خود جہاز اڑاتا ہو، وہ جس ملک میں بھی جائے ہمیں ساتھ لے کر جائے۔ اللہ کتنا مزہ آئے گا پھر ہم اپنے خوابوں کو پورا کریں، رائٹر بن جائیں گے۔"

"رائٹر کیسے بنوگی؟" ندا نے چڑاتے ہوئے کہا۔ مگر وہ تو اپنے خوابوں میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ اثر ہو کر ہی نہ دیا۔

"جب وہ ہمیں لے کر ملکوں ملکوں جائیں گے تو ہم وہاں کی سیر کا سارا حال قرطاس پر منتقل کر لیں گے پھر ہم کتاب چھپوالیں گے اور رائٹر بن جائیں گے...... ہائے اللہ کتنا رومینٹک لگتا ہے ناں رائٹر بننا...... جب لوگ ہمیں پہچان کر آٹوگراف لینے آئیں گے تو......" اس نے آٹوگراف دینے کے انداز میں کہا۔

"توبہ کرو...... رائٹر صاحبہ...... یہاں لوگ رائٹر وغیرہ سے آٹوگراف نہیں لیتے البتہ فلمی ہیروئنوں سے آٹوگراف کے لیے مرے جاتے ہیں، رائٹر کو تو کوئی پہچانتا بھی نہیں ہے اور بزنس مین طاہر عزیز صاحب کی اکلوتی صاحبزادی زمین عزیز صاحبہ ذرا اپنے اردگرد نظر ڈالیں، آپ کی اگلی پچھلی نسلوں میں کسی لڑکے، لڑکی نے میٹرک سے زیادہ تعلیم حاصل کی ہے؟ سوائے روپے گننے اور حساب کتاب لکھنے کے انہیں کچھ لکھنا آتا ہے؟ وہ تو دعا دو صفی خالہ کو جو ننھیال کی طرف سے کچھ شعور... عطا ہو گیا ورنہ خالو تو تمہیں میٹرک بھی نہ کرنے دیتے۔ اب کل ہی وہ اماں سے کہہ رہے تھے۔ "ذکیہ! ہماری زمین کے لیے بھی کوئی اچھا لڑکا تلاش کرو۔ تمہاری بہن کو تو کوئی فکر نہیں ہے۔ بیٹی کو ایم اے ویم اے کروانے کے چکر میں لگی ہوئی ہے۔ نہ جانے کیا خنّاس ٹھونستی رہتی ہے اس کے سر میں لڑکی کے ہاتھ سے کتاب ہی نہیں چھوٹتی۔ ہمارے خاندان میں تو کسی کو رکشے کے پیچھے لکھا ہوا شعر سمجھ نہیں آتا وہ اتنی اتنی موٹی موٹی شاعری کی کتابیں خرید کر لاتی ہے۔" ندا نے خالو کے انداز میں کہا تو زمین کی ہنسی نکل گئی اور اس کی دودھ سے گندھی ہوئی رنگت جیسے گال گلابی ہو گئے۔

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ میرے بھولے بھالے ابا کا مذاق اڑاتے ہوئے۔"

"اور تمہارے بھولے بھالے ابا تمہارے لیے اپنے جیسا بھولا بھالا روپے گننے والا داماد ہی پسند کریں گے کیونکہ آس پاس ملنے جلنے والوں یا خاندان

میں پائلٹ تو کیا پڑھا لکھا لڑکا بھی ملنا مشکل ہے۔ پھر کسی پائلٹ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ تمہارے جیسی بے وقوف سی لڑکی کو پسند کرے۔ اس کے اردگرد تو ویسے بھی حسینوں کا میلا لگا رہتا ہوگا۔"

"تم میرے خوابوں کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو۔ ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے سارے آئیڈیلزم کا، تمہارا کیا جاتا ہے جو میں خوابوں، خیالوں میں ہی رائٹر بن جاؤں تو......؟" زمین نے منہ بناتے ہوئے اپنی خالہ زاد بہن ندا کو دیکھا۔

"اس لیے زمین بی بی کہ میں چاہتی ہوں تم ان خیالوں، خوابوں کی دنیا سے نکل آؤ اور حقیقت پسند بن جاؤ اور رہی بات رائٹر بننے کی تو محترمہ رائٹر، ادیب، شاعر بنتا نہیں ہے...... پیدا ہوتا ہے، اللہ پاک نے اسے لکھنے کی پیدائشی صلاحیت عطا کی ہوتی ہے۔ صرف زمانہ، اردگرد کا ماحول اور اس کے آس پاس رہنے والے اس کے فن کو جِلا بخشتے ہیں۔" ندا نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

زمین اور ندا دونوں خالہ زاد بہنیں تھیں۔ بچپن سے دونوں کی بہت گہری دوستی تھی۔ دونوں نے ایک ہی اسکول میں پڑھا تھا۔ ندا کی وجہ سے زمین کو پڑھائی کی اجازت ملی تھی، ورنہ طاہر عزیز کے یہاں لڑکیاں تو کیا لڑکوں کی پڑھائی کا رواج تک نہیں تھا۔ ان کے خاندان میں زمین پہلی لڑکی تھی جس نے بی اے کیا تھا اور اب اس کے لیے رشتہ ملنا مشکل ہو رہا تھا۔ جو بھی رشتہ آتا لڑکا واجبی سا پڑھا لکھا ہوتا اور وہ ریجیکٹ ہو جاتا۔

زمین کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے کتابوں کی ایک پوری الماری بنا رکھی تھی۔ کسی بھی نئی کتاب کے متعلق اسے معلوم ہوتا وہ فوری طور پر خرید کر لے آتی۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے اسے رائٹر بننے کا جنون سوار ہو گیا۔

پہلے شاعری کرنے کی کوشش کی، وہ کوشش رائگاں گئی۔ ایک بھی شعر موزوں نہیں کر پائی۔ پھر افسانے پر طبع آزمائی کی تو وہ بھی بے سود رہی۔ زمین کو موسم سرما سے لطف اندوز ہونے کا شوق چرایا تو بس اپنی اماں، خالہ اور ندا کے ساتھ مری میں چھٹیاں گزارنے کا پروگرام بنا ڈالا مگر ابا نے جانے سے معذرت کر لی۔ زمین نے تو ضد پکڑ لی۔

"ابا نہ تو آپ کبھی اماں کو گھمانے پھرانے لے گئے نہ خود آپ کہیں جاتے ہیں اب تو چلنا ہی پڑے گا اتنا سارا روپیہ پیسہ بیکار ہے جب انسان اسے اپنے اوپر خرچ نہ کرے۔ صبح بزنس رات بزنس، ابا آپ پیسہ کمانے کی مشین بنتے جا رہے ہیں۔"

"ارے میرا بچہ اگر میں پیسہ کمانے کی مشین نہیں بنوں گا تو یہ تیرا اتنے ٹھاٹ باٹ سے رہنا...... کوٹھی، گاڑی، نوکر چاکر اور تیرا گھومنا پھرنا کہاں سے ہوگا۔ تیری اماں شکر گزار عورت ہے، وہ میرے ساتھ ایسے ہی خوش ہے۔" وہ اپنی منطق جھاڑتے۔

"لیکن ابا پانی کتنا بھی شفاف ہو ایک جگہ پڑے پڑے گدلا ہو جاتا ہے۔ اماں کو دیکھا ہے گھر میں پڑے پڑے بیماریوں کی پوٹ بنتی جا رہی ہیں۔ کبھی بلڈ پریشر کبھی شوگر، کبھی سر درد تو کبھی کچھ، آپ کو وقت ہی نہیں ملتا۔ کبھی تو انہیں تازہ ہوا کھلا کر لے آئیں، آپ انہیں کلفٹن تک نہیں لے کر جاتے۔"

"میرا بچہ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ آج کل میں چین سے ایک کنسائنمنٹ آنے والی ہے۔ اسے پورٹ پر اتروانا ہے، کسٹم کی کلیرنس کروانی، گودام میں مال رکھوانا ہے پھر سپلائی کا مسئلہ ہے۔ بیوپاریوں سے معاملات طے کرنے ہیں۔ دو تین مہینے تو میں بالکل فارغ نہیں ہوں۔ بڑے فائدے کا سودا ہے۔ ہاں فروری کے بعد دس پندرہ دن ملیں گے تو پھر تمہیں اور تمہاری اماں کو گھمانے مری لے جاؤں گا۔" انہوں نے تو پورے تین مہینے کا پروگرام بتا دیا تھا۔ زمین کی تو جان ہی جل گئی۔

''اور ہمارا ارادہ تو برف باری دیکھنے کا تھا۔ ابا میں نے کبھی برف باری نہیں دیکھی بہت دل چاہ رہا ہے مری جانے کا۔''

''تو کیا ہوا، اپنی اماں کو لے کر چلی جاؤ، بولو کتنا روپیہ چاہیے؟'' انہوں نے جھٹ سیف سے روپوں کی گڈی نکال کر میز پر اس کے سامنے رکھی۔ نرمین اداس ہوگئی۔ ابا کے پیسے دینے کا مطلب وہ سمجھتی تھی۔

''ابا میں اور اماں اکیلے کیسے جاسکتے ہیں۔ کوئی مرد ساتھ ہونا چاہیے۔'' اسے معلوم تھا۔ ابا اپنی ڈیل چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ اس لیے ہتھیار ڈال دیے اور منہ بناتے ہوئے اٹھنے لگی۔

''ارے بچہ...... اداس کیوں ہوتی ہے، ایسا کرو اپنے خالہ خالو اور ندا کو بھی ساتھ لے لو اور وہ تمہارا خالو کون سا بزنس سنبھال رہا ہے، ایک بیکار سی نوکری کر رہا ہے۔ دس پندرہ دن کی چھٹی لینا کون سا مشکل کام ہے۔'' انہوں نے بیٹی کی مسلسل ضد کا فوری حل بتایا۔

نرمین اسی پر خوش ہوگئی۔ اسے معلوم تھا ابا نہیں مانیں گے مگر خالو تو ضرور مان جائیں گے اور یہی ہوا ذرا سی حیل حُجّت کے بعد خالو مان گئے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ دونوں جو تھوڑا بہت گھومے پھرے تھے وہ خالہ، خالو کی وجہ سے تھے۔ ابا ان پر بہت اعتبار کرتے تھے۔

☆☆☆

مری جانے کی ضد تو وہ ہر سال کرتی تھی مگر ابا نے کبھی جانے نہیں دیا تھا مگر اس بار تو انہوں نے اجازت دے دی تھی۔ نرمین اور ندا بہت خوش تھیں۔ برف باری کے حساب سے خوب گرم کپڑوں کی شاپنگ کی۔ اماں اور خالہ کے لیے بھی گرم سوئٹر کوٹ، دستانے ٹوپیاں خریدی گئیں مگر وہ لوگ جیسے ہی پنڈی پہنچے تو دونوں خواتین نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔

''ارے ہٹاؤ بھئی، لڑکیوں مری کا پروگرام رہنے دو۔ ہماری تو یہاں ہی قلفی جمی جا رہی ہے۔ نہ جانے وہاں جا کر کیا حشر ہوگا۔'' مگر نرمین اور ندا کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہی کوٹ، دستانے، ٹوپیاں جن کا کراچی میں بیٹھ کر مذاق اُڑایا جاتا رہا تھا۔ اب وہی کپڑے نعمت لگ رہے تھے۔

''بھئی ذکیہ آج کل کے بچے ہیں عقل مند، کیسی تیاری کر لی جبکہ لڑکیوں نے کبھی مری کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اپنے کراچی میں تو بہت سردی لگی ایک موٹی چادر اوڑھ لی۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ سردی کیا ہوتی ہے۔'' نرمین کی اماں تو بہن سے لڑکیوں کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھیں۔ جوں جوں سردی بڑھتی جا رہی تھی، تعریفوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ نرمین نے پنڈی پہنچتے ہی ابا کو یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ بھی ساتھ آجاتے اور ہماری پیاری سی اماں کا جو حال سردی سے ہو رہا ہے وہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور ہمارے ساتھ انجوائے بھی کرتے...... کیوں ندا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟'' اس نے ٹھنڈ سے کپکپاتی اپنی اماں کی طرف اشارہ کیا۔

''تو کیا ہوا، تم کون سا بھول جاؤ گی، لمحے لمحے کا حال تو ابا کو سناؤ گی۔ اپنی اماں کا حال بھی سنا دینا۔'' اماں نے گرم گرم کافی کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کا چوتھا کپ ہے، کراچی میں تو ایک کپ کافی پی کر کہتی تھیں کہ ساری رات نیند نہیں آئی۔'' نرمین اماں کو کافی پہ کافی پیتے دیکھ کر بولی۔

''اے لڑکی، ماں کے کھانے پینے پر نظر رکھ رہی ہے۔'' ذکیہ خالہ کیسے اپنی بہن کی حمایت نہ کرتیں۔

رات مری میں خوب برف باری ہوئی تھی۔ اب آسمان صاف ہوگیا تھا۔ برف باری سے لطف اندوز ہونے والے ٹولیوں کی شکل میں خوب

انجوائے کرتے پھر رہے تھے مگر یہاں یہ حال تھا کہ تینوں بڑے گرم کمرے اور کمبلوں سے نکلنے پر تیار نہ تھے۔ خالو تو اپنے کمرے میں جا کر ایسا سوئے کہ اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''ہاں بیٹا! جب ابا کو مری کی سیر کا حال سنانا تو میرے چار کپ کافی کے بھول مت جانا۔'' اماں نے ڈرائی فروٹ کی ٹوکری اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

دونوں خواتین تو ڈرائی فروٹ اور کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور دونوں بچیوں کا دل باہر جانے کو تڑپ رہا تھا۔

''ہم بے چاریاں کیا مری کی سیر کا حال سنائیں گی۔ یہی کہ اماں اور خالہ ڈرائی فروٹ کھاتی رہیں اور کافی پیتی رہیں اور خالو جا کر سو گئے اور دونوں لڑکیاں انہیں کھاتا پیتا دیکھتی رہیں۔'' ندا نے اداس ہونے کی ایکٹنگ کی۔

''ارے تو تم کو کس نے روکا ہے کہ ہمیں بیٹھ کر تکتی رہو۔ جاؤ جا کر خوب گھومو پھرو...... مزے اڑاؤ...... لیکن دیکھو زیادہ دور مت جانا۔ نئی جگہ ہے کسی اجنبی سے بات مت کرنا اور جلدی واپس آجانا۔ کہیں اپنے ابا سے یہ مت کہنے بیٹھ جانا۔ اماں اور خالہ لے کر تو گھمانے پھرانے گئی تھیں اور صرف چلغوزے، مونگ پھلیاں کھلا کر لے آئیں۔'' ذکیہ خالہ نے چلتے چلتے نصیحتوں کی پوٹلیاں بھی ساتھ کر دی تھیں۔

''نہیں خالہ، ہم ابا کو خوب خوب گھومنے پھرنے کا حال سنائیں گے بلکہ میں تو ایسا کروں گی کہ سب ڈائری میں لکھ لوں گی تاکہ کوئی بات بھول نہ جاؤں...... نہیں تو ابا کہیں گے سودے میں منافع نہیں ہوا۔ انہیں...... تو آم کے آم گٹھلیوں کے دام والا سودا پسند ہے۔''

''دیکھا ذکیہ، یہ فائدہ ہوتا ہے اولاد کو پڑھانے لکھانے کا۔ اپنے ابا کی عادت کو کتنی اچھی طرح سمجھتی ہے بچی۔''

''ماشاء اللہ......'' خالہ نے تائید میں سر ہلایا اور دونوں خواتین ڈرائی فروٹ کی ٹوکری کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ اب یہاں گھر داری، کھانا پکانے کی فکر تو کرنی نہیں تھی۔ جب گھنٹی بجاؤ بیرا حاضر۔

☆☆☆

ندا اور نرمین بہت دیر تک اِدھر اُدھر گھوم پھر کر لوگوں کو برف میں کھیلتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ ابھی وہ اس موسم کی عادی نہیں ہوئی تھیں مگر کیونکہ خوب گرم کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ اس لیے سردی زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جب عادی ہوگئیں تو اسی سردی میں مزہ آنے لگا۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔

''مجھے نوٹ بک خریدنی ہے۔ چلو مال کی طرف چلتے ہیں۔'' نرمین نے ندا کو تجویز دی۔

''چلو چلتے ہیں مزہ آئے گا۔''

دونوں مال پر اِدھر اُدھر گھومتی رہیں، ایک بھی کتابوں کی دکان نہیں ملی۔ آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے لوئر مال کی طرف ایک دکان نظر آئی۔ جس میں ایک بوڑھا سا سیلز مین کچھ چیزیں نکال، نکال کر کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا۔

''جی...... ہمیں ایک نوٹ بک چاہیے۔'' نرمین نے دکان میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ کتابوں کی دکان میں کتابوں سے زیادہ گفٹ رکھے ہوئے تھے۔

''جی، نوٹ بکس تو ختم ہوگئی ہیں۔'' سیلز مین نے سرسری انداز میں جواب دیا اور دکان میں پہلے سے موجود دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جس کا مطلوبہ سامان نکال نکال کر وہ کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا۔

''جب آپ کے پاس نوٹ بکس نہیں ہیں تو دکان کے باہر بک شاپ کا بورڈ کیوں لگا رکھا ہے؟'' نرمین نے جھنجلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

وہ گاہک ایک طرف بورڈ میں لگے ہوئے کارڈز

دیکھنے کے لیے مڑ گیا تو دکان دار ان کے پاس آ گیا۔
"بی بی پہلے یہ ہمارا کتابوں کا دکان تھا پھر اِدھر کوئی لوگ کتابیں، کاپیاں نہیں خریدتے تو ہم نے یہ گفٹ بھی رکھنا شروع کر دیا۔ ابھی ہمارے پاس صرف اپنے حساب کتاب لکھنے کا رجسٹر اور نوٹ بکس ہوتا ہے۔ ایک بک بچا تھا وہ ان صاحب کو دے دیا ہے۔ آپ کو اگر بہت ضرورت ہے تو ہم آپ کی طرف سے بول دیتا ہے کہ یہ نوٹ بک بی بی صاحب لوگوں کو دے دو، مہربانی ہوگا۔" وہ بورڈ کے پاس کھڑے شخص کے پاس چلا گیا اور جھک کر آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔

اس شخص نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر اس سیلز مین سے کچھ کہا اور دوبارہ کارڈ تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔

"عجیب بدتمیز آدمی ہے، اتنی بھی بڑی چیز نہیں تھی کہ جس کے لیے منع کر دیا ہے۔ سیلز مین کی شکل سے لگ رہا ہے کہ اس نے نوٹ بک دینے سے انکار کر دیا ہے۔" دونوں نے اس کے واپس آنے سے پہلے قیاس آرائی کر لی تھی۔

"بی بی صاحب! صاحب کہہ رہے ہیں وہ نوٹ بک خرید چکے ہیں۔ اب اگر بی بی صاحب لوگ کو واقعی بہت ضرورت ہے تو وہ مجھ سے آ کر خرید سکتی ہیں لیکن اس کے لیے وہ وجہ بتانی پڑے گی، اگر ان کی ضرورت میری ضرورت سے بڑی ہوئی تو میں یہ نوٹ بک ان کے ہاتھ بیچ دوں گا ورنہ نہیں۔"

نرمین اور ندا دونوں نے ایک ساتھ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے نیازی سے پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔

"چلو ندا، ہمیں نہیں چاہیے نوٹ بک...... رکھے اپنے پاس۔" اس نے ٹوپی اپنے سر پر اچھی طرح جماتے ہوئے کہا۔ ندا نے بھی اس کی تائید کی اور باہر جانے والے شیشے کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن ان کے دروازہ کھولنے سے پہلے ہی کسی نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ لوگ تو ناراض ہو گئیں، میں نے تو ایسے ہی مذاق کیا تھا۔ ایک نوٹ بک کے لیے سفارش کروانے کی کیا ضرورت تھی ' یہ لیجیے۔" اس نے کاؤنٹر سے بک اٹھا کر سامنے کر دی۔

نرمین اپنا بیگ کھولنے لگی تاکہ نوٹ بک کے لیے رقم نکال سکے البتہ ندا نے شکریہ کہہ کر نوٹ بک پکڑ لی تھی۔

"رہنے دیجیے پلیز ...... یہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔" وہ پلٹ کر واپس جاتے ہوئے بولا۔ انداز میں وہی بے نیازی تھی۔ عام لڑکوں کی طرح لڑکیوں سے بات بڑھانے والا انداز نہیں تھا۔ اسے کارڈ پسند کرنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

"جی اگر آپ کو قیمت نہیں لینی ہے تو نہ لیں، میں کاؤنٹر پر رقم ادا کر دیتی ہوں۔ آپ اپنے سامان کی رقم سے یہ رقم نکلوا دیجیے گا۔" نرمین نے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ پکڑا اور اس کے پیچھے پیچھے لپکی۔

"جب میں نے تم سے کہہ دیا کہ یہ اتنی بڑی رقم نہیں ہے تو تم ضد کیوں کر رہی ہو؟" وہ درشتگی سے بولا۔ اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ نرمین جیسے ایک جگہ جم کر رہ گئی۔ وہ چہرے پر گہری سنجیدگی لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمبے اونچے قد کا نہایت ہینڈسم شخص تھا جس کے چہرے پر گہری سیاہ آنکھیں نہایت سنجیدگی کا تاثر دے رہی تھیں۔

"وہ اصل میں ابا نے کہا تھا کہ کبھی کسی اجنبی سے کوئی چیز مت لینا۔" وہ حواس باختہ ہو کر بولی۔

"ابا نے تو یہ بھی کہا ہوگا کہ کسی اجنبی سے راستے میں بات بھی مت کرنا...... اور وہ تم کر رہی ہو اور ابا نے تو یہ بھی کہا ہوگا کہ ہوٹل کے آس پاس ہی رہنا اور تم دونوں راستہ پوچھتی پوچھتی لوئر مال تک آ گئی ہو۔ اب واپس ہوٹل کیسے جاؤ گی۔ ہوٹل کا نام ٹیلی فون نمبر کچھ ہے تمہارے پاس؟" وہ بول رہا تھا اور نرمین نہیں، نہیں میں گردن ہلا رہی تھی۔ یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ندا شیشے کے دروازے سے ناک لگائے باہر دیکھ رہی تھی۔ سورج پھر بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا۔ باہر مٹیالا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ برف باری دوبارہ شروع ہو چکی تھی دُھنکی روئی جیسی برف آہستہ آہستہ آسمان سے زمین تک آ رہی تھی۔ ندا رو دینے والے انداز میں بولی۔

"ہائے اللہ اب ہم واپس کیسے جائیں گے باہر تو اندھیرا ہو رہا ہے۔" اندر تو پہلے سے لائٹ جل رہی تھی باہر بھی اسٹریٹ لائٹس جلنا شروع ہو گئی تھیں۔

نرمین بھی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"ندا! اماں اور خالہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔ کیا تمہارے پاس ہوٹل کا نام اور نمبر ہے؟"

"نہیں نرمین، میرے پاس تو نہیں ہے۔ اب کیا ہوگا؟" ندا نے ضبط کرنے کی کوشش کی۔

وہ اجنبی اب سیلز مین سے اپنا سامان پیک کروا رہا تھا۔ اس نے رقم ادا کی اور دروازے تک آ گیا اور وہیں کھڑے باہر دیکھنے لگا۔ جیسے باہر کے موسم کا اندازہ لگا رہا ہو کہ باہر نکلا جائے یا نہیں۔

"نرمین...... اب یہ بھی چلا گیا تو دکان میں ہم دونوں اور یہ دکان دار رہ جائے گا پھر کیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے یہ برف باری اب رکنے والی نہیں ہے، رات تک دو تین فٹ برف اور گر جائے گی۔" سیلز مین آدابِ میزبانی ادا کرنے کی خاطر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے شاید اچھی خاصی قیمت کا سامان خریدا تھا۔

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے، اس لیے برف باری رکنے کا انتظار فضول وقت کا زیاں ہوگا۔" اجنبی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"میرا خیال ہے صاحب آپ سامان اِدھر ہی چھوڑ دیں۔ اس میں خراب ہونے والی کوئی چیز تو ہے نہیں پھر بھی برف میں سامان اٹھا کر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ کل صبح سامان آ کر لے جانا یا میں ہوٹل پہنچا دوں گا۔ میرا خیال ہے میں بھی اب دکان بند کر کے گھر چلا جاتا ہوں۔ اتنی برف باری میں کون گاہک آئے گا۔" دونوں کی پرانی جان پہچان لگتی تھی جو یوں بے تکلفی سے بات چیت کر رہے تھے۔

"نرمین یہ دکان بھی بند کر رہا ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

دکان دار نے سامان اس کے ہاتھ سے لے کر اندر رکھا اور وہیں کھڑے ہو کر کاؤنٹر کے پیچھے رقم گن گن کر ایک چھوٹے سے تھیلے میں ڈالنے لگا پھر اس نے اپنا اوورکوٹ کھونٹی سے اتارا اور کوٹ پہن کر ہاتھوں میں دستانے پہنے اونی ٹوپی سر پر اچھی طرح جمانے کے بعد رقم کی تھیلی جیب میں رکھی اور کیل پر ٹنگی چابیوں کا گچھا اتارا اور دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ باہر برف کی دبیز چادر بچھی جا رہی تھی۔

لوئر مال کی نیچے تک جاتی ہوئی سڑک کا سیاہی مائل حصہ آہستہ آہستہ سفید ہونا شروع ہو چکا تھا۔ سیاہ دھبے اب چھوٹے چھوٹے ہو کر غائب ہونا شروع ہو چکے تھے۔ اپر مال کا جو حصہ یہاں سے نظر آ رہا تھا وہاں بھی کنارے کنارے برف کی ڈھیریاں لگ رہی تھیں اور آہستہ آہستہ لوہے کی ریلنگ تک پہنچ رہی تھیں۔ آنے جانے والی تیزی سے گزرتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ گھوڑے اور خچر اپنے مالکوں کے ساتھ ساتھ اپر مال سے گزر کر اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے تو ان کے سُموں سے اڑنے والی برف دھنکی ہوئی روئی کی طرح اُڑ رہی تھی۔

"شاید اوپر برف زیادہ پڑی ہے۔ میرا خیال ہے میں اب نکلتا ہوں۔" اس نے دکان دار سے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور نرمین اور ندا سر سے پیر تک کانپ گئیں۔ ان کے ساتھ دکان دار بھی باہر دیکھنے لگا۔

اجنبی ابھی تک باہر شیڈ کے نیچے دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”آؤ ہم بھی چلتے ہیں۔“ نرمین نے ندا کا ہاتھ پکڑا۔

لائٹ بند کرنے سے پہلے دکان دار کچھ چیک کر رہا تھا۔ اجنبی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دیتے ہوئے انہیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ ہمت کر کے باہر آ گئیں۔

”کیا اندر ہی سونے کا ارادہ تھا۔ اپنے گھر والوں کی فکر نہیں ہے۔ وہ کتنے پریشان ہوں گے۔ بہت شوق تھا اکیلے گھومنے کا...... پورا ہو گیا؟“ آواز بڑبڑاہٹ سے تھوڑی اونچی تھی مگر سناٹے کی وجہ سے صاف سنائی دے رہی تھی۔ عجیب بے نیازی اس کے انداز میں تھی۔

”اگر یہاں ہی کھڑے رہنا تھا تو باہر کیوں بلایا۔ اندر کم از کم سرد ہواؤں سے تو محفوظ تھے۔ اب اِدھر کھڑا کون سی شاہی سواری کا انتظار کر رہا ہے۔ آؤ ہم چلتے ہیں جس طرح پوچھتے پوچھتے آئے تھے۔ ایسے ہی واپس چلے جائیں گے۔“ نرمین نے ندا کے کان میں سرگوشی کی۔

”کیا پاگل ہوئی ہو، وہ وقت اور تھا اب اندھیرا ہو رہا ہے، نہ جانے کیا وقت ہوا ہے۔ ہم کو اجنبی سے مدد کی درخواست کرنی پڑے گی۔“ ندا نے آہستہ سے جواب دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اس مغرور شخص سے درخواست کرنے کی۔ ذرا بھی ہمدردی کا جذبہ نہیں ہے دو اکیلی لڑکیوں کو کم از کم راستہ تو بتا سکتا تھا۔“ نرمین نے پیٹھ موڑے شخص کی طرف دیکھ کر کہا جو شیڈ سے باہر نکلنے کو بالکل تیار تھا کیونکہ اس نے گرم ٹوپی پر اوور کوٹ کے ساتھ لگا ہڈ بھی سر پر ڈال لیا تھا۔

”سات بج چکے ہیں اگر اکیلے جانے کا شوق ہے تو پورا کر لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔

”نرمین اس نے سب کچھ سن لیا ہے تمہیں بہت شوق ہے بولنے کا۔“ ندا نے ٹہوکا دیا اور آگے بڑھ کر اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ندا کے مقابلے میں تھوڑی باہمت تھی۔

”جی، وہ نرمین کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ......“

”رہنے دیں، ان کا جو بھی مطلب تھا مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر ندا کو مزید بولنے سے روک دیا۔

”اگر آپ کا دل چاہے تو میرے ساتھ آ جائیں۔“ اس نے شیڈ سے باہر قدم بڑھا دیے، برف اس کے قدموں تلے آ کر چرچرانے لگی وہ تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا۔

ندا اور نرمین پہلے تو تھوڑا ہچکچائیں پھر اس کے پیچھے چل دیں مگر وہ اتنی تیز چل رہا تھا کہ دونوں کو اس کا ساتھ دینے کے لیے بھاگنا پڑ رہا تھا۔

”ندا ان سے کہو آہستہ چلیں، میری سانس پھول رہی ہے۔“ نرمین کی سانس پھولنے لگی۔

”چپ کر کے چلتی رہو۔“ ندا نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ مال روڈ پر سے ہو کر ایک طرف مڑ گئے۔ برف باری اب بھی ہو رہی تھی۔ ان کے ڈھکے سر اور کپڑوں پر بھی برف گر رہی تھی۔ سامنے ہی انہیں اپنے ہوٹل کی عمارت نظر آ گئی۔ ندا نے ہوٹل کی عمارت کو دور سے پہچان لیا تھا۔

”سنیں...... ہمیں اسی ہوٹل میں جانا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ بے نیازی سے کہتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا ہوا دروازے تک پہنچ کر رک گیا پھر اس نے گلاس ڈور کھول کر دونوں کو اندر آنے کا راستہ دیا اور ندا سے نصیحت آمیز الفاظ میں کہنے لگا۔

”آئندہ اگر باہر نکلنا ہو تو سب سے پہلے موسم

کے متعلق ضرور معلومات حاصل کرنا اور سنو کسی بڑے کو بھی ساتھ لے لینا۔“

”جی...... جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ایسا ہی کریں گے۔“ ندا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ نرمین البتہ سامنے ریسپشن پر رکھے صوفے پر ڈھیر ہو چکی تھی۔

اس نے اپنی ٹوپی اتارتے ہوئے ایک نظر نرمین پر ڈالی اور پھر سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔ نرمین نے بھی اسے دیکھا تھا وہ کوئی بہت عمر کا نہیں تھا مگر چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے خود کو بہت بردبار ظاہر کر رہا تھا۔

”چلو اوپر چلتے ہیں۔ نہ جانے اماں اور خالہ کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ ندا نے نرمین سے اٹھنے کے لیے کہا اور مرے مرے قدموں سے دونوں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے تک آ گئیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ اماں اور خالہ پریشان ہو رہی ہوں گی مگر وہ تو مزے سے ایک اور خاتون کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

لڑکیاں اندر داخل ہوئیں تو اماں نے انہیں اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا۔

”آؤ بیٹا آؤ...... آنٹی کو سلام کرو...... یہ بھی کراچی سے آئی ہوئی ہیں۔ یہ میری بیٹی نرمین ہے اور یہ میری بھانجی ندا ہے۔“ وہ دونوں سلام کر کے بیٹھ گئیں۔

”ماشاء اللہ بڑی پیاری بچیاں ہیں۔“ انہوں نے باری باری دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا...... اور خواتین پھر باتوں میں منہمک ہو گئیں۔

”اماں اور خالہ کو کیا ہو گیا ہے ذرا پریشان نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اتنی دیر اگر ہم کراچی میں باہر نکلے ہوتے تو دروازے پر ٹہلتی ہوئی ملتیں۔“ ان دونوں نے ابھی کپڑے بھی نہیں بدلے تھے اور بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی۔

”جاؤ بیٹا اپنے کمرے میں جاؤ، کپڑے بدلو...... میں کھانا بھجواتی ہوں۔“ خالہ نے ان کے ہلکے ہلکے گیلے کپڑے دیکھ کر کہا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے آ گئیں۔

☆☆☆

پہلا ہی دن اتنی کوفت میں گزرا تھا پھر اماں اور خالہ کی بے مروتی سے جی چاہ رہا تھا خوب دل بھر کر روئیں مگر جب بیرا کھانا لے کر آیا تو معلوم ہوا کہ بھوک اتنی شدت کی لگ رہی تھی کہ اماں اور خالہ کی بے مروتی پر آنسو بہانے کا پروگرام ملتوی کر کے وہ دونوں کھانے پر ٹوٹ پڑیں۔ کھانا کھاتے ہی نیند نے آ لیا اور وہ ایسی بے خبر سوئیں کہ رات کو جب کسی نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا تو ہڑبڑا کر اٹھیں۔

”کیا بات ہے بچیوں، کیا گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں۔ تمہاری خالہ اور اماں کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔“ نرمین کے دروازہ کھولنے پر خالو نے کہا۔

”آپ چلیں، ہم ابھی آتے ہیں۔“ نرمین نے خالو سے کہا بے چارے خالو سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ انہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ نرمین دل ہی دل میں کڑھتی ہوئی ندا کو اٹھانے لگی۔ دونوں وہاں پہنچیں تو کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔

”آپا ذرا ٹی وی تو کھولو موسم کا حال تو معلوم ہو سنا ہے ابھی تک اتنی برف باری ہو چکی ہے کہ راستے بند ہو گئے ہیں۔“ خالہ نے آج کی تازہ خبر سناتے ہوئے کہا۔

”شکر اللہ کا بچیاں وقت سے گھر پہنچ گئیں۔ ان کے آنے کے بعد تو ایسی برف باری ہوئی کہ اللہ بچائے۔“ اماں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے ریموٹ دباتے ہوئے کہا۔

”ہاں انہیں تو ہماری بڑی فکر تھی جو اَب شکر ادا ہو رہا ہے۔“ ندا اور نرمین نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنی اپنی جگہ پہلو بدلے۔

"آپا شکریہ تو ہمیں شکیلہ آپا کا ادا کرنا چاہیے جو انہوں نے ہمیں بچیوں کی خیریت کی اطلاع دے دی تھی ورنہ میں تو تمہاری طبیعت دیکھ کر اپنی پریشانی بھول گئی۔ خدا نہ کرے ایسی ٹھنڈی جگہ پر اس برف باری میں تو ڈاکٹر ملنا بھی مشکل تھا۔" خالہ کی بات سن کر دونوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ ہماری خیریت کی اطلاع ان آنٹی کو کیسے ہوئی؟" ندا نے بے دھڑک ہو کر پوچھا۔

"موبائل فون سے اور کیسے...... ان کے بیٹے نے اپنی اماں کو فون کر کے کہا تھا کہ آپ کے پرانے پڑوسیوں کی دونوں لڑکیاں خیریت سے ہیں۔ میں انہیں لے کر ہوٹل آ رہا ہوں۔ ہم جب کل یہاں آئے تھے تو اتفاق سے شکیلہ آپا مل گئی تھیں، وہ اسی دن بھوربن سے آئی تھیں اپنے بیٹے کے ساتھ لیکن تم دونوں آگے بڑھ گئی تھیں اسی لیے تعارف نہیں کروا سکیں لیکن ان کے بیٹے نے تمہیں اس گفٹ شاپ میں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس نے اپنی اماں کو موبائل پر فون کر کے بتا دیا اور کہا تھا کہ آپ جا کر ان کے گھر والوں کو خیریت بتا دیں۔"

"اوہو...... تو یہ قصہ تھا، ہم تو خواہ مخواہ اپنی اماؤں سے دل برا کر رہے تھے۔" ندا اور زمین نے آپس میں سرگوشی کی۔

"یہ کیا کھسر پھسر کر رہی ہو؟" اماں نے ٹوکا۔

"اگر ہمیں آپ موبائل فون دلا دیتیں تو کسی دوسرے کا احسان تو نہ لینا پڑتا۔ آپ کو تو نہ جانے موبائل استعمال کرنا کیوں برا لگتا ہے حالانکہ کتنے کام کی چیز ہے۔" زمین نے بات بنائی۔

"شامل کوئی غیر تھوڑی ہے، اپنا ہی بچہ ہے۔" اماں تو جیسے شکیلہ آپا اور ان کے بیٹے پر فدا ہوئی جا رہی تھیں۔ اصل بات یہ تھی کہ شکیلہ آپا اور ان کے میاں ان کے پڑوس میں رہتے تھے پھر وہ کچھ عرصہ پہلے ڈیفنس شفٹ ہوگئے تو ملاقات نہ ہو سکی اب اتنے دنوں بعد تو پرانی محبت جاگ اٹھی تھی۔ ان لوگوں کو آگے بھوربن، پتریاٹہ، ایوبیہ، نتھیا گلی جانا تھا اور پھر واپس اسلام آباد۔ اس لیے رابطے میں رہنے کے وعدے پر رخصتی ہوگئی۔

☆☆☆

زمین پہلے دن سے لے کر گھر واپسی تک کے ایک، ایک لمحے کا حال اپنی نوٹ بک میں لکھتی رہی۔ اپنے ملک کی خوب صورتی کے متعلق وہ اپنے ابا کو بتانا چاہتی تھی لیکن جب واپسی پر اس نے نوٹ بک ان کے حوالے کی وہ خوش تو ہوئے مگر انہیں اسے پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔

اماں کو واپسی پر ایک نیا مسئلہ ہاتھ آگیا۔ وہ تھیں اور شکیلہ آپا...... کبھی وہ ادھر تو کبھی اماں اُدھر...... آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ انہوں نے زمین کے لیے شامل کا رشتہ دیا ہے۔

"مجھے نہیں کرنی ہے کسی بزنس مین سے شادی...... اور اس مغرور شخص سے تو بالکل شادی نہیں کروں گی۔" زمین نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا برائی ہے شامل میں......؟ اتنا بڑا بزنس مین ہے، اپنے ابا کا پورا کاروبار سنبھال رہا ہے پھر انہوں نے خود تمہیں پسند کیا ہے۔" اماں کا انداز اسے سمجھانے والا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ زمین سے دوستانہ طریقے میں بات کرتی تھیں۔ ان کے لیے تو شامل کا زمین کے لیے رشتہ آنا ہی بڑی بات تھی۔

"کاروبار، کاروبار...... بزنس...... میں نے اپنے گھر میں ہر وقت یہی کچھ سنا ہے۔ آپ لوگوں کی دنیا تو صرف کاروبار کے گرد گھومتی ہے۔ اب شادی ہو کر جس گھر میں جانا ہو وہاں بھی ہر وقت کاروبار کی باتیں سننے کو ملیں گی۔ اماں میں اس دائرے سے نکلنا چاہتی ہوں۔ باہر کی دنیا میں بہت کچھ ہے۔ میرے لیے تو آپ کوئی جہاز اڑانے والا رشتہ تلاش کریں۔

جو مجھے اپنے ساتھ لے کر دنیا گھمانے لے جائے...... یہ میرا خواب ہے اماں، مجھے کوئی بزنس مین پسند نہیں آسکتا جسے ابا کی طرح سوائے کاروبار کے کسی اور چیز کی پروا ہی نہیں ہو۔ ان کے پاس تو اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ تفریح پر جانے کا وقت نہیں ہے اور آپ کو ایک بات معلوم ہے، میں نے ایک مہینے سے انہیں اپنی نوٹ بک دی ہوئی ہے مگر انہوں نے ایک لفظ نہیں پڑھا ابھی تک اور میں نے کتنی محنت سے راتوں کو جاگ کر لکھا تھا۔ اب جب بھی پوچھو کہتے ہیں، "آج پڑھتا ہوں...... کل پڑھتا ہوں۔" اب آپ کا خیال ہے میں ساری زندگی ایسے ہی کڑھتی رہوں بس آپ ان لوگوں کو منع کر دیں۔" زمین رو دینے کو تھی۔

"اچھا بیٹا تمہاری مرضی، ہمیں تو تمہاری خوشی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ تمہارے ابا بھی یہی کہہ رہے تھے کہ زمین کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا حالانکہ انہیں شامل بہت پسند آیا ہے۔" اماں کو افسوس تو بہت ہوا مگر زمین کی خوشی انہیں ہر حال میں عزیز تھی۔

اماں اور ابا تو اس کے انکار سے زیادہ ناخوش نہ تھے مگر شکیلہ آپا کو بہت افسوس ہوا، انہیں تو پوری امید تھی کہ وہ لوگ شامل کے لیے ضرور ہاں کریں گے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ انکار لڑکی کی طرف سے ہوا ہے تو انہیں اور بھی افسوس ہوا اور یہ بات جب انہوں نے شامل کو بتائی تو وہ حیران رہ گیا۔

"ممی آپ نے انکار کی وجہ تو پوچھی ہوتی...... کہیں زمین کسی دوسرے کو تو پسند نہیں کرتی اگر ایسی بات ہے تو انکار اس کا حق ہے اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"بیٹا وہ کہتی ہے کہ میں نے کسی بزنس مین سے شادی نہیں کرنی ہے۔ اس نے ساری زندگی اپنے ابا کو مصروف پایا ہے تو وہ نہیں چاہتی کہ اس کا شوہر بزنس مین ہو جو ہر وقت پیسہ بنانے کی مشین بنا رہے۔ وہ بڑے نازک احساسات کی شاعرانہ طبیعت کی بچی ہے۔ کسی اور کو پسند وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہے۔ اس کے ماں، باپ نے تو اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھ کر پالا ہے ویسے ہے بڑی معصوم بچی۔ اسی لیے تو مجھے بہت پسند آئی تھی۔"

"ممی...... اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر میں چاہوں گا کہ ایک بار مل لوں۔"

"اب تو انکار ہو چکا ہے بیٹا! اب ملنا بیکار ہے۔ آگے تمہاری مرضی......" بیگم شکیلہ نے بات ختم کر کے دوبارہ فائلوں پر نظریں جھکا دیں۔

بیگم شکیلہ حبیب بھی اپنی کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل تھیں اور وہ بیٹے کے ساتھ کمپنی کی ہر میٹنگ میں شریک ہوتی تھیں۔ چاہے کتنا ہی سفر طے کرنا پڑے۔ مری، بھوربن بھی اسی سلسلے میں گئی تھیں۔ جہاں ان کی ملاقات اپنی پرانی سہیلی سے ہو گئی تھی۔

☆☆☆

زمین کی دی ہوئی رجسٹر نما نوٹ بک ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے پڑھنے کے لیے پہلا صفحہ پلٹا اور گھبرا کر نوٹ بک بند کر دی پھر دوبارہ اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا کیونکہ نظروں کے سامنے اس کی سوالیہ نظریں اور روٹھا روٹھا انداز آ گیا تھا۔

"یا اللہ میری نازک سی گڑیا نے اتنے بھاری بھرکم الفاظ کیسے پوری کتاب برابر لکھ لیے۔ میں کیسے پڑھ سکتا ہوں۔ مہینہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔" انہیں اس کی ناراضی سے ڈر لگ رہا تھا پھر کوشش کر کے پڑھنے کی کوشش کی۔ آج تھوڑی فرصت ملی تھی کہ ٹیلی فون بجنے لگا۔

"سر کوئی شامل حبیب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" دوسری طرف ان کی سیکریٹری تھی۔

"یہ کیوں ملنے آگیا۔ میں کیسے اس کا سامنا کروں گا۔ مجھے کتنا اچھا لگا تھا خواہ مخواہ زمین کی بے

وقوفی کی وجہ سے رشتے داری ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

"بیٹا اسے بھیج دو۔" انہوں نے بے دلی سے سیکرٹری سے کہا۔ شامل ان کے آفس میں آکر سلام کر کے بیٹھ چکا تھا اور وہ اس سے کوئی بات نہیں کر پار ہے تھے کہ آخر وہ کیوں آیا ہے...... سامنے نرمین کی لکھی ہوئی نوٹ بک پڑی تھی۔ شامل بات شروع کرنے کے لیے مناسب الفاظ منتخب کر رہا تھا کہ اس کی نظر نوٹ بک پر پڑی۔

"یہ وہی نوٹ بک لگ رہی ہے جو میں نے اس بک شاپ میں نرمین کو دی تھی۔" اس نے دل میں سوچا۔

"سر یہ نوٹ بک؟" اس نے اشارہ کیا۔

"ہاں، ہاں یہ نرمین کی ہے۔ اس نے مجھے پڑھنے کو دی تھی۔ بس وقت ہی نہیں ملا اب یہ پڑھنا اپنے بس کی بات نہیں۔"

"سر پلیز آپ کو اگر برا نہ لگے تو میں دیکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں بیٹا......" انہوں نے نوٹ بک پکڑائی۔ شامل اسے لے کر صفحے پر صفحے پلٹتا رہا...... وہ کیا بات کرنے آیا تھا اب ایک گھنٹا ہو گیا تھا۔ اس کا انہماک قابلِ دید تھا۔ اس نے نوٹ بک رکھ دی اور عزیز صاحب سے مخاطب ہوا۔

"سر! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کے پاس کیوں آیا ہوں؟"

"ہاں بیٹا!"

"سر میں جب آپ کے پاس آیا تھا تو میرے آنے کا مقصد کچھ اور تھا لیکن وہ مقصد بدل کر کچھ اور ہو گیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں بیٹا...... کیونکہ میں سوچ رہا تھا کہ تم پوچھنے آئے ہو گے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ہماری طرف سے انکار ہوا۔"

"سر مجھے انکار کی وجہ معلوم ہو چکی ہے۔ اصل میں، میں سمجھ رہا تھا کہ آپ کی بزنس میں مشغولیت کی وجہ سے نرمین تمام بزنس مینوں کو اپنی فیملی کی طرف سے بے پروا سمجھ رہی ہیں لیکن سر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ کر میں سمجھ چکا ہوں کہ ایسی لڑکی جو اتنا اچھا لکھ سکتی ہے اور بہت بہترین ادبی ذوق رکھتی ہو تو اس کے لیے بہترین ساتھی وہ ہی ہو سکتا ہے جو اس کے ذہن سے مطابقت رکھتا ہو، ورنہ اس کا گزارہ کرنا مشکل ہوگا۔"

شامل جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا لیکن ذہن پر جو بوجھ تھا وہ ہٹتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

جوں جوں اس کی سالگرہ کے دن قریب آرہے تھے اس کی فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ابا سے ناراض تھی۔ اس نے تو اُن سے یہ پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ آپ نے میری نوٹ بک پڑھی کہ نہیں تو سالگرہ کی تیاری کا کیا پوچھتی...... البتہ اماں سے پوچھا تو وہ ہوں، ہاں کر کے ٹال گئیں...... ورنہ ہفتوں پہلے پوچھتی تھیں کہ نرمین اپنی سہیلیوں کو بلاوا بھجوا دو فون وغیرہ کر دو۔ جن جن عزیز رشتے داروں کو بلانا ہوتا تھا انہیں خود ہی کہہ دیتی تھیں حالانکہ یہ تقریب گھر پر ہی ہوتی تھی کیونکہ اس کی سالگرہ کی تقریب ان کے گھر کی بہترین تقریبات میں شمار ہوتی تھی۔

"شاید اس بار ابا میری سالگرہ بھی بھول گئے ہیں۔ شاید میرے انکار کی وجہ سے بہت ناراض ہیں۔" ندا کو اپنے دل کا حال سناتے ہوئے نرمین رو پڑی۔

"نرمین رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ خالو اور خالہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ ناراض نہیں ہو سکتے...... ہاں کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے... بدگمانی اچھی نہیں ہوتی ہے۔" لیکن نرمین کے لیے اس کی سالگرہ پر اتنی خاموشی ہونا ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔

سالگرہ کا دن تھا صبح صبح اماں نے اسے ایک

جوڑا دکھاتے ہوئے کہا۔

"نرمین بیٹا! میں نے تمہارے لیے یہ جوڑا سلوایا ہے۔ بتاؤ تو کیسا لگ رہا ہے؟"

"اماں یہ تو بہت خوب صورت ہے، آپ نے کب بنوایا؟"

نرمین کے لیے تو اماں ہمیشہ سے بہت اچھے کپڑے سلواتی تھیں لیکن یہ تو واقعی بہت خوب صورت تھا۔ نرمین سوچ رہی تھی کہ اماں اب کہیں گی کہ نرمین میری جان، میری بیٹی تمہیں سالگرہ مبارک ہو مگر وہ کہنے لگیں۔

"آج شام تمہارے ابا کے کسی دوست کے یہاں پارٹی ہے تم یہی جوڑا پہن کر چلنا۔" نرمین دل مسوس کر رہ گئی، وہ تو یہ بھی نہ کہہ سکی کہ اماں آپ لوگوں کو میری پارٹی یاد کیوں نہیں رہی۔

ندا، اماں اور خالہ کی تیاری بھی آج قابلِ دید تھی۔ لگ نہیں رہا تھا کہ کسی دوسرے کی پارٹی میں جا رہی ہیں۔ ندا نے بتایا کہ ہم لوگ گھر سے پارٹی میں جائیں گے اور خالو اپنے دفتر سے اُدھر پہنچ جائیں گے۔

"چلو کوئی بات نہیں ہے، ابا تو ہمیشہ سے ایسے ہی پارٹیوں میں شرکت کرتے ہیں وہ تو ہماری پارٹی میں بھی مہمانوں کی طرح وقت کے وقت آتے ہیں۔ یہ تو دوسروں کی پارٹی ہے۔" ندا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے کہا لیکن آج اماں نے ابا کی طرف سے کوئی وضاحت پیش نہیں کی بلکہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے مسکراتی رہیں۔

گاڑی ایک بڑے ہوٹل کے سامنے جا کر رکی، ہوٹل کے ایک خوب صورت ہال میں پارٹی کا انتظام تھا۔ وہ جب دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ یہ کسی سالگرہ یا شادی کی تقریب نہیں تھی بلکہ باقاعدہ اسٹیج بنا کر اس پر مہمانوں کے لیے کرسیاں رکھی تھیں جس پر ادبی دنیا کی کئی ایک مشہور شخصیات بیٹھی ہوئی تھیں۔

"یہ سب کیا ہے ندا یہ تو کوئی ادبی تقریب لگتی ہے۔"

"لگتی نہیں، یہ ہے ہی ادبی تقریب...... اسٹیج کے پیچھے دیکھو کیا لکھا ہے۔ نرمین عزیز کی کتاب کی تقریب پذیرائی۔" ندا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں نے تو کوئی کتاب لکھی ہی نہیں تو تقریب کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟" وہ سامنے کی سیٹوں پر بیٹھی اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں کمپیئر تقریب کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز کر رہا تھا۔ نرمین حیرت سے کبھی اسٹیج کی طرف دیکھتی کبھی اپنے رشتے داروں کی طرف جن کے چہروں پر کوئی حیرت نہیں تھی۔

وہ حیران تو جب رہ گئی جب کمپیئر نے جناب طاہر عزیز کو بلانے کا اعلان کیا اور ان کے ساتھ ہی نرمین عزیز کو بھی اوپر آ کر اسٹیج پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

"ابا یہ سب کیا ہے؟" نرمین نے ان سے پوچھا۔ وہ مائیک تھامے کھڑے تھے۔

”تم بیٹھو بیٹا...... ابھی سب معلوم ہوجائے گا۔“ انہوں نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود ڈائس کی طرف بڑھ گئے۔

”آج میری بیٹی زرمین عزیز کی سالگرہ ہے اور ایک باپ کی اس سے بڑی کیا خواہش ہوگی کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسا تحفہ دے جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہو۔ میری بیٹی کی خواہش یہ تھی کہ وہ ملکوں، ملکوں گھومے کوئی کتاب لکھے...... آج میری زرمین کی سب سے بڑی آرزو پوری ہورہی ہے۔ زرمین کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ میں اسے وقت نہیں دے سکا ہوں، وہ حق پر ہے لیکن اس کی جتنی حق تلفی ہوئی ہے میں اس کا ازالہ تو نہیں کرسکتا لیکن اس کی سالگرہ پر یہ تحفہ دے کر میں نے کوشش ضرور کی ہے، میری بیٹی چپکے چپکے کیا کچھ لکھتی رہی مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔ لیکن ایک دن اس نے مجھے اپنی نوٹ بک دی۔ جب وہ میرے بغیر گھومنے پھرنے گئی تھی تو اس نے وہاں کی سیر کے دوران جو کچھ دیکھا وہ لکھا...... میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی سفر نامہ ہوگا لیکن جب وہ نوٹ بک میرے ایک دوست نے پڑھی جو ادبی ذوق بھی رکھتا ہے تو اس نے بتایا یہ ایک ایسی کتھا ہے جو میری بیٹی نے میرے بغیر وہاں جا کر رقم کی تھی پھر ہم نے اس کی سہیلی اور خالہ زاد بہن ندا سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایسی تو بہت سی کتھائیں زرمین نے لکھ رکھی ہیں پھر ہم نے ندا کے توسط سے وہ سب مواد اکٹھا کیا اور اسے کتابی صورت دی جو... ہم بزنس مینوں کے لیے بھی مشعلِ راہ ہے جو صرف پیسہ کمانے کے چکر میں اپنی اولاد کو وقت نہیں دے پاتے۔ یہ میری بیٹی کی مجھ سے محبت کی دستاویز ہے جو لمحے اس نے میری بے پروائی کی وجہ سے مجھ سے دور گزارے وہ کسی گمراہی کے راستے پر بھی چل سکتی تھی...... برے دوستوں، سہیلیوں کی صحبت یا موبائل یا انٹرنیٹ کا غلط استعمال کر کے بھی گزار سکتی تھی لیکن اس نے کتاب سے رشتہ جوڑ کر اپنے آپ کو ان ساری چیزوں سے بچا رکھا، مجھے اپنی بیٹی پر بہت فخر ہے۔ میری ساری زندگی کی کمائی میرا یہ فخر ہے۔ اس کے ساتھ میں اس کی ماں کا، ندا کا اور خالہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا اور سب سے بڑھ کر اپنے اس عزیز کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جس نے مجھے یہ راہ دکھائی لیکن مجھے اپنا نام لینے سے منع کر دیا۔“

طاہر عزیز صاحب بول رہے تھے اور زرمین بڑے اعتماد سے بیٹھی سن رہی تھی۔ آج وہ ڈری سہمی لڑکی نہیں تھی کیونکہ آج تو اس کے ابا اس کے ساتھ تھے۔ اس نے تو یہ سب کچھ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اسے تو لگ رہا تھا کہ وہ بھی آسمان پر اڑنے والے پرندوں کے ساتھ ساتھ پر پھیلائے اُڑتی جا رہی ہو پھر باری باری بہت سے لوگ آئے اور تقریر کر کے چلے گئے لیکن اس کے کانوں میں اپنے ابا کے ہی الفاظ گونجتے رہے تقریب ختم ہوگئی۔ کتنے ہی لوگوں نے اس سے آٹوگراف لیے اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔

آہستہ آہستہ ہال خالی ہورہا تھا کچھ لوگ چائے کے دوران گپ شپ میں مشغول تھے۔

”ندا کہاں ہے؟“ اس نے ایک جگہ کھڑے کھڑے نظریں دوڑائیں۔

”سنیے، آپ مجھے آٹوگراف دیں گی؟“ کوئی قریب ہی کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ آواز تو سنی ہوئی لگ رہی ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”ارے آپ؟“ اس نے چونکتے ہوئے کہا ایک دم سے اسے شرمندگی ہونے لگی۔

”اب تو آپ کو یقین آگیا کہ بزنس مین بھی دل و دماغ رکھتے ہیں، حساس ہوتے ہیں اور اپنی اولاد سے محبت بھی کرتے ہیں۔“ وہ بڑی محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

زرمین کا اپنے قدموں پر کھڑے رہنا مشکل ہورہا

تھا۔

”جی آپ کو کیا ابا نے بلایا ہے؟“ اس نے زمین پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں...... میں بن بلایا مہمان ہوں ویسے آپ مجھے زبردستی کا مہمان بھی کہہ سکتی ہیں جسے کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے، وہ تقریبات میں زبردستی شامل ہوجاتا ہے۔ جیسے میں شامل ہوں۔“ وہ ذرا سا آگے خم ہوا۔

”ارے شامل بیٹا، تم نے کچھ لیا ہی نہیں۔“ ابا نے اچانک اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”انکل میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں جو آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں، میرا ارادہ تو زرمین کے ساتھ چائے پینے کا تھا۔ یہ اتنی بڑی رائٹر جو ہیں، ان کے ساتھ چائے پینا تو فخر کی بات ہے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”زرمین بیٹا...... میں نے جس شخصیت کا اس وقت نام نہیں لیا تھا وہ شامل ہی تو ہے۔ شامل نے ہی مجھے اس بات پر قائل کیا تھا کہ تمہاری کتاب چھپوائی جائے، یہ جو سارے انتظامات دیکھ رہی ہو اسی کے کیے ہوئے ہیں ورنہ مجھے ان باتوں کا کیا علم اور تمہیں ایک بات بتا دوں...... شامل بہت بہترین ادبی ذوق رکھتا ہے بلکہ ادیبوں، شاعروں کو پروموٹ کرنے میں مدد بھی کرتا ہے جو بے چارے مالی طور پر مستحکم نہ ہونے کی وجہ سے کتابیں نہیں چھپوا سکتے۔ اس کا اپنا پبلشنگ کا ادارہ ان کی کتابیں چھاپتا ہے...... اب باقی سوالات، جوابات تم خود کرلو...... کیونکہ اس سارے معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ وہ کسی اور سے گفتگو کرتے آگے بڑھ گئے۔

”سوری...... شامل صاحب...... میں نے آپ کے بارے میں بہت غلط سوچا تھا۔“ زرمین شرمندہ ہورہی تھی۔

”کوئی بات نہیں ہے...... جب آپ میرے متعلق جانتی ہی نہیں تھیں تو شکایت کرنا تو فضول ہے لیکن اب آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ میں بن بلایا مہمان ہوں جو زبردستی شامل ہوا ہوں۔ اب مجھے زبردستی آپ کے ساتھ چائے بھی پینی ہے تاکہ ٹیبل پر بیٹھ کر بزنس کے معاملات طے کیے جاسکیں۔“ اس نے ایک خالی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

”بزنس...... کیسا بزنس......؟ مجھے کوئی بزنس نہیں کرنا ہے، نہ مجھے بزنس کرنا آتا ہے۔“ زرمین کو غصہ آگیا جو اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہورہا تھا۔

”سوری...... زرمین عزیز صاحبہ آپ کیا سمجھ رہی تھیں آپ کا یہ تمام کام مفت میں ہی کردیا ہے، محترمہ میں صرف ضرورت مند رائٹرز کی کتابیں مفت چھاپتا ہوں۔ آپ تو ماشاء اللہ ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی ہیں، آپ تو افورڈ کرسکتی ہیں پھر آپ کو میرے پبلشنگ ہاؤس سے معاہدہ بھی تو کرنا ہوگا۔ جس میں کتاب کے جملہ حقوق میرے نام ہوں گے۔“ وہ خاصا سنجیدہ تھا۔ ”آپ اگر ان تمام شقوں سے متفق ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمام کتابیں اٹھا لیتا ہوں۔“

وہ جیب میں سے معاہدے کی کاپی نکالتے ہوئے بولا۔ زرمین کے دل میں جو اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا تھا۔ وہاں سے غصے اور نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ کتابوں کے سارے بنڈل اس کے سر پر دے مارتی مگر آس پاس لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے خاموش رہی پھر ابا نے اتنی محبت سے محفل سجائی تھی وہ ان کی خوشی کا ستیاناس نہیں کرسکتی تھی۔

”آپ کو یہ تمام باتیں پہلے ابا سے طے کرلینی چاہیے تھیں۔ انہوں نے کتاب چھپوائی ہے، میں نے نہیں۔“ زرمین سے ضبط کرنا مشکل ہورہا تھا وہ ابھی تک کھڑی تھی۔

”زرمین صاحبہ ہم بیٹھ کر بات نہیں کرسکتے؟“ وہ خود بیٹھ چکا تھا۔

”بدتمیز خواتین کا احترام کرنا بھی نہیں جانتا

ہے۔ کیا یہ بھی کسی نے نہیں سکھایا۔'' وہ ناخوشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا اس نے ہاتھ میں پکڑے لفافے پر ایک نظر ڈالی اور اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''اٹھالیں اپنی ساری کتابیں...... مجھے کوئی معاہدہ نہیں کرنا ہے۔'' وہ منہ پھیرے پھیرے بولی۔

''پلیز...... آپ پڑھ تو لیں......'' وہ اصرار کر رہا تھا مگر نرمین اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔

''غلطی میری تھی، میں نے آپ کو غلط سمجھا...... میں سمجھ رہی تھی واقعی آپ ایک حساس انسان ہیں لیکن آپ بھی ایک بزنس مین نکلے......'' اس نے میز پر رکھا لفافہ پڑھے بغیر پھاڑنے کے لیے اٹھالیا۔ شامل نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''نرمین پلیز پہلے پڑھ تو لو۔'' نرمین نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا جو اس کے ہاتھ پر رکھا ہوا تھا اور اس کے اپنے ہاتھ میں ایک گلابی لفافہ تھا جس کے اندر سے ایک بہت خوب صورت کارڈ جھانک رہا تھا وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے لفافے کے اندر سے کارڈ نکالا جس پر بہت خوب صورت گلاب کا پھول بنا ہوا تھا اور موٹے موٹے الفاظ میں congraulations کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

نیچے شامل کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔

''نرمین مجھے تم اپنی زندگی میں شامل کرلو۔ میں تمہارے جملہ حقوق اپنے نام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ معاہدہ منظور ہے تو دستخط کردو۔'' اس نے پین اس کی طرف بڑھا دیا۔

نرمین نے پلٹ کر اس طرف دیکھا جہاں اس کے گھر والے کھڑے تھے انہی میں اسے شکیلہ آنٹی بھی کھڑی نظر آئیں۔ سب لوگ اِدھر ہی دیکھ رہے تھے۔

''اس کا مطلب ہے یہ سب پہلے سے طے تھا...... صرف مجھے ہی خبر نہیں تھی۔'' نرمین نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

''اب جلدی سے دستخط کردو۔ ابھی ہماری منگنی کی رسم بھی ادا ہونی ہے۔'' اس نے نرمین کی آنکھوں میں جھانکا۔

''یعنی یہ بھی پہلے سے طے تھا' میری کوئی حیثیت نہیں۔ سب مجھ سے چھپایا جا رہا ہے اگر میں دستخط نہ کروں تو؟'' اس نے مصنوعی خفگی سے شامل کو دیکھا اور کارڈ لفافے میں واپس رکھ دیا۔

''نرمین...... کیا کرتی ہو، سب تمہیں سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ حیثیت کو بیچ میں کہاں لا رہی ہو، واقعی سب تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں نے یہ سب بڑے خلوصِ دل سے اور نیک نیتی سے تمہارے لیے کیا تھا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم نے اس رشتے سے انکار کردیا ہے تو واقعی مجھے بہت دکھ ہوا تھا اور امی کو بھی تمہارے انکار سے بہت تکلیف پہنچی تھی اور جب مجھے اصلی وجہ معلوم ہوئی تو میں انکل سے ملنے ان کے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا مجھ سے زیادہ دکھی تو انکل ہیں کیونکہ وہ خود کو اس معاملے میں قصوروار سمجھ رہے تھے پھر ہم سب نے مل کر تمہارے لیے یہ ادنیٰ سی کوشش کر ڈالی...... لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اتنے نرم و ملائم لہجے والی یہ خوب صورت سی لڑکی اتنا سخت دل رکھتی ہے۔'' وہ اب کچھ کچھ دکھی دکھائی دے رہا تھا۔

نرمین نے لفافے میں سے کارڈ نکال کر دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''شامل میں اس کارڈ پر دستخط نہیں کرسکتی، کاغذ پر لکھے لفظ تو مٹائے جاسکتے ہیں مگر جو لفظ دل پر لکھ دیے جائیں ان کو مٹانا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' اس نے ایک جذب کے عالم میں اتنا خوب صورت جملہ ادا کیا۔ شامل نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ اب اپنی نظریں جھکائے، ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اس کارڈ کو پھر سے پڑھنے میں مشغول تھی۔



پہلا قدم

فاطمہ خان

''مے آئی کم اِن سر؟'' عروسہ نے مسکراتے ہوئے اندر آنے سے پہلے اجازت طلب کی۔

''یس شیور۔'' صدیقی صاحب نے جوابی مسکراہٹ دی اور اندر آنے کا اشارہ کیا۔

نہایت اعتماد سے وہ کمرے کے اندر داخل ہوئی اور صدیقی صاحب کے سامنے والی نشست سنبھال لی۔ کمرے میں اے سی کی تیز کولنگ اور ائرفریشنر کی مسحور کن مہک نے اس کی طبیعت پر

بہت خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ وہ جو بات کہنے آئی تھی، اب زیادہ بہتر انداز میں کر سکتی تھی۔ کمرے میں رکھے ہوئے انڈور پلانٹس اور وال پینٹنگز کو دیکھ کر دل ہی دل میں اس نے صدیقی صاحب کے ذوق کو سراہا تھا۔ صدیقی صاحب نے اپنے سامنے پڑی ہوئی فائلز کو ایک طرف رکھا اور اس کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگے۔

"سر، وہ مجھے ایک ہفتے کی چھٹی چاہیے...... یہ میری درخواست ہے جس میں ساری تفصیل لکھی ہوئی ہے۔" عروسہ نے ایک کاغذ پر لکھی ہوئی درخواست ان کو پکڑا دی۔

"ہوں......" صدیقی صاحب نے لمبی سی ہوں کرتے ہوئے اس کی درخواست کو غور سے دیکھا۔

صدیقی صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے ایک ماہ سے زیادہ ہو چکا تھا، وہ اس کمپنی کے جنرل منیجر تھے۔ نہایت مہربان اور زندہ دل قسم کے انسان تھے۔ ہمیشہ بیٹا کہہ کر ہی مخاطب کرتے۔ انہیں دیکھ کر ان کے ساتھ کام کر کے جنسِ مخالف کے بارے میں اس کی رائے تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ ان پر بہت بھروسا کرنے لگی تھی۔ کچھ گھریلو معاملات کے باعث اسے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی چاہیے تھی۔ صدیقی صاحب جیسے مہربان افسر کی موجودگی سے اسے ڈھارس تھی کہ آسانی سے چھٹی مل جائے گی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ اسے صدیقی صاحب کے کھانسنے کی آواز آئی۔

"سوری سر، سوری۔" وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی جیسے کوئی گہری نیند سے جاگا ہو۔

"اٹس اوکے...... آپ کو چھٹی مل جائے گی۔" صدیقی صاحب نے اس کی درخواست پر دستخط کر کے اپنی فائل میں رکھتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو سر، تھینک یو سو مچ۔" عروسہ نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔

"ویسے مسکراتے ہوئے آپ بہت خوب صورت لگتی ہیں۔" صدیقی صاحب نے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے عجیب سے انداز میں کہا۔

"اوکے سر! میں اب چلتی ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئے۔ وہ اس کے اتنے قریب تھے کہ عروسہ کو اُن کی سانسوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ بہت کچھ غلط ہو جاتا۔ عروسہ نے پوری قوت سے انہیں زوردار دھکا دیا۔ صدیقی صاحب پاس پڑی میز سے ٹکرا کر گر پڑے۔ اس کے لیے یہ سنہری موقع تھا...... بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے وہ دروازے کی طرف بھاگی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ صبح ہونے والا پورا واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ صدیقی صاحب کا اس قدر قرب اس کے پورے جسم کو کانٹے کی طرح چُبھ رہا تھا۔ دکھ اور تکلیف کے جس احساس سے وہ گزر رہی تھی وہ صرف وہی جان سکتی تھی۔ روتے روتے اب اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو وہ خاموش ہو جاتی یا پھر آواز اٹھاتی۔ پہلا راستہ آسان تھا اور دوسرا راستہ مشکل...... وہ ہمیشہ سے مشکل پسند رہی تھی اس لیے اس نے مشکل راستے کا انتخاب کر لیا۔

"آر یو میڈ؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے سے ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ صرف اپنا ہی نقصان ہوتا

ہے۔" ارسلان نے غصے سے چیختے ہوئے فون پر اس سے کہا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے سامنے کوئی چیز پڑی ہوتی اور وہ اٹھا کر عروسہ کو دے مارتا۔

"میں صدیقی صاحب کے خلاف شکایت ضرور کروں گی اور اس سلسلے میں مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔" عروسہ نے نہایت تحمل کے ساتھ ارسلان سے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعاون نہیں کروں گا اور یہ بات بھی اپنے دماغ میں بٹھا لو کہ اگر تم نے زیادہ من مانی کرنے کی کوشش کی تو تمہاری اور میری منگنی بھی ختم ہو سکتی ہے۔"

عروسہ حیرت سے ریسور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے ارسلان سے اس قدر شدید ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ بے یقینی کے عالم میں وہ پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اپنی انگلی میں جگمگاتی ارسلان کے نام کی انگوٹھی کو اس نے نہایت بے دردی سے اتار پھینکا۔ اب یہ منگنی ارسلان کو نہیں بلکہ اسے ختم کرنا تھی۔

☆☆☆

ایک چھوٹا سا کمرا تھا، جس میں بہ مشکل تین لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ عروسہ کے سامنے والی دو کرسیوں پر اس کی کمپنی کے دو اعلیٰ افسران بیٹھے تھے جو اسلام آباد سے خاص طور پر اس کی شکایت کے بعد اس کے کیس کی انکوائری کے لیے آئے تھے۔ صدیقی صاحب سے وہ مل چکے تھے۔ اب عروسہ سے ملنے کے بعد وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا چاہتے تھے۔

"مس عروسہ وہاب، آپ کے ساتھ صدیقی صاحب نے کیا قابلِ اعتراض حرکات کی تھیں، تفصیل کے ساتھ بتائیں۔"

"ہم نے سنا ہے آپ کا پہلے بھی ان کے ساتھ افیئر رہ چکا ہے۔"

"آپ دونوں کتنی دیر تک ایک کمرے میں رہے تھے؟" انکوائری کمیٹی کے ان بے ہودہ سوالات کے جوابات اس کے پاس نہیں تھے۔ آدھے گھنٹے کی اس انکوائری کے بعد عروسہ جب اپنے کیبن میں آ کر بیٹھی تو اپنی بے بسی پر اسے شدید رونا آیا۔ اسے لگا کہ جیسے اس پوری دنیا میں وہ اکیلی رہ گئی ہے۔

عروسہ نے کانپتے ہاتھوں سے ٹرمینیشن لیٹر وصول کیا۔ وہ کاغذ نہیں بلکہ اسے لگا اس کی موت کا پروانہ تھا۔ پچھلے کچھ دن اس کی زندگی میں بھیانک خواب جیسے تھے۔ پہلے ارسلان سے اس نے اپنی منگنی ختم کی۔ خاندان میں اس کی الگ بدنامی ہوئی اور اب یہ نوکری بھی اس کے ہاتھ سے چلی گئی تھی۔ اپنا ٹرمینیشن لیٹر اس نے اپنے بیگ میں رکھا اور کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ سامنے کا منظر ناقابلِ یقین تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں جانب تمام اسٹاف ممبرز خاموشی سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان سب نے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے مسکرا کر اُن سب کے ساتھ فتح کا نشان بنایا اور باہر کی طرف چل پڑی۔ وہ اکیلی نہیں تھی...... سب اس کے ساتھ تھے۔ اپنا بہت کچھ قربان کر کے وہ ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہوئی تھی۔ پہلا قدم وہ بڑھا چکی تھی اور پُرامید تھی کہ آج نہیں تو کل صدیقی صاحب جیسے بھیڑیوں کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔





ناہید سلطانہ اختر

آخری قسط

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں... وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے لوگ، بہت سے مواقع ایسے ضرور ملتے ہیں ... جب محبت دستک دیتی ہے... اور اس کی خوشبو میں روشنی کی تابناکی بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ... مکرو فریب... سفاکی اور تنگ نظری کے سائے ... ازل سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی کبھی ترپ کی دگی بھی حکم کے اکے کو کاٹ دیا کرتی ہے...

انہی روابط میں بنی خوب صورت کہانی جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی







تقدیم اور ابا ناشتے کی میز پر تھے۔ پہلے والے گھر میں نہیں...... نئے گھر میں...... جو ابا نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد زمانۂ ملازمت میں چھاؤنی کی حدود میں خریدے گئے پلاٹ پر بنوایا تھا۔ ڈرائنگ، ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج، دو بیڈ رومز اور چھوٹے سے لان پر مشتمل اس گھر میں زندگی کی وہ ساری سہولتیں موجود تھیں جن کی ابا اور تقدیم کو ضرورت ہو سکتی تھی۔

وقت پر لگا کر اُڑا تھا۔ ٹاپوں ٹاپ......

زندگی کی اس داستان کا آغاز...... جس کے کرداروں میں تقدیم، حجاب، عباد اور عائزہ کے گھرانوں کے افراد تھے جیسے کل ہی کی بات تو تھی۔ وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ چہرے...... حالات...... زندگی کے نقش و نگار...... نہیں بدلے تھے تو زندگی کے تیور...... وہی کرّوفر وہی مطلق العنانی۔

تقدیم کے گھر میں اب کل تین نفوس تھے...... ابا، تقدیم اور کام والا لڑکا رفاقت جسے تقدیم نے ایسا سدھایا تھا کہ سلیقہ مند، گھر دار عورتوں کی طرح پورا گھر سنبھالتا...... ابا کی دیکھ بھال کرتا...... انہیں کمپنی دیتا...... مہینے، دو مہینے بعد جب وہ دو چار دن کو چھٹی پر اپنے گاؤں جاتا تو ابا اور تقدیم دونوں کو یوں لگتا جیسے زندگی سے کوئی اہم چیز جاتی رہی ہو۔

''رفاقت کے بغیر تو میں یتیم سا ہو جاتا ہوں۔'' ابا کہتے...... ابا کے لیے دوائیں اب کھانے سے بھی زیادہ ضروری ہو گئی تھیں...... کھانا کسی وقت چھوڑ سکتے تھے مگر دوا ایک وقت بھی نہیں...... کبھی بھول ہو جاتی تو جسم الارم دینے لگتا...... اماں کی موت نے ابا کو بہت تنہا اور دل گرفتہ کر دیا تھا۔ اکثر بے خوابی کی شکایت کرتے۔

''رات نیند آئی ابا؟'' ناشتے کی میز پر تقدیم نے ابا کے لیے چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... نیند کی گولی لے لی تھی...... جلتی بجھتی آ ہی گئی۔''

اس نے چائے کی پیالی ابا کی طرف بڑھائی۔

''دن بھر کرنے کو کچھ ہوتا نہیں...... ہم جیسے بیکاروں کو نیند بھلا کہاں آئے گی۔''

''ساری زندگی کام کیا ہے ابا...... اب آرام آپ کا حق بنتا ہے۔'' تقدیم نے کہا۔

ابا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی...... ریٹائرڈ لائف کے لیے کیسے کیسے خواب دیکھا کرتے تھے وہ اپنے زمانۂ ملازمت میں۔

فجر کی نماز کے بعد اشراق تک جائے نماز سے نہ اٹھنا پھر لمبی واک...... چھڑی ہاتھ میں لیے...... چھاؤنی میں گھومتے پھرتے حاضر سروس افسران کے ریٹائرڈ کرنیل، جرنیل باپوں کی طرح۔ اماں کے ساتھ بیٹھ کر دکھ سکھ کی باتیں، انہیں ساتھ لے کر حج پر جانے کی تمنا کو عملی جامہ پہنانا۔ بچوں کے بچوں سے کھیلنا...... اور رات کو عشا کی نماز کے بعد لمبی تان کر سو جانا...... سارے خواب گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔

انسان سوچتا کیا ہے...... ہو کیا جاتا ہے...... ہوتا وہ ہے جو انسان نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا...... زندگی کی شروعات کیا ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کا نقشہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

ابا نے یہ کب سوچا تھا کہ ان کی بعد از ریٹائرمنٹ خواہشات یوں تشنہ لب رہ جائیں گی۔ اماں پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ وہیل چیئر سے بستر پر آ لگیں۔ مسلسل لیٹے رہنے سے ان کی پشت پر بیڈ سورز ہو گئے تھے...... گہرے زخم...... جن میں اٹھنے والی ٹیسیں اماں کو اکثر اس طرح چیخنے، چلّانے اور بلک بلک کر رونے پر مجبور کر دیتیں کہ آس پڑوس کے لوگ بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے...... زبان بند ہو گئی تھی ٹکر ٹکر دیکھے جاتیں بس...... کبھی چھت کو...... کبھی چہروں کو...... ابا اور بچے ان کے پاس بیٹھ کر اس آس میں ان سے باتیں کرتے

رہے کہ شاید کسی شدید جذباتی اثر سے کسی لمحے ان کی زبان کو لگی گرہ کھل جائے مگر ایسا نہ ہوا...... اماں اپنی زبان کو قفل لگائے لگائے اس دنیا سے چلی گئیں...... فالج کا حملہ ان کی زندگی کی آخری علالت ثابت ہوا۔

''میں تو اب کسی لائق نہیں رہی...... بہنوں کو تمہی نے نمٹانا ہے۔'' مفلوج ہونے سے چند دن قبل انہوں نے تقدیم سے بصد حسرت کہا تھا اماں کی علالت کے دوران اور ان کی موت کے بعد بھی ان کی یہ بات تقدیم کے دامنِ دل سے بندھی رہی۔

اماں کو سب سے بڑا دکھ تسنیم کی بربادی کا تھا۔ اس دکھ کو وہ مرتے دم تک اپنے سینے سے نہ نکال سکیں۔ آخری وقت میں بھی ان کی نظریں اپنے سرہانے کھڑی تسنیم پر تھیں جو اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ان کی آنکھوں کی پتلیوں کو عجیب و غریب انداز میں گھومتے دیکھ کر خائف ہو رہی تھی۔

اماں کی آخری مگر طویل علالت کے دوران یوں تو گھر کے تمام افراد ہی نے ان کا ہر طرح سے خیال رکھا...... علاج معالجہ...... دوا دارو...... مالش...... صفائی ستھرائی، دل بستگی...... مگر تسنیم نے گویا خدمت کا حق ادا کر دیا...... اماں کی دیکھ بھال میں اسے اپنے بیٹے وقاص کی بھی چنداں پروا نہیں ہوتی۔

وقاص کی پروا کرنے والے اور بہت تھے...... باپ کی طرح پیار کرنے والے نانا اور جان چھڑکنے والی خالائیں...... وقاص گھر بھر کے لیے خوشی بن گیا تھا۔ تسنیم کی گود میں تو بس دودھ پینے کو ہی جاتا ورنہ نانا اور خالائیں سینے سے چمٹائے رکھتے۔ گردن ٹھہرنے لگی تو ابا اسے اپنے گھٹنے پر بٹھا کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیتے، وہ ٹکر ٹکر ایک ایک کو دیکھے جاتا۔

مدثر نے اسکاٹ لینڈ جانے کے بعد تسنیم سے رابطے میں رہنے کی بہت کوشش کی تھی۔ کئی مرتبہ پیسے بھی بھجوائے مگر تسنیم نے سوائے پہلی بار کے نہ پھر کبھی اپنے موبائل پر بیرونِ ملک سے آنے والی فون کال ریسیو کی نہ اس کی طرف سے بھجوائی جانے والی کوئی رقم وصول کی۔ مدثر نے تقدیم سے رابطہ کیا، اس نے بھی حوصلہ شکنی کی۔

''تسنیم تمہارا نام بھی نہیں سننا چاہتی، تمہاری فون کال سننے یا تمہارے بھیجے گئے پیسوں کو وصول کرنے پر اسے آمادہ کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔'' تقدیم نے کہا تھا۔

مدثر نے بچے کی تصویر بھجوانے کی گڑگڑا کر فرمائش کی۔ تقدیم کو معذرت کرنا پڑی۔ تسنیم کی مرضی کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔

تسنیم اور اہلِ خانہ کی جانب سے مایوس ہو جانے کے بعد مدثر کے لیے معلومات کا بس ایک ہی ذریعہ تھا...... اویس انصاری...... بیٹے کی پیدائش کی خبر اسے اسی ذریعے سے ملی تھی...... اس نے بچے کے اخراجات کے لیے رقم بھجوائی تو حسبِ سابق واپس کر دی گئی...... بچے کو اسکائپ کے ذریعے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اویس انصاری کے ذریعے جواب ملا کہ تسنیم کے گھر میں ایسی کوئی سہولت موجود نہیں، اس نے ویب کیم بھجوانا چاہا تو جواب آیا کوئی ضرورت نہیں۔

مدثر کے گھر سے بچے کو کبھی کوئی دیکھنے کے لیے نہیں آیا گو ممی چاہتی تھیں مگر ڈیڈی نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی تھی۔

تسنیم اور مدثر کے تعلقات کے بارے میں رشتے داروں اور ملنے جلنے والوں کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ مدثر نے باہر جا کر تسنیم کو طلاق بھجوا دی تھی۔

تسنیم نے زمانۂ حمل میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ آخری سمسٹر سے فراغت کے کچھ ہی دنوں بعد وقاص دنیا

میں آگیا تھا...... دنیا میں اس کی پہلی صدا سن کر تسنیم کے دل کی جو حالت ہوئی وہ ضبطِ الفاظ میں لانے وا
نہیں تھی...... اس کی آواز کانوں میں پڑتے ہی وہ اپنا ہر دکھ، ہر تکلیف بھول گئی تھی...... اس کو جنم د
صعوبت بھی...... وقاص کی پیدائش نے اس کی زندگی کو نئے معنی دیے تھے۔ یونیورسٹی سے تعلیم کی تکم
وقاص کی پیدائش کے ڈھائی ماہ بعد یونیورسٹی میں اپنے ہی شعبے میں کوآپریٹو ٹیچر کی جاب شروع کرتے
اس کے ذہن میں ایک ہی عزم تھا کہ اب اسے جو کرنا تھا وقاص کے لیے کرنا تھا۔

وقاص کوئی پانچ ماہ کا تھا کہ اماں کو فالج ہوگیا۔ ملازمت اور وقاص کی پرورش کی ذمے داری کے
اماں کی تیمارداری بھی تسنیم کے معمولات میں شامل ہوگئی۔ یونیورسٹی سے واپس آنے کے بعد وہ ابا سے
دیکھ بھال کا چارج لے لیتی...... انہیں وقت پر کھلانا پلانا، دوا دینا، حوائج ضروریہ سے فارغ کرانا،
مالش، نہلانا، دھلانا، بالوں کو دھیرے دھیرے پہلے اپنی انگلیوں سے سلجھانا پھر کنگھے سے دھیرے دھ
سنوارنا، ان کے بستر اور کمرے کی صفائی، ستھرائی، دلجوئی...... آخری دنوں میں وہ رات، رات بھر ان
سرہانے بیٹھی رہتی تھی...... اسی خدمت کا صلہ ملا تھا اسے کہ پہلے کوآپریٹو ٹیچر پھر لیکچرار ہوئی اور سال بھر کے
اندر اس نے مختلف مراحل طے کرکے برطانیہ کی ایک یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ بھی حاص
لی...... ابا اس حق میں نہ تھے کہ وہ باہر جائے۔ بچے کا ساتھ تھا...... اسے چھوڑ کر جانا اور خود تنہا دیارِ غی
رہنا...... وقاص کو چھوڑ کر جانا تو خود تسنیم کے لیے بھی ایک کارِ گراں تھا مگر تقدیم نے ابا کو بھی سمجھایا اور
ہمت بھی بڑھائی...... ایسے مواقع زندگی میں بار بار تھوڑی ملتے ہیں...... اور وہ بھی ہر کسی کو نہیں...... مقد
یاور کو...... تسنیم کا مقدر بھی یاوری کر گیا تھا...... اس سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہوتا...... تسنیم چلی گئی تھی
وقاص نانا اور خالاؤں کے پاس رہا...... پاؤں جمتے ہی تسنیم نے انسانی حقوق کی تنظیم کا سہارا لے کر وقاص
اپنے پاس بلوالیا تھا۔ تعلیم کی تکمیل پر تسنیم کو برطانیہ ہی میں ملازمت کا ایک شاندار موقع میسر آگیا تھا۔
سے دوسرے پاکستانی طلبہ کی طرح جو وظائف لے کر اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک جاتے ہیں اور موقع ملے
وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تسنیم نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تھا...... وقاص کی اور وقاص کے حوالے سے
کی اپنی زندگی کی بھی ضرورت یہی تھی۔

وطن سے باہر نکل کر...... ایک ایسے دیس میں آکر...... جہاں بھانت بھانت کی اقوام کے افراد
دوسرے سے آکر ملتے ہیں...... تبادلۂ خیال کرتے ہیں...... ایک دوسرے سے سیکھتے اور سکھاتے ہیں......
سوچ میں بھی وسعت پیدا ہوئی تھی...... مزاج میں اعتدال آیا تھا...... اس نے جان لیا تھا کہ زندگی چاہتی
انسان اسے سلیقے سے برتے اور جو ایسا نہیں کرتا اسے وہ اپنے پیروں تلے روندتی آگے بڑھ جاتی ہے......
جان گئی تھی کہ زندگی میں انسان کو ہمیشہ وہی نہیں ملتا جو وہ چاہتا ہے...... جیت کے ساتھ ہار بھی ہوتی ہے
گوہرِ مقصود ہر ایک کے ہاتھ نہیں لگتا...... رسائی ہمیشہ ہی مقدر نہیں بنتی...... کبھی کبھی بلکہ اکثر نارسائی کے دکھ
ساتھ بھی جینا پڑتا ہے...... بھانت بھانت کے لوگوں سے میل جول اور تبادلۂ خیال نے تسنیم کو وسیع القلب
وسیع النظر بنا دیا تھا...... اپنے حقوق، اپنے جذبات، اپنے محسوسات کے ساتھ اس نے دوسروں کے حقو
جذبات اور محسوسات کا احترام کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ حقائق سے نظریں چرانے والے بزدل
کمزور ہوتے ہیں...... شکست ان کا مقدر بنتی ہے...... اس نے حقائق کو دل سے قبول کرنا سیکھ لیا تھا کہ حقائ
قبول کرلینے سے بڑی عافیت اور کوئی نہیں ہوسکتی انسانی زندگی کے لیے...... اس نے وقاص کی زندگی میں ا

ساتھ مدثر کی اہمیت کو بھی تسلیم کرلیا تھا...... خود اس نے مدثر سے اپنے سابقہ تعلق کے حوالے سے کبھی ملنے جلنے کی کوشش نہیں کی تھی...... وہ اس کے بیٹے کی ماں تھی اور بس...... اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ مدثر سے اسے باوجود کوشش بسیار نفرت نہیں ہوسکی تھی...... اسی لیے وہ اس سے میل جول کی موہوم سی بھی کوشش نہیں کرنا چاہتی تھی...... راکھ میں دبی چنگاری کو ہوا دکھانا سم قاتل بھی تو ہوسکتا تھا...... انسان تو انسان ہی ہے کسی بھی لمحے کمزور پڑسکتا ہے...... اس زندگی سے گزر کر دائمی زندگی کی طرف بھی تو جانا ہے...... مہینے کے آخری ہفتے مدثر اسکاٹ لینڈ سے آتا اور سنیچر کی سہ پہر وقاص کو اپنے ساتھ لے جاتا...... اتوار کی شام وہ اسے تسنیم کے فلیٹ کے دروازے پر تسنیم کے سپرد کرکے واپس چلا جاتا۔

''مم...... ڈیڈ ہمارے گھر میں کیوں نہیں رہتے......؟'' وقاص نہایت ذہین اور سمجھدار بچہ تھا اور ایک روز تسنیم سے بولا۔

سوال بہت گمبیھر تھا... جواب مشکل۔

اور وقاص زندگی کے گمبیھر سوالات کے مشکل جوابات کو سمجھنے کے لیے، بہت چھوٹا۔

''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے سنی...... مم اور ڈیڈ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔'' اس نے وقاص کے گمبیھر سوال کے مشکل جواب کو وقاص کے لیے آسان بنانے کی کوشش کی۔

''کیوں نہیں رہ سکتے؟'' وقاص نے پہلے سوال سے بڑھ کر گمبیھر سوال کیا۔

''یہ...... جب تم بڑے ہوجاؤ گے...... تب میں تمہیں بتاؤں گی۔'' اس نے وقاص کے سر کو بصد محبت چومتے ہوئے کہا۔

''میں بڑا ہوگیا ہوں۔'' وقاص نے جو اس ماحول میں ہوش سنبھال رہا تھا جہاں بچوں کو بڑا ہونے کی جلدی ہوتی ہے کہا۔

''ابھی تمہیں اور بڑا ہونا ہے۔''

''کتنا...... ڈیڈ جتنا؟''

''ہوں......''

''بتائیں ناں......'' وقاص ٹھنکا۔ ''ڈیڈ ہمارے گھر میں کیوں نہیں رہتے؟'' وقاص کے ذہن کی سوئی بڑی مستقل مزاجی سے اپنی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

''ہمارا گھر چھوٹا ہے ناں بیٹا...... ڈیڈ یہاں نہیں رہ سکتے۔''

''اچھا تو پھر ہم ڈیڈ کے گھر چلتے ہیں۔''

''ممکن نہیں۔''

''کیوں! ڈیڈ کا گھر تو بہت بڑا ہے۔ ڈیڈ کہتے ہیں ان کے گھر میں سوئمنگ پول بھی ہے۔''

تسنیم کی آنکھوں کے کنارے چپکے سے بھیگ گئے۔

''ڈیڈ کے گھر میں ان کی بیوی اور دو بچے بھی تو ہیں میری جان...... وہاں ہمارے لیے جگہ کہاں ہوگی۔''

بات وقاص کی سمجھ میں آگئی اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ آنسو تسنیم کی پلکوں کی اوٹ میں رک گئے۔

زندگی میں یہی ہوتا ہے۔ مرد بھول جاتا ہے، عورت دل سے لگا کر رکھتی ہے، مرد اگلا قدم بڑھانے میں

دیر نہیں کرتا، عورت اکثر ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

''اس سے کہو وقت ضائع نہ کرے...... آج نہیں تو کل اسے اپنے لیے نہ سہی وقاص کے لیے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت محسوس ہوگی۔'' ابا کو تسنیم کے دور چلے جانے کے بعد بھی اس کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ ابا کو یقین تھا کہ تقدیم کی بات وہ رد نہیں کر سکتی۔

''ابا...... وقاص کے لیے وہاں مدثر ہے، تسنیم نے وہاں رہنے کا فیصلہ بھی اسی لیے کیا کہ وقاص کا اس کے باپ سے تعلق برقرار رہ سکے۔''

''اپنی اولاد کا تو اس درجہ خیال...... بوڑھے باپ کی فکر کا کوئی خیال نہیں اسے......'' ابا کو شکوہ ہوتا۔

''سمجھتی ہے سمندر پار جا کر اپنی فکر بھی ہمارے دل سے نکال لے گئی ہے...... دن، رات میں نہ جانے کتنی مرتبہ دھیان جاتا ہے اس کی طرف...... رات کو آنکھ کھل جائے تو دھیان سیدھا اسی کی طرف جاتا ہے۔''

''وہ اپنی زندگی سے اب مطمئن ہے ابا۔'' تقدیم ابا کو تسلی دیتی۔

''مگر میں تو اس کی زندگی سے مطمئن نہیں ہوں بیٹی...... عورت تنہا محفوظ نہیں ہوتی۔'' ابا کہتے۔

''اللہ پر بھروسا رکھیں۔ دعا کریں اس کے لیے...... کہتے ہیں اولاد کے حق میں باپ کی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔''

''پانچوں وقت دعا کرتا ہوں۔'' ابا کی آواز کمزور پڑنے لگتی۔

''آپ کی دعا ضرور قبول ہوگی ابا...... آخر تمہید، تعظیم، تقدیس اور مونس کے لیے بھی آپ کی دعائیں قبول ہوئیں کہ نہیں۔''

''تم تو میری سب سے لاڈلی بیٹی ہو...... تمہارے لیے تو میرا رُواں رُواں دعا کرتا ہے...... تمہارے لیے میری دعا کیوں قبول نہیں ہوئی اب تک؟'' ابا کو تسنیم ہی کی نہیں اس کی بھی فکر لگی ہوئی تھی۔

تقدیم خاموش رہتی کہ کبھی کبھی کسی بات کے جواب میں کچھ نہ کہنا، کہنے سے بہتر ہوتا ہے۔

☆☆☆

تمہید اپنے گھر میں راج کر رہی تھی، تین بچے تھے، اپنی خدمت گزاری سے اس نے شوہر، ساس، سسر اور دیگر سسرالی رشتے داروں کے دل جیت رکھے تھے۔

''ہم چراغ لے کر بھی ڈھونڈتے تو ہمیں ایسی لڑکی نہ ملتی ثریا...... جیسی تم نے ہمیں گھر بیٹھے دلوا دی۔ دن رات، خوشی، غم کوئی موقع ہو دلہن کو پکارو ایک ہی جواب ملتا ہے...... جی اماں جی...... پھر ہم اسے دل سے کیوں نہ چاہیں...... ہمارے لیے تو ہماری یہ بہو بیٹی سے بڑھ کر ہے۔'' تمہید کی ساس اپنی بھتیجی ثریا سے کہتیں۔

تمہید کا یہ حال تھا کہ سسرال والوں کی خدمت اور عزت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتی۔ ساس، سسر کی بیماری، آزاری میں ایک ٹانگ سے کھڑی ہو جاتی...... چھوٹی نند کی شادی میں یوں بڑھ چڑھ کر کام کیا کہ کیا بہنیں کرتی ہوں گی، شوہر کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑتی۔ ''بلال کو اللہ نے اس کی نیکی کے انعام میں ایسی بیوی دی ہے۔'' دیکھنے والے رشک سے کہتے۔

''جسے اچھی بیوی مل گئی اسے تو اس دنیا میں ہی جنت مل گئی۔'' سسر کہتے۔

تمہید نے اپنے گھر کو جنت ہی بنا رکھا تھا۔ صاف ستھرا، سلیقے سے سجا، ضرورت کی ہر شے موجود مگر کفایت کے ساتھ...... کوئی چیز ضائع نہ ہونے دیتی...... شوہر کی کمائی کا درد رکھتی...... ساس، سسر کی اموال بھی دیانت اور احتیاط کے ساتھ استعمال میں لاتی۔ جیٹھ جیٹھانی اور ان کے بچے گھر آتے تو ان کو تعظیم اور محبت دیتی۔

نندیں میکے آتیں تو ناک بھوں چڑھانے کے بجائے انہیں خوش آمدید کہتی اور ان کی خاطر داری میں لگ جاتی۔ بچوں کی پرورش اور تربیت میں بھی انہماک سے کام لیتی...... اس کی سسرال میں اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی تمیزداری کی مثالیں دی جاتیں۔

''دو بہوئیں ہیں میری...... لیکن جو بات چھوٹی دلہن کی ہے وہ بڑی کی نہیں۔'' ساس علی الاعلان کہتیں۔

سسرال میں تمہید کی برتری نے اس کہاوت پر مُہر لگا دی تھی کہ چاند نہیں چاند کا کام پیارا ہوتا ہے۔

یہ بات نہیں کہ تمہید زندگی کی ہمہ وقت مصروفیت سے تھکتی نہیں تھی یا اسے کولھو کے بیل کی طرح ہر وقت جُتے رہنے سے کبھی غصہ نہیں آتا تھا...... انسان تھی...... گوشت پوست کی بنی...... اکثر تھک بھی جاتی تھی...... غصہ بھی آتا...... یہ کیا ہر وقت کام، کام، کام...... مگر اپنی پیشانی پر شکن نہ آنے دیتی...... اللہ بخشے اماں کو وہ اس کی طرف سے بہت مطمئن رہیں۔

''یہاں بھی تو تم نے سب کی اتنے سال خدمت کی...... مجھ سمیت کسی نے کبھی تمہارے ویسے گُن نہیں گائے جیسا کہ حق بنتا تھا...... زیادہ سے زیادہ یہی کہ تمہید نے پورا گھر سنبھال رکھا ہے...... کبھی ہم میں سے کسی نے شکریہ ادا کیا یا تمہاری خدمت گزاری کو اپنا حق جانا...... سسرال میں خدمت کرو گی تو پھل پاؤ گی...... راج کرو گی مثالیں دیا کریں گے لوگ۔'' شادی کے بعد ایک دن انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

''ہاں بیٹی......'' ابا نے بھی اس کی ذہنی تربیت میں اپنا حصہ ڈالا۔ ''اپنی ذات کی نفی کرنی پڑتی ہے، تب کہیں جا کر سونا کندن بنتا ہے۔ دانۂ گندم خاک بسر ہو کر گل و گلزار ہوتا ہے۔''

''آخر وہاں بھی تو سب کی خدمت کرتی تھی یہاں خدمت کا ثمر تو مل رہا ہے۔'' جب کبھی تھکنے لگتی...... انسان ہونے کے ناتے جھنجلاہٹ اور غصہ طاری ہونے لگتا تو وہ اپنے آپ کو اماں کی بات دُہرا کر سمجھاتی۔

سب سے شیریں ثمر تو اس کے لیے بلال کی زبانی اپنی تعریف و توصیف ہوتی۔ دینداری کے سبب اس کی گفتگو میں ہمیشہ قرآن و حدیث کا حوالہ ہوتا۔ ''نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص خوش قسمت ہے جسے اچھی بیوی مل جائے...... اس اعتبار سے میں بہت خوش قسمت ہوں۔''

کون کہتا ہے کہ عورت، مرد کو اپنے حُسن سے جیتتی ہے۔ عورت، شوہر کو اپنی خدمت، اپنے کردار سے مسخر کرتی ہے...... اور جس نے شوہر کو جیت لیا وہ عورت ساری دنیا کو خرید کر اپنی جیب میں ڈال سکتی ہے۔

تمہید کا اپنی سسرال میں اسی حُسنِ سلوک کا ثمر تھا کہ تمہید کی خلیری ساس جن کا اس کی سسرال میں کافی آنا جانا تھا تمہید کے حُسنِ سلوک و عادات و کردار سے متاثر ہو کر تعظیم کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ دینے پر مجبور ہوئی تھیں۔ لڑکا دبئی میں پیٹرولیم انجینئر تھا۔

''بھائی صاحب! ہم آپ سے کچھ نہیں مانگتے...... بس لڑکی اور لڑکی کے بارے میں بھی ہمارا بس اتنا ہی اطمینان بہت ہے کہ تمہید کی بہن ہے۔'' رشتہ دیتے وقت انہوں نے ابا سے کہا تھا۔

لڑکیاں اپنی سسرالوں میں چھوٹی بہنوں کے لیے یونہی حوالہ بنتی ہیں۔

شادی کے بعد تعظیم اپنے شوہر کے ساتھ دبئی چلی گئی تھی...... بہت خوش تھی...... نوید تھی کہ امید سے تھی...... بے فیض اور ناشکری نہ تھی...... برملا اعتراف کرتی کہ اتنا اچھا گھر اسے اللہ کی مہربانی اور سسرال میں تمہید کے رویئے کے طفیل ملا تھا۔

تقدیس کی شادی بھی ہو گئی تھی...... اس ادارے کے توسط سے جو تقدیم کی زندگی میں ایک مشن، ایک

مقصد کا درجہ اختیار کر چکا تھا...... ''دردمند'' عوام الناس کے لیے دیگر رفاہی کاموں کے ساتھ رشتے ناتے کرانے میں رابطہ کار اور مشاورت کا فریضہ بھی انجام دیتا تھا...... اس ادارے کو بجا طور پر تقدیم کا ''بے بی'' کہا جا سکتا تھا۔ اسی نے اس ادارے کے قیام کی تجویز و خواہش ظاہر کی تھی...... ادارہ قطعاً نجی بنیادوں پر ذاتی وسائل سے قائم کیا گیا تھا۔ ابتدا میں اس ادارے کے قیام کے لیے وسائل اویس انصاری نے فراہم کیے تھے۔ اب مخیّر افراد بھی بہ ضرورت دامے، درمے، سخنے اعانت کرتے تھے۔ اپنے طریق کار اور پالیسیوں میں آزاد اور خود مختار رہنے کی خاطر کسی ملکی یا غیر ملکی فنڈنگ ایجنسی سے مکمل احتراز تھا...... تقدیم نے اپنی سابقہ ملازمت کو خیرباد کہہ کر اس ادارے کے قیام کے روزِ اوّل سے اس کی زمامِ کار سنبھالی تھی۔ پہلے دن وہ اکیلی تھی اب ادارے کا اسٹاف بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ دو گاڑیاں ادارے کی ملکیت تھیں جن میں سے ایک شہر کے ایک معروف صنعت کار کی عطیہ کردہ تھی۔ اویس انصاری، جب ممکن ہوتا اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے وقت نکال کر اس ادارے کو وقت دینے کی کوشش کرتا۔ ادارے کے توسط سے اس کی اپنی دو بہنوں کی شادیاں انجام پا چکی تھیں۔ وہ ادارہ جس کے قیام کی تجویز پر تقدیم کے سابقہ دفتر کے ساتھیوں نے اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تھی اپنے دائرۂ کار میں وسعت پیدا کر کے اپنے مقاصد کے تعین کے بعد اعتماد سے سفر کر رہا تھا۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ ادارے کے قیام کی تجویز کا مذاق اڑانے والے اب خود بھی اس کے نیازمندوں میں تھے۔ زندگی میں پہلا قدم گرنے کے خوف، راستے کی اونچ نیچ کے اندیشوں اور بے یقینی کے ساتھ ہی اٹھتا ہے لیکن جب یہ طے ہو جائے کہ بہر طور چلنا ہے تو پھر ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا قدم اٹھتا چلا جاتا ہے...... سفر طے ہونے لگتا ہے...... منزلِ مراد ایک نہ ایک دن مل ہی جاتی ہے۔

☆☆☆

راہ گم کردوں کا منزل تک پہنچنا ویسا ہی مشکل ہو جاتا ہے جیسا عباد کے لیے ہوا تھا۔ عباد کا وہ حساب ہوا جان بچی سو لاکھوں پائے...... برٹش نیشنلٹی کے انتظار میں وہ اپنی بگڑی بیوی کو بہ مشکل ڈیڑھ برس ہی برداشت کر سکا پھر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور ایسا بھاگا کہ طلاق بھی پاکستان آ کر بھجوائی۔ دوبارہ نوکری کی تلاش شروع کی تو امی کی دعاؤں نے کام دکھایا، پہلے ایک مقامی ادارے میں ملازمت ملی کچھ ہی عرصے بعد سعودی عرب میں نوکری مل گئی۔ امی نے اسے خوشی، خوشی سعودی عرب جانے کی اجازت دی کہ ایک تو انہیں عباد کے انگلینڈ جانے اور ڈیڑھ برس وہاں گزارنے سے اکیلے رہنے کی عادت بھی ہو گئی تھی۔ دوسرے عباد کے سعودی عرب جانے سے انہیں خود بھی عمرہ اور حج پر جانے کی امید بندھ گئی تھی۔ آخری عمر میں ہر مسلمان کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ زندگی تمام ہونے سے پہلے ایک بار بیت اللہ شریف اور گنبدِ خضرا کا دیدار کر لے۔

پہلے سال اپنی چھٹی کے دوران عباد نے امی کی اس آرزو کو پورا کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ سالانہ چھٹی پر خود پاکستان آنے کے بجائے اس نے امی کو سعودی عرب بلا لیا تھا۔ انہیں عمرہ کرایا، روضۂ رسولؐ پر حاضری کے لیے مدینہ شریف لے گیا۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں زیارات دکھائیں، انہیں ڈھیروں شاپنگ کرائی، تمام رشتے داروں کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات ضرور خریدوائی۔ امی اسے پھلنے، پھولنے، خوش رہنے اور پچھلے دکھ بھول جانے کی دعائیں دیتے نہ تھکتیں۔ سعودی عرب سے واپسی سے قبل امی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کا گھر دوبارہ بسے دیکھنا چاہتی تھیں۔

عباد کے لیے پہلی شادی کا تجربہ اتنا تلخ تھا کہ ابھی کچھ عرصہ وہ دوبارہ اس تجربے سے گزرنے کا خطرہ

مول نہ لینا چاہتا تھا۔ امی نے محبت اور دلسوزی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بیٹا! وہ فیصلہ ہی غلط تھا۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ بیٹی اونچے گھر میں دو، بہو دبتے گھر کی لاؤ...... یعنی لڑکے کی شادی ہمیشہ اپنے سے دبتے گھر میں کرنی چاہیے تاکہ آنے والی لڑکی شوہر کو اپنے پاؤں کی جوتی سمجھنے کی کوشش نہ کرے...... تم نے پیسے میں بگڑی اور وہ بھی موئے ولایت کی لڑکی سے شادی کی غلطی کی، اس نے تو نخرے دکھانے ہی تھے۔''

''نخرے!'' عباد کو نورین کے ساتھ گزارے دنوں کی تلخی اپنی زبان پر محسوس ہوئی۔ ''امی وہ تو کوئی بلا تھی بلا...... اس نے تو میرا اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا عذاب کر دیا تھا...... جنگلی بلی کی طرح اپنے پاؤں کا پنجہ مار کر مجھے جگاتی...... مجھے فِلدی پیکی کہتی۔''

''کیا مطلب؟'' امی نے عباد سے فلدی پیکی کا مطلب پوچھا۔

''مجھے پاکستانی ہونے کا طعنہ دیتی تھی۔'' عباد نے شرمندگی سے بتایا۔

''ہائے! تو کیا وہ خود انگریز تھی۔''

''وہ سمجھتی تو یہی تھی...... کالی انگریز...... کہتی تھی میرا وطن پاکستان تھوڑی ہے انگلینڈ ہے۔''

''لعنت......!'' امی نے بے ساختہ کہا۔

''امی! یہ وہاں بے شمار پاکستانی گھرانوں کا مسئلہ ہے...... ان کی اولاد خود کو انگریز ہی سمجھتی ہے...... بلکہ کبھی کبھی تو ان کے کرتوت گوروں کو بھی شرمانے لگتے ہیں۔ انگریز اگر جرمنی یا فرانس میں بھی رہے تو وہ جرمنی یا فرانس کو اپنا وطن قرار نہیں دے گا۔ کبھی انگلینڈ کو برا نہیں کہے گا مگر پاکستانی نوجوان...... بلکہ بعض ادھیڑ عمر اور بوڑھے بھی وہاں بیٹھ کر غیروں کے سامنے پاکستان کو برا کہتے ہیں...... خود کو برٹشر کہنے میں فخر سمجھتے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھی۔''

''شکر ہے تمہاری جان چھوٹی۔''

''جان بھی نہیں چھوڑتی تھی امی...... کہتی تھی تمہاری تو ہڈیوں کا شوربہ بنا کر پی جاؤں گی۔''

''ہائے کمبخت...... آدم خور تھی کیا؟''

''بس امی اللہ نے بچا لیا...... اتنی بدتمیز تھی کہ آپ تصور نہیں کر سکتیں...... مجھے تو اس کے ماں، باپ پر ترس آتا تھا...... سارا وقت اس کی بدتمیزیاں سہتے اور ناز برداریوں میں لگے رہتے...... مجھ سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگتے کہ ہماری خاطر اسے برداشت کرو۔''

''برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے بیٹے۔''

''ٹھیک کہتی ہیں آپ...... جب ناقابلِ برداشت ہو گیا تو میں چپ چاپ نکل آیا...... مگر اسے طلاق دینے کا اس کے والدین کو جو صدمہ ہوا اس پر مجھے بہت ہی افسوس رہا...... رو رہے تھے اس کے والد جب انہوں نے طلاق نامہ ملنے کے بعد مجھے وہاں سے فون کیا۔''

''اللہ ایسے ماں، باپ کے حالوں پر رحم کرے...... ویسے بیٹا اولاد کو بگاڑنے میں غلطی ماں، باپ ہی کی ہوتی ہے...... اولاد جہاں پہلی غلطی کرے ماں، باپ کو اس کا کان پکڑ لینا چاہیے۔''

''لیکن اس بگاڑ کا کیا علاج امی جو اس وقت رونما ہو جب ماں، باپ اولاد کا کان بھی نہ پکڑ سکتے ہوں...... میں تو بڑا ہو کر ہی بگڑا تھا ناں۔''

"تم جیسی اولاد تو اللہ ہر ماں کو دے۔" امی نے عباد کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں اس وقت صحنِ حرم کے ایک دور افتادہ گوشے میں بیٹھے دکھ سکھ کی باتیں کر رہے تھے۔

"مجھے معاف کر دیں امی...... مجھ سے بھول ہوئی جو میں نے آپ کا پڑھایا ہوا صبر و شکر اور قناعت کا سبق بھول کر لالچ اور طمع کا سبق پڑھنے کی کوشش کی...... سوری امی...... میں غلط تھا آپ ٹھیک کہتی تھیں...... میں اپنی وراثت کو درست کرنے کی کوشش کروں گا۔" عباد نے امی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگالیا اور رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا مطلب؟" امی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"آپ نے ایک روز کہا تھا ناں...... میں اپنے باپ پر گیا ہوں...... وہ بھی مادّہ پرست تھے...... کوشش کروں گا کہ میرے بچوں کو ان کی ماں کی طرف سے باپ کا طعنہ نہ ملے...... میں نے اپنے دل سے لالچ نکال پھینکی ہے امی کیونکہ اللہ نے مجھے اپنے در سے بہت نواز دیا ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"تم نے اسی سے مانگنے کی نیت جو کی ہوگی۔" امی نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"ایک بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔" عباد چونک کر حیرانی سے امی کو دیکھنے لگا۔

"کیا......؟"

"آپ میرے دل کی بات کیسے بوجھ لیتی ہیں؟"

"ماں ہوں تمہاری...... میرے دل کی دھڑکنوں نے تمہیں زندگی دی ہے...... میں نہیں تو پھر کون بوجھے گا تمہارے دل کی بات۔"

عباد نے اپنا سر جھکا کر ہونٹ امی کے ہاتھ کی پشت سے انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ مَس کر دیے۔

"بس اب کسی اچھی سی نیک لڑکی کے ساتھ دوبارہ اپنا گھر بسانے کی سوچو......" امی نے کہا۔

"انشاء اللہ اگلے سال جب چھٹی پر گھر آؤں گا تو آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا...... پھر میری ایک خواہش ہوگی۔"

"وہ کیا......؟"

"آپ، میں اور وہ مل کر حج کریں۔"

"اللہ کو منظور ہوا تو یہ بھی ہو جائے گا۔"

عمرہ ادا کرنے کے بعد امی سعودی عرب سے ایسی نہال لوٹیں کہ دیکھنے والوں کو رشک ہوا۔

برس بھر اور گزر گیا دوسرے سال عباد چھٹی پر وطن آیا تو اس نے امی کی خواہش پوری کرنے سے پہلے بڑا گھر خریدنا ضروری سمجھا۔ نیا لگژری اپارٹمنٹ جس میں ڈرائنگ، ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج اور دو بیڈ رومز مع اٹیچڈ باتھ تھے۔ پسند کرنے اور خریدنے میں بیس بائیس دن لگ گئے۔ چھٹی ختم ہونے میں صرف آٹھ دن رہ گئے تھے اور آٹھ دن میں شادی کے لیے لڑکی تلاش کرنا اور پھر شادی کے مراحل سے نمٹنا مشکل تھا سو عباد نے امی سے وعدہ کیا کہ اگلے برس وہ صرف اور صرف شادی کے پروگرام سے پاکستان آئے گا۔

☆☆☆

ماؤں کے لیے اپنے بچوں کو ان کے گھروں میں آباد دیکھنے سے بڑی خوشی اور کوئی نہیں ہوتی۔ رباب کے انجینئرنگ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوتے ہی اس کے لیے ایک ہم جماعت نوجوان انجینئر بابر رضا کا رشتہ آگیا۔ اس

رشتے میں دونوں کی باہمی پسند کا دخل زیادہ تھا۔ امی کو رباب سے زیادہ حجاب کی فکر تھی۔ رباب کا رشتہ منظور کرنے کے بعد شادی کو ایک دو برس تک مؤخر کیا جا سکتا تھا مگر حجاب کے پاس وقت نہیں تھا۔ شادی کی عمر نکلی جا رہی تھی۔ سر میں اب سفید بال بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ بال دھونے کے لیے نت نئے شیمپو استعمال کرنے کی وبا ایسی عام ہوئی تھی کہ لڑکیوں کے بال وقت سے پہلے ہی سفید ہونے لگتے۔ حجاب کو بالوں میں سفیدی چمکنے یا سیاہ ہی رہنے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس نے ساری زندگی شادی نہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ رباب کا رشتہ آنے پر اسی نے امی کو سمجھایا۔

"لڑکے کے بارے میں چھان بین کرالیں۔ اطمینان ہو جائے تو بسم اللہ کریں۔"

"اور تم......؟" امی کے اس دو لفظی سوال میں ان گنت سوال، بے شمار افکار لرزاں تھیں۔

"میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں امی، میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔" اس نے کہا۔

"یہ تم کہتی ہو...... میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"کیوں......؟"

"کیونکہ ماں ہوں...... ایک ماں کے لیے بیٹیوں کی فکر سے بڑی فکر کوئی اور نہیں ہوتی۔"

"رباب کی کر دیں...... میں اب بھی شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔"

"یہ تو میں تم سے بار بار سنے جا رہی ہوں۔"

"تو پھر بار بار کیوں کہتی ہیں؟"

"آج تو میں بیٹھی ہوں...... کل جب نہیں ہوں گی...... رباب بھی اپنے گھر کی ہوگی تو تم اکیلے کیسے رہوگی؟"

"آپ کہیں نہیں جا رہیں۔"

"ماں، باپ سدا کسی کے بیٹھے رہے ہیں؟"

"میری ماں رہے گی۔"

"ہذیان مت بکو...... کُل نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔"

"میں اور آپ ساتھ ساتھ جائیں گے۔"

"کسی کو کسی کا پتا نہیں ہوتا...... عورت ذات اکیلی نہیں رہ سکتی...... نہ بھائی خیال رکھ سکتا ہے، نہ بہن کو اس کا گھر چھوڑتا ہے کہ پلٹ کر خبر لے...... بہتر ہے ابھی اپنی فکر کرلو ورنہ پچھتاؤ گی۔"

"فیصلہ میرا اپنا ہے اس لیے کسی اور کو دوش نہیں دوں گی۔"

"خود پر نہیں تو مجھی پر رحم کھاؤ...... سکون سے مرنا چاہتی ہوں۔" امی لجاجت سے کہتیں۔ امی کے روزانہ اصرار اور رباب کے لیے دیر ہوتے دیکھ کر بالآخر اس نے امی سے اپنے دل کی بات شیئر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"آپ اصرار تو کرتی ہیں امی...... یہ تو سوچیں دوسرے آدمی نے اگر کبھی مجھے میری پچھلی زندگی کے حوالے سے کچھ کہہ سن دیا تو میں کہاں جاؤں گی۔"

امی اس کا منہ دیکھنے لگیں۔

"ایسا ہو سکتا ہے...... بلکہ ہوگا...... لوگ کسی کو بخشتے تھوڑی ہیں...... طعنے دینے سے نہیں چُوکتے...... بات کو کتنا ہی چھپاؤ کہیں نہ کہیں سے نکل ہی جاتی ہے۔ مجھے جو سہنا تھا سہہ چکی...... اب اگر کوئی طعنہ ملا تو میں زہر کھالوں گی۔"

"پاگل پن کی باتیں مت کرو، زہر کھانے والے کی عاقبت بھی خراب۔"

"مجھے ایسے ہی زندگی گزارنے دیں...... کم از کم عاقبت تو خراب نہیں ہوگی۔"

امی اداس دکھائی دینے لگیں۔

"رباب کو نمٹائیں...... لڑکا اچھا ہے تو دیر نہ کریں...... اس کے لیے دیر ویسے بھی نہ کریں...... بھنگ مارنے والے بھی بہت ہوتے ہیں...... کسی نے کہہ سن دیا کہ لڑکی کی بہن کا تو یہ قصہ رہا تو اس بے چاری کے لیے بھی مشکل ہو سکتی ہے۔"

امی اور بھی دل گرفتہ ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

"پلیز......! اتنا ترس کھا کر نہ دیکھیں مجھے کہ میں خود کو اس دنیا کی مظلوم ترین، محروم اور کمزور ترین مخلوق سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں...... کیا میرے بارے میں آپ کے اطمینان کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ میں زندہ ہوں اور خوش ہوں۔" وہ مسکرا دی۔

امی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پلیز......" حجاب نے اپنی بانہیں امی کے گلے میں حمائل کر دیں اور آہستگی سے ان کا رخسار چوم کر بولی۔ "میرے اس یقین کو برقرار رہنے دیں کہ میرے اور میری ماں کے درمیان کوئی کمیونیکیشن گیپ نہیں...... میری ماں میری بات کو سمجھ سکتی ہے۔"

خاصے دن معاملہ اٹکا رہا...... بالآخر امی کو رباب کی شادی کے لیے تیار ہونا پڑا۔ رباب کی با برضا شادی ہو گئی۔ رباب کی ساس تنک مزاج ریٹائرڈ ہیڈ مسٹریس تھیں مگر سسر کمال کے آدمی تھے۔ اپنی فہم و فراست سے بیگم کا مزاج ہی نہیں گھر کے تمام معاملات کو قابو میں رکھتے۔ رباب پر اپنی نگاہِ شفقت رکھتے اور ساس بہو کے معاملات کو ہر قسم کی ناگواری سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے۔ رباب اور اس کے میاں میں غضب کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ دونوں خوش تھے۔ بیٹے کی پیدائش نے ان کی زندگی کو اور باغ و بہار کر دیا تھا۔

گھر میں اب حجاب تھی اور روز بروز گھلتی ہوئی امی...... دونوں کی خیر خبر لینے کو کبھی بھجت بھائی چکر لگا لیتے کبھی نایاب باجی آ جاتیں کبھی رباب اپنے میاں اور بیٹے کے ساتھ ملنے آ جاتی۔ حجاب کی ملازمت جاری تھی البتہ اسکول اب وہ نہ تھا۔ اگلے گریڈ میں ترقی ملنے پر اس کا تبادلہ دوسرے اسکول میں کر دیا گیا تھا۔ وہ تبادلے سے ناخوش نہ ہوئی کہ تبادلہ محکمہ جاتی ضرورت سے زیادہ اس کی اپنی ضرورت بھی تھی۔ گھریلو امور اب امی سے زیادہ خود اس نے سنبھال لیے تھے۔ امی کا تو اب آرام کا وقت تھا۔ ساری زندگی انہوں نے کام ہی کام کیا تھا۔ حجاب کا چھٹی والا دن آئندہ ہفتے کی تیاری میں گزر جاتا۔ سودا سلف خرید کر لانا...... ایک دو ہانڈیاں پکا کر فریج میں رکھ دینا...... کبھی کبھار اسے واپسی میں دیر بھی ہو جاتی تھی۔ کھانا پکا رکھا ہوتا تھا تو اسے یہ فکر نہیں ہوتی کہ امی کو خود پکانا پڑے گا۔ گو امی اب بھی گھر کے کام کاج کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی تھیں مگر پہلے جتنی توانا نہ رہی تھیں۔ تیزی سے ان کی قربھی کم ہوئی تھی اور تیزی سے عوارض حملہ آور ہوئے تھے۔ بلڈ پریشر، جوڑوں کا درد اور آنکھوں میں موتیا بند...... بڑھاپا آدمی کو کتنی سرعت سے ڈھیر کرتا ہے۔ کبھی جو فرصت ملتی یا رباب ایک آدھ دن کو امی کے پاس رہنے کو آئی ہوتی تو حجاب کو امی کے اکیلے پن کی فکر نہ ہوتی اور وہ تقدیم سے ملنے چلی جاتی۔ کبھی کبھار تقدیم بھی آ جاتی۔

"تقدیم کیا تم دونوں نے کنوار کوٹھڑے چنوانے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔" امی کہتیں۔

تقدیم ہنس دیتی۔

"مجھے تو آپ الزام نہ دیں...... میں نے تو آپ کی بات مان لی تھی۔" حجاب کہتی۔ "ہاں اسے ضرور پکڑیں...... اسے آخر کیا مسئلہ ہے؟" وہ تقدیم کی بابت کہتی۔

"یہ مجھ جیسی ماؤں کی دعائیں سمیٹنے میں لگی ہے...... ہاں بھئی کتنے نئے رشتے کروا دیے؟" امی تقدیم سے محبت سے پوچھتیں۔

تقدیم اپنی کارگزاریوں کا احوال امی کو سنانے لگتی۔

"بھائی بہن ٹھیک ہیں؟" امی اس سے گھر والوں کا حال چال پوچھتیں۔

"جی آنٹی......"

"مونس کہاں ہے آج کل؟" امی کو مونس کا احوال بطورِ خاص پوچھنا نہ بھولتا۔

"کھاریاں پوسٹنگ ہوئی ہے۔"

"بھابی تو تمہاری اچھی ہے ناں؟"

"بہت اچھی آنٹی...... گھر کی لڑکی ہے ناں۔"

"بیٹا! بات گھر کی یا باہر کی نہیں ہوتی...... فطرت کی ہوتی ہے، لڑکی کی تربیت کی ہوتی ہے، پھوپی تمہاری اچھی ہو گی...... اس نے بیٹی کی تربیت اچھی کی ہو گی۔"

"ٹھیک کہتی ہیں آنٹی......" تقدیم کو امی سے اتفاق کرنا پڑا۔

"اللہ بخشے حجاب کے بابا کہا کرتے تھے کہ لڑکے کی شادی کرتے ہوئے لڑکی کو نہیں اس کی ماں کو دیکھو...... ماں اچھی ہو گی تو لڑکی لازماً اچھی ہو گی۔"

"اور ہمارے ابا کہتے ہیں آخر میں ہر لڑکی اپنی ماں کا نقش بن جاتی ہے۔" تقدیم بولی۔

"بالکل ٹھیک...... یہ جو مرد ہوتے ہیں ناں بیٹا...... ہم عورتوں کے بارے میں ان کا تجربہ، ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہوتا ہے...... اچھا بس...... بہت نیک کام کر چکیں اب تم خود بھی شادی کرو۔" امی نے اچانک ہی موضوع بدل دیا اور تقدیم کو سمجھانے لگیں۔ "وقت نکلا جا رہا ہے بیٹا...... عورت کی جوانی ہی کتنی ہوتی ہے...... پھول کی طرح مختصر...... تمہارے والد کو بھی تمہاری اسی طرح فکر رہتی ہو گی جیسی مجھے اس کی رہتی ہے۔" امی کی مراد حجاب سے تھی۔

"کوئی اچھا رشتہ ملنے دیں مجھے...... اس کے شایانِ شان...... پھر دیکھوں گی کیسے نہیں کرتی ہے یہ۔"

تقدیم نے بڑے مان سے حجاب کو دیکھا۔

"بس، بس۔" حجاب مسکرائی۔

"بس، بس کی بات نہیں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"تم سے کیا چھپانا تقدیم...... تم تو میری اپنی بیٹیوں کی طرح ہو...... یہ کہتی ہے دوسرے آدمی کو اگر پچھلی باتوں کے بارے میں کوئی سن گن مل گئی تو وہ طعنے دے گا۔"

"سارے مرد کم ظرف نہیں ہوتے آنٹی۔"

"یہی میں بھی سمجھاتی ہوں اسے...... ہو سکتا ہے کوئی ہمدرد اور مہربان آدمی مل جائے جو اسے طعنے دینے کے بجائے سر آنکھوں پر بٹھائے۔"

"کیوں اچھوتے خواب دیکھتی ہیں امی...... دنیا بہت ظالم، بڑی بے درد ہے۔ اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا اسے اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آ جاتا ہے۔" حجاب کے لہجے میں تلخی تھی۔

"سنکی ہو تقدیم۔"

"آپ فکر نہ کریں آنٹی...... بس کوئی کام کا بندہ ہاتھ آنے دیں میرے۔"

"اللہ کرے جلدی آئے۔"

"تم نے ایسا ٹوٹکا بتادیا ہے امی کو کہ اٹھتے بیٹھتے اب یہی دعا کریں گی کہ تقدیم کے ہاتھ کوئی بندہ آئے۔" تقدیم مسکرائی۔

"کریں آنٹی...... ڈٹ کر کریں...... اللہ تعالیٰ آپ کی ضرور سنے گا۔"

"تقدیم کی بچی۔" حجاب نے اسے گھورا۔

"تقدیم تو ابھی خود بچی ہے سرکار۔"

"سرکار!"

حجاب کو جیسے جھٹکا لگا۔

یہ لفظ تو الطاف اکثر استعمال کیا کرتا تھا اس سے بات کرتے ہوئے...... ان دنوں جب حالات بگڑے نہ تھے...... جب وہ رومینٹک ہونے کی کوشش کیا کرتا تھا ان دنوں۔

آہ...... زندگی نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

حجاب کا یک لخت بجھ جانے والا چہرہ دیکھ کر تقدیم کو ہزاروں میل دور بیٹھی بہن تسنیم یاد آگئی...... بربادی کے بعد اس کے چہرے پر بھی کچھ ایسا ہی منظر ٹھہر گیا تھا۔ نہ جانے اب بھی منظر بدلا ہوگا کہ نہیں...... کبھی سوچا تھا کسی نے کہ ایک چھوٹے سے گھر میں کھلی بساط پر دھرے مہروں کو زندگی کی چال یوں گڈمڈ کردے گی کہ نقشہ کچھ سے کچھ ہوجائے گا...... کتنے حیات افزا تھے وہ دن جب اماں زندہ تھیں...... جب زندگی ابھی دو گام ہی چلی تھی...... وسائل کم تھے...... مسائل بھی کم...... توازن اور عدل قانونِ فطرت جو ہے...... ان دونوں گھر کا سب سے بڑا مسئلہ تسنیم کی خودغرضی، تنگ مزاجی اور بھائی بہنوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہوا کرتے تھے۔

یہ چیز یہاں رکھی تھی وہاں کس نے رکھ دی...... یہ میرا کمرا ہے، وہ میرا تکیہ ہے...... آج پھر دال پکالی...... سالن بدمزہ ہے، مجھے پراٹھا نہیں کھانا...... میرے موبائل کو کیوں چھیڑا...... اور ایسی ہی بے شمار فضول اور لایعنی سی باتیں بھلا یہ بھی کوئی جھگڑے کی باتیں تھیں...... وہی تسنیم جو اکیلے پورے ایک کمرے پر قابض رہا کرتی تھی...... دومنٹ کو کسی بھائی، بہن کو اپنے کمرے میں برداشت نہ کرتی تھی اپنوں سے دور پردیس میں اکیلی پڑی تھی۔ دو کمروں کے ایک فلیٹ میں جن میں سے ایک میں وہ اور وقاص لیٹتے بیٹھتے تھے دوسرا خالی پڑا رہتا تھا۔

"ابا کے ساتھ کچھ دنوں کو یہاں آجاؤ میرے پاس...... کوئی اپنا ہے ہی نہیں...... ترس گئی ہوں کسی اپنے سے بات کرنے کو۔" تقدیم سے وہ کتنی لجاجت سے کہتی۔

"وقاص ہے ناں۔" تقدیم اس کا حوصلہ بندھاتی۔

"نا سمجھ ہے...... میرا تو جی چاہتا ہے کوئی اپنا ہو تو اس سے ڈھیروں باتیں کروں۔" زندگی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب تسنیم کسی اپنے کی بات سننا بھی پسند نہیں کرتی تھی اور ایک یہ وقت کہ وہ کسی اپنے سے بات کرنے کو ترس گئی تھی۔

ایک گھر میں رہنے والے کہاں کہاں بکھر گئے تھے۔ کوئی یہاں...... کوئی وہاں...... اماں کا جسدِ خاکی سارے رشتے ناتے توڑ کر منوں مٹی تلے...... روح ایک لمبے سفر پر...... مونس اپنی شریکِ زندگی خوش بخت اور گڑیا سی بیٹی کے ساتھ مگن...... تمہید اور تقدیس اپنی اپنی زندگی میں گم اور تعظیم دبئی کی ہوش ربا فضاؤں کی باسی...... تمہید جب خانہ دارانہ ذمے داریوں سے جھنجلانے لگتی تھی اور کسی چھوٹی بہن کا رشتہ آنے پر رونے بیٹھ جاتی تھی تو اسے

بتا تھا کہ اماں کے معذور ہونے کے بعد اس کے سر پر آپڑنے والی خانہ دارانہ ذمے داریاں تو دراصل ایک چھوٹی سی آزمائش تھی جس کے صلے میں اسے بلال جیسا شوہر اور اس کے گھر والوں جیسی ٹھنڈی سسرال ملنی تھی......؟ تعظیم اور تقدیس کو بھی اماں کی آخری علالت کے دوران ان کی خدمت کا حقِ خدمت مل گیا تھا...... ایک ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے...... ایک ہی گھر کی چار دیواری میں پلنے بڑھنے والے کہاں، کہاں چلے گئے تھے...... زندگی کا نقشہ کتنا بدل گیا تھا...... ایک گھر کی بساط پر مہروں کی طرح دھرے انسان اگر یہ جان لیں کہ زندگی کی چال انہیں ایک جگہ پر قائم نہیں رہنے دے گی...... ان کی جگہیں بدلتی جائیں گی...... برس بعد...... دو برس بعد...... پانچ سال بعد...... دس سال بعد...... کوئی یہاں ہوگا کوئی وہاں...... ماں، باپ سدا کس کے رہتے ہیں...... بہن، بھائیوں کی رفاقت بھی مختصر ہوتی ہے...... محض چند برسوں بعد ہر ایک کی اپنی، اپنی زندگی ہوتی ہے...... قیام مختصر ہونے کا احساس رہے تو شاید ایک گھر میں رہنے والے انسانوں کے باہمی جھگڑے گھٹ جائیں...... ایک دوسرے سے محبت بڑھ جائے...... ہر ایک اپنی، اپنی دنیا کا اسیر نہ ہو...... تسنیم کی طرح کوئی لڑکی گھر کے حبس سے گھبرا کر باہر جھانکنے کی کوشش میں اندھیری کھائی میں نہ جاگرے...... اور انسان بعد کے پچھتاوؤں سے بچ جائے...... جیسا کہ تقدیم بڑی حد تک بچی ہوئی تھی...... بہت کم ایسا ہوا تھا کہ اس کی کسی بھائی، بہن سے کوئی جھڑپ ہوئی ہو۔ اماں، ابا کی بے ادبی کا تو خیر سوال ہی نہیں تھا...... گھر میں کسی سے کسی بات پر اس کا اختلاف ہوتا بھی تو تحمل کا مظاہرہ کرتی...... کسی کو کسی معاملے میں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی تو اس کی نظرِ حاجت اٹھنے سے پہلے ہی اس کے ساتھ جا کھڑی ہوتی...... مونس، خوش بخت اور ان کی گڑیا سی بیٹی کو وہ اب بھی بڑی باقاعدگی سے تحائف اور خاص مواقع پر کارڈ بھیج کر انہیں یاد دلاتی رہتی تھی کہ کوئی ہے جس کے لیے وہ انتہائی اہم ہیں...... بہنوں کو بھی وہ ہاتھ کھول کر لیتی دیتی تھی۔ مرحومہ ماں، ابا، بھائی، بہنیں اسے کسی سے شرمندگی نہ تھی...... بہت پہلے کارنیلس نامی ایک حکمران نے کہا تھا۔ "سچی خوشی انہیں ملتی ہے جو اپنے اوپر حکمرانی کرنا سیکھ لیتے ہیں۔"

اپنی ذات پر حکمرانی کے لیے تحمل اور بے غرضی کی ضرورت ہوتی ہے...... زندگی سے خواہ وہ جیسی بھی کسی انسان کے حصے میں آئی ہو مفاہمت ہی نہیں محبت بھی لازم ہے۔

تقدیم نے زندگی سے مفاہمت اور محبت کو اپنا مسلک جانا تھا اسی لیے جب کبھی اسے اماں کی یاد آتی...... مونس کا خیال آتا...... تسنیم کی طرف دھیان جاتا...... یا دیگر بہنوں میں سے کسی کی بھی فکر دل میں سر اٹھاتی تو اسے ان میں سے کسی کے ساتھ اپنی طرف سے کسی زیادتی کا پچھتاوا نہیں ہوتا...... اس کے دل سے نکلتی لہو کی نہریں طمانیت سے لبریز ہوتیں...... کارنیلس نے سچ کہا تھا۔

☆☆☆

عباد ان دنوں چھٹی پر وطن آیا ہوا تھا۔ امی سے کیے گئے وعدے کے مطابق وہ اس بار اپنا گھر بسانے کا پابند تھا۔ زیتون تو تین سال پہلے فوت ہوچکی تھی۔ امی نے اپنی ملنے جلنے والیوں سے عباد کے لیے لڑکی بتانے کو کہہ رکھا تھا۔ عباد کے آنے سے پہلے امی اپنی ناتوانی کے باوجود ہمت کر کے وہ ساری لڑکیاں ایک، ایک کر کے دیکھ آئی تھیں جو اُن کی ملنے والیوں نے بتائی تھیں۔ کہیں لڑکی بس واجبی سی تھی۔ کہیں سلیقہ نہ تھا، کسی کی ماں تیز دکھائی دی تو کسی کی چھوٹی بہن زیادہ دل کو بھائی۔ عباد گھر آیا تو امی نے طوفانی دورہ کر کے تمام "شارٹ لسٹڈ" لڑکیاں دو تین دنوں میں عباد کو دکھا ڈالیں مگر...... عباد کو ایک بھی پسند نہیں آئی۔ امی سخت مایوس ہوئیں مگر عباد اپنے سابقہ تجربے کے باعث احتیاط برتنا چاہتا تھا۔

"امی لڑکی بے شک غریب گھر کی ہو مگر خوب صورت ہونی چاہیے۔" عباد نے کہا۔

"ارے بیٹا! خوب صورت لڑکیاں تو جیسے ناپید ہوتی جارہی ہیں...... جسے دیکھو ایم اے، بی اے، پی ایچ ڈی مگر صورت اللہ کی بخشی ہوئی...... زیادہ پڑھ پڑھ کر، یونیورسٹیوں کی خاک چھان چھان کر اچھی بھلی شکلیں بگاڑ لیتی ہیں لڑکیاں...... الہ دین کا چراغ ہوتا میرے پاس تو میں اسے رگڑ کر جن کو بلاتی اور کہتی میرے بیٹے کے لیے کوئی پری سی دلہن لا کر دے۔"

"امی جی پری سی بے شک نہ ہو گڈ لکنگ تو ہو۔" عباد ہنس دیا۔

"میں سمجھی نہیں بیٹا۔"

"میرا مطلب ہے خوش شکل تو ہو۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں...... ایک ہی تو بہو آنی ہے میرے گھر...... ایسا کرو بیٹا اخبار میں اشتہار دے دو۔"

"اخبار میں اشتہار......" عباد چونکا۔

"ہاں، ہاں...... تمہاری خالہ کے دیور کی بیٹی کی شادی اخبار کے اشتہار کے ذریعے ہی تو ہوئی...... اچھا رشتہ مل گیا۔ لڑکا جرمنی سے آیا تھا شادی کرنے۔" عباد سوچ میں پڑ گیا۔

"پہلے زمانے میں تو خدا بخشے زیتون کی طرح کی عورتیں گھر گھر پھر کر رشتے ناتے کراتی تھیں۔ اب تو زیتون بھی نہ رہی...... بس اخبار رہ گئے۔"

عباد نے اخبار میں "ضرورتِ رشتہ" کا چار سطری اشتہار چھپوا دیا۔ اپنے اشتہار کے علاوہ اس نے "ضرورتِ رشتہ" کے کالموں میں چھپے تمام اشتہارات لفظ بہ لفظ غور سے پڑھنے شروع کر دیے۔ "دردمند" نامی ایک ادارے کا اشتہار کچھ عجیب سا لگا۔

"نہ خوب صورتی کا دعویٰ...... نہ مال و دولت کا جھانسا...... نہ رشتے سے قبل نہ بعد کوئی فیس، کوئی مطالبہ نہیں...... غریب اور متوسط گھرانوں کی قبول صورت، تعلیم یافتہ اور بلا جہیز لڑکیوں کے لیے شریف گھرانے رجوع فرمائیں۔"

اشتہار کی آخری سطر میں ایک فون نمبر درج تھا۔

عباد کو لمبے چوڑے دعوؤں کے ساتھ رشتے کرانے والے اداروں کے اشتہارات کے ساتھ اس مسکین سے اشتہار کی عبارت خاصی مضحکہ خیز محسوس ہوئی۔ کون تھا جو ایسے اشتہار کو قابلِ اعتنا گردانتا۔

عباد نے اپنے اشتہار میں لکھا تھا۔ "انجینئر، عمدہ پرسنالٹی، سعودی عرب میں اچھی ملازمت، بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا، خوب صورت اور خدمت گزار لڑکی کا رشتہ چاہیے۔ لڑکا چھٹی پر پاکستان آیا ہوا ہے، شادی جلد، میرج بیوروز سے معذرت۔"

رابطے کے لیے عباد نے اپنا فون نمبر دے دیا تھا۔

اتوار کی صبح سے جو عباد کا فون بجنا شروع ہوا تو اسے خاموش کرانے کے لیے عباد کو سوئچ آف کے وقفے دینا پڑے۔ اَن گنت کو تو عباد نے فون پر پہلی بات چیت کے بعد ہی ڈراپ کر دیا۔ چنیدہ کو برق رفتاری سے بنفسِ نفیس دیکھنا شروع کیا، اخبار کا اگلا سنڈے ایڈیشن آ گیا۔ عباد کو مطلب کی لڑکی نہ ملی۔ ایک شام جب وہ اپنے لگژری اپارٹمنٹ کے ٹیرس میں بیٹھا اپنے اشتہار کے حوالے سے آنے والی ایک فون کال سن رہا تھا۔ اسے ٹی وی لاؤنج سے امی کی پکار سنائی دی۔

"عباد! عباد بیٹے! جلدی سے آؤ۔"

"ایکسکیوز می...... میں آپ کو بعد میں خود فون کرتا ہوں۔" عباد نے فون پر بات کرنے والے سے عجلت میں کہا اور رابطہ منقطع کرنے کا بٹن دبا کر لاؤنج کی طرف لپکا۔ "جی امی۔" اس کی مکمل توجہ امی پر تھی اور امی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی انتہائی انہماک سے ٹی وی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"میں...... میں پہچاننے میں غلطی تو نہیں کر رہی...... یہ وہی لڑکی ہے ناں؟" امی نے ٹی وی کی طرف انگلی اٹھائی اور اپنی بات مکمل کی۔ "جس سے تمہارا رشتہ لے کر گئی تھی میں اللہ بخشے زیتون کے ساتھ۔"

عباد نے ٹی وی کی جانب دیکھا...... اس وقت تقدیم کا کلوز شاٹ اسکرین پر تھا۔

"جی امی...... میرا خیال ہے وہی ہے۔"

"خیال کی بات نہیں...... یہ سو فی صد وہی ہے۔"

"تو آپ اتنی حیران، پریشان کیوں ہو رہی ہیں...... آج کل تو ہر شخص ٹی وی پر آنے کے شوق میں مبتلا ہیں۔"

"ارے بیٹا رشتے کراتی ہے یہ...... انٹرویو آ رہا ہے...... تم بیٹھ کر سنو تو اس کی باتیں، کیا اچھی باتیں کر رہی ہے...... یہ جو آدمی اس کے ساتھ بیٹھا ہے ناں...... وکیل ہے...... ان دونوں نے مل کر بنایا ہے ادارہ...... "دردمند" کے نام سے۔" امی بولیں۔

"دردمند" عباد چونکا۔ اس کا بیٹھنا ضروری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"آپ نے تو محفل لوٹ لی جناب......" اویس انصاری نے تقدیم کے دفتر میں میز کے دوسری طرف کرسی پر اس کے روبرو بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

تقدیم انکساری سے مسکرائی۔

"زبردست گفتگو کی آپ نے۔"

"اور میں اگر یہ کہوں کہ...... آپ کی گفتگو شاندار تھی۔"

"تو میں یہ کہوں گا کہ مجھے یہ موقع آپ نے فراہم کیا۔"

"وہ کیسے......؟" اسے تعجب ہوا۔

"وہ ایسے......" کرسی کو ذرا سا...... پیچھے سرکا کر وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرتے ہوئے بولا۔ "کہ نہ آپ اپنی باس کو یہ تجویز پیش کرتیں نہ ہم اس کو عملی صورت دینے پر کمر باندھتے۔"

"بہت شکریہ۔"

"کس بات کا؟"

"اس تجویز پر باقی لوگوں کی طرح میرا مذاق نہ اُڑانے، میری ہمت افزائی اور ادارے کے قیام کے لیے وسائل فراہم کرنے کا...... میں اکیلے تو یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔"

"انکساری سے کام نہ لیں...... آپ اکیلے بھی بہت کچھ کر سکتی ہیں بلکہ...... کر گئی ہیں...... تسنیم اور اپنی فیملی کی عزت برقرار رکھنے کے لیے آپ نے جو کچھ کیا اس کی وقعت میرے دل سے پوچھیں...... آئی ایم سوری بہت پرسنل ہو گیا ہوں مگر شاید...... مجھے اس کا حق ہے۔" اویس انصاری نے تقدیم کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"وہ میرا فرض تھا اویس صاحب۔"

''براہِ کرم میرے نام کے ساتھ صاحب لگانا چھوڑ دیں اب۔ سیدھا سادہ انصاری کہیے یا پھر......اویس۔''
''ادب کرتی ہوں آپ کا۔''
''ادب نہیں چاہیے مجھے۔''
تقدیم نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''زندگی میں آدمی کو محبت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔''
تقدیم دم بخود رہ گئی۔
''میرا ایک دوست کہا کرتا تھا کامیاب زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو پچاس فی صد خود غرض ہونا چاہیے...... مجھے اس سے کبھی اتفاق نہیں ہوسکا لیکن اب سوچتا ہوں......کبھی کبھی آدمی کو اپنے بارے میں بھی سوچ لینا چاہیے۔''
''بڑی آپا کے لیے جو رشتہ بتایا تھا میں نے...... آپ نے اس کے بارے میں کیا سوچا؟'' تقدیم نے اچانک موضوع بدل دیا۔ اویس انصاری کی بڑی بہن کے لیے جو شادی کے صرف چھ ماہ بعد ہی شوہر کے ایک حادثے میں ہلاک ہوجانے سے صرف اکیس سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں اور گزشتہ بارہ تیرہ سال سے بیوگی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ تقدیم نے ایک رشتہ بتایا تھا۔ موصوف ایک یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ دو سال پہلے ان کی اہلیہ کینسر کا شکار ہوکر چل بسی تھیں۔ دو بچے تھے۔ لڑکی میڈیکل کالج کی طالبہ، بیٹا ایف ایس سی کا طالب علم۔
''میں مل لیا ہوں اُن صاحب سے......اور ان کے دونوں بچوں سے بھی......انتہائی معقول آدمی ہیں...... بچے بھی سمجھدار سے ہیں...... گھر اپنا ہے، ویل سیٹ ہیں لیکن بڑی آپا کا کیا، کیا جائے۔''
''کیا مطلب؟''
''فرماتی ہیں جب تک تمہاری شادی نہیں ہوجاتی میں اس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گی۔''
''بہنوں کو بھائیوں کی فکر ہوتی ہے۔''
''تو پھر بتائیں میرے لیے بھی کوئی رشتہ۔''
تقدیم نے بے ساختہ اسے دیکھا۔
اس کے لبوں پر مسکان تھی اور آنکھوں میں بڑی مخمور سی کیفیت ''صرف تم تقدیم......'' اس نے کہا۔ تقدیم نے نظریں چُرالیں۔
''ہاں......ایک اور رشتہ بھی درکار ہے۔''
''وہ کس کے لیے؟''
''ایک وکیل دوست کے لیے......تقریباً میرے ہم عمر......میری ہی طرح ہنوز مجرّد......مگر ان کی پرابلم ذرا مختلف ہے۔''
''وہ کیا......؟''
''بتا رہا ہوں......بتا رہا ہوں۔'' تقدیم اپنی تعجیل پر جھینپ گئی۔
''جدّی پشتی رئیس آدمی ہیں...... پریکٹس بھی زبردست ہے...... دو ہزار گز پر شاندار کوٹھی...... گھر میں تین، تین گاڑیاں......دو ہی بہن بھائی ہیں، بہن شادی شدہ بلکہ جوان بچوں کی ماں......انہوں نے اپنی

والدہ کی وجہ سے شادی نہیں کی...... دماغی مریضہ ہیں...... چیختی چلاتی ہیں مگر کسی کو کبھی کوئی گزند نہیں پہنچائی...... اکثر خود کلامی کرتی رہتی ہیں...... اندھیرے سے خوفزدہ رہتی ہیں، شوہر کے انتقال کے بعد ان کی یہ کیفیت ہوئی...... تقریباً بیس سال سے اسی کیفیت میں ہیں...... بیٹے نے گھر میں ان کے لیے ایک جوڑا ملازم رکھا ہوا ہے۔ عورت گھر کے کام کرتی ہے، وکیل صاحب کی عدم موجودگی میں ان کی والدہ کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس کا شوہر اوپر کے کام کرتا ہے، گھر کی چوکیداری کرتا ہے، اس کے بیٹے کو ڈرائیونگ آتی ہے، وکیل صاحب نے اسے گھر کے لیے ڈرائیور رکھا ہوا ہے۔ غالباً پوری تنخواہ تو نہیں کچھ الاؤنس مقرر کر رکھا ہے اس کا مگر اس کے ماں، باپ فل ٹائم ملازم ہیں۔"

"وکیل صاحب تو اپنا سارا وقت وکالت میں گزارتے ہوں گے...... والدہ کی وجہ سے شادی نہ کرنے کا جواز سمجھ میں نہیں آیا میرے۔"

"ان کا کہنا ہے، شادی کروں تو بیوی کو دماغی مریضہ والدہ کو قبول کرنا آسان نہ ہوگا لہٰذا اس مسئلے سے بچنے کی بہترین صورت یہی سوجھی انہیں کہ شادی نہ کی جائے۔"

"بات تو ٹھیک ہے...... قربانی تو دینی پڑتی ہے......" تقدیم کو اَن دیکھے، انجانے وکیل صاحب سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

"والدہ کو مرنا بھی ہے...... اور اس بے چارے کو بوڑھا بھی ہونا ہے...... والدہ کے چکر میں اس نے کافی سال تو گزار دیے...... آگے آ رہا ہے مشکل وقت...... ابھی تو یہ ہے کہ باوجود انتہائی مصروفیت وہ کسی نہ کسی طور وقت نکال کر دو تین گھنٹے والدہ کے ساتھ گزارتا ہے بقول اس کے انہیں کمپنی دیتا ہے ان کے بال سنوارتا ہے، ان کے ہاتھ پیروں کی مالش کرتا ہے...... ان کے ساتھ اپنے مرحوم والد کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر باپ کی باتیں کرتا ہے اُن سے...... جب وہ مر جائیں گی تو پھر یہ کیا کرے گا اتنے بڑے گھر میں اکیلا...... والدہ کے لیے تو اس نے قربانی دی اس کے لیے کون دے گا۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے، سمجھاتا رہتا ہوں اسے...... کسی روز لے کر آؤں گا اپنے ساتھ آپ سے ملوانے کے لیے...... ایسے لوگوں کی دنیا میں کمی نہیں جو دوسروں کی مجبوریوں سے نباہ کرنے کو تیار ہوتے ہیں...... اگر یہ کارِ خیر انجام پا جائے تو بہت اچھا۔"

"ضرور ملوایئے گا اُن سے۔" تقدیم نے کہا۔

☆☆☆

تقدیم کے نفاست سے آراستہ دفتر میں عباد اس کے روبرو بیٹھا تھا۔ ٹی وی پر اس کے انٹرویو میں اس کی زبانی یہ سن کر کہ وہ خود ابھی تک غیر شادی شدہ تھی وہ اپنی دوسری مصروفیات ترک کر کے اگلے ہی دن "دردمند" پہنچا تھا۔ "بیٹا میں نے تو پہلے بھی اور اس مرتبہ بھی تمہارے لیے جتنی لڑکیاں دیکھیں مجھے تو سب سے اچھی یہی لگی تھی...... جاؤ کیا پتا کہ اللہ نے اسے اب تک تمہارے لیے ہی بٹھا رکھا ہو۔" امی نے کہا تھا۔

"جی فرمائیں......" تقدیم نے اس کے بیٹھ جانے کے بعد سپاٹ لہجے میں کہا۔

"رشتے کے لیے حاضر ہوا ہوں مس۔" عباد نے کہا۔

"کس کے رشتے کے لیے؟" تقدیم نے پوچھا۔

"اپنے۔"

"کوائف بتائیں پلیز۔" تقدیم نے ایک فائل کھولی، پین ہولڈر سے قلم نکالا اور اس کی طرف دیکھے بنا کہا۔

"عباد الرحمٰن ولد مطیع الرحمٰن...... والدین کی اکلوتی اولاد...... والدہ حیات...... والد فوت... ڈگری ہولڈر انجینئر...... سعودی عرب میں ملازم...... گھر...... گاڑی...... اللہ کا دیا سب کچھ......" تقدیم کا قلم تیزی سے رواں رہا۔

"مجھے ایک خوش شکل لڑکی کا رشتہ چاہیے جو میری والدہ کی خدمت کر سکے۔" عباد نے اس کے پوچھے بنا ہی اپنا معیار بھی اس کے گوش گزار کر دیا۔ خوب صورت سے اب وہ خوش شکل پر آ گیا تھا۔

"پہلی بات تو یہ عباد صاحب......!"

"آپ کو میرا نام کیسے یاد رہا؟" وہ بے ساختہ چونکا۔

"ابھی تو بتایا ہے آپ نے... عباد الرحمٰن ولد مطیع الرحمٰن۔"

"اوہ...... یس۔"

"پہلی بات تو یہ کہ ہمارے ہاں عام شکل صورت والی لڑکیوں کے رشتے ہوتے ہیں...... دوسری بات یہ کہ کسی بھی لڑکی کی پیشانی پر یہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ سسرال جا کر ساس کی خدمت کرے گی، خدمت باہمی تعلقات کا معاملہ ہوتا ہے...... آپ کسی سے کسی کی زبردستی خدمت نہیں کروا سکتے...... ساس بہو کے تعلقات دو طرفہ ٹریفک ہے...... ساس کے بیٹے اور بہو کے شوہر کو ایک ذمے دار اور مستعد ٹریفک سارجنٹ کا کردار نبھانا پڑتا ہے۔"

جوں جوں وہ بولتی گئی عباد کی آنکھوں میں چمک بڑھتی چلی گئی۔

"لڑکی سمجھدار ہو تو ٹریفک سارجنٹ بھی اسی کے اشاروں پر ناچ رہا ہوتا ہے۔" عباد نے بے باکی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" تقدیم نے برملا اتفاق کیا۔ "مگر صرف لڑکی کے اشاروں پر ہی کیوں...... ماں بھی تو ہے۔"

"مجھے آپ ہی جیسی سمجھدار لڑکی کی ضرورت ہے مس۔"

"جی......" تقدیم کو اس سے اس قدر بے باکی کی توقع نہیں تھی۔

"غالباً آپ مجھے پہچان نہیں پائیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے تقدیم کو دیکھا۔

"کیسے بھول سکتی ہوں میں اس شخص کو جس کی بھجوائی ہوئی فہرستِ مطالبات نے دنوں میرے باپ کو مضمحل اور ماں کو اداس رکھا تھا۔" تقدیم کے چہرے پر دھند سی چھا گئی۔

اب عباد کا چہرہ دھواں دھواں ہوا۔

"اسی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں میں۔" اس نے کہا۔

"میرے والد صاحب تو آج بھی آپ کے مطالبات پورے کرنے سے قاصر رہیں گے عباد صاحب۔" تقدیم کا لہجہ گئے دنوں کی تلخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ شرمندہ دکھائی دینے لگا۔

"یقین کیجیے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں...... سب کچھ ہے میرے پاس...... بس مجھے آپ جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔"

"عباد صاحب اس دنیا میں ہر شخص اپنی زندگی کچھ ترجیحات کے ساتھ گزارتا ہے...... میری ترجیح یقیناً وہ شخص نہیں ہو سکتا جس نے کبھی میرے پندار پر ضرب لگائی ہو...... میرے والدین کو آزار پہنچایا ہو۔"

"مجھے افسوس ہے مس۔"

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں کرب جھلک رہا تھا۔

"کبھی کبھی الفاظ بے معنی محسوس ہونے لگتے ہیں۔ شاید آپ نے اس وقت معذرت کی ہوتی جب دل کے زخم تازہ تھے...... میری والدہ حیات تھیں...... تب شاید میرا دل اپنی بے بضاعتی پر رو پڑتا...... اب ہنسی آ رہی ہے مجھے۔"

عباد نے پہلو بدلا۔

"آپ کو ہنسی آئے یا رونا...... میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔"

"تو سنیے...... ایک لڑکی ہے...... ٹھیک ٹھاک...... نہ بدصورت نہ بہت خوب صورت...... متوسط گھرانے کی بیٹی...... زندگی کے گرم و سرد کی عادی...... تعلیم یافتہ...... دعویٰ تو نہیں کر سکتی میں لیکن شاید...... اسے آپ کے گھر میں عزت ملے تو وہ بھی آپ کی والدہ کے لیے راحت کا سامان کرنے کی کوشش کرے۔"

"کوئی اور نہیں مس...... اخبار میں اشتہار دیا تھا میں نے...... رشتوں کی تو لائن لگی ہوئی ہے میرے پاس۔" اس نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر اپنے لہجے میں زور پیدا کر کے بولا۔ "صرف آپ......"

"سوری۔" تقدیم نے دو ٹوک کہا۔

"آپ اب بھی اسی گھر میں رہتی ہیں یا......؟"

"جی...... نہیں۔" تقدیم نے اسے نئے گھر کا بتایا۔

"اوکے......" وہ اٹھا سلیوٹ کرنے والے انداز میں اپنا ہاتھ پیشانی تک لے گیا پھر ایک جھٹکے سے ہاتھ کو نیچے گرایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

عقیل صمدانی سے لمبے عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی مونس کی...... عقیل اپنی نئی پوسٹنگ کے بعد کھاریاں آیا تھا اور کراچی سے اپنے بال بچوں کے پہنچنے سے قبل ان کے لیے رہائش کا مناسب بندوبست کر لینے کے لیے کوشاں تھا...... اس کی بیوی دوسرے بچے کی ولادت کے بعد اپنے میکے میں تھی۔

"بچے آ جائیں پھر بھابی سے ملنے آؤں گا تیرے گھر۔" عقیل نے کہا۔

"تب بھی آ جانا یار...... آج رات کا کھانا تو ہمارے ساتھ...... خوش بخت کمال کی بریانی بناتی ہے۔"

"آئی نو...... اردو اسپیکنگ لڑکیاں اپنے شوہروں کو کچن ہی سے تو باندھ کر رکھتی ہیں...... کبھی پائے کبھی نہاری...... کبھی بریانی تو کبھی متنجن۔"

"تو تو جیسے فارسی اسپیکنگ ہے ناں۔"

"بندے کا کچھ پتا نہیں ہوتا یار کب اردو سے فارسی اسپیکنگ بن جائے...... میرا تو تجھے معلوم ہے لُڑھکنے میں منٹ نہیں لگاتا...... اکیلے آؤں گا بھابی کے سامنے خواہ مخواہ تمیز دار بن کر بیٹھنا پڑے گا...... تجھے تو پتا ہے ناں مجھے تمیز چھو کر نہیں گزری۔"

"یعنی تو آج بھی ویسا ہی ہے۔"

"بالکل جانم...... یہ تو اپنا ٹریڈ مارک ہے...... یاد ہے ناں صبور ماموں کے گھر کتنا اودھم مچایا کرتا تھا میں۔"

مونس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا۔

"ایک بات پوچھوں......؟" عقیل نے اس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو کھوجنے کی کوشش کی۔

"ہاں......" مونس گویا اس کے پوچھنے سے پہلے ہی جان گیا تھا کہ وہ کیا پوچھنے جا رہا تھا۔

"عائزہ باجی میں انٹرسٹڈ تھا ناں تو؟"

"چھوڑ یار...... پرانی باتوں کو یاد کرنے سے فائدہ......" مونس نے اپنی آنکھوں کی نمی کو دل کی حدت بہم پہنچانے کی کوشش کی۔

"ویسے ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے...... عائزہ باجی کی موت نے صبور ماموں کی فیملی کا نقشہ ہی بگاڑ دیا۔"

"عائزہ کی موت......؟" مونس جیسے خواب میں بڑبڑایا۔

"ہاں یار...... مامی کی کسی دوست کے بیٹے سے شادی کے بعد وہ انگلینڈ چلی گئی تھیں۔ جڑواں بیٹے ہوئے...... ہالیڈیز میں شوہر اور بچوں کے ساتھ پاکستان آئیں گھومنے کے لیے مری گئیں...... گاڑی کا ٹائی راڈ کھل گیا...... بچے تو خیر ساتھ نہیں تھے کافی چھوٹے تھے۔ انہیں مامی کے پاس ہی چھوڑ گئی تھیں...... شوہر شدید زخمی ہوئے مگر بچ گئے...... لیکن عائزہ باجی...... موقع پر ہی...... گاڑی کا تو بھرکس نکل گیا تھا...... میں تو خیر نہیں جا سکا مگر دیکھنے والے بتاتے ہیں پہچانی نہیں جاتی تھیں عائزہ باجی۔"

اماں کے بعد یہ دوسری بڑی موت تھی مونس کے لیے جس نے اس کے دل میں شورِ محشر بپا کیا۔

"بچے کہاں ہیں اس کے؟" مونس کو اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"ہسبینڈ ساتھ ہی لے گیا...... ماموں اور مامی بہت روتے ہیں عائزہ باجی کے لیے اور ان سے زیادہ ان کے بچوں کے لیے...... عائزہ باجی کی موت نے صبور ماموں کی فیملی کو بالکل ہی بدل ڈالا یار۔"

"زندگی یوں ہی بدل جاتی ہے دوست۔" مونس نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"کاش یہ بدلا نہ کرے۔" ایسا ممکن نہیں تھا۔ زندگی کو تو بدلنا ہی ہوتا ہے...... ہر پل...... ہر ساعت۔

☆☆☆

"اویس صاحب نے آپ کی اتنی تعریف کی کہ مجھے ان سے کہنا پڑا آپ سے ملوائیں۔" تقدیم نے میز کے دوسری جانب اپنے روبرو کھڑے انتہائی ہینڈسم اور انتہائی خوش پوش مرد سے کہا۔

"تعریف اس خدا کی جس نے اویس صاحب جیسا نفیس انسان اور باکمال وکیل بنایا......" اویس انصاری کے ہمراہ آنے والے وکیل دوست نے خوش دلی سے کہا۔

"درست!" تقدیم نے فراخدلی سے تائید کی۔

"مسٹر سیف علی خان۔" اویس انصاری نے اپنے ہمراہی کو تقدیم سے متعارف کرایا پھر سیف علی کی جانب دیکھتے ہوئے تقدیم کی بابت کہا۔ "ان سے تو آپ کا تعارف ہے ہی۔"

"وہ کیسے......؟" تقدیم نے قدرے تعجب سے کہا۔

"کچھ باتیں راز بھی رہنے دی جاتی ہیں۔" سیف علی خان کے لہجے اور نگاہوں دونوں میں معنی خیزی تھی۔

تقدیم جھینپ گئی۔

"تشریف رکھیے۔" اس نے آنے والے مہمان کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

سیف علی خان اور اویس انصاری دونوں اس کے روبرو بیٹھ گئے۔

"کافی پئیں گے...... ویسی ہی جیسی آپ نے پرسوں پلوائی تھی۔" اویس انصاری نے فرمائش داغی۔

"گویا آپ کافی پینے کے لیے یہاں اکثر آتے رہتے ہیں؟" سیف علی خان نے اویس انصاری کو پُرمعنی

نگاہوں سے دیکھا۔
"اجی حضرت...... ! ہم تو مستقل ڈیرے ڈال دینے کے درپے ہیں۔" وہ آہستہ سے بولا۔
"خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔"
"آمین ثم آمین۔" اویس انصاری نے خلافِ عادت اونچا قہقہہ لگایا۔
تقدیم نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلایا اور کافی لانے کی ہدایت کی۔
"خاتونِ معظم ! ان کے لیے کوئی لڑکی بتائیے...... بڑی مشکل سے آمادہ کیا ہے میں نے انہیں۔" اویس انصاری سنبھل کر بیٹھ گیا۔
"یار ! کیوں مروانا چاہتے ہو...... اب بھی وقت ہے اپنے نیک ارادوں سے باز آ جاؤ...... تمہیں پتا ہے زندگی میں میری پہلی ترجیح کیا ہے ؟" سیف علی خان نے گردن موڑ کر اویس انصاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں انہیں سب کچھ بتا چکا ہوں۔" اویس انصاری نے ایک نظر تقدیم کو دیکھتے ہوئے سیف علی خان سے کہا۔
"مس !" سیف علی نے روئے سخن تقدیم کی جانب کیا۔ "میری تو وہ ماں ہیں، غیر لڑکی کیونکر برداشت کرے گی انہیں۔"
"دنیا ایسے لوگوں سے محروم نہیں سیف علی صاحب جو دوسروں کے دکھوں اور مسائل کو شیئر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں...... عبدالستار ایدھی، مدر ٹریسا، سسٹر گرٹروڈ فرشتے نہیں، ہم آپ جیسے انسان ہی ہیں۔"
"ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں میں کوئی ایک ہوتا ہے بھابی۔"
تقدیم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا...... یہ کیا کہہ گیا تھا وہ !
"سوری !" اس نے اگلے ہی لمحے معذرت کی، اویس انصاری کے لبوں پر مسکراہٹ دکھائی دی۔ سیف علی خان نے اسے گھورا پھر تقدیم کی طرف معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اویس انصاری کی جانب انگلی اٹھا کر بولا۔ "اصل میں یہ شخص آپ سے شادی کے لیے اس حد تک تیار ہو چکا ہے کہ میں قبل از وقت ہی آپ کو بھابی کہہ بیٹھا۔"
"اب آپ بھی مجھے کسی خاتون کو بھابی کہنے کا موقع عنایت فرمائیں۔" اویس انصاری نے مسکراتے ہوئے سیف علی کو دیکھا۔
"مجھے تو یہ شخص بے دست و پا کر کے آپ کے پاس لایا ہے...... یہی کہہ سکتا ہوں آپ سے کہ...... کچھ ایسا کیجیے...... میری والدہ کو کوئی مسئلہ ہو نہ مجھے...... میرے لیے میری زندگی کی پہلی ترجیح میری والدہ ہیں...... اور جب تک خدا نے اُن کی حیات لکھ رکھی ہے وہی میری اولین ترجیح رہیں گی۔" سیف علی نے سپر ڈالنے والے انداز میں تقدیم کی طرف دیکھا اور کہا۔
کافی آ گئی تھی۔
"دو وکلا کے سامنے بولنا ہے تو کارِ گراں...... مگر کوشش میں کیا حرج ہے۔" چپڑاسی کافی دے کر جا چکا تو تقدیم نے کہا۔
"ارے نہیں صاحب...... آپ کی گفتگو کا تو ہر وہ شخص مداح پایا گیا جس نے ٹی وی پر آپ کی گفتگو سنی...... سنا ہے اب کسی دوسرے چینل کے لیے بلاوا ہے۔" سیف علی نے کہا۔

"جی ہاں......" وہ بولی۔
"آپ کچھ کہنے والی تھیں......" سیف علی خان نے جیسے یاد دلایا۔
"سیف صاحب ! جنت اور دوزخ تو انسان کی زندگی کی بہت دور کی منزلیں ہیں...... میرا ایمان ہے کہ ہمیں ہماری نیک نیتی کا ثمر اس دنیا میں بھی مل جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ مادی صورت میں...... قلب کا اطمینان بھی ایک بڑا انعام ہے۔"
"بے شک......" ان دونوں نے تائید کی۔
"آپ کی نیت نیک ہے انشاءاللہ کوئی بہت اچھی لڑکی ملے گی آپ کے لیے...... ایسی کہ جو آپ کو اللہ کا انعام محسوس ہوگی۔"
"انشاءاللہ۔" اویس انصاری نے کہا۔
اور عین اسی لمحے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی کھٹکھٹاہٹ کے ساتھ حجاب دروازے پر کھڑی دکھائی دی۔
"حاضر ہو سکتی ہوں میڈم ؟"
"ویلکم ! ویلکم۔" تقدیم اس کی پزیرائی کو اٹھی۔
"تمہاری پی اے نے بتایا کہ تم اویس انصاری صاحب اور ان کے کسی مہمان کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو...... میں بے دھڑک چلی آئی......" حجاب بے تکلفی سے بولتی آگے بڑھتی چلی گئی۔ "ڈسٹرب تو نہیں کیا ؟"
"قطعاً نہیں...... قطعاً نہیں۔" تقدیم نے گرمجوشی سے کہا۔
"السلام علیکم اویس صاحب کیسے ہیں آپ ؟" حجاب نے اویس کی طرف دیکھا اور اویس انصاری کے ساتھ بیٹھے سیف علی خان کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا تاثر یک لخت بدل گیا۔ چند لمحے وہ صدمے کی کیفیت میں کھڑی رہی پھر مڑی اور دروازے کا رخ کیا۔ جاتے جاتے اس نے سیف علی خان کو انتہائی نفرت سے دیکھا۔
"حجاب...... حجاب !" تقدیم نے اسے پکارا۔
وہ جاتے جاتے پلٹی اور اس نے سیف علی خان کی طرف یوں انگلی اٹھائی جیسے کوئی مقتول کسی معجزے سے زندہ ہو کر اپنے قاتل کی نشاندہی کرے۔ "آئی ہیٹ دس مین...... اتنی نفرت میں نے زندگی میں کسی سے نہیں کی...... اس نے مجھ سے...... میری فیملی سے وہ افتخار چھین لیا...... جسے میری ماں نے اپنے بچوں کے ساتھ مل کر ریزہ ریزہ چُنا تھا...... میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آئی ہیٹ ہم...... آئی ہیٹ ہم۔"
گھر آئے مہمان کی اس ذلت پر تقدیم دم بخود تھی۔
حجاب پھر مڑی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی کمرے سے نکل گئی۔
تقدیم انتہائی شرمندہ سی اویس انصاری اور سیف علی خان سے نظریں چراتی اپنی کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑے وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے سیف علی سے نظریں ملائے بنا کہا۔ "سوری سیف صاحب...... آئی ایم رئیلی سوری...... یہ میری دوست تھی...... پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا۔"
"آپ پریشان نہ ہوں......" سیف علی نے کہا۔ "ان خاتون کو میرا خون بھی پی جانے کا حق ہے۔"
تقدیم کو اس کی بات پر اچنبھا ہوا۔ اویس انصاری نے اس کی حیرانی تاڑ لی۔
"زیادہ حیران نہ ہوں آپ...... موصوف آپ کی دوست کے خلع کے مقدمے میں آپ کی دوست کے

سابقہ شوہر کی وکالت فرماتے رہے ہیں۔'' اویس انصاری نے بتایا۔

''اوہ آئی سی۔'' یہ بات آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتائی۔'' تقدیم کو اویس انصاری سے گلہ ہوا۔

''بات موقع سے کی جاتی ہے..... موقع ہی نہیں آیا بتانے کا۔''

''مجھے سیف صاحب کے سامنے شرمندہ دیکھنا تو جیسے بڑا سنہری موقع ہے آپ کے لیے۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کی دوست آفتِ ناگہانی کی طرح یوں نازل ہوں گی۔'' اویس انصاری نے سیف علی خان کا بازو تھپتھپایا۔ ''نو پرابلم وکیل صاحب..... گالیاں تو پڑتی ہیں ہم وکلا کے کاموں میں۔''

''ویسے..... نزول بڑے موقع سے ہوا۔'' سیف علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تقدیم حیران تھی کہ اس تناؤ کی صورتِ حال میں اویس انصاری اور سیف علی خان کس قدر شگفتہ مزاجی کا مظاہرہ کررہے تھے۔

''ان کی دوسری شادی ہوئی یا نہیں؟'' سیف علی خان نے تقدیم سے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

''جی نہیں..... اور نہ کرے گی۔''

''کیوں.....؟'' سیف علی چونکا۔

تقدیم کو سیف علی کو مزید شرمساری سے بچانے کی خاطر حجاب کے دوسری شادی سے گریز کی وجہ بتانے میں کچھ تردد ہوا لیکن پھر اس نے بتا ہی دیا۔ ''وہ کہتی ہے عدالت اور میڈیا میں اتنی ذلت کے بعد بھی اگر اس نے دوسری شادی کرلی اور دوسرے شوہر نے کبھی اسے پچھلی زندگی میں بدکرداری کا طعنہ دے دیا تو اس کے پاس زہر کھا کر مرجانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔''

''بات چلائیں۔'' سیف علی نے کہا۔

''جی؟'' تقدیم نے چونک کر اسے دیکھا۔

''موصوف آپ کی دوست سے اپنے رشتے کی بات چلانے کی فرمائش کررہے ہیں.....'' اویس انصاری نے بڑے پیار سے سیف علی کے سر کے جیل لگے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ یہ گھنے خوب صورت بال ان کے سر پر نہ رہیں۔''

''آپ اس کے مذاق پر نہ جائیں..... میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' سیف علی نے تقدیم سے کہا۔ ''بلکہ یوں سمجھیں کہ غیر معمولی سنجیدہ۔'' اس نے توقف کیا پھر بولا۔ ''زندگی میں اپنی والدہ کے بعد میں جس بات کو انتہائی سنجیدگی سے لے رہا ہوں وہ یہی ہے..... میں ان خاتون سے ہر قیمت پر شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''فلمی سچویشن ہوگئی۔'' اویس انصاری نے مسکراتے ہوئے تقدیم کو دیکھا۔

''آپ کچھ بھی کریں۔'' سیف علی نے تقدیم سے کہا۔

''چیلنج ہے خاتونِ معظم۔'' اویس انصاری نے ابروئیں مٹکائیں۔

''مشکل ہے..... بلکہ حالات وواقعات کی روشنی میں تو ناممکن ہی لگتا ہے..... بہرحال کوشش کروں گی کہ حجاب کے ہاتھوں میرے قتل کی نوبت نہ آئے۔''

''خدا آپ کو سرخرو کرے۔''

''سوچ لیجیے..... انہیں یا آپ کو؟'' اویس انصاری نے کہا۔

''بہت مذاق سوجھ رہا ہے تمہیں اس لیے ناں کہ تمہارا مستقبل محفوظ ہے۔''

''آپ کے لیے بھی دعا گو ہوں۔'' اویس انصاری نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہاتھوں کی اوٹ سے تقدیم کو دیکھا جس کی محبت میں اس کا دل بے طرح غلطاں تھا۔

☆☆☆

ابا ناشتے کی میز پر ناشتے اور تقدیم کا انتظار کرنے کے ساتھ تازہ اخبار کی سرخیاں دیکھ رہے تھے جب تقدیم ملازم کو پکارتی ناشتے کے لیے پہنچی۔ ''رفاقت! ناشتے کو دیر کیوں ہوگئی آج؟''

''لا رہا ہوں جی..... دودھ والا دیر سے آیا۔'' جواب آیا۔

''اس سے کہا کرو کہ وقت پر آیا کرے..... اول تو پھیر ڈال کر رکھا کرو..... دودھ کی ضرورت کسی وقت بھی پڑ سکتی ہے۔''

''اچھا جی.....'' کچن کی جانب سے پھر جواب موصول ہوا۔

''جو دودھ بچتا ہے وہ خود ہی پی جاتا ہے۔'' ابا نے آہستگی سے بتایا۔ وہ مسکرادی۔

گھر کے دو افراد اور آئے گئے مہمان کی خدمت گزاری اتنا حق تو دیتی تھی رفاقت کو۔ تقدیم کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''اخبار بھی زندگی کی طرح ہوتا ہے۔'' ابا اپنی نظریں اخبار پر مرکوز رکھتے ہوئے بولے۔

''زندگی اخبار کی طرح ہوتی ہے ابا..... ہر روز ایک نئی شہ سرخی کے ساتھ..... پرانی خبریں..... نئے لوگ..... نئی تصویریں..... پرانے انداز.....''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' ابا نے اخبار اپنے منہ کے سامنے سے ہٹایا اور اسے میز پر بچھا کر تہہ کرتے ہوئے بولے۔ ''وہ کل پھر آیا تھا..... دو گھنٹے بیٹھا میری منت سماجت کرتا رہا..... پھر آنے کو کہہ گیا ہے..... چار مرتبہ آچکا ہے..... کہہ رہا تھا گرین سگنل ملتے ہی والدہ کو لے کر آئے گا۔''

''پاگل ہے وہ۔'' تقدیم نے کہا۔

''ارے نہیں بیٹا..... باتیں تو بڑی سمجھداری کی کرتا ہے۔''

''اپنی خواہشوں کے اسیر ایسے ہی ہوتے ہیں ابا..... جب چاہا سادگی دکھادی جب ضرورت پڑی سمجھداری کی باتیں کرنے لگے۔''

''بہرحال صبح کا بھولا شام کو گھر پلٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے..... اپنی غلطی پر نادم ہے..... معافی مانگ رہا ہے..... ازالہ کرنا چاہتا ہے..... گھر تو تمہارا بسانا ہی ہے بیٹی..... کسی ایسے کے ساتھ بس جائے جو عزت اور چاہت سے لے جائے تو اچھا ہے..... میں بھی مطمئن رہوں گا۔''

''نہیں ابا..... اس شخص کے ساتھ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''اویس انصاری؟'' ابا کے لہجے میں استفہام سے زیادہ یقین تھا۔

''آپ سے کس نے کہا؟'' اس نے چونک کر ابا کو دیکھا۔

''میرا قیاس ہے۔''

''آپ قیاس پر یقین رکھتے ہیں؟''

''اگر دل بھی قیاس کی شہادت دے تو یقین کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔'' ابا مسکرادیے۔

''وہ پھر آئے تو اس سے کہہ دیں..... کوئی غریب، شریف، مناسب شکل صورت والی لڑکی چاہیے تو

آجائے میرے آفس..... میرے چکر میں بالکل نہ رہے۔'' اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔
رفاقت ناشتا لیے آپہنچا تھا۔

☆☆☆

''تم میری جگہ ہوتیں تو میں تم سے پوچھتی۔'' حجاب نے ناگواری سے کہا۔ ''جس شخص کی میں صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں، تم اس سے میری شادی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگارہی ہو..... جہنم میں جائے وہ اور.....''

''ہاں، ہاں بولو..... رک کیوں گئیں..... دو مجھے بھی جہنم میں جانے کی بددعا۔'' تقدیم جو اسے سیف علی سے شادی کے لیے منانے کے مشن پر تھی بولی۔

''میں جان سے ماردوں گی تمہیں۔'' حجاب نے اسے گھورا۔

''تم مجھے جان سے مارو یا بے جان سے..... میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ جو اس نے پہلے کیا وہ اس کی پیشہ ورانہ مجبوری تھی..... جو وہ اب چاہتا ہے وہ اس کی زندگی کی ضرورت۔''

''میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گیا ہے وہ؟'' حجاب بپھر کر بولی تو تقدیم مسکرائی۔

''پہلے اس نے صرف سنہری آنکھیں ہی دیکھ رکھی تھیں تمہاری اب پورا رُخِ زیبا دیکھ لیا ہے..... دیوانہ تو ہو ہی جانا تھا اسے..... ویسے ایک رشتہ اور بھی ہے تمہارے لیے میرے پاس..... انجینئر، سعودی عرب میں ملازم، خوب صورت لڑکی سے شادی کا طلبگار..... لیکن یہ زیادہ بہتر ہے تمہارے لیے..... اس سے شادی کر کے تمہیں طعن و تشنیع کا اندیشہ نہیں ہوگا کیونکہ اس دنیا میں اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ اس نے عدالت میں تم پر جو الزامات لگائے اس میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ..... وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے جھوٹ بکا تھا..... عدالت کو گمراہ کرنے اور تمہیں دباؤ میں لینے کے لیے..... الطاف چاہتا تھا کہ تم اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دو..... ہار مان لو..... اور رو پیٹ کر صبر کرلو کہ عدالت میں تمہاری کردار کشی اور میڈیا میں اس کی تشہیر کے بعد تمہارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس کے ساتھ گزارہ کرو۔''

''کہا تھا ناں اس نے..... کسی اور کے لائق نہیں چھوڑا ہے میں نے تمہیں۔'' حجاب کا لہجہ کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔

''سینے پر سانپ لوٹ جائے گا اس کے جب اسے یہ پتا چلے گا کہ وہی ہینڈسم وکیل جس کے ذریعے اس نے تمہاری کردار کشی کروائی تھی اس نے تمہیں اپنالیا ہے۔''

''مجھے بخش دو۔'' حجاب نے دونوں ہاتھ جوڑے۔

''حجاب.....''

''حجاب مرگئی..... حجاب اسی دن مرگئی تھی جس دن اخبار میں اس کی تصویر چھپی تھی، بدکرداری کے الزامات کے ساتھ۔''

''اپنی امی کی تم نہیں سن رہیں..... میری تم نہیں مان رہیں..... تو پھر کس کی سنوگی؟''

''کسی کی بھی نہیں۔'' اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔

سیف علی خان نے اس سے خود بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

''مس تقدیم پلیز.....'' اس کے لہجے میں، نگاہوں میں، حرکات و سکنات میں ناقابلِ بیان لجاجت تھی۔

تقدیم کو اس سے کراہیت محسوس ہوئی..... مرد کو مرد نظر آنا چاہیے..... یہ کیا کہ نظریں بگاڑنے پر آئے تو شیر ہوجائے اپنی مطلب برآری کے لیے گیدڑ بن جائے۔

''میں اب زِچ ہوچلی ہوں عباد صاحب.....'' تقدیم نے ناگواری سے کہا۔

''پلیز.....'' سیل ناکارہ ہوجانے والی گھڑی کی سوئی کی طرح اس کی سوئی بھی ایک ہی جگہ اٹکی تھی۔

''کتنی عجیب بات ہے۔'' تقدیم نے اسے خشونت سے دیکھا۔ ''جب لوگ ہماری رسائی میں اور معاملات ہماری دسترس میں ہوتے ہیں تو ہم نعوذ باللہ خدا بن بیٹھتے ہیں اور جب وقت ہمارے اختیار سے نکل جاتا ہے تو اپنے تھوکے کو چاٹنے کے لیے ہم زمین سے لگ جاتے ہیں۔''

اس سرزنش پر عباد کو شدید سُبکی محسوس ہوئی۔

''آج آخری بار آیا ہوں مس تقدیم۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر آخری بار میرا جواب بھی سن لیجیے..... جو آپ چاہتے ہیں وہ ممکن نہیں۔''

''لیکن کیوں؟ وجہ تو پتا چلے..... کیا کمی ہے مجھ میں؟''

''اس سوال کا جواب دینا ضروری تو نہیں لیکن آپ کے اطمینان کے لیے جواب دوں گی۔'' اس نے توقف کیا پھر بولی۔ ''اپنی آئندہ زندگی کے لیے فیصلہ میں اس شخص کے حق میں محفوظ رکھتی ہوں جو میرا محسن ہے..... جس نے زندگی کی مشکلات میں میرا ساتھ دیا ہے..... اس رفاہی ادارے کے قیام کو میرے لیے خواب سے حقیقت بنانے میں دامے، درمے، سخنے میری مدد کی ہے۔''

''یہ وہی صاحب تو نہیں جو آپ کے ٹی وی انٹرویو میں بھی آپ کے ساتھ تھے؟'' عباد جو مبہوت و متحیر اس کی بات سن رہا تھا بولا۔

''جی..... بالکل وہی۔'' تقدیم نے اس کے قیاس کی تائید کی۔

وہ چند ثانیے سر جھکائے، خاموش بیٹھا رہا پھر اک احساسِ شکست خوردگی کے ساتھ کرسی سے اٹھا۔

''اوکے مس تقدیم۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور جانے کو مڑ گیا۔

''ایک لڑکی ہے عباد صاحب.....'' تقدیم نے اس کی پشت پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھٹک گیا۔

''ایم اے اسلامیات..... خوش سیرت..... خوش سلیقہ..... بقول اس کی بڑی بہن سوئے اتفاق خوش شکل بھی نکل آئی ہے..... گھرداری میں طاق..... ایسے لاجواب کھانے پکاتی ہے کہ آپ سعودیہ میں بیٹھ کر برنس روڈ کی نہاری، پائے اور ریشمی کبابوں کا لطف اٹھا سکتے ہیں..... والد علی گڑھ کے ہیں والدہ دہلی کی..... بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی مگر بقول بڑی بہن عقل میں سب سے بڑی..... اس کی بڑی بہن سے ہمارے فیملی ٹرمز ہیں بہت عرصے سے..... ہاں جہیز بھی تھوڑا بہت مل ہی جائے گا..... ہوسکتا ہے آپ کی والدہ کی خدمت بھی کر گزرے۔''

وہ مزید چند ثانیے اسی طرح ٹھٹکا کھڑا رہا پھر پلٹا اور دوبارہ اس کے روبرو آبیٹھا۔ ''آپ ری کمنڈ کررہی ہیں اس لیے۔'' اس نے کہا۔ ''شادی کے لیے میرے پاس صرف دس دن ہیں۔''

''زندگی میں ہر کام اللہ کے بھروسے پر کرنا چاہیے عباد صاحب۔'' تقدیم بولی۔

''شادی سے قبل لڑکی کو ضرور دیکھنا چاہوں گا میں..... بلکہ بات بھی کروں گا..... اسلام اس کی اجازت

دیتا ہے۔"

"اسلام تو اور بھی بہت کچھ کہتا ہے عباد صاحب......" تقدیم دھیرے سے مسکرائی اور اپنے سامنے دھرے آفس کے لینڈ لائن فون پر ثریا کا نمبر ڈائل کرنے لگی کہ عباد کے گوش گزار کیے جانے والے کوائف ثریا کی چھوٹی بہن عمارہ کے تھے۔

☆☆☆

سیف علی خان اس سے براہِ راست بات کرنے کے لیے وہاں پہنچا جہاں وہ اس پر نہ تو چیخ چلا سکتی تھی نہ اسے اپنے دفتر سے دھکے دے کر نکال باہر کرنے کا حکم صادر کر سکتی تھی۔ اسٹاف اور طالبات کے سامنے خود ہی تماشا بن جانے کا احتمال تھا۔ بڑی مشکلوں سے تو پچھلی کہانیوں پر وقت کی گرد اُٹی تھی...... راکھ میں دبی چنگاریوں کو کریدنے کا مطلب تھا اپنا ہی چہرہ خاک آلودہ کرنا...... ویسے بھی اس معاملے میں تقدیم اور امی کے بارہا سمجھانے بجھانے نے سیف علی خان کے لیے اس کے جذباتِ دشمنی کو قدرے معتدل کر دیا تھا...... برسوں سے دل میں پکتا لاوا بہہ نکلا تھا اب اندر پہلے کی سی تپش نہ تھی...... مگر سیف علی کو وہ اپنے دشمنوں کی فہرست میں اب بھی سرِفہرست رکھے ہوئے تھی۔

"میں اتنا برا آدمی نہیں ہوں جتنا آپ سمجھ بیٹھی ہیں۔" سیف علی خان نے کہا۔

"تماشا نہ بنائیں...... چلے جائیں یہاں سے......" اس نے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے دفتر کے دروازے پر متعین چپڑ اسی کے خیال سے دھیمی آواز میں کہا۔

"جو سزا الطاف آپ کو نہیں دے سکا...... وہ آپ خود کیوں تجویز کر بیٹھی ہیں اپنے لیے۔"

"کون سی سزا؟" اس نے چونک کر خشونت سے اس کی طرف دیکھا اور تیوری چڑھا کر بولی۔

"زندگی کو مشکل بنا لینے کی۔" سیف علی کے لہجے میں دلسوزی تھی۔

"کوئی مشکل وشکل نہیں۔" اس نے ناگواری دکھائی پھر تلخ لہجے میں بولی۔ "نکل آئی ہوں مشکلوں سے...... زندہ ہوں...... خوش ہوں۔"

"زندہ رہنے کے لیے صرف خوش ہونا ہی ضروری نہیں ہوتا۔" سیف علی کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

"تو پھر کیا ضروری ہوتا ہے؟" حجاب نے گویا اس کی دانش کو آزمانے کی کوشش کی۔

"زندہ رہنے کے لیے زندگی کا مقصد سمجھنا ضروری ہے...... اگر آپ زندہ ہیں اور زندگی کا مقصد نہیں سمجھے تو آپ مُردوں سے بدتر ہیں۔"

"کیا ہے زندگی کا مقصد؟" اس کے لہجے میں بھڑکتی شمع کی یک بیک بلند ہو جانے والی لو کا تنتنا تھا۔ "دوسروں کو ذلیل کرنا...... بھری عدالت میں جھوٹی الزام تراشیوں سے کسی کو رسوا کرنا...... کرایے کے فوٹوگرافر کو ایک عزت دار عورت کی تصویر اس کی لاعلمی میں کھینچنے کے لیے تیار رکھنا...... اور پھر جھوٹی الزام تراشیوں کے ساتھ اس تصویر کو اخبار میں شائع کرا دینا۔" اس کی آنکھوں میں سرخی اور نمی ایک ساتھ لرزاں دکھائی دی۔

"آئی ایم سوری...... آئی ایم رئیلی سوری۔" وہ شرمندہ دکھائی دینے لگا۔

"کیا اب کسی کے سوری کر دینے سے میری گئی ہوئی عزت واپس آ سکتی ہے؟" حجاب نے بلبلا کر اسے دیکھا۔

"اپنی اسی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھ پر رحم کھانے کی ضرورت نہیں...... سمجھے!" اس نے تڑپ کر کہا اور اپنے آخری لفظ پر اسے کھا جانے

والی نظروں سے دیکھا۔

"رحم کی اپیل تو میں اپنے لیے کر رہا ہوں۔"

حجاب نے غیر شعوری طور پر اپنے جبڑے بھینچ لیے۔

چند لمحے خاموشی میں گزرے پھر وہ بڑے تحمل سے گویا ہوا۔ "اقبال محض شاعر نہیں تھا...... وہ کوئی نہایت اعلیٰ درجہ کی روح تھی...... کہتا ہے زندگی، بے بندگی، شرمندگی...... سوال یہ ہے کہ بندگی کیا ہے...... تارک الدنیا ہو کر اپنی ذات کی نفی کرنا بندگی نہیں۔ دنیا کو برتیں اعتدال کے ساتھ...... زندگی کو جئیں اس کے اصل حق کے ساتھ۔ حقوق اللہ بھی ادا کریں...... حقوق العباد کا خیال بھی رکھیں...... حقوق النفس کو بھی فراموش نہ کریں...... جس رب نے زندگی دی ہے اس کا شکر ادا کریں...... اس کے بندوں کو آسانیاں بہم پہنچائیں اور اپنی ذات کی نفی نہ کریں۔"

"مسٹر سیف علی خان! میں آپ سے بہتر لیکچر دے سکتی ہوں' حجاب نے اسے گھورا اور انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔

"میں جانتا ہوں...... میں جانتا ہوں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "آپ کی صلاحیتوں کا معترف ہوں...... کوئی اور خاتون ہوتی آپ کی جگہ تو الطاف جیسے آدمی کے سامنے اتنی استقامت سے نہ کھڑی رہتی۔"

"آپ الطاف کا ذکر بار بار کر کے کیا سمجھانا چاہتے ہیں مجھے؟" حجاب کی نگاہوں میں شدید ناگواری ڈولنے لگی۔

"کہ آج کے بعد یہ نام آپ کی اور میری لُغت سے خارج ہوگا۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"آپ کو تو اس نے خاصی تگڑی فیس دی ہوگی۔" حجاب نے اپنی دانست میں طنز کیا۔

"فیسوں کی کوئی کمی نہیں...... الحمدللہ رب نے بہت نواز رکھا ہے...... والدہ کے خیال سے شادی کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا...... اس لیے نہیں کہ مجھے اپنی ذات کی نفی پسند ہے...... بلکہ اس لیے کہ میں کسی اور کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا...... میری تو وہ ماں ہیں...... جیسی بھی ہیں مجھے اچھی لگتی ہیں...... ان کے پاس بیٹھ کر مجھے ٹھنڈک ملتی ہے...... چلاّتی بھی ہیں تو میں انہیں خاموش کرنے کی کوشش اس لیے نہیں کرتا کہ ان کا چیخنا، چلاّنا مجھے برا لگتا ہے بلکہ اس لیے کہ آس پاس رہنے والوں کو الجھن نہ ہو...... ویسے گھر اتنا بڑا ہے کہ ان کی آواز انتہائی صورت میں ہی گھر سے باہر جاتی ہے...... کورٹ سے واپسی پر دو تین گھنٹے میں ہوتا ہوں اور وہ...... والد صاحب مرحوم کی تصویر کے سامنے انہیں بٹھا کر میں اُن سے انہی کی باتیں کرتا رہتا ہوں...... مثالی محبت تھی دونوں میں...... انہی کی موت نے ان کا ذہنی توازن درہم برہم کیا۔"

وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

"یہ آپ کی دوست مس تقدیم کے ہونے والے شریکِ زندگی ہیں...... اویس انصاری...... جنہوں نے مجھے شادی پر آمادہ ہونے کے لیے گھیرا...... اور اس بری طرح کہ جائے فرار نہ رہی...... اب شکر ادا کرتا ہوں کہ بہت صحیح گھیرا انہوں نے مجھے...... مس تقدیم بتا رہی تھیں آپ کی والدہ بہت فکرمند رہتی ہیں آپ کے لیے...... زندگی تنہا بھی گزر ہی جاتی ہے مس حجاب...... لیکن شاید کسی کا سہارا بن کر...... اور کسی کا سہارا لے کر آپ زیادہ بہتر زندگی گزار سکتے ہیں...... میرے والدین جب تک اکٹھے تھے ہمارا گھر جنت تھا اور دونوں کی زندگی قابلِ رشک...... لیکن والد صاحب کے زندگی سے نکلتے ہی والدہ بھی بکھر کر رہ گئیں...... میرا خیال ہے



شاعرہ نجمہ ناز اصغر سے ملاقات

آج ایک بیٹی اپنی ماں کا تعارف لکھ رہی ہے اور ماں بھی ایسی جو معروف شاعرہ... مگر اب کچھ عرصے سے انہوں نے لکھنا پڑھنا سب چھوڑ رکھا ہے۔ میں اپنی امی کا تعارف اس وجہ سے بھی بھیج رہی ہوں کہ وہ پھر لکھنے کی طرف لوٹ آئیں۔ بچپن میں شہزادوں اور پریوں کی کہانیاں پڑھنے والی کو جب خدا نے جیتے جاگتے شہزادے اور پریاں عطا کیں تو ملکہ نے اپنے بادشاہ کے ساتھ مل کر بہترین تربیت کی اور تعلیم دلائی۔ امی مکمل ہاؤس وائف ہیں اور ابو AG سندھ میں سینئر آڈیٹر تھے۔ ابو کو مزے مزے کے کھانے کھانے کا شوق تھا اور امی کو کوکنگ کا۔ زندگی سکھ چین سے گزر رہی تھی کہ اچانک زلزلوں کی زد میں آگئی۔ ابو کینسر سے لڑنے والی زندگی کی جنگ ہزار دعاؤں کے باوجود ہار گئے۔ ابو تاج تھے اور امی محل جب تاج نہ رہا تو یہ محل بھی ویران ہو گیا۔

امی، ابو کو کتابیں پڑھنے کا جنون تھا گھر میں اردو ادب کا خزانہ ہے، دونوں کی پسند مشترک تھی انڈین اور پاکستانی گانے اور غزلیں پسند تھیں، ابو کے پاس بہترین کلیکشن تھی امی جب بھی کچھ لکھتیں ابو کو دکھاتیں، ابو حوصلہ افزائی کرتے امی نے صرف آٹھ کلاس تک پڑھا مگر غضب کی نالج ہے، میں کیا بتاؤں ہمارا ماحول کتنا سادہ اور پُرسکون تھا، ابو نے بنا رشوت لیے اور امی نے بڑے سلیقے سے ہم پانچ بچوں کی پرورش کی ان کی شاعری میں کہانیاں اور قصے بجے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار پڑھیے۔

ذات تیری ہے دل و جاں کا حسیں تاج محل
یاد سے تیری مہکتے ہیں گلِ لالہ سمن اور کنول
معاملہ عشق کا ہے راہیں بھی دشوار بہت
دھار شمشیر کی ہے برہنہ پا تنہا چل
گھر کی دہلیز ہی کیا؟ اپنوں سے منہ کو موڑا
پیش رو تھا تیرا گھر دل نے کہا گھر سے نکل
جذبۂ دل ہو فقط ہو خس و خاشاک کا گھر
تو رہے شاہجہاں میں رہوں ممتاز محل
صرف دھوکا ہی تھے ناز یہ مہ و سال کے دن
جالِ مکڑی کا ہے اب ایسے سرابوں سے نکل

امی، ابو کی محبت مثالی تھی، جب موسم ابر آلود ہوتا ابو اپنی ون ٹین بائیک اٹھاتے اور امی کو لے کر گھومنے نکل جاتے۔ چاندنی رات ہوتی تو ابو امی سے نسیم بیگم کے گانے سنتے اور ہم بچوں سے بھی کچھ نہ کچھ سنتے۔ کوئی نظم سناتا کوئی گانے، ابو، امی اپنے ماضی کے قصے سناتے بارش ہوتی تو امی پکوڑے بناتیں بیسن کے پراٹھے بناتیں اور اب میری ماں یکدم خاموش ہو کر رہ گئی ہیں۔ دعا کریں کہ اپنا یہ تعارف پڑھ کر وہ پھر پہلے جیسی ہنستی مسکراتی شاعرہ بن جائیں۔

از طرف بنتِ نجمہ ناز اصغر، کراچی

میں اور آپ بھی ایک دوسرے کا سہارا لے کر...... دوسروں کا سہارا بن کر اپنی موجودہ زندگیوں سے بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی اگرچہ وہ میری پیشہ ورانہ ضرورت تھی...... لیکن میں آپ سے اور آپ کی فیملی سے کھلے دل سے معافی مانگنے کو تیار ہوں...... آپ سے تو ابھی اور اسی وقت۔'' اس نے دونوں ہاتھ باہم جوڑ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''سوری۔''

حجاب اس کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکی۔

''اور ایک بات......'' اس کے لہجے کی قطعیت نے حجاب کو چونکنے اور اس کی جانب نظر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ہاتھ کھولے اور دائیں انگشتِ شہادت سے اپنے کان کی لو کو چھوتے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''مجھ سے بہتر آدمی آپ کو شاید اس زندگی میں تو نہ مل سکے۔''

اپنی دائیں کہنی میز پر ٹیک کر اس نے اپنی خوب صورت ٹھوڑی اپنے ہاتھ کی مسند پر رکھ دی اور سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں استخارہ کروں گی۔'' حجاب نے اپنی سنہری آنکھوں سے اپنے روبرو بیٹھے دشمنِ جاں کو دیکھا اور پہلی بار اسے اس کی بے پناہ وجاہت کا احساس ہوا۔

''ارے...... یہ کیا بات کر دی آپ نے...... میں استخارہ کر چکا ہوں۔'' اس کی بات سن کر وہ بے ساختہ اچھل پڑا۔

''کیا رہا؟'' اب وہ چونکی۔

''پہلے آپ کر لیجیے پھر بتاؤں گا۔''

☆☆☆

اگلے تین دن وہ نمازِ استخارہ پڑھ کر سوتی رہی۔ دو دن نہ خواب میں کچھ دکھائی دیا نہ دل میں اس حوالے سے کوئی خیال پیدا ہوا۔ تیسری شب اس نے خواب میں دیکھا جیسے وہ ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر اپنا سر دونوں گھٹنوں پر ٹکائے ننگے سر بیٹھی تھی دفعتاً کسی نے اسے زرتار سبز دوپٹا اوڑھا دیا۔ اس نے سر اٹھایا اور دوپٹا اپنے رخ سے ہٹا کر یہ دیکھنے کو نظریں اوپر اٹھائیں کہ دوپٹا اسے کس نے اوڑھایا تھا...... وہاں سیف علی خان کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

ملاقات کے لیے تقدیم کے دفتر سے بہتر جگہ اور کوئی نہ سوجھی دونوں کو...... اویس انصاری بھی موجود تھا۔ تقدیم نے آفس بوائے کو کافی لانے کو کہہ دیا تھا...... اور اب ان دونوں کو اپنے، اپنے استخارے کا احوال بیان کرنا تھا۔

''پہلے آپ بتائیں۔'' سیف علی خان نے حجاب سے کہا۔

''پہلے آپ......''

''پہلے آپ...... کیونکہ آپ نے استخارہ پہلے کیا تھا۔'' حجاب بولی۔

''لیڈیز فرسٹ۔'' سیف علی خان دور کی کوڑی لایا۔

''بہت ہوشیار ہوتے ہیں آپ مرد لوگ...... عورت کو ہمیشہ گائے کی طرح اپنے پیچھے، پیچھے چلتے دیکھنا پسند کرتے ہیں لیکن جب اپنے مطلب کی بات ہوتی ہے تو...... لیڈیز فرسٹ!'' تقدیم بھی موڈ میں تھی۔

''پہلے تم بتاؤ۔'' سیف علی خان۔ ''آپ'' سے ''تم'' پر آ گیا۔

''یار تم ہی پہلے بتا کر ثبوت دے دو کہ مرد زیادہ جی دار ہوتے ہیں۔'' اویس انصاری نے کہا۔

''اوکے......'' سیف علی نے آمادگی ظاہر کی اور سنبھل بیٹھا...... دھیرے سے کھنکھارا پھر بتانا شروع کیا۔ ''میں نے دیکھا...... ایک اونچی سی جگہ پر جو بہت سرسبز ہے ایک لڑکی بیٹھی ہے...... اس کا چہرہ واضح

نہیں......لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ یہی ہیں۔"

"یہی سے مطلب؟" اویس نے تقدیم کو دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے سیف علی کو چھیڑا۔

"حجاب یار......" سیف علی نے کہا۔

"اچھا، اچھا......پھر؟"

"چپ کریں......بتانے دیں سیف بھائی کو۔" تقدیم نے اویس کو تنبیہ کی۔

"واہ بھئی! ابھی سے۔" اویس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" سیف علی مسکرایا۔

"سیف بھائی آگے بتائیں ناں۔" تقدیم نے بے تابی سے کہا۔

"میری بہن مجھے ایک چمکیلی سی چادر دیتی ہے کہ اس لڑکی کا سر ننگا ہے اسے چادر اوڑھا دو......بس پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

حجاب کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تم نے کیا دیکھا تھا حجاب؟" تقدیم نے پوچھا۔

"شاید کوئی یقین نہ کرے۔" حجاب کا لہجہ کچھ اس طرح خوابناک تھا۔ جیسے وہ خود کو کسی دوسرے جہان میں پہنچا رہی تھی۔ "میں نے دیکھا جیسے میں ننگے سر ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھی ہوں......میں نے اپنا سر گھٹنوں پر اوندھا رکھا ہے......مجھے کوئی آکر سبز رنگ کا گوٹا لگا دوپٹا اوڑھا دیتا ہے......میں نظر اٹھا کر دیکھتی ہوں تو یہی ہیں۔"

"آپ دونوں نے کہیں مل بانٹ کر قسطوں میں تو نہیں دیکھا تھا خواب؟" اویس انصاری کو مذاق سوجھا۔

"مذاق نہ سمجھیں......بائی گاڈ یہ سچ ہے۔" حجاب بولی۔

"لیجیے جناب......آپ تو پہاڑ کی چوٹی سر کر بیٹھے......اب ہمارے حق میں دعا فرمائیں۔" اویس انصاری نے مسکراتے ہوئے سیف علی خان سے کہا۔

"آپ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔" سیف علی خان نے خوش دلی سے کہا۔

حجاب کی نگاہیں سیف علی خان کی نگاہوں سے بغلگیر ہوئیں......کل کے دشمن آج کے رفیقِ زندگی بننے کو تیار بیٹھے تھے۔

تقدیم نے ان کی نگاہوں کے ہم آغوش ہونے کا منظر دیکھا۔

"زندگی ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔" تقدیم کا لہجہ گئی رُتوں کے کرب سے بوجھل اور آنے والی رُت کے تصور سے نہال تھا۔

ہر خوشی، ہر غم کے موقع کی طرح سمندروں پار بیٹھی تسنیم کی یاد نمی بن کر پھر اس کی آنکھوں میں ہلکورے لینے کو تیار تھی۔

دکھ ہو یا سکھ......دور گئے......بچھڑے لوگ......شبنم کی صورت نہ جانے کیوں اپنے پیاروں کی آنکھوں میں اتر آتے ہیں۔

زندگی!

اے زندگی!

(ختم شد)

ایک خواہشِ لاحاصل

عقیلہ حق



"کیا اپنے کیا پرائے...... کیا امیر کیا غریب......کوئی بات کوئی حیثیت نہیں رکھتی، بس بیٹیوں کے اچھے نصیبوں کی دعا کیا کرو اور ہر معاملہ اللہ پر چھوڑ دو کہ ہر تدبیر، تقدیر کے آگے بے بس ہے لیکن دعائیں تقدیروں کو بھی بدل دیتی ہیں، بیٹیاں بھاری نہیں ہوتیں، ان کے نصیبوں سے ڈر لگتا ہے بس ہر ڈر سے نجات کے لیے مالکِ حقیقی سے سوال کرو......اگر رشتہ مناسب ہے تو استخارہ کرلو اور اللہ کا

نام لے کر رخصت کرو۔ یقین سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ اللہ پر یقین رکھو۔" مسرت بیگم نے قطعیت سے اپنی پڑوسن سے کہا جو اپنی بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں ان سے مشورہ مانگنے آئی تھیں۔

اُدھر اپنے کمرے میں مٹی سے اَٹے آئینے میں اس نے سر میں تیزی سے بڑھتے سفید بالوں کو ٹٹولا اور پھر اس کی نظریں اپنی ویران کلائیوں میں الجھ گئیں۔

☆☆☆

"لو بھئی حد ہوگئی اتنا بڑا ٹبر..... گھر کم شادی ہال زیادہ لگ رہا تھا، میں تو اپنی بیٹی کبھی نہ دوں، ساری زندگی روٹیاں ہی تھوپتی رہ جائے گی، وہاں تو ساس کی بھی ساس زندہ ہیں، مرنے کا تو رواج ہی نہیں اس خاندان میں، بڈھے کھوسٹ بھی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے جی رہے ہیں، وہاں تو روز دیگیں چڑھتی ہوں گی، توبہ ہر کونے سے لوگ لال بیگوں کی طرح نکلے چلے آرہے تھے، بس منع کروادیں، میرا بالکل دل نہیں ہے۔ میری بچی بوکھلا کر رہ جائے گی، آپ سن رہے ہیں ناں صاف انکار کہلوادیں۔" مسرت بیگم نے میاں کا شانہ ہلایا۔ جن کی توجہ اُن کی طرف کم اور ٹی وی پر چلنے والے ٹاک شو کی طرف زیادہ تھی۔

"بند کریں یہ ٹی وی، وی وی.....'' انہوں نے الٹے ہاتھ میں ریموٹ لے کر ٹی وی بند کیا اور سیدھے ہاتھ سے ان کا شانہ ہلایا۔ "بات سنیں میری، ابھی ان چالاکو بی کا فون آیا تھا کہ آپ نے لڑکا تو دیکھ لیا، اب آپ کی کیا رائے ہے، فی الحال تو میں سنی ان سنی کر گئی کہ جس راہ نہ چلنی اس کے کوس کیا گننے، پتا نہیں کس کس کے حوالے دے رہی تھیں فلاں ہمارا رشتے دار ہے، وہ ہمارا کنبے دار ہے، آپ معلومات کرلیں، توبہ میری بچی کا کم بختوں نے پیچھا ہی پکڑ لیا۔ جیسے میں اپنی نازوں کی پلی بچی انہیں دے ہی تو دوں گی، میں تو اپنی شافعہ کی شادی کسی پڑھی لکھی مختصر سی فیملی میں کروں گی اور خاص کر آپ کی ذات برادری سے ان لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہو۔ بالکل لوگ ہوں، سن رہے ہیں ناں آپ...... یہاں غصے اور فکر سے برا حال ہے اور آپ کا اطمینان واہ بھئی واہ۔" مسرت بیگم اپنے شوہر بہزاد علی کے بے سے انداز پر کھول کر رہ گئیں۔

"تو وجہ بھی تو ہو کوئی انکار کی...... کس بات پر انکار کروں، لڑکا خوش شکل، تعلیم یافتہ، نیک برسر روزگار ہے۔ اپنا ذاتی گھر ہے، اعلیٰ خاندان شاندار حسب نسب اور کیا چاہیے آپ کو، کیا یہ کہہ کر انکار کروں کہ آپ کا کنبہ بہت بڑا ہے، آپ کے گھر میں ماشاء اللہ سب حیات ہیں، چھوٹوں کے سر پر بڑے اور بڑوں کے دل بہلانے کے لیے چھوٹے ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، ایک ساتھ کھانا پکتا ہے اور سب ایک دستر خوان پر بیٹھ کر محبت سے کھاتے ہیں، ہماری بیگم کو آپ کے گھر کا محبت بھرا ماحول پسند نہیں آیا۔ انہیں اپنی بیٹی کے لیے صاف میدان چاہیے۔ بولیے کیا کہوں؟" بہزاد علی نے سنجیدگی سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"مجھے نہیں پتا جو دل چاہے کہیں...... لیکن سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ بہت بڑا کنبہ ہے، دادا دادی تک زندہ ہیں، آج کے دور میں بھی چاچی اور تائیاں تک ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔ میری بچی تو الجھ کر رہ جائے گی، اتنے سارے لوگ، ارے اگر سب ایک، ایک بات بھی کہیں گے تو روز کی دسیوں باتیں میری بچی کے کلیجے میں گڑیں گی۔"

"لیکن بیگم صاحبہ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ روزانہ دس محبت بھرے جملے آپ کی بیٹی کو سننے کو ملیں اور خوشی سے اس کا دل اور دامن بھر جائے آپ صرف منفی باتیں ہی کیوں سوچتی ہیں، بھرے پُرے گھر میں بچی دینے کے لیے صرف منفی سوچ کیوں...... آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ان کے گھر کا ماحول بہت اچھا ہوگا جو سب آج تک ایک ڈور سے بندھے ہیں

...بہت ساری اچھائیاں بھی تو ہیں، ہماری بیٹی کا کوئی بہن بھائی نہیں۔ اسے بہت سارے بہن بھائی اور بہت سے خوب صورت رشتے مل جائیں گے، سب سے بڑی بات کہ لڑکی اکیلی نہیں ہوگی، اچھے برے وقت میں بہت سارے لوگ آس پاس ہوں گے اگر خدانخواستہ بیٹی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو، داماد ستائے تو گھر میں بڑے تو موجود ہوتے ہیں سمجھانے کے لیے۔ بڑے خاندان میں لڑکی بھاری بھرکم رہتی ہے۔ وہاں بہوؤں کو ستانا آسان نہیں کہ چار اُن کے اپنے ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہی باز پرس کرنے کھڑے ہوجاتے ہیں، بس میرے خیال سے سارے وہم جھٹک دیں، اللہ پر بھروسا رکھیں، بیٹیاں تو امانت ہوتی ہیں، یہ رشتہ مناسب ہے زیادہ فکر ہے تو استخارہ کرلیں۔'' بہزاد علی نے بیوی کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

''جی...... جی بالکل درست فرما رہے ہیں آپ مسٹر بہزاد علی...... بھرے پُرے کنبے میں لڑکی بہت خوش رہتی ہے، ایسا ہی سلوک ہوتا ہے اس کے ساتھ جیسا میرے ساتھ ہوا۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے، ساری زندگی تباہ کرنے کے بعد تو سمجھ آیا، سب بکواس ہے۔''

''خاندانی ہیں، شریف ہیں۔ ہونہہ اندر سے زنگ زدہ روحیں رکھتے ہیں بہت سے خاندانی...... بس میری بچی کو تو معاف ہی رکھیں، میرے اندر اب کوئی کہانی دہرانے کی سکت نہیں ہے، ایک ہی تو میری بیٹی ہے، میں اسے ہر حال میں اس زندگی سے بچاؤں گی جو میں نے گزار لی۔'' مسرت بیگم نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے دوٹوک لہجے میں کہا اور ان کے شوہر خاموشی سے ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

کچھ تو تھا اُن کے انداز میں کہ بہزاد علی نظریں چرا گئے۔

☆☆☆

''اماں جی کیا خیال ہے، کیسی لگی لڑکی؟'' ناصرہ نے لڑکی کے گھر سے نکلتے ہی ماں سے سوال کیا۔

''ہاں ہے تو انسان کی بچی...... لیکن ذرا گھر تو دیکھو، چائے کے برتن تک اتنے معمولی تھے، بہت کم حیثیت لوگ لگ رہے ہیں۔'' اماں جی نے نخوت سے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں اماں جی، مالی حالات تو کمزور ہی لگ رہے ہیں، دیواروں تک پر رنگ بے رنگ ہوگیا۔ زمین پر بچھی چاندنی الگ لگ رہی تھی کہ برسوں سے دُھل دُھل کر بچھائی جا رہی ہے لیکن جمن بی بتا رہی ہیں بہت خاندانی لوگ ہیں، حسب نسب میں کوئی کھوٹ نہیں، ایک زمانے میں بہت مالدار تھے، یہ تو گھر کی بناوٹ بتا رہی تھی کہ عمارت کبھی شاندار رہی تھی، سنا ہے کہ جب سے باپ بیمار ہوئے ہیں، بہت مشکل سے سفید پوشی کا بھرم رکھ رہے ہیں لیکن اماں یہ سوچ لیں کہ لڑکی اتنی خوب صورت اور کم عمر ہے کہ آپ کا بیٹا اس لڑکی کو منٹوں میں بھولے گا جس کے لیے وہ آپ کے آگے سینہ تان کر کھڑا ہوجاتا ہے، یہ تو زبردستی کا سودا ہے، ہم اسے بھائی کے دل پر چڑھنے ہی نہیں دیں گے جو چاہیں گے کریں گے جیسے چاہیں گے رکھیں گے، نہ اسے بھائی کے دل پر چڑھنے دیں گے اور نہ اُس چڑیل کو اترنے دیں گے۔'' چھوٹی مہر دور کی کوڑی لائی تھی۔

''لیکن پھر بھی......'' اماں بی جز بز تھیں۔

''ارے بس چھوڑیں غریب گھر کی لڑکی ہے، ہمیشہ دب کے رہے گی، دال کھاتی آرہی ہے سبزی کھائے گی تو شکر گزار ہوگی۔'' رئیس احمد سارے راستے بیوی اور بیٹیوں کی باتیں سنتے آئے تھے، گھر آتے ہی اپنی رائے دینے لگے اور کمرے میں موجود چھوٹے بڑے تائیدی انداز میں سر ہلانے لگے۔

پھر ان خود غرض اور بے حس لوگوں نے رفیق احمد کے گھر کے چکر کاٹنے شروع کردیے۔ گو رفیق

احمد آنکھوں سے تقریباً معذور ہو چکے تھے لیکن بہت معاملہ فہم، سمجھدار اور زیرک آدمی تھے، ان کی چھٹی حس ان سے کہتی سوچ لو اچھی طرح سوچ لو، یہ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں، کچھ ہے جو چھپایا جا رہا ہے لیکن ہائے رے مجبوریاں اور بیٹیاں شاید ایک ساتھ جڑی رہتی ہیں پھر انہوں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ یہ سب ان کا محض خیال ہو کیونکہ بظاہر ان لوگوں میں کوئی خامی نظر نہیں آ رہی تھی...... خاندانی تھے مالدار، شریف اور بظاہر اچھے اخلاق کے مالک سو انہوں نے ان کے اصرار سے مجبور ہو کر سترہ سالہ مسرت کو بیاہ دیا۔

”بھائی میری بچی بہت کم عمر اور ناسمجھ ہے، اپنی بیٹی بنا کر رکھیے گا، کوئی خطا ہو تو سمجھا دیجیے گا، انشاء اللہ دوبارہ شکایت کا موقع نہیں دے گی، یہ میری کُل پونجی ہے جو آج میں آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔“ وقتِ رخصت رفیق احمد گڑگڑائے تھے لیکن وہاں سن کون رہا تھا اور افسردہ باپ کو چھوڑ کر مسرت پھولوں بھری گاڑی میں بیٹھ چکی تھی، ایک نئی زندگی کے آغاز کے لیے......

اور جلاپے کی ابتدا تو اسی لمحے ہو گئی کہ جب اسے سسرال میں سرخ جازم پر مخمل کے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بٹھایا گیا، سرخ کمخواب کے دبکے اور سلمے سے بھرے لہنگے اور بیش قیمت زیورات سے سجی بڑے سے گھونگٹ میں سر جھکائے بیٹھی مسرت اتنی حسین لگ رہی تھی کہ محفل میں موجود ہر عورت پھیکی سی پڑ گئی، سلامی کی رسم ہو رہی تھی۔ عورتیں... ذرا سا گھونگٹ سرکا کر دیکھتیں اور سلامی کا لفافہ اس کی دودھیا ہتھیلی پر رکھ دیتیں جو مہندی کے بیل بوٹوں سے سج کر آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

وہ تھی ہی اتنی حسین کہ جب اس نے سسرال کی دہلیز پر قدم رکھا تو دولہا کی دادی نے جو بوجہ ضعیفی بارات کے ساتھ نہ جا سکی تھیں کہا۔ ”جس دلہن کے پیر اتنے حسین ہوں اس کا چہرہ کیا ماہتاب ہو گا۔“ بڑی نند ناصرہ کو بھاوج کی اس قدر پزیرائی کی امید نہیں تھی، بظاہر خوشی خوشی پر در حقیقت بہت ... دلی سے وہ سلامیوں کے لفافوں کے ساتھ ... مبارک بادیں بھی وصول کر رہی تھیں کہ ... کمرے میں چلے آئے۔

”یا اللہ ایسا نصیب بھائی بہزاد کا ... کیا دلہن ہے...... لگتا ہے حور زمین پر اتر آئی ... نصیب پایا ہے حسن اور کم سنی ایک ساتھ... واہ ... ارے میں اگر پہلے دیکھ لیتا تو میری کلو جان ... سے کبھی شادی نہ کرتا۔“ انہوں نے اپنی ... کے کان میں شرارت سے سرگوشی کی اور ... ناصرہ نے تیوری بدل کر میاں کی طرف ... خشمگیں نگاہوں سے پھولوں سے لدی، مہمانوں ... گھری شرمائی لجائی سی، چھوئی موئی سی دلہن... قہر بھری نگاہ ڈالی اور ایک پھانس سی اس کے ... چبھ گئی اور اس لمحے اسے احساس ہوا ... خاندان جہاں تقریباً ہر عورت درمیانی صورت کی ہو وہاں حسین بھاوج کیا کوئی حسین ... نہیں لانا چاہیے کہ لوگ موازنہ کرنے لگتے ہیں ... جو غلطی ہو گئی اسے سزا نہیں بنتا اب اس صورت ... چاندنی کی طرح دمکنا نہیں اور جو چاند کو گہنا ... کرنا ہو گا اس نے اسی لمحے نہ جانے کیا کچھ ... اور ادھر سونف اور چھالیا چباتے ہوئے ... نے یہ سوچا تک نہیں کہ ان کی معمولی سی شرارت ... کے لیے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر دے گی ... کی شرارت کی قیمت کسی کی پوری زندگی کی ... ایک خوشی دے کر بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆

بہزاد فطرتاً نرم مزاج اور صلح جو تھے۔ ... دن ہی مسرت کی معصومیت اور حسن پر فریفتہ ... اور اپنی محبوبہ کو بھول چکے تھے لیکن وہ نہیں جانتی ... یہ خوشی کتنے دن کی ہے، وہ ہواؤں میں اُڑ رہی ... کترے بھی جا سکتے ہیں وہ نہیں جانتی تھی۔

... مرد کی محبت عورت کے گرد ایسا حصار کھینچ دیتی ہے جس کا کوئی دروازہ نہیں، جہاں کوئی جھری نہیں، کوئی کھڑکی، روشندان نہیں، وہ مرد کی محبت میں قید ہوتی چلی جاتی ہے، عورت، مرد کی محبت میں سب ... لیتی ہے، محبت کی ایک نگاہ اس کے سیکڑوں زخموں کو بھر دیتی ہے۔ عورت مرد کی محبت میں پامال ہو جاتی ہے، قدموں میں بیٹھ جاتی ہے، راہوں میں رُل جاتی ہے، سنگسار ہونے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور مسرت بھی بہزاد علی کے پیار میں ڈوبی سسرالی سختیاں سہنے کو ہر لمحے تیار رہتی۔

☆☆☆

وہ ایک بھرا پُرا کنبہ تھا جہاں اس نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ دو جیٹھانیاں، ساس، سسر، دیور دو کنواری نندیں، وہ خوش تھی کہ وہ گھر بسانے آئی تھی، خدا نے اسے غیر معمولی حسن کے ساتھ بہت محبت بھرا اور معصوم دل بھی دیا تھا۔ وہ تھی بھی تو صرف سترہ برس کی...... جیٹھ کے بچوں کی عمر کی اپنی ان کنواری نندوں سے بھی چھوٹی لیکن اس نئے رشتے نے اسے کسی کی چاچی کسی کی مامی اور کسی کی بڑی بھابی بنا دیا تھا اور وہ ہر رشتے کو نبھانے کے لیے دل و جان سے تیار تھی۔

”اِدھر آؤ...... یہ کیا طریقہ ہے، یہ جیٹھ، دیوروں کا گھر ہے، یہ بازاری عورتوں کی طرح سج سنور کر کیوں کھڑی ہو، بہو بیگم۔“ ابھی وہ اپنے کمرے سے سیاہ کامدار سوٹ کے ساتھ کندن کا خوب صورت سیٹ پہن کر ہلکے ہلکے میک اپ میں تیار ہو کر باہر ہی آئی تھی کہ اس کی ساس جو بڑی بیٹی کے ساتھ صحن میں بچھے تخت پر بیٹھی تھیں، کڑی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے لتاڑنے لگیں۔

”اماں جی، ہمارے ماموں کے گھر دعوت ہے ناں، میں نے آپ سے جانے کی اجازت تو لی تھی۔“ اس نے گھبرا کر وضاحت کی۔

”تو...... اور کیسی اجازت......؟ مجھ سے تو تم نے پوچھنا تک گوارا نہیں کیا۔“ اماں جی دہاڑیں۔

”کیا مسرت... تم نے اماں سے پوچھا تک نہیں؟“ بہزاد جو شور سن کر کمرے سے باہر آ گئے تھے، مسرت سے سوال کر رہے تھے۔

”نہیں، میں قسم کھا سکتی ہوں، میں نے رات کو بھی پوچھا تھا اور تیار ہونے سے پہلے بھی۔“ مسرت گھگیا گئی۔

”تو کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہماری اماں جھوٹی ہیں۔“ ناصرہ نے بات کا رخ ہی بدل ڈالا۔

”اور یہ سرخ رنگ کی لپ اسٹک کس لیے لگائی ہے... ارے بی بی یہ شریفوں کا گھر ہے، یہاں یہ چونچلے نہیں چلیں گے۔ خبردار آئندہ احتیاط کرنا، اونہہ باپ کے گھر کچھ نصیب نہیں تھا اور یہاں بیگم صاحبہ اوقات سے زیادہ پا کر پھٹ ہی پڑیں۔ چلو جاؤ اور منہ دھو کر سادہ سے کپڑے پہنو۔“ اس کی ساس نے اس کی کلائی پکڑ کر اس کا رخ واپس کمرے کی طرف کیا۔

وہ دم بخود حیران اور شرمندہ سی اپنے کمرے کی طرف جانے لگی لیکن آنکھوں سے بہتا پانی ہر چیز کو دھندلا رہا تھا۔ ہر طرف ایک دھند سی چھا رہی تھی اور دھند تو چھانی ہی تھی کہ بہزاد جو ابھی چند لمحوں پہلے اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھا رہا تھا جس کی زبان اس کے حُسن کے قصیدے پڑھتے پڑھتے خشک ہو رہی تھی اور وہ چہرہ جو چند لمحوں پہلے فخر اور خوشی سے گلابی ہو رہا تھا، وہ چہرہ جو اس کی سسرال کی عورتوں کے لیے مشکل تھا پر وہ اس کے محبوب، اس کے شوہر کا پسندیدہ چہرہ تھا۔ وہ مارے خفت کے سفید پڑ رہا تھا، ہائے مرد کی محبتوں کا احساس، عورت غرور اور فخر کی سرحدوں پر جا کھڑی ہوتی ہے جب اس کا محبوب، اس کا دیوتا، اس کا شوہر اس کے آگے اس کی محبت میں گھٹنے ٹیک دیتا ہے، وہ بھی ان چند لمحوں میں آسمان سے زمین پر آ گری تھی وہ جو ابھی چند لمحوں پہلے اس کے کانوں میں گنگنا کر کہہ رہا تھا، ”تم میری

جان ہو، ہر لمحے بس میرے لیے مسکراتی رہا کرو کہ تمہاری مسکراہٹ میری زندگی ہے اور تمہاری سوگواری میری موت......''

وہ خاموش کھڑا اس کی ذلت، اس کی رسوائی، اس کی سوگواری اور اس کے آنسو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اپنی ماں، بہنوں کی محبت میں اس ظلم کا حصہ بننے والے مرد یہ کیوں نہیں سوچتے کہ عورتیں ان کے پاس اللہ کی امانت ہوتی ہیں اور ان پر کی جانے والی ہر زیادتی کے لیے روزِ حشر سوال ہوگا اس لیے کہ وہ ان کی رعایا ہوتی ہیں۔ یہاں رعایا کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ وہ مخلوق جس پر ہر ظلم و زیادتی جائز ہوتی ہے اور ظلم کیا ہے؟ کسی چیز کو اس کا صحیح مقام نہ دینا، ٹوپی کو پیروں میں رکھنا ظلم ہے غرضیکہ کسی شے کو اس کا جائز مقام نہ دینا ظلم...... اور وہ تو اس کی بیوی تھی ایک جاندار مخلوق...... سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں بیاہ کر لایا تھا۔ وہ یہ کب چاہ رہی تھی کہ وہ اپنی ماں سے بدتمیزی کرے لیکن کم از کم اس کا جائز مقام تو دے۔ اس کے ساتھ بے جا زیادتی تو نہ ہو۔ چھوٹے تو اس سے بدتمیزی نہ کریں اور یہ زندگی کا ایک عجیب موڑ تھا۔ چہرے پر شرمندگی لیے اور پلکوں پر موتی سنبھالے، وہ گویا عالمِ نزع میں چل رہی تھی۔ اب اسے صبر کرنا تھا، اپنے دل پر جبر کرنا تھا یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی تکلیف کے احساس سے اس کا کلیجا پھٹا جا رہا تھا، کوئی اس کے اندر بین کر رہا تھا۔ سوال کر رہا تھا۔

''میرا قصور کیا ہے؟''

کاش! وہ سمجھ سکتی کہ اس کا قصور کیا ہے؟ جب انسان سمجھوتا کر لے تو وہ ہر بات سہہ جاتا ہے اور اس نے بھی سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے پر تنقید ہوتی، اس کے جہیز کے سامان کا مذاق اڑایا جاتا، اس کے باپ کے گھر کی بدوضع دیواروں، اور غربت کا ذکر ہوتا، اس کے کھانے پینے پر نگاہ رکھی جاتی، میکے سے آنے والے ٹیلیفون بند کر... جاتے، گھر کے وہ کام جو پہلے صرف ملازمیں... تھے اب اس سے کرائے جاتے، کوئی رشتے دار... صرف اس کی اور اس کے میکے کی برائیاں ہوتیں... وہ صرف خاموش رہتی۔ اس کا رنگ و روپ... پڑ گیا، آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے، پیر میکے... لگے، وہ پروا نہ کرتی، بال آدھے رہ گئے لیکن وہ... ڈالتی کہ زندہ رہنے اور جینے میں بہت فرق ہوتا ہے... وہ زندہ نہ تھی وہ جی رہی تھی وہ زندگی کے دن... کرنے کے لیے سانسیں لے رہی تھی۔

☆☆☆

روز صبح اس کی نند ناصرہ کا فون آ جاتا اور... سارے دن کے احکامات نافذ ہو جاتے، اماں... ابا جی ناصرہ کی ہر بات آنکھ بند کر کے مان... جیٹھانیاں ساس سے چپکی رہتیں، ساس نندیں بھی... میں گھلی ملی تھیں کیونکہ ایک ساس کی بھانجی تھی... دوسری سسر کی بھانجی۔ ان ہی کی طرح معمولی... صورت شکل کی۔ کم تعلیم یافتہ اور گھریلو سیاست... طاق اور جہاں ایک چھت تلے اتنے سارے... سیاستدان رہتے ہوں وہاں اس جیسی ننھی معصوم... لڑکی کا کیا زور چلتا اور وہ زور چلانے آئی بھی نہیں تھی۔ وہ تو گھر بسانے آئی تھی۔

گھر بسانا۔ کتنا مشکل کام ہے، وہ جان گئی تھی کہ ایک روز اس کے مجبور باپ نے اس سے کہا تھا۔

''بیٹا قدرت کی طرف سے اچھا ذہن، اچھی صورت تحفے کے طور پر ملتی ہے مگر بعض اوقات قدرت کے اس تحفے کی دنیا قیمت طلب کر لیتی ہے۔ بعض اوقات خوشیوں اور رشتوں کا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارا گھر سلامت رہے تو اپنی ہر خواہش، ہر آرزو کو پامال کر دینا جو بہزاد چا... ہے وہ کرو، مسکرا کر اس پل صراط سے گزر جاؤ... کے درد کو چھپالو، اس شادی کو قائم رکھنے کے لیے... بھی قربانی سے دریغ نہ کرو کہ ناکام شادی سے تکلیف والی مشکل شادی شدہ زندگی بہتر ہے۔ شادی مرد اور عورت کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ایک مذہبی معاہدہ ہے، مرد بہت کم معاہدے کے اصولوں کا خیال رکھتا ہے۔ وہ شادی کے تقاضوں کا خیال نہیں رکھتا۔ وہ ہر چیز پرفیکٹ چاہتا ہے۔'' وہ اسے مسلسل حوصلہ دے رہے تھے۔

''شادی ایک معاہدہ ہی تو ہے، اب تم سوال کرو گی کہ معاہدہ تو دو فریقین کے درمیان ہوتا ہے تو پھر صرف ایک فریق ہی کیوں تختۂ مشق بنتا ہے۔ بس بیٹا ہمارے معاشرے میں یہ ازل سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ عورت گھر بناتی ہے، ہر قول نبھاتی ہے۔'' ابا کی باتوں کے ساتھ ساتھ اسے اپنی ماں کی کہی یہ بات یاد آئی۔

''باپ کے گھر گندم کی روٹی پکتی ہے اور میاں کے گھر لوہے کی۔ دو نوالے حلق سے اتارنے مشکل ہو جاتے ہیں۔'' وہ جب بھی سارے دن کی مشقت کے بعد دو نوالے کھاتی اسے اپنی ماں بہت یاد آتی اور وہ آنسوؤں کے نمکین پانی کی مدد سے وہ نوالے حلق سے اتارتی۔

☆☆☆

''مسرت بھابی، برتن دھونے کے بعد ذرا باورچی خانہ بھی صاف کر لینا، ساری برنیاں اور کیبنٹ کس قدر گندے ہو رہے ہیں۔'' ناصرہ نے صاف ستھرے چمکتے ہوئے جارز کے ڈھکنے اتار اتار کر سنک میں پھینکے اور وہ سر جھکائے برتن دھوتی رہی کہ آج اتوار کا دن تھا اور آج سب بہن بھائی اکٹھے ہوتے تھے۔ اس کی نندیں اے سی والے کمروں میں الٹی سیدھی لیٹی گپیں مارتیں اور اس کے کاموں میں عیب نکالتیں، اس کا مذاق اڑاتیں، فرمائشیں کرتیں...... بھائی بہنوں کی آؤ بھگت میں لگے رہتے۔ رات دن کی ذہنی اور جسمانی بے آرامی نے اس کے چہرے کی ساری شگفتگی چھین لی اور اس کا سڈول بدن بے آرامی کی وجہ سے بے ڈول ہونا شروع ہو گیا لیکن وہ کس سے کہتی کہ وہ شخص جس کے پلے بندھ کر وہ یہاں آئی تھی، وہ اس کے ساتھ ہونے والی ہر بے انصافی پر خاموش تماشائی بنا رہتا۔ بھری محفل میں کوئی اسے جوتے بھی مارتا تو وہ نظریں چرا لیتا لیکن بند کمرے میں اس کے آگے ہاتھ جوڑتا معافی مانگتا، پر وہ خاموش رہتی، اسے چپ لگ گئی تھی۔ ایک ایسی چپ جو اندر ہی اندر دھاڑیں مار مار کر روتی رہتی۔

وہ بظاہر ایک خوب صورت گھر میں رہتی۔ بہترین زیورات اور شاندار کپڑے پہن کر محفلوں میں جاتی کہ یہ اس کی سسرال اور اس کے شوہر کی عزت کی بات تھی اور جو اس کے اندر کی لڑکی احتجاج کرتی تو کوئی سمجھاتا کہ پگلی یہی ایک لڑکی کا مقدر ہوتا ہے۔ ایک گھر، ایک اجنبی سا شوہر چند زیورات اور خوب صورت ملبوسات اور تیرے پاس یہ سب کچھ ہے لیکن اس نے ان چیزوں کے لیے تو شادی نہیں کی تھی۔ وہ تو بھرے پُرے گھر میں اپنے اندر کی تنہائی ختم کرنے آئی تھی وہ تو ہنسنے آئی تھی، کھیلنے آئی تھی، وہ تو خوش تھی کہ اللہ نے اسے اس نئے رشتے کی بدولت بہن اور بھائی، دوست سہیلیاں سب دیے لیکن اب اس کی سوچ بدل چکی تھی وہ اپنے آپ سے سوال کرتی۔

کیا بہن بھائی ایسے ہوتے ہیں؟ کیا سہیلیاں ایسی ہوتی ہیں کون لوگ جیٹھانی اور دیورانی کو سہیلیاں بنا لیتے ہیں وہ جھرجھری لے کر سوچتی۔ نہیں بہن بھائی صرف، بہن بھائی ہوتے ہیں، یہ میری بہن نہیں، یہ میری نندیں ہیں، یہ جیٹھ دیور ہیں میرے سگے بھائی نہیں، یہ جیٹھانی میری سہیلی نہیں ہے جو مقابلے کرتی ہے۔ ماں، ماں ہوتی ہے اور ساس ساس۔ ساس کبھی ماں نہیں بن سکتی، ایک زہر اس کی رگوں میں دوڑنے لگتا، رشتوں پر سے اس کا اعتبار ختم

ہوگیا۔ تلخی اس کے چہرے اور زبان پر رچ گئی۔ اس کے خیالات اور نظریات بدل گئے۔ وہ اکثر سوچتی لوگ یہ تو کہنے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ اتنی اچھی لڑکی تھی شادی کے بعد بہو بن کر بدل گئی کبھی یہ سوچا کہ وہ لڑکی بہو بن کر کیوں بدل گئی؟ اس معصوم لڑکی کو کن حالات نے بدلنے پر مجبور کردیا۔ وہ ایک مختلف سوچ رکھنے لگی تھی۔ نہیں، میں اپنی بیٹی کو کبھی ایسے گھر میں نہیں دوں گی جہاں ساس نندیں ہوں، جہاں اردگرد سسرالی رشتے ہوں، یہ سسرالی رشتے لڑکی کو چین سے رہنے نہیں دیتے۔ یہ پہلے خوب صورت لڑکیوں کو لے کر آتے ہیں اور پھر اُن کی خوب صورتی سے ڈر کر ان پر ظلم کرتے ہیں، ان سے حسد کرتے ہیں اور پھر ہر وہ حربہ استعمال کرتے ہیں جن سے وہ لڑکیاں شوہر کے دل پر نہ چڑھ سکیں۔ وہ جب بھی اپنی ننھی بیٹی کو دیکھتی تو اسے سینے سے لگا کر سوچتی، نہیں جو میں نے سہا وہ میں اسے نہیں سہنے دوں گی۔ میں تدبیر سے تقدیر بدل دوں گی، میں اپنی بیٹی کو اکیلے لڑکے کو دوں گی، جہاں وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکے کوئی اور اس کی زندگی نہ گزار سکے اور وہ آج تک اپنے فیصلے پر قائم تھی۔

ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی، بیتی ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ آج بھی مسرت کو روزِ اول کی طرح یاد تھا۔ اس نے نیند سے سوجی ہوئی آنکھوں پر کلائی رکھی اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

کہتے ہیں بارہ سال میں تو گھوڑے کے بھی دن بدل جاتے ہیں اس کے بھی حالات بدل گئے۔ نندیں اپنے گھروں میں مگن ہوگئیں اور ساس سسر اللہ کے پاس...... آج سب کچھ تھا لیکن اب نہ وہ امنگیں رہیں اور نہ ہی وہ دل اور جوانی سو آج کے اختیارات بھی اسے تکلیف دیتے کہ جب دانت تھے تو گڑ نہ تھا اور جب گڑ ملا تو دانت نہ رہے۔

☆☆☆

وہ ایک گرم دوپہر تھی، جس میں وہ اپنے کمرے میں اے سی کو ہائی کولنگ پر کیے اطمینان سے لیٹی کم از کم زندگی میں اپنی ایک خواہش کی بروقت تکمیل پر خوش ہورہی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھول کر وہ چلی آئی اور پھر جیسے اس کے قدموں تلے زمین نہ رہی اور ساتوں آسمان اس کے سر پر آگرے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کوئی چیز بچے کے لیے مضر ہوتی ہے لیکن ہمارے لاکھ سمجھانے کے باوجود بچہ اپنی ضد پر اَڑا رہتا ہے۔ وہ چاہے کتنی ہی ضد کرے، روئے پیٹے، خوشامد کرے، گڑگڑائے ہم وہ چیز اسے نہیں دیتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ چیز ہمارے بچے کے لیے نقصان کا باعث ہے اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچے کی ضد سے تنگ آکر وہ چیز بالآخر ہم اسے تھما دیتے ہیں کہ تکلیف اٹھانے کے بعد ہی ہماری مصلحت اور اپنی بے جا ضد کا اندازہ ہوگا اور پروردگار جو ستّر ماؤں سے بڑھ کر ہم سے پیار کرتا ہے اس کا تعلق بھی اس کے بندے کے ساتھ بندے کے مزاج کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

وہ رحم کرنے والوں کے ساتھ رحم کرنے والا بن جاتا ہے سوال کرنے والوں کے ساتھ جواب دینے والا اور ضد کرنے والوں کو کبھی کبھی ضد کا مزہ بھی چکھا دیتا ہے۔

☆☆☆

مسرت بیگم کی کوششیں جاری رہیں اور کہتے ہیں کہ اگر انسان خدا کو ڈھونڈنے نکلے تو خدا بھی مل جاتا ہے، وہ تو صرف اپنی نازوں پلی بیٹی کے لیے اکیلا لڑکا چاہ رہی تھیں اور بالآخر انہیں بھی ایک مالدار، مہذب، اعلیٰ خاندان کے اکیلے لڑکے کا رشتہ مل ہی گیا۔

”سعد بہت اچھا لڑکا ہے، اپنی فیکٹریاں ہیں، بوتیک ہیں، گاڑیوں کے شوروم ہیں، باپ نہیں ہے سر پر مگر سارے چچا تایا کے بڑے بڑے کاروبار ہیں، دبئی

سنگا پور، اور تھائی لینڈ میں ان لوگوں کی بوتیک کی چین ہے، ارے میری شافعہ کا تو نصیب کھل گیا، کیا ہوا اگر ذرا رنگ دبتا ہوا ہے اس کا ویسے بھی مرد کی صورت کون دیکھتا ہے، میری شافعہ کو دیکھ کر دونوں ماں، باپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ارے اتنی مالدار ہونے کے باوجود اس کی ماں تو میرے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئیں کہ ہاں سن کر ہی اٹھوں گی، اتنے بڑے لوگ اس طرح گر گر کر میری بچی کا رشتہ مانگ رہے ہیں بس اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ اللہ نے کیسی میری دل کی سنی، راج کرے گی میری بچی راج...... ارے چار چار تو گاڑیاں ہیں، ان کے گھر میں، کبھی مرسڈیز میں آتے ہیں تو کبھی لینڈ کروزر میں تو کبھی کس میں۔ سعد تو کہہ رہا تھا کہ آنٹی میں کل پراڈو بھجوا رہا ہوں، وہ آپ کے گھر میں رہے گی، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ شافعہ میری منگیتر ہوتے ہوئے رکشا، ٹیکسی میں سفر کرے۔ ارے وہ تو میں نے منع کر دیا کہ نہیں بیٹا، معیوب بات ہے، لوگ کیا کہیں گے اپنے گھر لے جا کر چاہے اسے سونے کے تخت پر بٹھانا ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' وہ مسلسل ان کی تعریفیں کیے جا رہی تھیں۔

''لاکھوں کا تو بارات کا سوٹ دلوایا ہے انہوں نے شافعہ کو لے جا کر بھئی ہم ان کی ٹکر پر تو نہیں آسکتے لیکن آپ کچھ بھی کریں تین لاکھ سے زیادہ بھیجیں سعد کو شادی کی شاپنگ کے لیے۔''

مسرت بیگم نے دن میں دس مرتبہ دُہرائی جانے والی باتیں جو وہ ہر آئے گئے کے سامنے دُہراتی تھیں اپنے شوہر سے کہیں۔

☆☆☆

جب سے شافعہ کا رشتہ طے ہوا تھا ان کا جوش اور ولولہ عروج پر تھا۔ ہر آئے گئے کے سامنے وہ اپنے ہونے والے داماد کی مال و دولت اور بیٹی کے نصیب کا فخریہ ذکر کرتیں لیکن نہ جانے کیوں بہزاد علی مطمئن نہ تھے۔ انہوں نے بیوی کے دباؤ میں آکر اقرار تو کر لیا، منگنی بھی کر دی لیکن ان کی چھٹی حس ان سے کہتی۔

''بہزاد علی سوچ لے۔ کبھی مخمل میں بھی ٹاٹ کا پیوند لگا ہے۔ ایسا کیا ہے میری بیٹی میں۔'' لیکن مسرت بیگم ان کے کسی وسوسے اور خدشے کو خاطر میں نہ لاتیں کہ برسوں کے طویل انتظار کے بعد وہ دن آ رہا تھا کہ جس کے انہوں نے خواب دیکھے تھے۔ اب تعبیر پانے جا رہی تھی ان کی پیاری بیٹی۔ وہ بہت مطمئن تھیں، وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ خوشی میں وہ غرور اور تکبر کی حدوں کو پھلانگ چکی تھیں۔

☆☆☆

انہوں نے لڑکھڑاتے وجود کے ساتھ اس کاغذ کو اٹھانے کی کوشش کی جو اُن کے پیروں میں پھڑ پھڑا رہا تھا اور پھر جیسے ان کے حواس گم ہو گئے اور انہوں نے لیک کر زمین پر ڈھیر ہوتی اس دکھیاری کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اور پھر سارے راز کھلتے چلے گئے۔ تقدیر پر ہر تدبیر کبھی کبھی بیکار بھی ہو جاتی ہے۔ ہم کتنی ہی ہوشیاری اور سمجھداری دکھا لیں، تقدیر کا ایک ہی وار تدبیروں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب ہم غیر حقیقی خوشیاں حاصل کرنے کی تمنا کرتے ہیں۔

☆☆☆

مسرت بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دنیا کی ہر نعمت شافعہ کے جہیز میں دیں، وہ سعد کی فیملی کی امارت سے درجہ مرعوب ہو چکی تھیں۔ سعد کی اماں جب بھی آتیں، تین لاکھ کی کوئی جیولری شافعہ کو پہنا دیتیں اور پھر مسرت بیگم کچھ بھی ہو جائے پلٹاوا اس سے دُگنا کرتیں۔

اس سلسلے میں وہ بہزاد علی یا کسی کی بھی نہیں سن رہی تھیں۔ بیش قیمت زیورات، نفیس کپڑے، اعلیٰ کراکری، فرنیچر، برے وقتوں کے لیے رکھا گیا پلاٹ غرض ہر چیز انہوں نے شافعہ کو جہیز میں دے دی۔ ان کی ایک ہی تو بیٹی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اُن کی بیٹی کہیں پر کمزور پڑے کہ کپڑے لتے اور

زیور کے لیے انہوں نے ساری زندگی طعنے سنے اور کوئی طعنہ، کوئی طنز، وہ شافعہ کے لیے برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اُن کی اکلوتی بیٹی کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو پر سعد کی ماں نے ولیمہ کچھ عرصے بعد رکھنے کو کہا کہ ان کے کسی رشتے دار کا امریکا میں انتقال ہو گیا پھر بھی بارات کا انتظام انہوں نے بہت شاندار کیا لیکن ولیمہ نہ ہونے کی کسک ان کے دل میں رہ گئی۔ شافعہ کو رخصت ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ وہ بہت مطمئن تھیں۔ سعد، شافعہ کا اتنا دیوانہ ہو چکا تھا کہ جب سے شادی ہوئی تھی وہ فیکٹری ہی نہیں جا رہا تھا اور جو کبھی بہزاد علی کہتے۔

''داماد جی کوئی کام نہیں کرتے ہر وقت گھر میں پڑے رہتے ہیں۔'' تو وہ فخریہ کہتیں۔

''بھئی وہ ملازمت نہیں کرتا، اس کا اپنا بزنس ہے، نئی نئی شادی کے دن ہیں نہیں جا رہا...... چلا جائے گا، آپ کی بیٹی کو تو کسی چیز کی کمی نہیں۔ ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک ہے، ہر دوسرے دن تھوڑی دیر کے لیے آ بھی جاتی ہے۔''

''ہاں، ہاں پھر بھی گھوڑا اپنے تھان پر ہی سجتا ہے۔ مرد کام پر جاتے ہی اچھے لگتے ہیں۔'' بہزاد علی اپنی بات پر ڈٹے رہتے کہ نہ جانے کیوں ایک بے چینی تھی جو انہیں چین نہیں لینے دیتی وہ حیران تھے کہ جو انہیں محسوس ہو رہا ہے مسرت کو کیوں نہیں نظر آ رہا۔

☆☆☆

کمرے میں گہرا سکوت تھا، ہر شخص اپنی جگہ خاموش اور دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ پورے کمرے پر ڈالی، رو رو کر خود اس کی آواز بیٹھ چکی تھی لیکن پھر بھی اسے بولنا تھا۔ اس نے ایک نگاہ پیپر ویٹ کے نیچے دبے کاغذ پر ڈالی اور پھر اس نے ساری ہمت مجتمع کی اور......

☆☆☆

فائیو اسٹار ہوٹل سے رخصت ہو کر وہ سعد کی ڈیفنس میں واقع وسیع و عریض کوٹھی میں اتری۔ اونچے اونچے ستونوں اور وسیع لان والے گھر میں ایک خوب صورت سا سوئمنگ پول بھی تھا۔ گھونگٹ کی آڑ سے بس وہ یہی دیکھ سکی لیکن اسے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ایلیٹ کلاس میں داخل ہو چکی ہے۔

سعد نے منہ دکھائی میں ڈائمنڈ کی بیش قیمت بریسلیٹ پہنائی، گھر میں استقبال کے لیے سعد کی امی کے ساتھ دو عجیب و غریب حلیے کی پختہ عمر کی عورتیں تھیں اور گہرا سکوت تھا۔ اس کے استفسار پر سعد نے بتایا کہ سارے مہمان ہوٹل سے ہی گھروں کو چلے گئے جو پورا خاندان بارات کے ساتھ دلہن کے استقبال کے لیے موجود ہو یہ متوسط طبقہ میں ہوتا ہے۔ اس کلاس میں نہیں سوا سے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایلیٹ کلاس میں داخل ہو چکی ہے۔

''میں اور امی تنہائی پسند ہیں، ہم لوگ کسی سے ملتے ملاتے نہیں ہیں۔'' سعد نے غیر معمولی سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

اور محبتوں سے بھرپور لمحوں میں وہ کچھ نہ سننا چاہتی تھی اور نہ ہی سمجھنا...... بعض اوقات ہم اتنا خوش ہوتے ہیں کہ رونے کی بات پر بھی قہقہہ لگا بیٹھتے ہیں سو وہ بھی مسکرا دی۔ کیا اسے مسکرانا چاہیے تھا؟

☆☆☆

صبح جب اٹھ کر اس نے اپنے رات کو پہنے لہنگے پر سعد کا بلیک سوٹ پڑا دیکھا تو نہ جانے کیوں اسے ایک عجیب سا احساس ہوا...کیوں وہ خود بھی سمجھ نہیں پائی۔

صبح اس نے سائڈ ٹیبل اور اس کی ایک، ایک دراز چھان ڈالی کہ منہ دکھائی کا بریسلیٹ کہاں ہے وہ پہننا چاہتی تھی کہ تھوڑی دیر بعد اس کی سہیلیاں اور کزنز اس کا ناشتا لانے والی تھیں لیکن وہاں کچھ ہوتا تو ملتا ناں۔

''سعد میری سلامی کا کیش اور وہ بریسلیٹ نہیں مل رہا۔ جو رات آپ نے پہنایا تھا۔'' اس نے باتھ روم سے شاور لے کر نکلتے سعد سے پوچھا۔

"نہیں ہوگا سب کچھ۔" سعد نے حد درجہ بے پروائی سے کہا۔

"نہیں، میں نے ایک، ایک جگہ دیکھ لی، میرا پرس تک نہیں ہے۔ مجھے سب کچھ پہننا ہے ابھی تھوڑی دیر میں میرے گھر سے ناشتا آنے والا ہے، سب پوچھیں گے۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کو الٹتے پلٹتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں؟ سب ناشتا کیوں لے کر آئیں گے، کیا ہمارے گھر میں کھانے کو نہیں ہے، دیکھو شافعہ یہ مڈل کلاس رسم ورواج کو اپنی اماں سے یہ کہہ کر ختم کرو، میں اپنے گھر میں کسی کا آنا جانا پسند نہیں کرتا۔ تم اگر اپنے ماں، باپ سے ملنا چاہتی ہو تو خود چلی جایا کرو یا میں لے جایا کروں گا لیکن میرے گھر کا چکر بند کرو۔" سعد کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ نہ سمجھ پائی۔

"اور یہ کیا ڈھونڈ رہی ہو؟ لے گئی ہوگی ماسی اٹھا کر۔" سعد جھنجلایا۔

"لیکن یہاں تو کوئی نہیں آیا۔" وہ بدستور ایک شاک کی کیفیت میں تھی۔

"کوئی نہیں آیا، کیا میں بھی؟" سعد اس کے کان میں گنگنایا اور وہ سعد کے پل پل بدلتے موڈ پر حیران ہو کر ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگی۔

"ارے میری جان ہوسکتا ہے میں نے اٹھا لیا ہو۔ خیر ان معمولی چیزوں کے لیے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" سعد کی بانہوں کا گھیرا تنگ ہوگیا اور وہ سب بھول گئی کہ عورت اتنی ہی تو معصوم ہوتی ہے مرد کی محبت کے دو بولوں پر سب کچھ قربان کردینے والی۔ سب کچھ بھول جانے والی، مرد کی محبت بھری نگاہ بڑی ظالم ہوتی ہے۔ جب ساری دنیا اس کے قدموں تلے ہو اور وہ آپ کو ایک بچے کی طرح تک رہا ہو اس لمحے عورت، مرد پر سب کچھ وارنے کے لیے تیار ہوجاتی ہے اور وہ بھی بھول گئی۔

"کوئی بات نہیں مل جائے گا بریسلیٹ۔" اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کپکپاتے لہجے میں کہا اور اس لمحے سعد کے لبوں پر وہ مسکراہٹ پیدا ہوئی جیسے ہوا نے مستی میں پھولوں کو چھو لیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی سفاک چمک آگئی کہ شافعہ کو اپنی نگاہیں نیچی کرنی پڑیں۔

کچھ سودے بڑے خسارے والے ہوتے ہیں اور خسارہ بھی وہ جو نظر نہیں آتا، وہ بھی ایک ایسا خسارہ اٹھا رہی تھی جو نہ نظر آتا اور نہ سمجھ آتا لیکن خسارہ تھا۔

وہ سعد جو شادی سے پہلے پیسہ پانی کی طرح خرچ کرتا تھا شادی کے بعد ایک، ایک پائی احتیاط سے استعمال کرتا، وہ تو پیسوں کی شکل کو ترس گئی تھی۔ سعد نے اس کے سارے زیورات چند ہی دنوں کے بعد لاکر میں رکھوا دیے اور جب اس نے چند سیٹ یہ کہہ کر روکنے چاہے کہ ابھی دعوتوں کا سلسلہ چلے گا، نئی نئی شادی ہے سب سوال کریں گے کہ تم اچھی تیار کیوں نہیں ہوتی ہو۔

"تم میرے لیے سجتی ہو یا طوائفوں کی طرح مجمع کے لیے سجو گی...... جب میں کہہ رہا ہوں نہیں پہننا زیور تو نہیں پہننا۔ تمہاری سمجھ میں ایک دفعہ کی بات کیوں نہیں آتی۔" سعد حلق کے بل پر چیخا اور وہ دم بخود رہ گئی ایسا لہجہ اور ایسی زبان اس نے کب سنی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی میں اب کیا کیا دیکھنا اور سننا ہے، کاش وہ جان سکتی۔

☆☆☆

"زندگی روز بروز مشکل ہوتی چلی جا رہی ہے، شازیہ میں کیا کروں؟" وہ رو دینے کو تھی۔ "سعد ساری ساری رات اسموکنگ کرتے ہیں، دوسرے کمرے میں سوتے ہیں، سب کے سامنے چپکے رہتے ہیں اور تنہائی میں بالکل سفاک اجنبی بن جاتے ہیں، راتوں کو دیر سے گھر آتے ہیں، مشکوک بلاک نمبروں سے کالیں آتی ہیں، کال آتے ہی باہر چلے جاتے ہیں

اور پھر ساری ساری رات غائب رہتے ہیں، مجھے ان کی گہری آنکھوں اور سیاہ ہونٹوں سے خوف آتا ہے۔" آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ راز رکھنے کی سکت ختم ہوگئی تو اس نے اپنی عزیز از جان دوست شازیہ کے آگے دل کی کتاب کھول دی۔

"کیوں، تمہاری ساس کہاں ہیں؟" شازیہ جو شافعہ کی زندگی کو رشک سے دیکھتی تھی اور سارا سارا دن اپنے میاں کو سعد کی دولت اور شافعہ کے لیے اس کی دیوانگی کے طعنے دیتی رہتی تھی نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ تو چند دن بعد ہی اپنی بہن کے پاس دبئی چلی گئیں، اس کے بعد نہ انہوں نے مجھے کبھی فون کیا اور نہ ہی بات، جب میں سعد سے پوچھتی ہوں تو وہ کہتے ہیں ان کے موبائل پر کالز آتی رہتی ہیں لیکن شازیہ وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر لائی تھیں... کم از کم مجھ سے بات تو کریں۔" شافعہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔

"اور تمہاری امی کیا کہتی ہیں؟"

"وہ تو ساس کی غیر موجودگی کو میرے لیے خوش نصیبی قرار دیتی ہیں، وہ تو بہت خوش ہیں کہ میں اکیلے گھر میں راج کر رہی ہوں اور میں بھی ان سے کچھ بھی نہیں کہتی، میری ہمت ہی نہیں پڑتی۔" وہ رو رہی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے سعد کے اس گھر میں میرے جہیز کا کوئی سامان نہیں ہے، فرنیچر کراکری، کپڑے، بیڈ شیٹ کچھ بھی نہیں۔ اول تو گھر کے آدھے سے زیادہ کمرے لاکڈ ہیں اور جو کھلے ہیں وہاں کچھ بھی نہیں اور جو میں نے سعد سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔"

"تمہارا سارا سامان میں نے اپنی بہادر آباد والی کوٹھی میں اتروا دیا تھا، ہم وہیں شفٹ ہوتے مگر وہ تمہارے اعزاز میں سج رہی تھی لیکن تمہاری اماں نے اس قدر جلدی مچائی کہ میں تمہیں رخصت کروا کر یہاں لے آیا اگر تم ماں، باپ پر اتنا بوجھ نہ ہوتیں تو ہم دو چار ماہ بعد شادی کرتے اور میں تمہیں وہاں لے کر جاتا۔" سعد نے سفاکی سے جواب دیا اور میں خاموش کھڑی کی کھڑی رہ گئی کہ میں اپنی ماں کی جلد بازی سے بخوبی واقف تھی لیکن اس کے نقصانات کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔" وہ شازیہ کے سامنے ورق ورق پلٹ رہی تھی۔

دوسری طرف شازیہ ریسیور تھامے ساکت کھڑی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی پیاری دوست کو کیا مشورہ دے۔

"ہیلو شازیہ تم سن رہی ہو ناں؟" اس نے گہری خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں میری دوست، میں سن رہی ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا مشورہ دوں، یہ تمہاری پوری زندگی کا معاملہ ہے، تم اپنے ماں، باپ سے ذکر کرو کیونکہ سعد کی ایکٹی وٹیز مشکوک ہیں۔"

"نہیں، نہیں میں انہیں نہیں بتا سکتی اور تم بھی نہ بتانا کہ میرا شریف باپ اور میری جذباتی ماں تو یہ سن کر ہی مر جائیں گے کہ ان کی بیاہی بیٹی آج بھی بن بیاہی جیسی ہے۔ میں ان کے سامنے خوش وخرم رہتی ہوں، میں انہیں کوئی تکلیف نہیں دے سکتی۔ تمہیں قسم ہے، شازیہ تم ان سے اور کسی سے بھی کوئی بھی ذکر نہیں کروگی۔" وہ ٹیلیفون پر رو دی۔ زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی جارہی تھی اس کی ساس نندیں نہیں تھیں، جیٹھ دیور نہیں تھے لیکن اس کے دکھ بہت عجیب تھے، وہ سارے گھر میں بولائی بولائی پھرتی، کوئی حال احوال پوچھنے والا نہیں تھا، اماں، ابا اس کی ویران زندگی کا راز نہ پالیں اس خوف سے وہ ہر دوسرے دن تھوڑی دیر کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاتی، جو لکڑی دھڑا دھڑ جل رہی ہو وہ جلدی ختم ہوجاتی ہے اور وہ بھی سوکھی لکڑی کی طرح جل رہی تھی، ختم ہو رہی تھی، خوش نصیبی کیا ہوتی ہے؟ اچھا نصیب کیا ہوتا ہے؟ عورت کی اصل دولت کیا ہوتی ہے؟ بہت جلد ہی اس کی سمجھ میں آگیا

تھا۔ جب کبھی وہ اپنی لمبی سی گاڑی کے شیشے نیچے کر کے فٹ پاتھ پر ٹھیلے کے پاس کھڑے محبت سے ایک ہی پلیٹ میں آلو چھولے کھاتے میاں، بیوی کو دیکھتی تو درد اور رشک کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ جاتی۔ کبھی بازاروں میں پسینے میں شرابور شوہر اور بدرنگ برقع میں ملبوس بیوی کو ہر مال دس، دس روپے میں سے پلاسٹک کی چوڑیاں اور بُندے چھانٹتے دیکھتی اور پھر ہاتھ میں سختی سے دبائے پسینے سے بھیگی دیہاڑی لیے شوہر زبردستی بیوی کو چوڑیاں پہناتا تو اس کا دل چیخ چیخ کر کہتا خوش نصیبی تو یہ ہوتی ہے۔

لیکن وہ کس سے کہتی...... کس سے سوال کرتی؟ کس کا دامن پکڑتی۔ کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے آپ کو ان لوگوں سے چھپانا جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں، جن کا خون ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہو، ان لوگوں سے جھوٹ بولنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور وہ یہ مشکل مرحلہ بھی بخوبی گزار لیتی اسے جھوٹ بولنے میں اپنا آپ چھپانے میں کمال حاصل ہو گیا تھا......

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا باپ کے پُرشفقت سینے میں منہ چھپا کر دھاڑیں مار مار کر روئے یا ماں کی محبت بھری آغوش میں آنکھیں بند کر کے سمٹ جائے لیکن اس نے تو چپ سادھ لی تھی۔ وہ ماں، باپ کے مطمئن چہروں پر نگاہ ڈالتی تو کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ پاتی، صرف سوچ کر رہ جاتی۔ عورت کے کمزور کاندھوں پر بعض اوقات تقدیر بڑی بھاری ذمے داری ڈال دیتی ہے، وقت اس سے بڑی بڑی قربانیاں طلب کرتا ہے اور وہ اپنے پیاروں کے لیے قربانیاں دیے چلی جاتی ہے۔ شاید وہ صرف محبت کے لیے پیدا کی گئی اور محبت ہی کی خاطر فنا ہو جاتی ہے۔ کہیں اس کی قربانی پر مقالہ نہیں لکھا جاتا، نہ کوئی بریکنگ نیوز لگتی ہے، وہ دیواروں کے پیچھے پامال ہوتی رہتی ہے اور وہ بھی پامال ہو رہی تھی لیکن کب تک۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے گھر میں عجیب وغریب سے لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی، گھر میں بے ہنگم موسیقی بجتی، فلک شگاف قہقہے لگتے، جام کھنکتے، محفلیں جمتیں، کارڈز کھیلے جاتے اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کپکپاتی رہتی...... یا جائے نماز پر بیٹھی سسکتی رہتی۔

سعد کا رویہ اس کے ساتھ مزید تلخ اور اکھڑا اکھڑا ہو گیا تھا۔ اکثر وہ سوچتی کاش اس گھر میں بہت سے لوگ ہوتے، کوئی بڑا یا چھوٹا ہوتا، جو سعد سے سوال کر سکتا، جو اس بے حیائی کو روکتا، اسے ڈھیروں برتن ہی دھونے پڑتے، روٹی ہی پکانی پڑتی لیکن کم از کم ڈھارس پہنچاتے رشتے تو موجود ہوتے، ہر رشتہ خراب نہیں ہوتا، اچھا یا برا نصیب ہوتا ہے کوئی چیز کسی کے لیے رحمت اور کسی کے لیے زحمت بن جاتی ہے، ہو سکتا ہے میری ماں کے لیے جو زندگی زہر تھی میرے لیے وہ امرت ہوتی، ہم ضد کیوں کرتے ہیں، ہم اللہ کی مصلحت کیوں نہیں سمجھتے۔

ہم اتنے جلد باز، ناشکرے اور بے صبرے کیوں ہیں؟ ہم اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے لکھنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں، کیوں؟ اگر اللہ پر ایمان ہے تو اس کے لکھے ہوئے فیصلوں پر اعتراض کیوں؟ اس کی ماں نے بھرے پُرے گھروں کے ڈھیروں رشتے بلاوجہ ٹھکرائے تھے۔ ہزار تلخیوں کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ سعد، شافعہ کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا اور یہ قدرتی بات تھی کہ اسے اس سے محبت ہو گئی تھی کیونکہ وہ اس کا مجازی خدا تھا اور نیک اور پاکیزہ عورت کے دل میں تو نکاح کے دو بولوں کے ساتھ ہی شوہر کی محبت وحی کی صورت میں اترتی ہے۔ شافعہ نے بھی سعد کے مزاج کے مطابق ڈھلنے کی کوشش شروع کر دی کہ محبت تو بس محبت ہوتی ہے، محبت صورت بدل دیتی ہے، اصول بدل دیتی ہے، جہان بدل دیتی ہے مزاج اور ترجیحات بدل دیتی ہے اور وہ

بھی بدل رہی تھی یا بدلنے کی کوشش کر رہی تھی، سعد کی خوشی کے لیے اپنے گھر کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے، وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھی، وہ گھر بسانے آئی تھی، وہ گھر بسا رہی تھی۔ اب وہ سعد کے ساتھ تقریبات میں جانے لگی تھی، مردوں کی محفلوں کو مسکراتے لبوں اور خوب صورت اداؤں کے ساتھ اٹینڈ کرنے لگی تھی، کچھ دنوں سے سعد کا موڈ خوشگوار رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی ہر چیز حتیٰ کے وہ پلاٹ جو اس کی ماں نے کمیٹیاں ڈال ڈال کر برے وقتوں کے لیے رکھا تھا وہ بھی سعد کے نام کر دیا۔

سعد شباب وکباب کی محفلوں میں جاتا، غیر مردوں سے اس کا تعارف کرواتا، ان کے سامنے ذومعنی جملے کہتا مگر تنہائی میں اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ اس پر عجیب وغریب موڈ گزرتے، وہ گم صم ہو جاتی، اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر سجدے میں گری روتی رہتی۔

☆☆☆

وہ جائے نماز پر بیٹھی اپنے مالک کے سامنے زاروقطار روتے ہوئے فریاد کر رہی تھی کہ ایک دم کوئی آہستگی سے کمرے میں داخل ہوا آنے والے نے پہلے گردن گھما کر باہر کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ میں پکڑا وہ لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

☆☆☆

''ارے میری جان، آج کل تو تم گلاب کی طرح کھل رہی ہو۔'' آج کئی دنوں بعد سعد نے بہت محبت سے اس سے کہا تو وہ جیسے کھل سی گئی اور دل خوش فہم ہو کر دھڑکنے لگا۔ یہ دل کے معاملے بھی بڑے نرالے ہوتے ہیں، عورت کا دل ہمیشہ خوش فہم رہتا ہے۔

''آج میرا ایک دوست کافی عرصے بعد پاکستان آ رہا ہے اور میں نے اس کے اعزاز میں آج شاندار دعوت رکھی ہے، تم بہت اچھی طرح تیار ہو کر اس سے ملنا اور اس کو خوش کر دینا، میں چاہتا ہوں بس وہ تمہیں دیکھتا رہ جائے۔'' سعد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے قریب کیا۔

''کیا ان کی بیگم بھی آ رہی ہیں؟'' اسے سعد کا یہ انداز اور باتیں عجیب لگ رہی تھیں۔

''وہ ان جھنجٹوں میں نہیں پڑتا۔ جس پر نظرِ کرم کر دے، اس کا نصیب سنور جاتا ہے، تم بس پارلر جاؤ، ٹریٹمنٹ لو، خوب صورت میک اپ کراؤ، تمہارا لباس میں خود لے کر آؤں گا، بس میں چاہتا ہوں وہ تمہیں دیکھتا کا دیکھتا رہ جائے۔ بھئی پہلی دفعہ جو تم سے ملے گا ناں۔'' سعد نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا لیکن وہ سن نہیں پا رہی تھی۔

''ایک غیر مرد کے لیے......؟'' اس کی آنکھیں سراپا سوال تھیں۔ وہ نظریں چرا گیا۔

وہ چپ رہی، وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی سوال سعد کا موڈ خراب کر دے گا، یہ لمحاتی قربت بھی ختم ہو جائے گی، یہ مطلب بھری محبت بھی دم توڑ دے گی اور پھر اذیت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا جو وہ کرتا آ رہا تھا۔

لیکن کچھ تھا، جو اسے بے کل کر رہا تھا، اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی۔ ''اٹھ دیکھ کیا ہو رہا ہے؟''

نظم

کسی کی قسمت میں تاریکیاں
کسی کے قدموں تلے چاندنی
کسی کا مقدر اوجِ ثریا
کسی کا نصیبا پھرے دربدر
کوئی طوفاں کی موجوں پہ محوِ سفر
کوئی ڈوب گیا لبِ ساحل پر
کسی کو ملے بے دعا کہ ثمر
کسی کی دعائیں رہیں بے اثر

شاعرہ: نجمہ ناز اصغر، کراچی

"توڑ دے ہر زنجیر، چلی جا، پلٹ جا۔" اور پھر وہ جائے نماز پر جا بیٹھی سب سے بہترین اور مخلص دوست کے سامنے۔

☆☆☆

چہل پہل تھی، لوگوں کی آمد و رفت بڑھ رہی تھی، قہقہے لگ رہے تھے، جام چل رہے تھے، سب ایک دوسرے میں مگن تھے اور وہ اپنی تقدیر کا پرچہ ہاتھ میں دبائے خاموشی سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

"شافعہ!

آج کے بعد تم مجھے دیکھنا چاہو گی، ملنا چاہو گی، میں تمہیں کہیں نہیں ملوں گا کیونکہ میں اس سرزمین کو چھوڑ کر جا رہا ہوں، کیوں! اس لیے کہ نہ تم سے میرا کوئی تعلق تھا اور نہ ہے، تم میرے باس کی پسند تھیں، انہوں نے تمہیں ایک شاپنگ پلازہ میں دیکھا اور تمہارے دیوانے ہو گئے، ان کو متوسط طبقے کی ان چھوئی، مسکراتی، شرماتی، شریف لڑکیاں بہت بھاتی ہیں اور جو چیز انہیں بھا جائے اسے وہ حاصل کر کے رہتے ہیں۔ چند راتوں کے لیے چند ہفتوں کے لیے چند مہینوں کے لیے یہ ان کے موڈ پر منحصر ہے، میری ماں کا کردار بھی ہمارے گروپ کی ایک ممبر نے ادا کیا تھا، ہم نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتا چلا تمہاری ماں ایک بے وقوف اور ضدی عورت ہے، وہ تمہارے لیے صرف اکلوتے رشتے کی خواہش رکھتی ہے، بد قسمتی سے جس دن ہم اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے جا رہے تھے باس گرفتار ہو گئے سو میرے اور ان کے درمیان یہ معاہدہ طے ہوا کہ میں تمہیں شادی کر کے لے آؤں، جہیز و مال و متاع میرا اور تم ان کی، ہمارے کاروبار میں زبان کی بہت اہمیت ہے، ہم لوگ تم شریفوں سے زیادہ وعدے کی پاسداری کرتے ہیں سو میں نے تمہاری انتہائی قربت سے ہر ممکن بچنے کی کوشش کی اب باس آ گئے ہیں، تم جانو اور وہ جانیں، خبردار مزاحمت مت کرنا، ورنہ تمہاری بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دی جائیں گی...... اگر زندگی چاہتی ہو تو باس کو خوش رکھنا اور باس جو کہے جیسا کہے وہی کرنا، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ جس وقت تمہیں یہ خط ملے گا میں یہاں سے سیکڑوں میل دور جا چکا ہوں گا۔

سعد"

ایک ایک لفظ تھپڑ کی طرح مسرت بیگم اور بہزاد علی کے منہ پر لگ رہا تھا۔ جوان بیٹی برباد ہوئی سسک رہی تھی، بدنامی دہلیز پر پر پھیلائے بیٹھ گئی تھی۔

کس سے سوال کریں...... شکایت کریں کہ شکر......

کہ اس مالک نے بیٹی کی آبرو بچالی اور وہ ملازم نہ جانے کیسے، وقت سے پہلے وہ پرچہ شافعہ کو تھما گیا۔ ہاں، اللہ جب کسی کو بچانا چاہے تو اسباب پیدا کر ہی دیتا ہے۔

مسرت بیگم لرزتی، کپکپاتی، بلکتی بیٹی کو سینے سے لگائے بلک بلک کر رو رہی تھیں کہ رونا ساری زندگی کا مقدر ٹھہرا تھا۔

☆☆☆

مسرت بیگم درد سے ڈوبے لہجے میں پڑوسن سے نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں، اپنے کمرے میں بیٹھی سونی کلائیوں کو ویران آنکھوں سے تکتے ہوئے شافعہ سوچ رہی تھی۔

"کاش، ہم لوگ اللہ پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کامل پر یقین بھی رکھیں، کاش میری ماں کفرانِ نعمت نہ کرتی، میرے لیے آنے والے رشتے اپنی ضد سے نہ لوٹاتی کاش آج کوئی تو ہوتا جو سعد کو ڈھونڈ لاتا، گھر نہ بھی بستا، طلاق تو ہو جاتی، آج برسوں سے میں رہائی کے انتظار میں کھلی فضاؤں میں سانس لے رہی ہوں۔ کوئی تو ہوتا جو سوال کرتا؟ کہیں تو اس کی جڑیں ہوتیں؟ کوئی تو ہوتا، کوئی تو پوچھتا۔" اس کا دل مسلسل انہی جملوں کی گردان کر رہا تھا اور اس کے آنسو تواتر سے اس کی سونی کلائیوں پر گر رہے تھے۔



زہر

نگہت اعظمی

"حمیدہ اپنے گاؤں واپس چلی گئی۔" بڑی بھابی کے اس جملے پر ایرج کے ہاتھ سے سیل فون گرتے گرتے بچا۔

"پھر...... اب کیا ہوگا؟" یہ سوال کسی گہری کھائی کی طرح اس کے سامنے آ گیا۔

"ہم سب خود ہی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے ہیں۔" بڑی بھابی کی آواز سے ہی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

”یہ حمیدہ کو بیٹھے بٹھائے گاؤں جانے کا کیسے خیال آ گیا......؟“ اریج جانتی تو تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر اُن کی زبان سے اگلوانے کے لیے پوچھا۔

”وہ تو کافی عرصے سے یہاں سے جانے کے لیے پر تول رہی تھی......کل میں نے ذرا سختی سے بات کر لی تو وہ بھتے سے ہی اکھڑ گئی فوراً ہی اپنا بوریا بستر سمیٹا اور کہنے لگی آپ باجی کو بتا دیجیے گا، میں نے اب یہاں نہیں رہنا۔“ بڑی بھابی جس انداز سے بتا رہی تھیں اسے یقین ہو گیا تھا کہ بات اتنی سادہ بھی نہیں ہو گی۔

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس سے سختی سے بات نہ کیجیے گا، وہ ایک خاندانی عورت ہے، میں نے کتنی مشکلوں سے اسے یہاں کام کرنے کے لیے راضی کیا تھا۔ آپ لوگوں نے اسے بھی رہنے نہیں دیا۔“ اریج نے اپنے اوپر قابو پانے کی بہت کوشش کی پھر بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”تمہیں کیا معلوم ہم نے اسے اتنے عرصے کس طرح برداشت کیا ہے۔ کتنے نخرے تھے اس کے...... کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتی تھی...... ایک، ایک کام کے لیے دس، دس بار کہنا پڑتا تھا مما بھی بہت شکایت کرتی تھیں۔“ بھابی نے بہت چالاکی سے مما کا کاندھا استعمال کیا۔

”تو اب میں کیا کروں......؟“ وہ یہ سوال کرنے میں حق بجانب تھی کیونکہ دونوں بھائی اور بھابیاں مما کی ساری ذمے داریاں اس کے کاندھوں پر ڈال کر سب سے یہ کہتے تھے کہ مما کی نظر میں ہماری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ ہر بات میں اریج ہی سے مشورہ کرتی ہیں اور اریج کی ہر بات مانتی ہیں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ دونوں بھائیوں اور ان کے بیوی بچوں نے مما کے ہر کام سے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ دونوں بھائی اپنی، اپنی فیملیز کے ساتھ بظاہر مما کے ساتھ رہتے تھے لیکن دونوں کے پورشنز الگ تھے اور کچن بھی بڑی بھابی کا اپنا بوتیک تھا وہ سارا دن اس میں مصروف رہتیں۔ چھوٹی بھابی بیوٹی پارلر چلاتی تھیں، مما کالج میں پرنسپل تھیں، اپنے زمانے میں بے حد چاق و چوبند اور سمجھدار خاتون تھیں۔ پاپا کا اپنا بزنس تھا، گھر میں بے حد خوش حالی تھی، وہ پانچ بہن بھائی تھے۔ دو بھائی ملک سے باہر تھے اور دو بھائی اور ایک بہن پاکستان میں ہی رہتے تھے۔ اریج جاب نہیں کرتی تھی اور وہ سسرال میں رہتی تھی جہاں اس کے جیٹھ، جیٹھانی ان کے بچے ساس، سسر اور دو دیور تھے۔

پاپا نے اپنی زندگی میں ڈیفنس میں ہزار گز پر گھر اس طرح بنایا تھا کہ چاروں پورشنز الگ، الگ بنوائے تھے اور ایک پورشن اپنے اور اریج کے لیے بنوایا تھا کہ جب وہ میکے آئے تو آرام سے رہے۔ کسی کو ناگوار نہ گزرے۔ جب دونوں بڑے بیٹے باہر چلے گئے تو اُن کے پورشنز بھی یہاں رہنے والے دونوں بھائیوں کے حصے میں آ گئے اور مما پاپا اپنے اور اریج کے پورشن میں رہنے لگے جب تک پاپا زندہ تھے اور مما صحت مند تھیں کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن پاپا کے انتقال اور مما کی بیماری کی وجہ سے مما کی دیکھ بھال کا مسئلہ پورے خاندان کے لیے مسئلہ کشمیر بن گیا تھا۔ مما کو سال بھر پہلے بریسٹ کینسر ہوا تھا اس کا آپریشن ہوا۔ پھر ریڈیو تھراپی ہوئی جس کی وجہ سے وہ بے حد کمزور ہو گئی تھیں اور دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوری بڑھتی جا رہی تھی لیکن ان کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب اپنے، اپنے کاموں میں بے حد مصروف تھے۔ مما کو چوبیس گھنٹے ایک اٹینڈنٹ کی ضرورت تھی اور ایسی عورت کا ملنا جو ایماندار بھی ہو محنتی بھی ہو ہمدرد بھی ہو، صاف ستھری بھی ہو، تمیز دار بھی ہو، صحت مند بھی ہو جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ ہر چند مہینوں بعد ایک عورت رکھی جاتی پھر کسی نہ کسی بھابی سے اس کا جھگڑا ہو جاتا اور وہ چلی جاتی اور مما اکیلی رہ جاتیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ بڑی بھابی

جس عورت کا بندوبست کرتیں وہ چھوٹی بھابی کو پسند نہیں آتی اور چھوٹی بھابی جس عورت کو رکھواتیں بڑی بھابی کی اس سے نہ بنتی اور اب مما اس قابل بھی نہیں رہی تھیں کہ اپنے لیے کچھ پکا سکیں جب ان کے پاس کوئی عورت نہ ہوتی تو وہ بہت ہی پریشان ہوتیں۔ ان کے پورشن کی صفائی بھی ڈھنگ سے نہ ہوتی، ان کے کھانے پینے کا بھی کوئی خیال نہیں رکھتا، کبھی بڑی بھابی کھانا پکا کر بھیج دیتیں، کبھی انہیں کام زیادہ ہوتا تو وہ چھوٹی بھابی سے کہہ کر چلی جاتیں۔ چھوٹی بھابی بھی بہت مصروف رہتی تھیں، اُن کے دو بچے تھے دونوں ہی اسکول جاتے تھے، ویسے تو صمد بھائی کی تنخواہ اتنی تھی کہ انہیں پارلر چلانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ ان کا شوق ہے پھر بچوں کے اسکول جانے کے بعد وہ بہت بور ہوتی ہیں اور مزید یہ کہ گھر میں رہ کر ان کی صلاحیتیں ضائع ہو رہی تھیں۔ یہی مسئلہ بڑی بھابی کے ساتھ بھی تھا۔ ان کے دونوں بیٹے اور بیٹی کالج میں پڑھ رہے تھے، ان سے بھی بچوں کے کالج جانے کے بعد وقت نہیں گزرتا تھا اور ان میں بھی صلاحیتیں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھیں پھر ان کی والدہ ایک NGO چلا رہی تھیں جس کی وجہ سے ان کے بڑے اونچے اونچے گھرانوں سے تعلقات تھے اور ان تعلقات کی وجہ سے ان کا بوتیک دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا جس کی وجہ سے گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ دونوں بھابیاں بہت مصروف تھیں اور دونوں ہی کے پاس نہ ساس کے لیے وقت تھا نہ اپنی گھر گرہستی کے لیے اور بقول ان دونوں کے گھر گرہستی کون سا مشکل کام ہے ویسے بھی آج کل بچے گھر کے پکے ہوئے کھانے کب کھاتے ہیں، ان کے گھر میں کھانا پکنے کا رواج ہی تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ زیادہ تر فاسٹ فوڈ اور ہوٹلنگ پر گزارہ ہوتا تھا۔ بچے گھر کے کھانوں کے عادی نہیں تھے مگر مما کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ نوکری کے باوجود کھانا ہمیشہ خود پکاتی تھیں اور باہر کا کھانا انہیں بالکل پسند نہیں تھا اور اب تو انہیں ہضم بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ دن رات اُن کے لیے کڑھتی رہتی، اسے مما کی حالت دیکھ کر شدید دکھ ہوتا۔ ایک دن وہ بازار سے دوپہر میں انہیں دیکھنے چلی گئی تو اس کا خون کھول گیا۔ وہ کھانے کے وقت دودھ اور بسکٹ کھا رہی تھیں اس زمانے میں ان کے پاس کوئی عورت نہیں تھی۔

”مما، بھابی نے آپ کو کھانا نہیں بھیجا کیا؟“ اریج کو مما کی بے بسی پر رونا آنے لگا تھا۔

”بھیجا تو ہے......تم خود دیکھ لو، کیا پکایا ہے؟“ مما نے ٹرالی پر رکھی ہوئی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے ٹرے میں رکھے ہوئے پیالے کو اٹھا کر دیکھا۔ مرغی کی دو بوٹیاں پانی جیسے شوربے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”ذرا سونگھ کر دیکھو، مرغی کی کیسی بساند آ رہی ہے۔“ اس نے ان کے کہنے پر سالن کو سونگھا تو اسے بھی ابکائی آ گئی۔ مما بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں اور پھر مما کو تو پکانے کا شوق بھی بہت تھا، وہ ہمیشہ کھانا بہت اہتمام سے پکاتی تھیں۔

”ایسے سالن سے تو بہتر ہے کہ میں بسکٹ سے پیٹ بھر لوں۔“ مما نے غصے سے کہا۔

”جب تک کسی عورت کا بندوبست نہیں ہوتا میں آپ کے لیے ہفتے بھر کا کھانا بنا کر لے آؤں گی۔“

”ہرگز نہیں......تمہاری سسرال والے کیا سوچیں گے کہ اس عمر میں، میں لاوارثوں کی طرح پڑی ہوں...... یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔“ مما نے اپنی پوری زندگی بڑے رعب اور دبدبے کے ساتھ گزاری تھی۔ وہ بہت خوب صورت، محنتی اور سلیقہ مند خاتون تھیں، ہر کام بے حد محنت اور لگن سے کرتی تھیں، ان کی محنتوں کا نتیجہ تھا کہ ان کے چاروں

بیٹے پڑھ لکھ کر بڑے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ ایرج نے بھی ایم بی اے کیا تھا لیکن اس کے شوہر کی مرضی نہیں تھی کہ وہ جاب کرے اس لیے وہ گھر اور بچوں میں مصروف ہوگئی تھی۔

مما نے بیماری اور کمزوری کے باوجود اپنے رعب میں کمی نہیں آنے دی تھی اور اسی لیے دونوں بہویں مما سے خوش نہیں تھیں۔ ویسے تو ہر وقت مما، مما کرتی رہتی تھیں اور سب کے سامنے یہ ظاہر کرتیں جیسے انہیں مما کی بے حد فکر ہے۔ جب بھی کسی سے ملتیں مما کی بیماری اور کمزوری کا ذکر اس انداز میں کرتیں کہ سننے والے حیران رہ جاتے اور ان کی قسمت پر رشک کرتے کہ انہیں آج کے زمانے میں بھی ایسی خیال رکھنے والی بہویں ملی ہیں بلکہ چھوٹی بھابی تو جب بھی کسی کو مما کی بیماری کے بارے میں بتا رہی ہوتیں تو اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوجاتیں اور ایرج ان کے آنسو اور رقت بھری آواز سن کر سوچتی کہ یہ خواہ مخواہ پارلر میں وقت ضائع کر رہی ہیں اگر یہ اداکاری کرتیں تو یقیناً ملکۂ جذبات کہلاتیں۔

''مما اب میں پوری سسرال کو بتا کر تو کھانا نہیں پکاؤں گی۔ خاموشی سے دو چار ڈشز بنا کر لے آؤں گی......'' ایرج نے ایک اور تجویز پیش کی۔

''نہیں بھئی...... اتنا تردّد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے پاس ہر قسم کے بسکٹ اور نمکو ہیں پھر تمہارے بھائی پھل وغیرہ لا دیتے ہیں ہمارا گزارہ ہو جاتا ہے۔'' انہوں نے ایرج کو سختی سے منع کر دیا۔

ایرج گھر آ کر بہت پریشان رہی کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ویسے مما ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں اس کی ساس بہت اچھی تھیں لیکن گھر کا سارا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھتی تھیں وہ روزانہ ڈرائیور کے ساتھ جا کر گوشت اور سبزی لاتیں اور گھر کا سارا حساب کتاب اپنے ہاتھ میں رکھتی تھیں۔ کھانے میں ایک آدھ سالن تو خود بھی پکاتی تھیں، ان کی نظروں سے بچ کر وہ مما کے لیے کیسے پکا سکتی تھی۔

''اگر میں ایک دن صبح سے مما کے پاس چلی جاؤں اور ہفتے بھر کا... کھانا پکا کر رکھ دوں...... لیکن مما کو یہ بھی گوارا نہیں ہوگا کہ بیٹی ان کے پاس ایک دن کے لیے آئے اور سارا دن کچن میں گھسی رہے۔'' وہ سارا دن اس شش و پنج میں گرفتار رہی پھر اتفاق سے شام کو اس کی نند کا فون آ گیا۔

''بھابی آپ کی امی کو کسی عورت کی تو ضرورت نہیں؟'' سمیرا کے اس جملے نے اس کے اندر جیسے توانائی بھر دی۔

''ہاں، ہاں بہت شدید ضرورت ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''میرے گھر جو زبیدہ خالہ رہتی ہیں' ان کی بھابی ہیں۔ ان کی دو بچیاں ہیں دونوں کی شادیاں ہوگئی ہیں۔ ابھی چند دن پہلے ان کے شوہر کا انتقال ہوا ہے۔ اب بے چاری بالکل اکیلی ہیں۔'' سمیرا نے تفصیل بتائی۔

''تم انہیں آج ہی بھیج دو۔''

''بس بھابی ایک مسئلہ ہے......'' سمیرا کچھ کہتے کہتے جھجک گئی۔

''کیا......؟'' اس کی سانس رکنے لگی۔

''بھابی ان خاتون نے کبھی کسی کے گھر کام نہیں کیا۔ اب مجبوری کی وجہ سے کام کرنے پر راضی ہوئی ہیں لیکن ان کے ساتھ ماسیوں کا سا برتاؤ نہیں کیجیے گا، میں انہیں جانتی ہوں' وہ بہت شریف اور نیک خاتون ہیں۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو، تم تو مما کو جانتی ہو، وہ تو کسی سے تیز لہجے میں بات تک نہیں کرتیں۔'' ایرج نے اسے اچھی طرح اطمینان دلایا۔

''ہاں بھابی جبھی تو مجھے آپ کی امی کا خیال آیا۔ مجھے یقین ہے آپ کی امی ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔'' سمیرا نے حمیدہ خالہ کی مزید تعریفیں

شروع کر دیں تو اس کے دل میں گہرا اطمینان اتر آیا۔ چند لمحوں پہلے چھائی ہوئی افسردگی اور پژمردگی کی جگہ خوشی اور مسرت نے لے لی ورنہ مما کی فکر کی وجہ سے اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا اور نہ ہی کسی کام میں دل لگ رہا تھا۔

سمیرا نے دوسرے دن ہی حمیدہ خالہ کو بھجوا دیا۔ وہ انہیں اسی وقت لے کر مما کے پاس آ گئی۔ مما ان سے مل کر اور ان کا انٹرویو کر کے بہت خوش ہوئیں وہ انہیں ان کی مرضی کے مطابق لگ رہی تھیں۔

''بس آپ مما کا اچھی طرح خیال رکھیے گا، انہیں کس چیز کی تکلیف نہ ہو، انہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھانے کو کچھ نہ کچھ دیتی رہیے گا۔'' وہ انہیں اچھی طرح سمجھا کر گھر آ گئی۔ دونوں بھابیوں کو پتا چلا تو دونوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔

''بھابی، حمیدہ خالہ بہت محنتی، ہمدرد اور نیک خاتون ہیں۔ بہت مہذب اور تمیز دار ہیں۔ وہ دوسروں کی عزت کرتی ہیں اور چاہتی ہیں دوسرے بھی ان کی عزت کریں۔ ان سے ماسیوں کی طرح پیش نہیں آیئے گا۔'' ایرج نے شام کو فون پر بڑی بھابی کو سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دی۔

''تو کیا ہم کسی کی عزت نہیں کرتے۔ ہم تو خود ان لوگوں کا اپنے سے زیادہ خیال رکھتے ہیں لیکن اب یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم ان کمی کمین لوگوں کو سر پر بٹھالیں۔''

''بھابی کبھی کبھی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''تمہیں کیا پتا ہم مما کی وجہ سے کس طرح ان لوگوں کے ساتھ گزارہ کرتے ہیں اور ان کی باتیں برداشت کرتے ہیں۔'' بڑی بھابی اپنے سامنے کسی کی نہیں سنتی تھیں۔

''ٹھیک ہے اگر آپ کو اُن سے کوئی شکایت ہو تو آپ مجھے بتا دیجیے گا، میں ان سے خود بات کر لوں گی۔ آپ کو اندازہ نہیں میں گزشتہ پندرہ دن سے کتنی پریشان تھی۔ کل بھی میں دوپہر کو آئی تھی تو مما کھانے کے وقت بسکٹ کھا رہی تھیں۔'' وہ نہیں چاہتی تھی کہ بات بڑھے لیکن بھابی کی بے مقصد بحث پر اس کا لہجہ بھی تلخ ہوگیا۔

''مما کے ساتھ بڑا مسئلہ یہی تو ہے کہ انہیں کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پسند نہیں آتا۔ علینہ بتا رہی تھی کہ اس نے پارلر جانے سے پہلے مما کو اپنے ہاتھ سے سالن پکا کر بھیجا تھا مگر مما نے اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور شام کو واپس بھجوا دیا۔''

''آپ نے وہ سالن دیکھا تھا؟'' وہ بہت متحمل مزاج تھی لیکن اسے بھی غصہ آ گیا۔

''میں نے تو کھایا تھا بہت مزے کا تھا......''

''ٹھیک ہے، میں کیا کہہ سکتی ہوں، بہر حال آپ حمیدہ خالہ سے کچھ نہ کہیے گا۔'' اس نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔

حمیدہ خالہ بہت اچھی اٹینڈنٹ ثابت ہوئیں، وہ ایک لمحہ بھی فارغ نہیں بیٹھتی تھیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتیں، مما اُن سے بے حد خوش تھیں' ان کی صحت بھی بہتر ہو رہی تھی، ایرج کو بھی اطمینان ہوگیا تھا۔ البتہ ایک دفعہ وہ مما کے پاس آئی تو اس نے دیکھا مما تو اکیلی بیٹھی ہیں اور حمیدہ خالہ بڑی بھابی کے گھر کام کرنے گئی ہوئی ہیں۔ اس نے فوراً ان کو بلوایا۔

''خالہ میں نے آپ کو صرف مما کے لیے رکھا ہے، آپ مما کو ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑا کیجیے۔''

''باجی، بھابی کی ماسی چھٹی پر گئی ہوئی ہے انہوں نے پہلے بھی مجھ سے کہا تھا میں نے منع کر دیا تھا آج بھی وہ مجھے بلانے آئیں تو میں نے منع کیا تو وہ بہت ناراض ہونے لگیں۔''

''وہ کچھ بھی کہیں، آپ نے کسی صورت ان

کے گھر کا کام نہیں کرنا ہے۔'' وہ جانتی تھی پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے، مما کے لیے جو عورت رکھی جاتی تھی دونوں بھابیاں اس سے اپنے گھروں کے کام کرواتی تھیں۔ جس کے نتیجے میں مما کے کاموں کا حرج ہوتا تھا اور پھر وہ ماسیاں کام کی زیادتی سے گھبرا کر چلی جاتی تھیں۔

''ٹھیک ہے باجی، آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی۔'' وہ گھر آ گئی اور گھر میں داخل ہوتے ہی بڑی بھابی کا فون آ گیا۔

''ایرج یہ بہت غلط بات ہے، تمہارے بھائی بہت ناراض ہو رہے تھے۔'' بھابی اتنی ناراض تھیں کہ سلام دعا کے بغیر ہی غصہ ہونے لگیں۔

''کیوں، ایسا کیا ہو گیا......'' وہ بھی جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔

''تم نے ایک ماسی کے سامنے میری حیثیت دو کوڑی کی کر دی۔ وہ سارے برتن بغیر دھوئے چھوڑ کر چلی گئی اور ابھی میں نے اسے بلوایا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ باجی نے منع کیا ہے۔''

''ظاہر ہے، انہیں مما کے لیے رکھا ہے اور وہ مما کے ہی کام کریں گی۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''ایرج پلیز...... ہم نے کبھی تمہارے گھر کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کی، تمہیں بھی کوئی حق نہیں کہ تم ہمارے گھر کے معاملات میں دخل دو۔''

''میں آپ کے گھر کے معاملات میں دخل نہیں دے رہی ہوں، یہ مما کا معاملہ ہے۔'' اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''مما ہمارے ساتھ رہتی ہیں......'' بھابی کی آواز تیز ہونے لگی۔

''تو پھر آپ لوگ مما کا خیال رکھیں ناں!''

''ہم لوگوں سے جتنا ہو سکتا ہے ہم...... مما کا خیال رکھتے ہیں۔''

''ہونہہ...... خیال رکھتے ہیں۔'' اس نے غصے سے فون پٹخ دیا اور اس دن کے بعد کئی دن تک بھائی اور بھابی کا رویہ بہت تکلیف دہ ہو گیا۔ وہ مما کے گھر آتی تو وہ دونوں اس سے بات ہی نہیں کرتے۔ اسے برا تو لگتا لیکن وہ خاموش رہتی پھر کچھ دنوں بعد چھوٹی بھابی نے شکایت کی۔

''ایرج، کل حمیدہ نے مجھ سے بہت بدتمیزی کی۔''

''اب کیا ہوا؟'' اس کے گھر رات میں کھانے کی دعوت تھی، وہ صبح سے کچن میں مصروف تھی اور اس وقت سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔ ایسے میں چھوٹی بھابی کا فون کرنا اسے سخت کھلا۔

''تم تو جانتی ہو آج کل شادیوں کا سیزن ہے، آج کل پارلر میں بے انتہا رش ہے پھر ہانیہ کے پیپرز بھی ہو رہے ہیں، سرمد کو دو دن سے بخار آ رہا تھا میں نے حمیدہ سے صرف یہ کہا کہ صبح کا ناشتا بنا دے اس نے صاف انکار کر دیا کہ باجی نے منع کیا ہے۔ حمیدہ کے اس طرح جواب دینے پر تو سرمد کو بہت غصہ آیا کہہ رہے تھے اس کی اسی وقت چھٹی کرو، ایرج نے اسے بہت سر پر چڑھایا ہے۔'' دونوں بھابیوں کی کوئی بات بھائیوں کو شامل کیے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم...... جو آپ لوگوں کا جی چاہے کریں۔ میں ابھی بہت مصروف ہوں۔'' ایرج نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

''صمد بھائی اور ان کی بیوی سے تو تعلقات کشیدہ تھے ہی اب لگتا ہے سرمد اور ان کی بیوی سے بھی تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ عجیب عورتیں ہیں نہ خود مما کا خیال رکھتی ہیں نہ کسی عورت کو ٹکنے دیتی ہیں اور بھائی ایسے کاٹھ کے الو ہیں جو بیویاں کہہ دیں اسے ہی سچ سمجھ لیتے ہیں، دونوں میں سے کسی کو یہ توفیق نہیں کہ اپنی بیویوں سے کہہ سکیں کہ تم اپنے کام چھوڑ کر ہماری ماں کی خدمت کرو۔ ان کو

آرام پہنچاؤ...... یہ کیوں کہیں گے؟ وہ ماں جس کی ساری زندگی کی محنت پر آج چین سکون سے اتنے بڑے گھر میں رہ رہے ہیں، وہ ماں ایک وقت کھانے کے لیے غیر عورت کی محتاج ہے۔'' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی وقت ماں کے پاس جائے اور دونوں بھابیوں سے چیخ چیخ کر لڑے۔

☆☆☆

دعوت کے اگلے دن ہی صبح صبح حمیدہ کا فون آ گیا۔ ''باجی آج بڑی بھابی نے میری بڑی بے عزتی کی ہے۔''

''ان لوگوں کو تو بولنے کی عادت ہے آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔'' اس نے حمیدہ خالہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''باجی، میں نے تو ان سے کوئی بات بھی نہیں کی انہوں نے خود ہی آ کر مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے ان کے دماغ تو نہیں خراب ہو گئے۔''

''باجی آپ خود بیگم صاحبہ سے پوچھ لیں۔'' حمیدہ نے فون مما کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''کیا بات ہے مما...... کیا ہو گیا؟''

''ایرج میں تمہیں بتا رہی ہوں یہ دونوں کسی عورت کو میرے پاس رہنے نہیں دیں گی۔ انہیں میرا آرام اچھا نہیں لگتا۔ میں آرام سے ہوتی ہوں تو یہ کڑھتی رہتی ہیں، یہ چاہتی ہیں میں سسک سسک کر مر جاؤں۔'' مما بہت زیادہ ڈپریسڈ ہو رہی تھیں۔

''مما آخر ہوا کیا...... کچھ بتائیں تو سہی۔''

''ارے ہونا کیا تھا، صبح میں نے حمیدہ سے کہا میرے سر میں تیل لگا دو، وہ میرے سر میں تیل لگا رہی تھی تو صمد کی دلہن اونگھتی ہوئی آئی اور کہنے لگی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے سب ناشتے کے لیے انتظار کر رہے ہیں تم سب کا ناشتا بنا دو۔ اتنی دیر میں مما کے پاس بیٹھ جاؤں گی۔ حمیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور میرے سر کی مالش کرتی رہی۔ بس اتنی سی بات پر وہ خوب چیخی چلائی اور روتی ہوئی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد صمد بھی آ گیا وہ بھی گرجتا برستا رہا اور مجھے اور تمہیں بھی خوب باتیں سنائیں کہ ہم دونوں کی شہ پر دو ٹکے کے لوگ انہیں بے عزت کر رہے ہیں۔''

''اُف خدایا......'' سارا قصہ سن کر اس نے سر پکڑ لیا۔ ''میں نے حمیدہ سے کہہ دیا ہے تم اپنا کہیں اور بندوبست کر لو......''

”مما پھر آپ کیا کریں گی۔“

”میرا کیا ہے، میں کسی نہ کسی طرح وقت گزار لوں گی۔“ مما کے لہجے کی مایوسی نے اسے اندر سے ہلا ڈالا۔

”مما ایسا کیسے ممکن ہے؟“

”بیٹا مجھے کون سا برسوں زندہ رہنا ہے، تم کیوں اتنی فکر کرتی ہو، جو میرے نصیب میں لکھا ہے اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ تم پریشان مت ہو۔“

”کیسے نہ پریشان ہوں آپ میری ماں ہیں، مجھے ذرا سا بخار ہو جاتا تھا آپ ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتی تھیں اب آپ بیمار ہیں تو میں آپ کی کوئی خدمت نہ کروں۔“ وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

☆☆☆

اب دو دن بعد فون پر بھابی حمیدہ کے جانے کی خبر سنا کر مشورہ مانگ رہی تھیں۔

”تمہارے بھائی کہہ رہے تھے کہ اگر ایرج خود حمیدہ سے بات کرے۔“

”میں اب کسی سے کوئی بات نہیں کروں گی، یہ آپ کے گھر کا معاملہ ہے آپ خود طے کیجیے۔“ اس نے دل پر پتھر رکھ کر صاف جواب دے دیا۔

”میں نے تو اپنے سارے ملنے جلنے والوں سے کہا ہوا ہے لیکن تم تو جانتی ہو آج کل اعتبار والی عورت کا ملنا کتنا مشکل ہے۔“ وہ نہ جانے کیا، کیا کہتی رہیں لیکن اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

وہ پورے ایک ماہ بعد مما سے ملنے آئی تو مما کی حالت دیکھ کر وہ آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔ ان کے کمرے کی حالت بے حد ابتر تھی بیڈ کی چادر نہ جانے کتنے دنوں سے بدلی نہیں گئی تھی ہر چیز پر ڈسٹ تھی، واش روم بے حد گندہ ہو رہا تھا اور مما بے حد کمزور لگ رہی تھیں۔

”مما آپ کی یہ حالت ہو رہی ہے اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

”میں نے سوچا اچھا ہے تم نہ آؤ تاکہ انہیں اور احساس ہو۔“

”آپ کے کھانے کا کیا ہوتا ہے؟“

”وہی بد ذائقہ، بد رنگ، بساند بھرا سالن یا کھچڑی اور بہت ہوا تو بازار کی مرچوں بھری بریانی آجاتی ہے، دونوں وقت وہی کھاتی ہوں۔“ مما نے جل کر بتایا۔

”اور سارے خاندان میں یہ مشہور ہو رہا ہے کہ آپ کی تیمارداری کی وجہ سے بڑی بھابی کے بوتیک کا کام ٹھپ ہو گیا ہے۔ بے چاری کو آپ کی دیکھ بھال کی وجہ سے بوتیک پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔“ اس نے چڑ کر کہا۔

”میری وجہ سے کچھ نہیں ہوا بلکہ اس لیے ٹھپ ہو گیا کہ ان کی چچا زاد بہن نے ان کے بوتیک کے سامنے اپنا بہت بڑا بوتیک بنا لیا ہے جہاں کے ڈریسز اچھے اور سستے ہیں۔“ مما نے حقیقت بتائی۔

”خدا کرے ان کا بوتیک بالکل ہی ختم ہو جائے۔“ اس کا دل اتنا جلا ہوا تھا کہ اس نے کُھل کر بد دعا کی اور پھر دوپہر میں بڑی بھابی نے سو احسان جتا کر جو کھانا بھیجا اسے دیکھ کر تو اس کی بھوک ہی اڑ گئی۔ گائے کے گوشت کا پلاؤ جس میں چاول اچھے خاصے نرم ہو گئے تھے اور ساتھ میں لوکی کی سبزی جس سے مما کو چڑ تھی۔ بھابی کے جانے کے بعد اس نے پلاؤ اور سبزی ایک طرف رکھی اور مما کے لیے مرغی کا بھنا ہوا قورمہ، مٹر پلاؤ اور تھوڑا سا کسٹرڈ بنایا پھر مما نے جس رغبت سے وہ کھانا کھایا وہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”آج نہ جانے کتنے دنوں بعد میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا ہے۔“ پھر مما کے اس جملے نے تو جیسے اس کا دل چیر کر رکھ دیا۔

”مما جب تک کسی عورت کا بندوبست نہیں ہوتا آپ کا کھانا میں ہی پکا کر لایا کروں گی۔“ اس کے اس جملے پر مما خاموش ہو گئیں شاید اب وہ بھی یہی چاہتی تھیں۔

☆☆☆

مما کے لیے کسی عورت کا بندوبست نہیں ہو سکا لیکن ان کے کھانے کی ذمے داری ایرج نے اپنے ذمے لے لی۔ وہ ہفتے میں ایک دن ان کے پاس رہنے کے لیے آتی اور مختلف طرح کے سالن، سبزیاں اور دالیں بنا کر رکھ جاتی۔ اسے بھی اطمینان ہوتا تھا اور مما کی صحت بھی خاصی بہتر ہوتی جا رہی تھی لیکن بھابیوں کو اس پر بھی اعتراض تھا۔ اس طرح سارے خاندان میں ان کی بدنامی ہو رہی تھی۔ اس نے اور مما نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح باتیں تو پھیل ہی جاتی ہیں، کبھی مما کے پاس ان کے بہن یا بھائی آتے اور اسے کچن میں مصروف دیکھتے تو فوراً اعتراض کرتے۔

”اندھیر ہے، گھر میں دو دو بہوئیں موجود ہیں اور بچی سسرال سے آ کر بھی کچن میں مصروف رہتی ہے۔“ اس دن بڑی خالہ مما کے پاس رہنے کے لیے آئی ہوئی تھیں تو اسے صبح سے مسلسل کاموں میں مصروف دیکھ کر سخت ناراض ہوئیں۔

”میں تو خود منع کرتی ہوں، مجھے خود اچھا نہیں لگتا پر کیا کروں مجبوری ہے۔“ مما میں بھی اب برداشت نہیں رہی تھی۔ بڑی خالہ کی باتیں سن کر اُن کا دل بھی بھر آیا۔

”کاہے کی مجبوری...... آخر بہوئیں کس مرض کی دوا ہیں؟“

”انہیں اپنے کاموں سے فرصت نہیں۔“

”تو یہ بھی تو ان ہی کے کام ہیں، تم کوئی غیر تو نہیں ان کی ساس ہو۔“

”جبھی تو یہ سلوک ہو رہا ہے۔“

”اس میں سارا قصور تمہارا ہے، تم ہی نے دونوں بیٹوں کو ڈھیل دے رکھی ہے۔“

”وہ کیا کریں، ان کے سامنے تو دونوں ہر وقت مما کا پہاڑا پڑھتی رہتی ہیں۔ کھانے بھی پکا کر بھیجتی ہیں مگر کھانے ایسے ہوتے ہیں جیسے جیل کے قیدیوں کو دیے جاتے ہیں اور ساتھ میں یہ کہا جاتا ہے کہ مما کو ہمارے ہاتھ کا کھانا ہی پسند نہیں آتا۔“ مما کا دل بہت بھرا ہوا تھا انہوں نے کُھل کر بڑی خالہ سے سب کچھ کہہ دیا جس کے نتیجے میں بڑی خالہ نے دونوں بیٹوں اور بہوؤں کی خوب کلاس لی، اس وقت تو سب خاموش رہے لیکن ان کے جانے کے بعد سب منہ بنا کر اپنے اپنے پورشنز میں چلے گئے، مما اور زیادہ اکیلی ہو گئیں پھر وہ سارا سارا دن اکیلی دیواریں تکتی رہتیں اور کوئی پلٹ کر خبر نہیں لیتا۔ انہی دنوں ایک دن واش روم میں ان کا پاؤں پھسل گیا جس کے نتیجے میں کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی وہ تو شکر تھا کہ صبح کا وقت تھا، دونوں بیٹے گھر پر ہی تھے۔ مما کی چیخوں نے زمین اور آسمان ہلا دیے۔ انہیں فوراً اسپتال لے جایا گیا ایک مہینے اسپتال میں رہنے کے بعد جب وہ گھر آئیں تو پھر وہی مسئلہ کہ کون ان کی دیکھ بھال کرے، ان کو اب چوبیس گھنٹوں کے لیے عورت کی ضرورت تھی۔ ایک عورت صبح سے شام تک کے لیے تو مل گئی لیکن اب انہیں رات کو بھی اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ایرج صبح کو اپنے گھر کے کام نمٹا کر آجاتی ان کا منہ ہاتھ دھلا کر ناشتا کرواتی ماسی کے ساتھ مل کر ان کا بیڈ ٹھیک کرتی، ان کو نہلاتی، دھلاتی، رات کے گندے کپڑے دھوتی سارا دن ان کی خدمت کرتی بھابیاں دنیا دکھاوے کو دن میں ایک دو چکر ضرور لگاتی تھیں کبھی ماسی کو ہدایت دینے کے لیے، وہ رات کو بھی ماں کے پاس رہتی۔ حمیدہ تو جانے کے بعد ایسی غائب ہوئی جیسے اسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو اور اب بھائی بھابیوں کو اس کی قدر محسوس ہو رہی تھی اور اس طرح پورے تین

سال گزر گئے۔ کبھی کبھار کوئی فل ٹائم ملازمہ ملی بھی تو وہ زیادہ عرصے تک ٹِک نہ سکی۔ مما کو سنبھالنا آسان نہیں تھا۔ اس نے ماں کی خاطر سب کچھ برداشت کیا سسرال والوں کے طعنے سنے، شوہر کا غصہ سہا لیکن ماں کا ہر طرح خیال رکھا۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دی اور پھر ایک دن سب چیزوں کا خاتمہ ہوگیا۔ مما رات کے کسی پہر ان سب کو چھوڑ کر اپنی اصلی منزل کی طرف روانہ ہوگئیں۔

☆☆☆

مما کا چہلم تھا۔ ڈرائنگ روم میں سفید فرش بچھا ہوا تھا جگہ جگہ تپائیوں پر سپارے رکھے ہوئے تھے فضا میں اگربتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ خواتین کلف لگے کھڑکھڑاتے ہوئے کپڑوں میں ملبوس قرآن شریف پڑھنے میں مصروف تھیں۔

وہ سپارہ پڑھ رہی تھی۔ اس کی پشت پر خواتین سرگوشیوں میں مصروف تھیں۔ اس کا دھیان بار بار بھٹک کر ان کی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

''حیرت کی بات ہے کہ بیٹوں کے ہوتے ہوئے تمہاری ساس نے اپنا پلاٹ ایرج کے نام کردیا۔'' بڑی بھابی کی بہن کی آواز پر وہ چونکی انہیں شاید علم نہیں تھا کہ وہ ان کے اتنے قریب ہے کہ ان کی معمولی سی سرگوشی بھی سن سکتی ہے۔

''صرف پلاٹ ہی نہیں اپنا سارا بینک اکاؤنٹ اور زیور بھی......'' بڑی بھابی کی آواز سے شدید دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔

''صرف یہ گھر ہی بیٹوں کے حصے میں آیا ہے، اس میں بھی ایرج کا حصہ ہے۔'' اس دفعہ چھوٹی بھابی نے غم کا اظہار کیا۔

''تمہاری ساس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، یہ تو سخت ناانصافی ہے۔'' کسی اور خاتون کی سرگوشی سنائی دی۔

''بس ہم کیا کہہ سکتے ہیں ساری زندگی مما ہمارے ساتھ رہیں، ہم نے ان کی خدمت کی اور وہ مرنے سے پہلے اپنا سب کچھ ایرج کے نام کر گئیں۔'' یہ چھوٹی بھابی کی سرگوشی تھی۔

مما نے آخری دنوں میں وکیل بلا کر اپنا سب کچھ ایرج کے نام کر دیا تھا جس کا علم مما کی موت کے بعد ہی ان کی اولادوں کو ہوا تھا۔

''یہ تو سراسر ظلم ہے۔'' کسی اور خاتون نے بھابیوں کے غم میں شریک ہونے کی کوشش کی۔

''کیا واقعی مما نے ظلم کیا......؟ کیا مما کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟ مگر مما نے تو کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا...... کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی پھر...... انہوں نے ایسا کیوں کیا...... کیا حقیقت میں مما نے اپنے بیٹوں پر ظلم کیا ہے؟'' اس کا دل گھبرانے لگا۔

''لیکن ایرج نے بھی تو ماں کی جس طرح خدمت کی ہے آج کل کون اس طرح کرتا ہے، اس نے تو اپنا گھر بار چھوڑ کر دن رات ایک کر دیے تھے۔''

''یہ کون ہیں؟'' ایرج نے پلٹ کر دیکھنا چاہا پھر بڑی بھابی کی آواز پر وہ رک گئی۔

''یہ نہ کہیں، ہم بھی ایرج کے ساتھ برابر سے مما کی دیکھ بھال کرتے تھے۔''

''وہ اکیلی تھوڑی ان کی خدمت کرتی تھی۔ ہم اس کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ تو ہماری ساس کو شوق تھا کہ ان کی بیٹی ہر وقت ان کے سامنے رہے۔'' چھوٹی بھابی کے اس جملے پر وہ ایک دم پلٹی اور اسے دیکھ کر چھوٹی بھابی اور خواتین کے چہروں پر جیسے کسی نے مٹی تھوپ دی۔ سب کی زبانیں گنگ ہوگئیں اور چہروں پر مُردنی برسنے لگی۔

''مما نے جو کچھ کیا وہ تو بہت بڑا ظلم ہے لیکن آپ دونوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ کیا ہے؟ عدل...... انصاف...... نیکی......؟'' اس نے زہر بھرے لہجے میں دونوں بھابیوں کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ناولٹ

حدیثِ دل

عظمیٰ افتخار



''اوکے...... سین فور، ٹیک ون۔'' ولید نے کسی ماہر ڈائریکٹر کی طرح روشنی کو اپنے ڈائیلاگ بولنے کا سگنل دیا۔

''کیا تم آج سلیم سے ملی ہو...... ثریا؟'' روشنی نے مکالمہ ادا کیا۔

''کٹ، کٹ۔'' روشنی کے مکالمہ ادا کرنے پر ولید نے فوراً ہی کٹ کہہ کر سین قطع کر دیا۔

''سلیم نہیں، صاحبِ عالم...... سلیم تمہیں احتیاطاً

سمجھانے کے لیے لکھا گیا ہے۔ روشنی...... تم اپنے آپ پر انارکلی کا موڈ طاری کرو...... انارکلی جو مغلیہ دور کی کنیز تھی اور امتیاز علی تاج کے ڈرامے کا مرکزی کردار بھی۔" ولید نے اسے ایک بار پھر سمجھایا۔

"تو اتنی دیر سے میں اور کیا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کیا میں تمہیں سراپا سے انارکلی نہیں نظر آ رہی؟" وہ بیزار ہوئی۔ اس کے کہنے پر ولید نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی گویا واقعی مغلیہ دور کی کنیز انارکلی ہو۔

"بولو، کیا نہیں لگ رہی؟" اب کے روشنی کی آواز میں تیزی تھی۔ ولید کو روشنی کے سراپا پر سے اپنا ارتکاز سمیٹنے میں قدرے دقت ہوئی۔ اب وہ اسکرپٹ دیکھ رہا تھا پھر اس نے وہ اسکرپٹ روشنی کی طرف بڑھا دیا۔

"صرف سراپا سے "انارکلی" نظر آنا اہم نہیں ہے روشنی۔ تمہارے مکالموں کی ادائیگی اور تاثرات میں باہمی ربط ہونا چاہیے۔ اس منظر میں انارکلی سے زیادہ اس کی بہن ثریا کے مکالمے ہیں اور یہاں انارکلی کو صرف اپنے چہرے کے تاثرات سے منظر میں جان ڈالنی ہے......" ولید تیسری بار اسے سمجھا رہا تھا۔

"افوہ...... میں تنگ آ گئی ہوں۔ میں نہیں کر رہی۔" اس نے اسکرپٹ صوفے پر اچھال دیا۔

"اوکے...... پھر میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"افوہ...... ولید رکو تو......" اس نے ولید کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"اصل غصہ تو مجھے سویرا پر ہے۔" اس نے اپنی جڑواں بہن کا نام لیا۔

"حالانکہ تمہیں اس پر غصہ نہیں ہونا چاہیے۔ روشنی اور سویرا تو لازم و ملزوم ہیں۔"

"روشنی پھیلتی ہے تو سویرا ہوتا ہے۔" وہ روشنی کے روکنے پر رک گیا تھا اور اب آرام سے صوفے پر بیٹھا تھا۔

"تم اس کی زیادہ حمایت نہ کرو آئی سمجھ۔ سب سمجھتے ہیں میں اسے تنگ کرتی ہوں جبکہ وہ چھپی رستم ہے۔" روشنی نے چڑ کر کہا۔

"تم نے شاید غور سے میرا جملہ نہیں سنا۔ اس جملے میں، میں نے تمہیں اہمیت دی ہے۔" ولید نے اس جملے پر زور دیا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے باہر آنے کو بے چین تھی۔

"ویسے تنگ تو تم اسے کرتی ہو، یہ تو تمہیں ماننا پڑے گا۔ پچھلے دنوں اس کی رازداں ڈائری جو تم نے چھپا دی تھی۔ یاد کرو، تم نے مزے مزے لے کر یہ بات مجھے فون پر بتائی تھی۔" ولید نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں تو...... میں اسے گھر میں تنگ کرتی ہوں ناں، کالج میں تو نہیں اور جب میں دوست نما بہن موجود ہوں تو اسے اس بے جان ڈائری کو رازداں بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ جو اسے ڈھنگ سے مشورہ بھی نہیں دے سکتی۔" اس نے تنک کر کہا پھر مزید گویا ہوئی۔

"محترمہ سویرا صاحبہ نے اس بات کا مجھ سے ٹھیک ٹھاک بدلہ لیا ہے۔ ہمارے کالج کی اردو ادب سوسائٹی "انارکلی" ڈراما پیش کرنے والی ہے۔ محترمہ سویرا صاحبہ انتظامیہ کی نگراں مس نور کے پاس گئیں، اپنا دیدار کروایا اور نام، پتا میرا لکھوا آئیں اور جب اردو سوسائٹی کی نگراں نے مجھے آڈیشن کے لیے بلوایا تو میری بتی گم ہو گئی۔ میں لاکھ انکاری مگر وہ مُصر تھیں کہ آپ تو خود بہت شوق سے اپنا نام لکھوا کر گئی ہیں اور انارکلی کے کردار کے لیے جن تین لڑکیوں کا انتخاب کیا گیا تھا ان میں آپ ہمیں سب سے بہتر لگی ہیں۔ پہلے تو مجھے سمجھ نہیں آیا مگر جب ذہن کے گھوڑے دوڑائے...... تو بات سمجھ میں آئی...... بس پھر کیا تھا میں تو سویرا پر چڑھ دوڑی۔ خود تو محترمہ کسی طور انارکلی سے کم نہیں۔ ڈائری کو اپنا رازداں بنائے

رکھتی ہیں اور لے کر ڈرامے میں مجھے جھونک دیا۔" روشنی نے آخری جملہ یوں ادا کیا گویا ڈرامے میں نہیں آگ میں جھونک دیا ہو۔

"وجہ اس کی یہی ہے کہ تم سب کچھ کہہ دینے پر مامور ہو اور وہ کچھ نہ کہنے پر...... تمہیں اونچی آواز میں خود کلامی کی عادت ہے اور اسے ڈائری کو سب کچھ سونپ دینے کی......" ولید نے توجیہہ دی۔

"مگر ولید...... شرارت، ہنسی مذاق اپنی جگہ...... مگر یہ تو پورا ڈراما ہے...... ایک اسٹیج پلے ہے جس کا مرکزی کردار مجھے ادا کرنا ہے...... اور تمہیں پتا ہے ناں، میں ڈھونگ نہیں رچا سکتی...... پر کیا کروں...... بہت بری پھنسی ہوں، نہ تو مس نور یہ بات ماننے کو تیار ہیں کہ نام میں نے نہیں لکھوایا اور نہ میں اپنی بہن کو ان کے سامنے لے جا کر جھوٹا ثابت کر سکتی ہوں۔" روشنی حقیقتاً پریشان تھی۔

"بس تو پھر یہ حق تو تمہیں ادا کرنا ہی ہے۔" ولید نے اسے باور کرایا۔

"مگر کیسے......؟" اس کی سوئی ہنوز وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"ڈونٹ وری...... میں ہوں ناں...... اتنی اچھی تیاری کرواؤں گا کہ سچ مچ کی انارکلی لگنے لگو گی۔" ولید نے ایک ادا سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"تھینک گاڈ...... تم مسکرائیں تو...... اب یہ بتاؤ خالی خولی باتیں ہی ہوں گی یا کچھ کھلایا پلایا بھی جائے گا۔"

"لاتی ہوں مگر پہلے یہ بتاؤ، تم آج بھی تایا ابو اور تائی امی سے ملنے نہیں گئے؟" روشنی نے پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی، برابر میں ہی تو گھر تھا۔

"نہیں، تمہاری کال سنتے ہی ادھر چلا آیا۔"

"تائی امی، تمہارے لیے پریشان رہتی ہیں ولید۔"

"میں ان سے رابطے میں رہتا ہوں۔"

"تایا ابو بھی دل کے برے نہیں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" ولید کا ہر جواب مختصر تھا۔

"پھر گھر کیوں نہیں آتے؟" روشنی نے اس کا چہرہ کھوجا۔

"گھر میں ہی تو ہوں۔ یہ سارا دیس میرا گھر ہی تو ہے۔"

"باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔" روشنی لاجواب ہو چکی تھی۔

"اور چائے بنانا تو کوئی تم سے......" ولید نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "مگر فی الوقت چائے نہیں کافی لانا...... وہ بھی بنا شکر کے۔"

"تم اتنے تلخ کیوں ہو ولید؟" وہ کچن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں، ایسا بھی نہیں ہے، کبھی شدت سے میرا دل چاہتا ہے کہ خوب چینی ڈال کر کافی بناؤں اور مزے لے کر پیوں۔" وہ مسکرایا۔ "لیکن کبھی یہ کوشش کی نہیں۔"

"اور وہ دن کب آئے گا جب تم اس خواہش پر عمل کرو گے۔" روشنی جاتے جاتے رکی۔

"میرا خیال ہے...... جب ویٹو پاور پاکستان کے پاس ہوگا اور امریکا اپنا ہر کام اس سے پوچھ کر کرے گا۔" ولید نے چند ساعتوں کی خاموشی کے بعد جواب دیا۔

"حد ہے تم سے بھی...... کبھی سیدھا جواب نہ دینا...... اور اس صدی میں تو ایسا ہونا ناممکن ہے۔"

"ایسا مت کہو روشنی...... انسان کے کہے ہوئے لفظوں کی بازگشت بہت دور تک جاتی ہے۔ ہم منفی کے بجائے مثبت بھی تو سوچ سکتے ہیں ناں...... پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔" ولید نے اسے نرمی سے ٹوکا...... وہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ ولید نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ وہ ایسا ہی تھا...... سب کو لاجواب کر دیتا تھا۔ سوائے پروفیسر اکرام اللہ کے...... جو اس سے کبھی متاثر نہ ہو سکے

تھے اور اس بارے میں ایک بار روشنی نے ولید کو یہ کہتے سنا تھا...... "ہم میں سے بہت سارے لوگوں کو پتا ہی نہیں چلتا کہ بڑے بڑے درختوں کے سائے میں چھوٹے چھوٹے بوٹے کبھی پنپ نہیں پاتے۔ نہ انہیں صحیح معنوں میں زمین سے مضبوطی ملتی ہے اور نہ سورج سے حرارت...... یوں وہ کبھی کبھار بے نام و نشان ہی رہ جاتے ہیں۔"

☆☆☆

پروفیسر اکرام اللہ اور انعام اللہ دو ہی بھائی تھے۔ دونوں کے گھروں کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ انعام اللہ کے گھر کی ساری رونق روشنی اور سویرا تھیں۔ دونوں جڑواں تھیں۔ سرتاپا ایک جیسی...... مگر عادات میں مختلف...... اور مزاج کا یہی تضاد دونوں کو ہمہ وقت چاند اور چکور بنائے رکھتا مگر پروفیسر اکرام اللہ کے گھر کی کچھ عجب نوعیت تھی۔ وہ مقامی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ ماضی پرست بھی تھے اور وطن پرست بھی۔

بڑا بیٹا مونس پولیس کے محکمے میں تھا۔ ایک دن اپنی موبائل وین میں گشت کے دوران کچھ شر پسند عناصر کی گولیوں کا نشانہ بن کر تاریخ کا حصہ بن گیا تھا۔ جس طرح جنگل میں سیدھے درخت سب سے پہلے کاٹے جاتے ہیں، اسی طرح شاید سچا اور ایماندار آدمی بھی معاشرے کی لاقانونیت کو راس نہیں آتا اور اگر معاشرے میں جنگل کا ہی قانون ہو تو شاید سب سے پہلے اسی اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ دوسرا بیٹا حسنات تھا۔ کیپٹن حسنات...... جو شمالی وزیرستان میں اپنے اسلاف کی تاریخ کے نقوش بگڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور انہیں بچانے میں مصروف تھا اور پھر تھا...... ولید...... ولید اکرام اللہ...... جو ایک نئی تاریخ مرتب کرنے کا خواہاں تھا...... وہ اس شعر کی تصویر نظر آتا تھا۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ ایک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

زمانۂ طالب علمی میں پروفیسر صاحب اسے کیڈٹ کالج بھیجنے پر مُصر رہے۔ یہاں تک کہ اس کا داخلہ بھی کروا دیا مگر وہ انکاری رہا اور اس نے آرٹس کے مضامین میں انٹر کیا۔ انٹر کے بعد بھی انہوں نے بہت چاہا کہ وہ کمیشن کا امتحان پاس کرے اور فوج میں بھرتی ہو جائے۔

"تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ وطن کی سربلندی کے لیے خود کو پیش کیا ہے اور اگر میری دس اولادیں بھی ہوتیں تو بھی میں انہیں وطن کے...... سپرد کر دیتا۔" وہ ہر بار اپنی کہی ہوئی بات اور سختی سے دُہراتے۔

"میں آپ کی بات سے منکر نہیں ابا جان...... مگر معاف کیجیے گا، میں آپ کی طے کردہ راہ پر چل نہیں سکتا۔" ولید اپنے موقف پر ڈٹا رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پروفیسر صاحب کی گڈ بک سے خارج ہو گیا۔ ان کے نزدیک وہ نکما اور نالائق تھا۔ جس کا سارا وقت سونے، کمپیوٹر پر وقت گزارنے اور ٹی وی دیکھتے گزرتا تھا۔ وہ اس ہر وقت کی لعن طعن سے تنگ آ کر گھر ہی چھوڑ گیا تھا۔ ناصرہ خاتون ماں تھیں، بہت روئیں مگر پروفیسر صاحب کی اصول پسندی کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ بھلا ان کے کون سے اور بیٹے تھے۔ مونس دنیا سے جا چکا تھا حسنات مہینوں گھر نہ آتا تھا اور اب ولید بھی گھر چھوڑ گیا تھا۔ یونیورسٹی میں اس نے جرنلزم میں داخلہ لیا اور ہوسٹل میں کچھ دوستوں کے ساتھ کمرا شیئر کرنے لگا۔ ماں نے چلتے وقت کچھ زادِ راہ ساتھ دیا تھا مگر وہ کب تک ساتھ دیتا۔ سو حصولِ تعلیم کے دوران ہی وہ چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے لگا...... اور ان تجربوں کے دوران اس نے وقت سے اور زندگی سے بہت کچھ سیکھا مگر پھر بھی پروفیسر صاحب کا فیورٹ نہ بن سکا۔

☆☆☆

"کیا کر رہی ہو؟" روشنی کچن میں داخل ہوئی اور سویرا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

"اگر دو آنکھیں رکھتی ہو تو دیکھ سکتی ہو کہ چائے بنا رہی ہوں۔" سویرا کی پوری توجہ چائے کی طرف تھی۔

"چائے بن رہی ہے...... وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے مگر یہ جو لوازمات کا پہاڑ ٹرالی میں سجا ہوا ہے، وہ کس خوشی میں ہے؟" اس نے ٹرالی میں رکھی سموسوں کی پلیٹ سے ایک سموسہ اٹھایا۔

"حسنات بھائی آئے ہیں۔" سویرا نے اسے گھور کر دیکھا اور سموسہ اس کے ہاتھ سے لے کر واپس رکھا۔ روشنی کی یہ بری عادت تھی کہ ڈرائنگ روم میں جانے والی کسی بھی چیز کا وہ اچھی طرح پوسٹ مارٹم کرتی تھی۔

"کیا...... کیپٹن حسنات آئے ہیں؟" وہ حسنات کا نام سن کر اتنی پُرجوش ہوئی کہ سویرا کے سموسہ لے کر واپس پلیٹ میں رکھنے پر بھی بدمزہ نہیں ہوئی۔

"یہ تم انہیں کیپٹن حسنات کب سے کہنے لگی ہو...... بھائی کیوں نہیں کہتیں......" سویرا کمر پر ہاتھ رکھ کر پوری طرح اس کی طرف گھومی۔

"انہیں...... واہ......" روشنی نے معنی خیزی سے انہیں کہا۔

"میری پیاری بہن سویرا...... تم ہو ناں...... انہیں بھائی کہنے والی اور ویسے بھی فوجیوں کو بھائی بنانا کوئی دانش مندی نہیں ہے اور وہ فوجی اگر کیپٹن حسنات ہو تو ہرگز بھی نہیں۔" روشنی نے اِک ادا سے کہا سویرا جل ہی گئی۔

"ارے بھئی لڑکیوں...... باتیں ہی کرتی رہو گی یا کچھ کھانے کے لیے بھی لاؤ گی...... بچہ کب سے چائے کے انتظار میں ہے۔" زہرا بیگم کچن میں داخل ہوئیں۔

"امی...... بچہ تو نہ کہیں اتنے گبرو جوان کو۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ وہ ایک عدد بیوی لے آئیں گے...... کیوں سویرا؟" اس نے پہلے امی کو مخاطب کیا اور پھر اپنے ساتھ سویرا کی رائے چاہی۔

"مجھے نہیں پتا......" سویرا چڑ گئی۔

"امی آپ جائیں...... سب تیار ہے، بس لا رہے ہیں۔" سویرا نے امی کو جواب دیا اور آخری نظر ٹرالی پر ڈالی کہ کچھ کم تو نہیں ہے۔

"ویسے سویرا...... جب حسنات بھائی کی شادی ہوگی تو کتنا مزہ آئے گا ناں...... سچ میں، میں تو بہت انجوائے کروں گی۔" روشنی مزے لے لے کر کہہ رہی تھی گویا شادی کا سارا سین اس کی نظروں کے سامنے چل رہا ہو۔

"تم یہ اپنی بے وقت کی راگنی بند نہیں کر سکتیں۔" سویرا نے غصے سے کہا اور دوپٹا شانوں پر درست کرنے لگی۔

"کیوں، بے وقت کی راگنی کیوں...... کیا تمہیں کیپٹن حسنات کی شادی کی خوشی نہیں ہوگی؟ ویسے تائی امی مجھے بہت چاہتی ہیں، ہو سکتا ہے مجھے ہی بہو بنا لیں...... آہ...... ایک دلربا خواب......" روشنی نے آنکھیں میچیں۔

"روشنی اپنی لن ترانی بند کرو اور ڈرائنگ روم میں چلو، سنا نہیں امی کیا کہہ کر گئی ہیں۔" سویرا نے اسے آگے دھکیلا۔

"ایک کام نہ کریں سویرا...... کچھ دیر کے لیے تم روشنی بن جاؤ اور میں سویرا...... کیپٹن حسنات کو بے وقوف بنائیں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔" روشنی کو نیا آئیڈیا سوجھا۔

"دماغ تو صحیح ہے تمہارا...... ڈرائنگ روم میں سب بیٹھے ہیں...... اور ولید بھی آیا ہوا ہے۔ وہ تو ریکارڈ ہی لگا دے گا ہمارا۔" سویرا راضی نہ تھی۔

"تو کیا ہوا؟ سب کی موجودگی کا ہی تو سارا مزہ ہے...... اور ولید کیوں ریکارڈ لگائے گا...... وہ کون سا روز آتا ہے کہ جان جائے ہم میں سے کون روشنی اور کون سویرا ہے؟"

"اب سوچ کیا رہی ہو؟ چلو ناں...... ورنہ امی دوبارہ آجائیں گی۔" سویرا کو سوچ میں پڑتے دیکھ کر روشنی نے دوبارہ ٹہوکا دیا۔ آخر سویرا کو ماننا ہی بنی۔

"چلو پھر ٹرالی لے کر آگے بڑھو...... تم ہو روشنی چلبلی اور بڑبولی سی اور میں تمہارے پیچھے چائے لے کر آرہی ہوں۔ میں یعنی سویرا، سنجیدہ مزاج اور کم گو۔"

ڈرائنگ روم میں زور شور سے باتیں ہو رہی تھیں۔ سب ہی جمع تھے۔ امی، ابو، تایا ابا، تائی اماں، حسنات بھائی...... اور تو اور ولید بھی حسنات کی ایک فون کال پر دوڑا چلا آیا تھا۔ حسنات غضب کی حسِ مزاح رکھتے تھے۔ عید پر نہیں آسکے تھے اس لیے اب آئے تھے اور اس وقت بھی عید کے حوالے سے دوست کا کوئی قصہ سنا رہے تھے۔

"میرا ایک دوست ہے چچا جان، یہیں کراچی کا رہنے والا، اسے شمالی وزیرستان سے پشاور اور پشاور سے ہوتے ہوئے کراچی آنا تھا۔ بے چارے کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی۔ اسے تینوں جگہ چاند کی نوید ملی مگر روزِ عید کہیں نصیب نہ ہوا۔ کراچی پہنچا تو عید کا دوسرا دن تھا۔ بے چارہ لوگوں سے ڈھنگ سے گلے ملنے سے بھی محروم ہوگیا۔"

"یہی تو ہمارا المیہ ہے بیٹا کہ ہم ایک چاند پر بھی متفق نہیں ہوسکتے۔" انعام اللہ نے تاسف سے کہا۔

"اور ہماری ٹریجڈی بھی اب لطائف سے کم نہیں رہی۔ سمجھ نہیں آتا روئیں یا ہنسیں۔" پروفیسر اکرام اللہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"وہ بھی مجھ سے جب فون پر بات ہوئی تھی تو یہی کہہ رہا تھا کہ بلا وجہ نئی نویلی دلہن کی دید کی چاہ میں چلا آیا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ پہاڑوں پر ہی عید منالیتا۔" حسنات نے کچھ اس انداز سے کہا کہ سبھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسی وقت روشنی اور سویرا ایک دوسرے کا سوانگ بھرے آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

"یہ لیجیے...... حسنات بھائی۔ آپ کی چ... دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے روشنی نے سو... انداز کی نقل اتاری...... وہ کیپٹن حسنات کے... رک گئی تھی۔

"تم بھی حد کرتی ہو سویرا...... کیپٹن حسنات... پہلے کیک، سموسے تو کھلاؤ...... بنانا کیک جو تم... بیک کیا ہے...... ٹیسٹ کریں حسنات بھائی... نے بہت اچھا بنایا ہے۔" سویرا روشنی کے انداز... کہتے ہوئے ٹرالی میں سے چیزیں نکال کر ا... سامنے ٹیبل پر رکھنے لگی...... اصلی روشنی نے... نظروں سے اپنی نقل کرتی سویرا کو دیکھا۔ جو... مٹھو بنی اپنی تعریفیں خود ہی کیے جا رہی تھی۔

"ڈونٹ وری سویرا...... میں سب کچھ کھا... گا۔" حسنات نے مسکرا کر کہا اور سویرا اور... دونوں کا منہ حیرت سے کھل گیا کیونکہ حسنات... روئے سخن اصلی سویرا کی جانب تھا۔

"آپ...... آپ نے کیسے پہچانا......؟" سویرا ہی بالآخر حیرت کے جھٹکے سے باہر آئی۔

"دل کی آنکھ سے۔" ولید جو بہت دیر سے... کے برابر میں خاموشی سے بیٹھا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"کیا مطلب......؟" روشنی کمر پر ہاتھ ر... آگے آگئی۔

"مطلب یہ کہ میں تو روشنی کو سویرا اور سو... روشنی سمجھ لیتا مگر ولید پہچان گیا۔" حسنات نے... سے کہا اور کیک کا پیس منہ میں رکھ لیا۔ زہرا بیگم چا... کو آپس میں نوک جھونک کرتے دیکھ کر خود ہی... جیٹھانی اور شوہر کو ریفریشمنٹ پیش کرنے لگی تھیں۔

"مگر کیسے...... ہم تو ایک دوسرے کا سوا... بھرلیں تو کالج والے تو کیا خاندان والے بھی... پہچان پاتے...... اور تم تو ویسے ہی مہینوں میں... دکھاتے ہو۔" روشنی کو حسنات کے سامنے اپنا آ... فلاپ ہوجانے کا دکھ تھا۔ وہ ولید پر چڑھ دوڑی۔

"کہا تو ہے کہ دل کی آنکھ سے پہچانا......" اس ...نے روشنی کو غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہنے ...گا۔ "اور شاید تم بھول گئیں کہ میں ایک ہفتہ پہلے ہی ...آ گیا ہوں...... جب تم نے مجھے انارکلی کے آڈیشن ...کا پورا قصہ سنایا تھا۔" اس نے روشنی کی عقل پر ماتم ...کیا...... اور پھر کھڑا ہوگیا۔

"اچھا بھائی چلتا ہوں۔ ایک ضروری فون آرہا ...ہے ابھی تو آپ دو ہفتے کے لیے یہاں ہیں ناں...... ...میں دوبارہ چکر لگاؤں گا۔" وہ حسنات کے گلے لگا ...پھر چچی جان سے جانے کی اجازت چاہی۔

"ارے ولید بیٹا...... بیٹھو چائے تو پیو......" ...انعام چچا اسے روکنے لگے۔

"جانے دو انعام...... اس کے لیے باہر ...والے، گھر والوں سے زیادہ اہم ہیں۔" اکرام اللہ ...نے روکھے لہجے میں کہا اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔ ماں ...سے پیار لیتا باقی سب کو سلام کرتا باہر نکل گیا۔

"ابا جان پلیز...... کبھی کبھی آپ زیادتی ...کر دیتے ہیں، یقیناً اس کا کوئی ضروری فون آرہا تھا۔ ...ورنہ وہ یہاں اس وقت ہم سب کی محبت میں ہی بیٹھا ...تھا۔" حسنات کے یوں ولید کی طرف داری کرنے پر ...انہوں نے کچھ نہ کہا، خاموشی سے کپ ہونٹوں سے ...لگا لیا۔ باقی سب لوگ بھی چائے اور دوسرے ...لوازمات کی طرف متوجہ ہوئے۔ ناصرہ خاتون نے ...آنکھوں میں آئی نمی غیر محسوس انداز سے دوپٹے کے ...کونے سے صاف کرلی۔ روشنی نے لحظہ بھر انہیں غور ...سے دیکھا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔ ولید ...کے چلے جانے سے اسے بھی پورے ماحول میں ایک ...عجیب سی اداسی محسوس ہونے لگی تھی۔

"کیا تم واقعی مجھے دل کی آنکھ سے دیکھتے ہو ...ولید؟" وہ دل ہی دل میں ولید سے مخاطب تھی۔

☆☆☆

جیسے ہی کالج وین گھر کے دروازے پر رکی۔ دونوں لپک کر اس میں سے باہر نکلیں۔ بچپن کی سرحد تو عرصہ ہوا پار کرلی تھی مگر دونوں میں اب بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر مقابلے بازی چلتی رہتی تھی کہ گاڑی سے اتر کر دروازے کی گھنٹی پہلے کون بجائے گا۔ ابو جان کے آواز دینے پر سب سے پہلے کون ان کی خدمت بجالائے گا۔ تایا ابا اچھی چائے کے رسیا تھے۔ ہمیشہ دونوں کو اس بات پر اکساتے کہ جو اچھی چائے بنائے گا انعام کا حقدار وہی ہوگا۔ لہٰذا اب تایا جان کے گھر آنے پر بھی چائے بنانے میں مقابلے بازی ہوتی تھی۔

"میں نے گھنٹی بجادی۔" سویرا دوبارہ گھنٹی بجا کر اب فخر سے روشنی سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں، تم نے تو بجانی ہی تھی۔ فری اسٹائل کاٹن کے سوٹ میں جو ہو۔ میری طرح انارکلی کی گھیر دار فراک تھوڑی پہنے ہوئے ہو اور اوپر سے یہ ڈھائی گز کی چادر...... جو سنبھالے نہیں سنبھل رہی۔" روشنی نے تڑ سے جواب دیا۔

"مانتی ہو ناں کہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔" سویرا کا اشارہ آج کالج کے آڈیٹوریم میں ہونے والے ڈرامے "انارکلی" کی طرف تھا۔ جسے نہ صرف بے حد پذیرائی ملی تھی بلکہ سب نے روشنی کو انارکلی کے گیٹ اپ میں بے حد پسند بھی کیا تھا۔

"واہ...... سارا کریڈٹ اپنے انتخاب کو دے دیا اور میری محنت، وہ کس کھاتے میں ڈالو گی تم؟" روشنی نے لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے۔

"ایسی لڑاکا انارکلی...... میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے توبہ توبہ۔" اس نے باقاعدہ گال پیٹے۔ "اور محترمہ انارکلی صاحبہ، یہ سارا کریڈٹ ولید کو جاتا ہے۔ جس نے تمہارے اندر یہ جادو جگایا۔" سویرا نے مزے سے کہا۔ کبھی کبھار تو اسے موقع ملتا تھا، روشنی کو چڑانے کا۔ ورنہ اکثر یہ فریضہ تو روشنی ہی انجام دیتی تھی۔

”جادو، ہاں جادو تو واقعی اس نے میرے اندر جگایا ہوا ہے۔“ روشنی نے آہستگی سے کہا اور اسی وقت دروازہ کھل گیا مگر سامنے کوئی نظر نہیں آیا...... شاید امی دروازہ کھول کر اندر کچھ کرنے میں مصروف تھیں کہ صحن میں سے ہلکی ہلکی باتوں کی آواز آرہی تھی۔

”تھینک گاڈ...... امی آپ نے دروازہ تو کھولا ورنہ آپ کی انارکلی گرمی سے یہیں زمیں بوس ہوجاتی۔“ روشنی بہ آواز بلند کہتے ہوئے اندر آئی اور سویرا نے اس کی تقلید کی مگر اندر صحن میں قدم رکھتے ہی اس کی زبان کو ایک دم ہی بریک لگ گیا کہ صحن میں ایک اجنبی نوجوان شخص، ابو جان سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے رخصت ہونے کی اجازت چاہ رہا تھا۔ ابو جان کی دن کے تین بجے گھر میں موجودگی پر دونوں حیران تھیں۔ بہ مشکل اپنی حیرت کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے دونوں نے ابو جان کو سلام کیا، انعام صاحب اور اس اجنبی نے ایک ساتھ سلام کا جواب دیا پھر وہ اس اجنبی کو اپنی دونوں بیٹیوں سے متعارف کروانے لگے۔ اجنبی کی نگاہیں سویرا سے ہوتی ہوئی روشنی کے چہرے پر آئیں...... اور ٹھہر سی گئیں۔ خوب صورت سے لباس میں سرتاپا سجی سنوری انارکلی نے لمحوں میں اس کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ نگاہ میں یک بیک ڈھیروں پسندیدگی اتر آئی۔ روشنی نے اجنبی کی محویت پر برا سا منہ بنایا اور اندر کی راہ لی...... سویرا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔

”عجیب شخص تھا...... دیکھے ہی چلا جارہا تھا لگ رہا تھا سالم ہی نگل لے گا۔“ روشنی اپنی جیولری اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخنے کے انداز میں رکھتی جارہی تھی۔

”تم لگ بھی تو اتنی پیاری رہی تھیں۔“ سویرا نے اسے چھیڑا۔

”بکواس نہ کرو......“ وہ سویرا کو گھورتی ہوئی اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم کی سمت چل دی جبکہ سویرا ہنستی رہی......

”واقعی لگ رہا تھا کہ وہ انارکلی کو سالم ہی نگل لے گا۔“ سویرا نے دل میں سوچا۔

☆☆☆

”امی جان...... کیا ابو جان کھانا نہیں کھا... گے؟“ دونوں جب کپڑے تبدیل کر کے ڈا... ٹیبل پر آئیں تو باپ کو موجود نہ پایا۔

”میں بلا کر لاتی ہوں......“ روشنی پانی کی ... اور گلاس ٹیبل پر رکھ کر انہیں بلانے جانے لگی۔

”روشنی...... انہیں آرام کرنے دو، طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ زہرا بیگم نے چاول کی ڈش ... ٹیبل پر رکھی۔

”میں ابو جی سے مل کر آتی ہوں۔“ روشنی ... کہا۔ ”کیا ہوا ہے انہیں؟“

”اور میں بھی۔“ سویرا جو کرسی پر بیٹھ چکی تھی کھڑی ہوگئی۔

”روشنی، سویرا، دونوں بیٹھ جاؤ، تمہارے ... جی نے کہہ دیا تھا کہ جب تک دونوں کھانا نہ کھا... میرے پاس نہ آنے دینا......“ امی نے دونوں ... تنبیہہ کی۔ دونوں کو بیٹھتے ہی بنی...... پھر جلدی ... کھانا کھا کر دونوں نے برتن سمیٹے اور باپ ... کمرے کی طرف دوڑ لگادی۔ کمرے میں جھانک ... دیکھا تو وہ کتاب کی ورق گردانی کررہے ... دونوں اجازت لے کر اندر آگئیں۔

”آج آپ گھر جلدی کیسے آگئے؟ امی بتارہی ... کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ سویرا باپ ... بالکل قریب جا کر بیٹھ گئی۔ روشنی نے بھی اس کی تقلید ...

”آپ کا تو ماتھا گرم ہورہا ہے، دوا لی آپ ...“ روشنی نے باپ کا ماتھا چیک کیا جو قدرے گرم تھا۔

”اور یہ شخص کون تھا ابو جی؟ آج سے پہلے آپ کسی کو یوں گھر نہیں لائے۔“ سویرا نے ... سوال جڑ دیا۔

”ارے بھئی چھری تلے دم تو لو تم لوگ ...

...ب بتاتا ہوں۔“ انعام صاحب نے دونوں کا ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کیا۔ وہ جانتے تھے کہ دونوں ان سے کتنی محبت کرتی ہیں۔

”آج طبیعت کچھ ناساز محسوس ہورہی تھی صبح سے...... ہلکی ہلکی سردی سی لگ رہی تھی۔ آفس سے جلد ہی اٹھ گیا۔ ڈاکٹر فیض کے کلینک گیا تو انہوں نے کہا کہ بخار ہے...... میڈیسن دیں اور کچھ دیر وہیں ریسٹ کرنے کا کہا۔ اتفاقاً وہیں عازم سے ملاقات ہوگئی۔ وہ جسے تم لوگ اجنبی کہہ رہی ہو، فیض کا بھانجا ہے اور میرے اور تمہارے تایا ابو کے جگری دوست پروفیسر حسن انصاری کا بیٹا ہے جو ڈھاکا یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ کافی عرصے بعد عازم سے ملاقات ہوئی تھی۔ بتارہا تھا کہ مستقلاً کراچی شفٹ ہوگیا ہے، ماشاءاللہ سے اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کررہا ہے۔“ عازم سے ملاقات کی خوشی ان کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

”اور پروفیسر انکل...... اب وہ کہاں ہوتے ہیں؟ آپ نے بتایا کہ وہ ڈھاکا یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔“ سویرا بولی۔

”تھے سے کیا مطلب ابو جی؟“ روشنی کی سوئی تھے پر اٹک گئی تھی۔

”اس لیے بیٹا جی کے چار سال پہلے اس کا انتقال ہوگیا...... کیا ہی خوب دوست تھا اور کیسا پیارا انسان۔“ ان کے لہجے میں چھلکنے والی خوشی، دوست کی یاد آنے پر مدھم پڑ گئی تھی۔

”ابو جی...... آپ بھی تو کافی عرصے پہلے ڈھاکا گئے تھے ناں...... کوئی نمائش وغیرہ تھی شاید......“ سویرا کو...... اپنے بچپن کی بات یاد آئی۔

”ہاں بیٹا...... جب تم دونوں آٹھ سال کی تھیں تب گیا تھا۔ ڈھاکا میں تجارتی نمائش لگی تھی۔ تب میں انصاری کے گھر پر ٹھہرا تھا۔ اس کی پوری فیملی تو کافی عرصہ پہلے لاہور آچکی تھی مگر وہ ساری زندگی پاکستان نہ آسکا۔“

”کیوں ابو جی...... انصاری انکل کیوں پاکستان نہ آسکے؟ بنگلہ دیش، پاکستان سے اتنا دور تو نہیں تھا۔“ روشنی کو حیرت تھی۔

”بیٹا...... وہ اپنے آپ سے کیے گئے عہد کا پابند تھا۔“ انعام اللہ نے ایک گہری سانس لی۔

”کیسا عہد ابو جی؟“ سویرا نے باپ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور وہ دونوں کی صورت دیکھنے لگے۔ ایک سی شکل...... پریوں جیسی پیاری، اگر دونوں میں سے کسی ایک کو بھی ان سے جدا کردیا جائے تو ان کی جان پر بن آئے۔ پاکستان بھی تو ایسا ہی تھا۔ ان کے پیاروں کا خواب...... جسے اقتدار اور کرسی کے کھیل میں ملوث لوگوں نے دولخت کردیا۔ پھر پیچھے مڑ کر کسی نے دیکھا ہی نہیں کہ مشرقی پاکستان جو بنگلہ دیش بن گیا۔ اس میں کتنے ہی محب وطن پاکستانی...... مغربی پاکستان آنے کے لیے تڑپتے رہ گئے۔

”ابو جی...... بتائیں ناں...... کون سا عہد تھا۔ جس کے وہ پابند تھے؟“ روشنی نے ہلکے سے باپ کا بازو ہلایا تو وہ چونک کر ماضی سے حال میں لوٹ آئے۔

”بیٹا...... دراصل برسوں پہلے ”منتقلی محصورین پاکستان“ کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ جس کا مقصد ان پاکستانیوں کو جو ابھی تک، بنگلہ دیش میں تھے اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے پاکستان نہیں آسکے تھے ان کو پاکستان لانا مقصود تھا۔ انصاری بھی اس کمیٹی کا بے لوث ممبر تھا اور اس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک ایک بھی پاکستانی، بنگلہ دیش میں محصور ہے وہ سرزمین پاکستان پر قدم نہیں رکھے گا۔ جن دنوں میں نمائش کے لیے وہاں گیا تھا وہاں سیکڑوں کچی جھگیاں، چونتیس سال سے آباد تھیں، گندگی کے انبار، ننگ دھڑنگ بچے، لاغر عورتیں اور بوڑھے مگر آنکھوں میں اِک آس اور جھگیوں کے مرکزی ستون

کے ساتھ لہراتا پاکستان کا سبز ہلالی پرچم سب کا مشترکہ اثاثہ تھا۔ ان جھگیوں میں وہ لوگ آباد تھے جنہیں مکتی باہنی نے ان کی املاک سے بے دخل کردیا تھا۔ جنہیں عیسائی مشینری کئی بار عیسائی بنانے کی کوششیں کرچکی تھی اور جنہیں خود بنگلہ حکومت، شہریت دینے کی خواہاں تھی مگر ان کی صرف ایک ہی آرزو تھی کہ انہیں کسی طرح پاکستان پہنچادیا جائے۔ انصاری اور اس جیسے کئی سرپھرے ان کے حق کے لیے آواز اٹھاتے اٹھاتے اس دنیا سے رخصت ہوگئے...... اس سال کے بعد برسوں گزر گئے۔ میں پھر کبھی ڈھاکا نہ گیا مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں ان بے وطن پاکستانیوں کی بدحالی دیکھتا۔'' انعام اللہ کے لہجے میں گئے دنوں کا بہت گہرا املال تھا۔ عازم حسن سے مل کر گویا سارے زخموں پر سے پھر سے کھرنڈ اتر گیا تھا۔

روشنی اور سویرا دونوں اپنی اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی تھیں...... یہ کیسی حقیقت تھی جو بظاہر داستان لگتی تھی۔ کوئی یوں بھی اپنے وطن سے محبت کرتا ہے اور کوئی یوں بھی وعدہ نبھاتا ہے۔

''کیا ہم ان میں سے ہیں......؟'' دونوں نے ایک ساعت کے لیے ایک دوسرے کی طرف نگاہ کی اور پھر پلکیں جھکالیں۔ کتنے آنسو، دونوں کی آنکھوں سے گرتے چلے گئے۔

''میرے آباؤ اجداد نے حرمت آدمی کے لیے
تاابد روشنی کے لیے...... کلمۂ حق کہا
مقتلوں، قید خانوں، صلیبوں میں بہتا لہو
ان کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ لہو، حرمت آدمی کی ضمانت بنا
تاابد روشنی کی علامت بنا......
اور میں پابرہنہ سرکوچۂ احتیاج
رزق کی مصلحتوں کا اسیر آدمی...... سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے ان کا لہو ہے تو پھر
یہ لہو بولتا کیوں نہیں......''

☆☆☆

''واہ...... تائی امی، چنے کی دال کے حلوے کی خوشبو تو بہت زبردست آرہی ہے...... مگر نہ عید ہے نہ شب برات...... پھر؟'' روشنی نے کچن میں آکر زور سے خوشبو سانس کے ذریعے اندر کھینچی۔

''چکھ کر بتاؤ...... کیسا بنا ہے؟'' انہوں نے حلوے میں کٹے ہوئے پستے بادام...... شامل کیے اور آخری بار چمچ چلایا۔

''زبردست......'' روشنی نے تھوڑا سا اٹھا کر منہ میں ڈالا اور بے ساختہ اس کے منہ سے داد نکلی۔

''یقیناً حسنات بھائی کے لیے بنا رہی ہوں گی؟'' روشنی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ مسکرادیں۔

''ہاں...... اس کے لیے بھی اور ولید کے لیے بھی...... میرے جب دونوں بچے میرے پاس ہوں تو ہر دن میرے لیے عید اور شب برات جیسا ہوتا ہے۔'' ان کے لہجے میں ممتا کی آنچ تھی۔ یہ کہتے ہوئے پتیلے میں سے حلوا گھی سے چپڑی تھالیوں میں نکالنا شروع کردیا اور تیزی سے دائیں ہاتھ کی نم ہتھیلی سے تھالی میں حلوے کی سطح یکساں کرنے لگیں۔

''حسنات تو اب کی بار آیا ہے تو بہت ہی دبلا ہوگیا ہے اور رنگ بھی جل گیا ہے۔''

''ایک کام کریں تائی اماں...... ان کی شادی کردیں۔ بیوی ساتھ رہے گی تو آپ کی فکر کچھ کم ہوجائے گی۔'' روشنی نے ایک چمچ بھر کر حلوا منہ میں ڈالا۔ حلوے میں سے اصلی گھی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

''ہوں...... سوچتی ہوں، اس دفعہ تو انعام بھائی سے ان کی چہچہاتی چڑیا مانگ ہی لوں تاکہ وہ میرے گھر کی خاموشی میں بھی رنگ بھردے۔'' وہ ابھی پیٹھ موڑے ہوئے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

''واؤ...... آپ ہمارے گھر آئیں گی...... کیپٹن

حسنات کا رشتہ سویرا کے لیے لے کر...... سچ تائی امی، یو آر گریٹ سو گریٹ......!'' اس نے خوشی کے مارے پیچھے سے بانہیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔

''سویرا کے لیے کیوں؟'' وہ یکلخت پلٹیں...... ''میں تمہارے لیے رشتہ لے کر آؤں گی۔ مجھے اپنے گھر میں تمہاری ہنستی مسکراتی چہکار چاہیے۔'' روشنی کے ہاتھ کی گرفت ان پر ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹی۔

''یہ...... کیسے ممکن ہے؟ نہیں تائی امی...... آپ ایسا سوچیے گا بھی نہیں۔''

''کیوں...... کیا تم میرے گھر کی رونق نہیں بننا چاہتیں؟'' وہ اس کی قطعی بات سن کر دل گرفتہ سی ہوگئی تھیں۔

''ایسی بات نہیں ہے تائی امی...... مگر کیپٹن حسنات...... ان کے لیے تو سویرا ہی ٹھیک ہے، وہ انہیں پسند کرتی ہے تائی امی...... اور کیپٹن حسنات بھی اسے پسند کرتے ہیں۔'' وہ اپنی بہن کے جذبات سے آگاہ تھی۔ کیپٹن حسنات، سویرا کے متعلق کیا سوچتے تھے' وہ نہیں جانتی تھی مگر اس نے انہیں بھی شامل کرلیا تھا، اس کی نظر میں بہن کے لیے سات خون بھی معاف تھے۔

''اور تم روشنی...... کیا تم حسنات کو پسند نہیں کرتیں؟'' تائی کی سوئی روشنی پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔ کم گو سی سویرا کی نسبت انہیں شوخ وچنچل روشنی زیادہ پسند تھی اور وہ ان کا خیال بھی بہت رکھتی تھی۔

''تائی امی...... کیا آپ کا صرف ایک ہی بیٹا ہے؟'' اس نے آہستگی سے یہ بات کہتے ہوئے نظریں جھکالیں۔ نہ جانے کیسے اس کے لبوں سے یہ بات پھسلی تھی۔

''تم...... تم میرے ولید سے شادی کروگی روشنی......؟'' کچھ لمحوں تک تو انہیں روشنی کی بات سمجھ نہیں آئی اور جب سمجھ آئی تو انہوں نے اسے جھپٹ کر زور سے گلے لگالیا۔

''میں صدقے، میں واری...... میری بچی۔'' ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ روشنی کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

''حسنات بھائی...... آپ کو سویرا کیسی لگتی ہے؟''

''حد کرتی ہو روشنی تم بھی...... یہ بات پوچھنے کے لیے تم مجھے یہاں لان میں لائی ہو، عازم کیا سوچ رہا ہوگا؟'' حسنات نے اسے گھرکا۔

''عازم حسن کیا سوچ رہا ہوگا...... اس بات کو چھوڑیں، ان موصوف کو کمپنی دینے کے لیے میرے ابا حضور اور آپ کے ابا حضور دونوں موجود ہیں۔ آپ مجھے بس یہ بتائیں کہ آپ کو سویرا کیسی لگتی ہے؟'' روشنی، حسنات کے گھرکنے کو ہرگز بھی خاطر میں نہ لائی۔

عازم حسن، انعام اللہ سے ملنے آیا تو انہوں نے اسے رات کے کھانے کے لیے روک لیا اور پھر بڑے بھائی اور حسنات کو بھی ادھر ہی بلالیا تین گھنٹے سے ان چاروں کی محفل جمی تھی۔ اب کہیں جاکر کھانے کے بعد روشنی کو یہ موقع ملا تھا کہ وہ حسنات سے اپنے مطلب کی بات پوچھ سکے جبکہ سویرا سب کے لیے سبز چائے بنانے لگی تھی۔

''مادام! میں فوجی آدمی ہوں، لازمی بات ہے کہ صبح خیز ہوں، تو مجھے تو سویرا بہت اچھا لگتا ہے۔''

''اپنا دماغ ذرا وسیع کریں۔ میں وہ صبح والے سویرے کی نہیں، اپنی بہن سویرا کی بات کررہی ہوں۔'' روشنی نے انہیں گھورا۔

''اوہو...... اچھا، اچھا، ہاں...... بس ٹھیک ہے۔'' حسنات نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے بے پروائی ظاہر کی۔

''شادی کرنے کے لیے کیسی رہے گی؟''

روشنی نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

''معلوم نہیں...... کروں گا تو پتا چلے گا۔'' وہ بھی اسی کے انداز میں گویا ہوئے۔

''یعنی کہ...... آپ راضی ہیں سویرا سے شادی کرنے کے لیے؟ سچ میں حسنات بھائی، آپ بہت فائدے میں رہیں گے۔ ایک تو وہ بہت اچھی کک ہے، آپ کو مزے مزے کے کھانے بنا کر کھلائے گی...... پہاڑوں پہ رہ رہ کر یہ جو آپ آم کی گٹھلی کا روپ دھار گئے ہیں۔ یقین جانئیں وہ آپ کو پھر سے آم بنا دے گی اور دوسرے یہ کہ وہ کم گو سی ہے، آپ سے کبھی گلے شکوے نہیں کرے گی۔ جو بات کبھی کہنی سننی ہو گی، وہ اپنی ڈائری سے کرے گی۔ آپ کی تو زندگی بہت چین میں گزرے گی۔ مان جائیں فی زمانہ ایسی لڑکی ملنا مشکل ہے۔'' روشنی، سویرا کی گوناگوں خوبیوں پر روشنی ڈال رہی تھی۔

''آہم...... میں آم کی گٹھلی جیسا لگتا ہوں؟'' حسنات نے روشنی کو گھورا۔

''اوہو...... حسنات بھائی، منہ سے نکل گیا...... یہ بھی تو دیکھیں پھر میں نے آپ کو آم بھی تو کہا...... اور آم کیا ہوتا ہے؟ سارے پھلوں کا بادشاہ......'' وہ خوشامد سے ان کا بازو سہلانے لگی۔ ''اور ویسے بھی، یہ تو سب ثانوی باتیں ہیں...... اصل مسئلے کی طرف آئیں ناں...... سویرا...... یو نو، سویرا؟'' اس نے سویرا پر زور دیا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے مگر ایک بات ہے مجھے اس کی ڈائری سے جیلسی ہو جائے گی۔'' حسنات نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''وہ کیوں......؟'' روشنی حیران ہوئی۔

''بھئی، شادی کے بعد بھی وہ اپنی ڈائری کے لاڈ اٹھائے گی، سینے سے لگائے گی تکیہ کے نیچے رکھ کر سوئے گی، ہاتھ میں لے کر لکھا کرے گی...... تو بحیثیت شوہر، ڈائری سے جیلس ہونا تو میرا حق بنتا ہے ناں۔'' حسنات نے توجیہہ پیش کی۔ انہیں بھی اس گفتگو میں مزہ آ رہا تھا۔

''یعنی آپ اس کے شوہر بننے کے لیے تیار ہیں؟'' روشنی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی شادی کا بھنگڑا ڈالنا شروع کر دے۔

''سو فیصد...... اگر یہ ڈائری رقیب نہ بنے تو......'' حسنات نے شرط رکھی۔

''بس تو پھر آپ بے فکر رہیں، شادی کے بعد آپ کو اس کی ڈائری سے بھی محبت ہو جائے گی۔'' روشنی نے مان سے کہا۔

''وہ کیسے......؟''

''اس کی ڈائری میں ہے کیا؟ سوائے آپ کی باتوں کے۔'' روشنی نے راز سے پردہ اٹھایا۔ ''پورا حسنات نامہ ہے اس کی ڈائری میں۔''

''کیا......؟'' حسنات بہت زور سے چونکے۔

''جی...... اب میں اندر جا رہی ہوں پر آپ سوچیے گا ضرور......'' روشنی نے ''جی'' پر زور دیا اور اندر کی طرف جانے لگی۔

''بہنا......!'' حسنات نے زور سے آواز لگائی۔ روشنی واپس مڑی۔

''مجھے...... ڈائری اور...... ڈائری والی دونوں بہت عزیز ہیں۔'' حسنات نے منہ پر ہاتھ رکھ کر مائیک کا اسٹائل دیا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر جملہ مکمل کیا۔

''یاہو...... روشنی نے فضا میں خوشی سے ہاتھ لہرایا۔ سویرا نے اندر ڈرائنگ روم میں سبز چائے سرو کرتے ہوئے شیشے کے دروازے کے اس پار دیکھا۔ حسنات اور روشنی ایک ساتھ کھڑے بہت خوش تھے۔ تایا ابو اس کے ہاتھ کی بنی چائے کی تعریف کر رہے تھے۔ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

☆☆☆

روشنی نے جلدی جلدی چائے کپوں میں ڈال کر ٹرے سیٹ کی۔ خوشی اس کے چہرے پر چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ تایا ابو اور تائی امی اس وقت گھر کی بیٹھک میں موجود تھے اور وہ ان کی آمد کا سبب جانتی تھی۔ اسی وقت امی کچن میں داخل ہوئیں۔

''لاؤ، روشنی یہ ٹرے تم مجھے دے دو اور تم جا کر سویرا کو دیکھو، کہاں ہے وہ؟ ہم لوگ خواہ مخواہ ہی بیٹیوں کے نصیب کے لیے پریشان ہوتے ہیں، خدا نے کیسے بیٹھے بٹھائے میری دونوں بچیوں کے لیے ہیرے جیسے بر بھیج دیے۔ شکر ہے اس رب العزت کا۔'' انہوں نے روشنی کی پیشانی چومی۔ وہ شرما سی گئی۔

''میں دیکھتی ہوں جا کر، شاید وہ نہا کر نکل گئی ہو۔'' روشنی نے ماں سے کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر ٹرے لے کر واپس ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ وہ اندر کمرے میں آئی تو سویرا ابھی تک باتھ روم سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جا کر تین بار زور زور سے دستک دی۔

''سویرا...... جلدی نکلو بھئی...... ایک گھنٹے سے گھسی ہوئی ہو۔'' جواباً اندر سے سویرا نے بھی کچھ کہا جو اس نے سننے کی زحمت نہیں کی اور اپنا موبائل اٹھا کر چیک کرنے لگی جس پر دو مسڈ کالز تھیں۔ دونوں مسڈ کالز ولید کی تھی۔ ولید کا نام پڑھ کر بے ارادہ مسکرائے گئی۔

''آہم...... تو موصوف کو بھی خبر ہو گئی۔ تائی امی بھی کوئی بات سرپرائز نہیں رہنے دیتیں۔'' مسکراتے ہوئے وہ ولید کا نمبر ڈائل کرنے لگی مگر ہر بار انگیج کی ٹون سنائی دے رہی تھی۔ اس نے فون واپس رکھ دیا۔ اسی وقت سویرا واش روم سے باہر نکلی، سویرا کو دیکھتے ہی روشنی نے چہرے پر بارہ کا ہندسہ سجا لیا۔

''جاؤ اب نہانے...... آدھے گھنٹے میں کوئی پچیس بار تم نے دروازہ پیٹا ہو گا۔ ویسے تو تمہیں ہفتہ، ہفتہ بھر نہانا یاد نہیں آتا مگر جس دن مجھے کپڑے دھونے ہوتے ہیں اسی دن تم پر بھی ایمر جنسی نافذ ہو جاتی ہے۔'' سویرا نے بالوں کو تولیے کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے روشنی کی اپنے جملوں سے تواضع کی۔

''چلی جاؤں گی......'' روشنی نے ڈھیلے انداز میں جواب دیا اور بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی۔

''اب کیا ہوا؟ شکل پر کیوں بارہ بج رہے ہیں، امی سے ڈانٹ پڑی ہے۔'' وہ روشنی کے برابر میں ٹک گئی۔

''تایا ابو اور تائی امی آئے ہوئے ہیں۔'' روشنی نے اطلاع دی۔ ''امی تمہیں کب سے بلا رہی ہیں۔'' دوسرا جملہ کہہ کر پھر سر جھکا لیا۔

''اوہ...... اسی لیے تم دروازہ بجا رہی تھیں...... آئی ایم سوری...... میں کچھ زیادہ ہی بول گئی...... میں ان دونوں سے مل کر آتی ہوں۔'' سویرا بالوں میں جلدی جلدی برش کرنے لگی۔

''وہ تمہارے لیے کیپٹن حسنات کا رشتہ لائے آئے ہیں۔'' روشنی ابھی تک چہرے پر افسردگی کا تاثر لیے بیٹھی تھی۔ سویرا کے قدم چوکھٹ پر ہی جم گئے۔

''کیا......؟'' وہ تیزی سے پلٹ کر روشنی کی سمت آئی۔ ''تم سچ کہہ رہی ہو، تایا ابو اور تائی امی ان کے لیے میرا رشتہ لائی ہیں؟'' حیرت اور استعجاب بے پایاں خوشی میں بدل گیا تھا۔ خوشی سے اس کا سارا وجود جگمگا اٹھا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ روشنی کو بازو کے گھیرے میں لے کر زور زور سے کئی چکر دے ڈالے مگر اگلے ہی پل اس نے خود کو کمپوزڈ کیا اور روشنی کی شکل دیکھی...... جہاں یہ بات بتاتے بتاتے کوئی خوشی کا تاثر نہیں تھا بلکہ چہرہ اترا ہوا لگ رہا تھا۔

''سوری روشنی...... میں یونہی...... ایکسائیٹڈ ہو گئی...... میں امی سے کہہ دوں گی کہ وہ تائی امی کو منع کر دیں...... میں جانتی ہوں تم انہیں کیپٹن حسنات کیوں کہتی تھیں کیونکہ تم انہیں پسند کرتی ہو۔'' وہ دوبارہ روشنی کے برابر میں بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''اب کیا فائدہ کچھ بھی کہنے کا سویرا۔ تم جانتی تو ہو تایا ابو جو ایک بار کہہ دیتے ہیں پھر اس بات سے پیچھے نہیں ہٹتے ہیں۔'' روشنی نے جھکے سر سے ہی جواب دیا۔

''تم کیوں فکر کرتی ہو، میں ہوں ناں...... میں تمہارے لیے ضرور اسٹینڈ لوں گی۔'' روشنی نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا جس کے چہرے کی جوت لمحوں میں بجھ چکی تھی۔ روشنی نے پہلے مسکرانا شروع کیا اور پھر ہنسنے لگی اور ہنس ہنس کر کمرے کے چکر لگانے لگی۔

''روشنی...... روشنی اسٹاپ اٹ...... خدا کے لیے ایسے بی ہیومت کرو۔'' سویرا کو روشنی کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

''میں ٹھیک ہوں سویرا......!'' وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

''تم ٹھیک نہیں ہو روشنی...... تم اپنے دکھ پر ہنسی کا پردہ ڈال رہی ہو۔'' سویرا کو کیسے یقین آتا۔

''میں واقعی ٹھیک ہوں ڈیئر...... تم کیا سمجھیں، میں کیپٹن حسنات کی محبت میں مبتلا ہوں اور تم میری محبت میں قربانی دینا چاہ رہی تھیں۔'' روشنی نے ہنسی کو کنٹرول کرلیا تھا۔ سویرا نا سمجھی سے اسے سن رہی تھی۔

''تو اس قربانی کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تمہاری راز داں ڈائری نے من و عن تمہارے دل کا حال مجھ سے کہہ ڈالا تھا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ میری کم سن سی بہن کے دل میں محبت کا اتنا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے اور جب یہ راز کھلا تو میں نے تمہیں چڑانے کے لیے حسنات بھائی کو کیپٹن حسنات کہنا شروع کردیا اور صبح شام ان کے نام کی مالا جپنے لگی۔ تم جتنا چڑتی تھیں اتنی ہی تمہارے ہر انداز سے ان کے لیے محبت جھلکتی تھی۔'' روشنی اپنی ساری پچھلی شرارتیں سویرا کے گوش گزار کررہی تھی۔

''اب خوش ہو جاؤ، تمہارے من کی مراد...... پوری ہوگئی ہے۔ تایا ابو اور تائی امی نے تمہیں ان کے کھونٹے سے مستقل طور پر باندھنے کا بندوبست کرلیا ہے۔'' سویرا پہلے تو حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر زور سے روشنی سے لپٹ گئی۔

''مجھے واقعی یقین نہیں آرہا روشنی۔ خواب بھی سچ ہوتے ہیں۔ خواہشیں اس طرح بھی پوری ہوتی ہیں۔''

''میری گم صم انارکلی تمہیں تمہارا شہزادہ سلیم مبارک ہو...... اب جلدی چلو اپنی ہونے والی ساس کی خدمت میں سلام پیش کرآؤ۔'' روشنی نے اس کی ٹھوڑی چھو کر شرارت سے کہا تو سویرا کا چہرہ گل رنگ ہوگیا۔

☆☆☆

''کبھی آپ لوگوں نے ساحلِ سمندر پر موسم سرما کے مہمان پرندوں کو دیکھا ہے۔ جن کے وجود سے پھوٹتے رنگوں کو دیکھ کر کبھی کبھی ایک منجھا ہوا آرٹسٹ بھی دنگ رہ جاتا ہے کہ وہ کون سے بنیادی یا ثانوی رنگ ایک دوسرے میں باہم ملادے کہ قدرت کی طرح کی تخلیق کرسکے۔'' ولید کی آواز، دیواروں میں نصب اسپیکرز کے ذریعے آڈیٹوریم میں گونج رہی تھی...... یہ ایک نجی یوتھ کونسلنگ سروس سینٹر تھا۔ جہاں پندرہ سال سے پچیس سال تک کی عمر کے تقریباً پچاس نوجوان موجود تھے۔ ولید اکثر یہاں اپنے پروفیسر خالد وہاب کی ایما پر آتا تھا۔ پروفیسر خالد کو اپنا یہ ذہین، سمجھدار، حساس اسٹوڈنٹ بہت پسند تھا اور اسی پسندیدگی کی بنا پر وہ کبھی کبھی اس یوتھ سینٹر میں لیکچر بھی دیتا تھا۔ پروفیسر خالد اس یوتھ کی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبر اور ہردلعزیز کونسلنگ ٹیچر تھے۔

''یہ خوب صورت آبی پرندے جیسے ڈکوش آڑی، کونج اور راج ہنس وغیرہ...... موسم سرما کے آغاز سے سائبیریا سے قراقرم اور ہندوکش کے پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے پاکستان کے ساحلی علاقوں میں چلے آتے ہیں۔ نومبر سے جنوری تک کا یہ سفر گویا ان کے لیے ہجرت کی حیثیت رکھتا

ہے۔ ان پرندوں کے پاس کیا ہے؟ ایک محدود دماغ...... اور پرواز کی ایک محدود قوت مگر اس کے باوجود یہ ہجرت کی اہمیت سمجھتے ہیں...... جب موسم اور حالات ان کے لیے ناسازگار ہوتے ہیں تو یہ نقل مکانی کرلیتے ہیں۔''

''مگر ہم جنہیں خدا نے ایک لامحدود شعور دیا ہے...... اور خیال کی ایسی اچھوتی قوت جسے اگر ہم ایک تعمیری نقطے پر مسلسل مرکوز رکھیں تو خواب حقیقت بن جائیں...... ہم ہجرت کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ ہجرت صرف جسمانی نہیں ہوتی...... ذہنی وجود کو بھی ہجرت کی ضرورت ہوتی ہے...... مگر آج کی نوجوان نسل اس احساس سے نابلد ہے۔ وہ خاندانی، معاشرتی اور معاشی رویوں اور دباؤ سے گھبرا کر فرار کے راستے ڈھونڈتی ہے۔ نشے میں فرار، خودکشی کے ذریعے فرار، گھر سے فرار، وطن سے فرار......''

''مگر سر یہ کیسے ممکن ہے کہ صرف ذہنی نقل مکانی سے ہمارے مسائل کا حل نکل آئے؟ ہمارے بڑوں کا اکثر ہم پر پریشر ہوتا ہے...... آپ کو ڈاکٹر بننا ہے یا انجینئر بننا ہے یا کارپوریٹ کلچر کا حصہ بننا ہے۔ ہم تم پر اتنا پیسہ لگا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ...... پھر ہمیں ٹائم لمٹ دے دی جاتی ہے، تم نے دو سال میں خود کو ثابت کرنا ہے یا چار سال میں اپنا ٹارگٹ اچیو کرنا ہے۔'' سعود نے مائیک اپنے آگے کیا اور ولید کے آگے اپنا سوال اٹھایا۔

''سعود آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے بعض اوقات ہمارے بڑوں کا رویہ ہی ہمارے مستقبل کا تعین کررہا ہوتا ہے مگر یہی وہ ٹرننگ پوائنٹ ہوتا ہے جب مجھے اور آپ کو اپنا وژن کلیئر کرنا ہوتا ہے۔ آپ سب یہاں موجود ہیں۔ یہ اس بات کی گہری دلیل ہے کہ آپ صرف دو اور دو سے چار کرنا نہیں سیکھنا چاہتے۔ آپ یہ بھی سیکھنا چاہتے ہیں کہ اس دنیا کو ایک بہترین دنیا کیسے بنائیں۔ سیتھ گوڈن (seth godin) مارکیٹنگ کی دنیا کا ایک بڑا نام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خود کو اتنا حقیر مت سمجھیں کہ آپ کے نزدیک ایک دن کے کام کا مطلب ایک دن کی تنخواہ ہو اور میں بھی آپ سے یہی کہتا ہوں اپنے اندر کے آرٹسٹ کو باہر آنے دیں۔ زندگی کے کینوس کو وسیع کیجیے۔ اپنی ترجیحات کا تعین کیجیے، اپنی سوچوں کو اڑان دیجیے کیونکہ سوچ، خیال کو جنم دیتی ہے، خیال، لفظوں میں ڈھلتے ہیں اور لفظ، عمل کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔'' ولید اپنے مخصوص انداز میں بولتا ہوا پورے ماحول کو اپنی سوچ کا ہم سفر بنا رہا تھا۔

''ہم اس دنیا کو بہترین دنیا کیسے بنا سکتے ہیں سر؟'' انیس سالہ ماریہ نے سوال اٹھایا اور پھر مزید کہا۔ ''ہم پڑھتے اس لیے ہیں کہ اچھی جاب مل سکے، جاب اس لیے کرتے ہیں کہ اسٹیٹس بلند ہو۔''

''ماریہ......! میں جب آپ کی عمر کا تھا تو بہت لاابالی تھا...... میرے والد مجھ سے خفا رہتے تھے۔ وہ مجھے جن اصولوں پر چلانا چاہتے تھے میں ان سے باغی تھا پھر میں نے ایک صبح فجر کے وقت ایک خواب دیکھا۔ میں وہ خواب آپ کو سناتا ہوں۔'' اس نے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی۔

''میں نے دیکھا کہ ایک تاریک کمرا ہے، جس کے ایک کونے میں ایک ٹیبل رکھی ہے...... جس پر ایک لیمپ روشن ہے، اس لیمپ کی روشنی میں میرے سامنے کرسی پر بیٹھی ایک معزز ہستی کا چہرہ روشن ہوتا ہے، وہ میرے اور آپ کے بابائے قوم، قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ میں ان کے سامنے بہت تعظیم سے کھڑا تھا۔ ان کے پیروں تلے شیر کی کھال کا قالین بچھا تھا...... اور میری پشت پر جو دیوار تھی اس پر پاکستان کا نقشہ بنا تھا۔ میری تعظیمی نظریں جناح کیپ سے ہوتی ہوئی ان کے چہرے پر آکر رک گئیں۔ ان کے چہرے پر دکھ اور رنج کی سی کیفیت تھی۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھ سے صرف

ایک جملہ کہا۔

''عارضی فائدے پر کبھی دائمی خوشی کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔'' پھر میری آنکھ کھل گئی۔ مگر یہ ایک جملہ جیسے میرے لیے مشعلِ راہ بن گیا۔ میں جو تیزی اور شتابی کا مارا تھا دو نقطوں کے درمیان سفر کرنے کا عادی...... جیسے کمان سے نکلا تیر...... اچانک دائرے کے سفر میں داخل ہوگیا...... دائرے کا سفر جو کبھی ختم نہیں ہوتا...... جس کے ہر ہر نقطے کا اپنے مرکز سے یکساں فاصلہ ہوتا ہے۔'' اس نے مزید کہا۔

''جب آپ دائرے کے سفر میں داخل ہوجاتے ہیں...... تب آپ کے اردگرد بسنے والے آپ کے برابر آکھڑے ہوتے ہیں...... ذات، پات، رنگ، نسل سب پیچھے رہ جاتا ہے...... پھر آپ کا وقت اور آپ کی زندگی صرف آپ کی اپنی نہیں رہتی...... پوری دنیا اس میں سما جاتی ہے اور جو چیز آپ کی ملکیت میں آجائے کیا آپ اسے بہترین نہیں بنانا چاہیں گے؟'' وہ مسکرا کر ماریہ سے سوال پوچھ رہا تھا...... ماریہ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بتا رہی تھی، ولید نے آخر میں مسکرا کر سب کو دیکھا اور علامہ اقبال کا شعر پڑھا۔

''حدیثِ دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ'

☆☆☆

''کتنے روکھے بال ہو رہے ہیں روشنی، اچھے بھلے خوب صورت لمبے بالوں کا تم نے ستیاناس مار رکھا ہے۔ آخری بار کب تیل لگایا تھا تم نے؟'' امی روشنی کو پکڑے بیٹھی تھیں اور اب اس کے سر میں تیل لگا رہی تھیں۔

''آخری بار...... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ ہی نے تیل لگایا تھا اور وہ بھی دو ہفتے پہلے۔'' روشنی آنکھیں بند کیے ایک کان میں ہیڈ فون لگائے عابدہ پروین کا گایا صوفیانہ کلام ''جی چاہے تو شیشہ بن جا، جی چاہے پیمانہ بن جا۔'' پر سر دھن رہی تھی، دوسرے کان سے ماں کی باتیں سنتے ہوئے جواب بھی دے رہی تھی۔

''خود بھی کبھی اپنے بالوں پر توجہ دے لیا کرو، سسرال جاؤ گی تو کیا ساس سے اپنے سر کی مالش کروایا کرو گی؟'' امی نے گھر کا۔

''کیا مضائقہ ہے امی؟ اگر ساس بھی یہ کام کردے، آخر وہ بھی تو ماں کی جگہ ہوتی ہے۔'' روشنی نے شرارت سے کہا۔

''شاباش بیٹا! اپنی ساس سے یہ کام کرواؤ گی، دو دن میں چوٹی پکڑ کر باہر کردے گی۔''

''کیوں امی، تائی امی تو ایسی نہیں ہیں۔'' روشنی نے گردن موڑ کر ماں سے استفسار کیا۔

''ہاں، تمہاری تائی تو بھلی مانس عورت ہیں اور مجھے سویرا کی طرف سے کوئی فکر بھی نہیں کیونکہ اس سے وہاں محبت کرنے والے ہوں گے۔ اصل میں تو مجھے تمہاری فکر لگی رہے گی کہ جانے عازم حسن کے گھر والے تمہارے ساتھ کیسے رہیں گے...... تم تو ابھی کم سن اور نادان ہو، سسرال اور سسرالی رشتوں کو ڈھنگ سے برت پاؤ گی؟'' امی اپنے ہی دھیان میں گم اس سے اپنی فکر شیئر کر رہی تھیں مگر روشنی کے ہاتھ کی انگلیاں جو تھوڑی دیر قبل اپنے ہی گھٹنوں پر تھرک رہی تھیں۔ وہیں ساکت ہوگئیں...... اس نے ایک جھٹکے سے ماں کے ہاتھ اپنے سر سے ہٹائے اور ان کی طرف پوری کی پوری گھوم گئی۔

''آپ نے کیا کہا ابھی امی، عازم کے گھر والے...... وہ کہاں سے اس ساری گفتگو میں آگئے اور میرا ان سے کیا تعلق......؟''

''اس لیے کہ تم عازم کو بہت پسند آئی تھیں، اپنے گھر والوں کو بھی ایک بار لا چکا ہے جب تم اپنی دوست سعیہ کی برتھ ڈے پارٹی میں گئی ہوئی تھیں۔ مجھے اور تمہارے ابو جی کو تو عازم بہت پسند آیا،

تمہارے تایا بھی اس کی بہت تعریف کر رہے تھے کہ کافی سلجھا ہوا اور سمجھدار لڑکا ہے۔''

روشنی کی شکل دھواں دھواں ہو رہی تھی۔ اسے لگا اسے سننے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

''آپ یہ سب کیا کہہ رہی ہیں امی...... عازم اور میں ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ میں تو......'' وہ کہتے کہتے رک گئی...... ''تائی نے تو کہا تھا کہ......'' اس کے منہ سے بے ربط جملے ادا ہو رہے تھے۔

''کیا کہا تھا بھابی نے......'' امی روشنی کی شکل دیکھنے لگیں مگر روشنی فوراً اپنی جگہ چھوڑ کر تائی کے پورشن کی طرف بھاگی...... ہیڈ فون نیچے پڑا رہ گیا...... تیل لگے بال شانوں پر بکھرے تھے اور دوپٹا ایک طرف جھول رہا تھا مگر اسے بس اپنے سوال کا جواب پانے کی دھن تھی۔

''روشنی...... روشنی ٹھہرو مجھ سے بات کرو۔ سویرا...... سویرا ادھر آؤ دیکھو اس لڑکی کو جاکر سر جھاڑ منہ پھاڑ بھابی کے پاس بھاگی ہے۔ خدا جانے کیا سن لیا اس نے؟'' امی پہلے روشنی کو آواز دیتی رہیں مگر وہ تو جاچکی تھی پھر سویرا کو آواز دینے لگیں۔

زہرا بیگم نے نیچے فرش پر پڑے روشنی کے موبائل اور ہیڈ فون کو اپنے دوپٹے سے پکڑ کر کرسی پر رکھا پھر تیل کی بوتل بند کی۔

''عجیب لڑکی ہے۔ موبائل بھی نیچے ہی چھوڑ کر چلی گئی۔ ابھی میرے پیر کے نیچے آجاتا تو اسکرین ہی ٹوٹ جاتی۔'' بڑبڑاتے ہوئے وہ تیل میں بھرے ہوئے ہاتھ دھونے واش روم چل دیں۔

☆☆☆

وہ بھاگتی ہوئی تائی امی کے پورشن میں آئی تھی۔ اس وقت یا تو وہ اپنے چھوٹے لان میں ہوتی تھیں جہاں انہوں نے سیزن کی ہر سبزی اگائی ہوئی تھی یا پھر کچن میں مگر آج وہ دونوں جگہیں ان کے وجود سے خالی تھیں۔ وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کے اور تایا ابو کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیے اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں۔ دروازے کی طرف سے ان کی پشت تھی۔ وہ جانتی تھی تائی امی کو نہ تو دیر تک سونا پسند تھا اور نہ بے وقت سونا مگر آج اسے سب کچھ غیر معمولی لگ رہا تھا۔

''تائی امی۔'' اس نے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر انہیں پکارا۔ ان میں کوئی جنبش نہ ہوئی وہ تیزی سے چلتی ہوئی دیوار کی طرف آگئی۔

''تائی امی'' اس کی آواز میں نمی تھی اور پلکیں آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں ہلکان تھیں۔ تائی امی نے آنکھیں کھولیں۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ ان کے سرہانے نیچے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

''تائی امی...... آپ نے تو کہا تھا سویرا حسنات بھائی کے لیے ہے اور ولید کے لیے آپ میرا ہاتھ......'' بس یہیں تک اس کا ضبط تھا۔ اس کی پلکیں آنسوؤں کی روانی کے آگے باڑھ باندھنے سے قاصر تھیں۔ آنسو اس کے گالوں پر پھسلتے چلے گئے۔

وہ تو جانے کب سے ولید کی چاہت میں مبتلا تھی۔ اسے تاریخ یاد تھی نہ سال۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا کہ خدا نے اس کے دل میں ولید کی چاہت کے لیے ہی اس زمین پر اتارا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی نازک سی گولڈ رنگ پچھلے سال ولید کی طرف سے دیا گیا سب سے منفرد تحفہ تھا اور وہ پہلا موقع تھا جب دونوں نے اپنے دلی جذبات کو الفاظ کی صورت میں ڈھالا تھا۔

''روبرو پا کر اسے وقت کی دھڑکن تھم گئی
اب کیا نکالیں گوشوارہ ماہ کیا اور سال کیا
نقش ہے تصویر جب سے دل پر حُسنِ یار کی
رہتا ہوں اکثر محوِ شوق مرا خواب کیا، خیال کیا

ولید نے پُر شوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اشعار پڑھے تھے۔ یہ خود اس کی ذاتی کاوش تھی۔

''یہ اشعار آپ نے میری شان میں کہے

ہیں؟'' وہ مسکرائی تھی۔

''یہ اشعار ہیں یا نہیں، مجھے نہیں معلوم کیونکہ وزن کی کمی بیشی اس میں ہوسکتی ہے مگر یہ میرے دل کی آواز ضرور ہے۔''

''تمہارا دل بھی اتنا رومینٹک ہوسکتا ہے؟'' روشنی نے شرارت سے پوچھا تھا۔

''اکثر لوگوں کو میرے بارے میں شدید غلط فہمی ہے۔ اگر تم بھی مجھے نارمل لوگوں کی صف سے باہر لا کھڑا کرو تو کیا مضائقہ ہے۔'' وہ اتنا ہی پرسکون تھا۔

''نہیں ولید، مجھے تمہارے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میرے دل نے جیسا تمہیں سمجھا ہے تم ویسے ہی ہو۔''

''مانگا تھا...... بہت شوق سے ان کے آگے دست سوال دراز کیا تھا مگر میں یہ بھول گئی تھی کہ جب باپ ہی بیٹے کے وجود سے متنفر ہیں تو بھلا چچا کیونکر اپنی بیٹی کا نصیب اس کے ساتھ باندھیں گے۔'' تائی امی کی آواز نے اسے، اس کی زندگی کے سب سے خوب صورت لمحوں سے نکال کر واپس حقیقت کی دنیا میں لا پٹخا تھا۔

''انعام بھائی نے مجھ سے کہا کہ بھابی، ولید مجھے عزیز ہے کہ وہ میرے بھائی کا بیٹا ہے مگر بحیثیت داماد میں اس کے ساتھ اپنی بیٹی کے مستقبل کو بہت اچھا نہیں دیکھتا۔ آپ کو پتا ہے کہ وہ جس اخبار کے دفتر سے وابستہ تھا وہاں سے بھی اس نے صحافت کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ حال ہی میں وہ کسی گانے بجانے والے گروپ کے ساتھ پڑوسی ملک کا چکر لگا کر آیا ہے۔ آج کل جس طرح کے حالات ہیں کسی پر بھی بہت آسانی سے دہشت گرد کا لیبل لگ سکتا ہے۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ کسی تنظیم کے ساتھ بھی اس کے تعلقات ہیں۔ معاف کیجیے گا ایسی بے یقینی کی کیفیت میں، میں اپنی بیٹی کو کنویں میں نہیں دھکیل سکتا۔'' تائی امی، من وعن انعام صاحب کی باتیں کہتی چلی گئیں جیسے کوئی چابی کی گڑیا میں چابی بھر دے اور وہ چل پڑے مگر وہ تو چابی کی گڑیا نہیں تھی۔

''مجھے معاف کر دو روشنی۔ شاید مجھے تم سے یہ بات کہنی ہی نہیں چاہیے تھی۔'' تائی امی اس سے معافی مانگ رہی تھیں مگر روشنی وہ ایسا کیا کرتی کہ ماضی کے ان لمحوں سے رہائی مل جاتی جب وہ ولید کی محبت کے حصار میں آئی تھی۔ اس نے تائی کے بندھے ہاتھ کھول دیے اور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ اس کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔ اوپر صرف ایک کمرا تھا اور باقی کا سارا صحن کھلا تھا اور وہ کمرا ولید کا تھا۔ وہ کچھ وقت اس کے کمرے میں گزارنا چاہتی تھی۔ وہ جس کیفیت میں تھی اس نے دیکھا ہی نہیں کہ سویرا نے اس کی اور تائی کی گفتگو سن لی ہے۔ سویرا خود حیرانی کے جھٹکے سے دوچار تھی۔ اس کی ہنسوڑ، شرارتی اور باتونی سی بہن اتنی گہری اور حساس... نہ جانے کس احساس کے تحت وہ بھی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

روشنی تو ولید کے کمرے میں کچھ وقت گزارنے آئی تھی مگر داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئی۔ ولید آنکھوں پر بازو دھرے لیٹا تھا۔

''ولید......'' وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھوں کی کھال کلائی سے کچھ اوپر تک جگہ جگہ سے جھلسی ہوئی تھی۔ وہ اپنی سسکیاں نہ دبا پائی اور ولید کی آنکھ کھل گئی۔

''روشنی تم؟'' وہ اٹھ بیٹھا مگر روشنی روتی رہی۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ ولید گھر آیا ہوا ہے۔ شاید تائی امی کو بھی پتا نہیں چلا تھا وہ تو ہر بار یونہی خاموشی سے آتا کچھ دن اپنے کمرے میں گزارتا اور پھر چلا جاتا اسے نہ کبھی گھر آنے پر حسنات بھائی کی طرح پروٹوکول ملتا تھا اور نہ واپس جانے پر کوئی الوداعی نظر اس کو رخصت کرتی تھی۔

''یہ تمہارے ہاتھ...... یہ کیسے جھلس گئے؟'' اس نے چھونا چاہا مگر ولید نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

''مت چھوؤ، تکلیف ہے ان میں۔''

''مگر یہ کیسے ولید؟'' اس نے اپنی سسکیوں کو دبایا۔

''بس کچھ لوگوں کے خوابوں کو آگ کے شعلوں سے بچانے کی ادنیٰ سی سعی کی تھی مگر پھر بھی سب کچھ خاکستر ہوگیا۔ نہ وہ آنکھیں بچیں نہ ان آنکھوں میں بسنے والے خواب۔''

''تم اس سائٹ ایریا کی فیکٹری کی بات کر رہے ہو؟'' اسے یاد آ رہا تھا۔ یہ وہی دن تھا جب تایا اور تائی امی ان کے گھر پروپوزل لے کر آئے تھے۔ ولید کی دوبار کال آئی تھی مگر وہ اٹینڈ ہی نہیں کر پائی۔ تپش آگ کے شعلوں کی ہو یا عشق کی جلا ہی دیتی ہے۔

''میں یونہی تو تمہیں اپنے من کی راز داں نہیں کہتا...... تم میرے لیے ایسی ہو جیسے جنت کی حور۔ جنت کیا ہوتی ہے روشنی...... میرے نزدیک جنت ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں سکون ہو، خدا کی نعمتیں وافر مقدار میں ہوں اور ایک سچا ساتھی جو آپ کو کمفرٹ زون میں لے جائے۔ جس کے ساتھ بیٹھ کر زمان و مکاں مٹھی میں سما جائیں ... تمہارا ساتھ مجھے جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ میں مبہم سا بھی اشارہ دوں تو تم سمجھ جاتی ہو۔'' وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا تھا اور وہ اس کے قدموں میں جیسے کوئی داسی اپنے مرشد کے قدموں میں آ بیٹھی ہو۔

''ہاں روشنی...... اسی فیکٹری میں۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''یہ ہاتھ تو بہت جھلس گئے ہیں، ڈاکٹر کو دکھایا؟'' وہ اپنے اندر کے اضطراب کو بہ مشکل دبا رہی تھی۔

''روشنی ہم سمجھتے ہیں زندگی بس وہی ہے جو ہم جیتے ہیں۔ خواب بس وہ ہی پورے ہونے چاہئیں جو ہم دیکھتے ہیں۔ خواہشیں سراب نہ بن جائیں اسی

کشمکش میں لگے رہتے ہیں۔ ایک ذرا اپنی ''میں'' سے اوپر آنے کی دیر ہوتی ہے پھر دور تک نظر آتا ہے۔ جو میں نے دیکھا یہ بس تھوڑے تھوڑے سے جھلسے ہوئے ہاتھ اس کا عشرِ عشیر بھی تمہیں نہیں دکھا سکتے۔'' ولید کی آواز میں صدیوں کا کرب تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے رونے لگی۔ کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے۔

''ولید...... ابو جان اور تایا جان نے سویرا اور حسنات کی بات طے کردی ہے مگر میرے لیے...... میرے لیے انہوں نے اچھا کیوں نہیں سوچا ولید...... میں عازم حسن کے لیے نہیں ہوں اور نہ عازم حسن میرے لیے پھر ابو جان نے تائی امی کا سوال رد کیوں کردیا۔ وہ کہتے ہیں تم نے جاب چھوڑ دی ہے، تم کسی تنظیم سے وابستہ ہو اور یہ کہ تم کسی گانے والے گروپ کے ساتھ پڑوسی ملک بھی گئے تھے۔'' روشنی کی آنکھوں میں پھر سے طغیانی امڈ آئی تھی۔

''میں نے تم سے کہا ناں روشنی...... ہم سمجھتے ہیں زندگی بس وہی ہے جو ہم جیتے ہیں۔ خواب بس وہ ہی پورے ہونے چاہئیں جو ہم دیکھتے ہیں...... وہ جو جل کر سیاہ کوئلہ ہوگئے، کیا ان کے خواب نہیں تھے۔ کیا انہیں پتا تھا کہ ان کی جاب کا ایک عام سا دن، ان کا آخری دن ہوگا۔ کوئی بہت اچھی پوسٹ پر ہو، ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا ہو تو کیا اس کے ساتھ رشتہ جوڑنا ہمیں محفوظ کردیتا ہے؟ نہیں...... موت جسے میں نے پچھلے دنوں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا...... ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جو گارنٹی اور سکیورٹی جیسے لفظوں کے آگے کئی سوالیہ نشان ڈال دیتی ہے۔'' وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔

''میرے فعل پر تو میرے والد بزرگوار شبے سے دوچار رہتے ہیں تو انعام چچا کیونکر اپنی بیٹی دے سکتے ہیں؟'' اس نے ایک ساعت کے لیے رک کر روشنی کا چہرہ دیکھا جو لمحوں میں کملا گیا تھا۔

''جانتی ہو، میں نے جاب کیوں چھوڑ دی...... اس لیے کہ میں جس قلم کو لے کر جہاد کرنے نکلا تھا اس سے لکھے پالش شدہ لفظوں سے میرا خرچہ تو نکل آتا تھا مگر جہاد بالقلم کا فرض پورا نہیں ہوتا تھا اور سچ میں ڈوبے کھرے لفظ لکھنا اخبار کی پالیسی کو راس نہیں آتا تھا۔ جہاں تک بات کسی تنظیم سے تعلق کی ہے تو یہ کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے...... یہ تو اسکاؤٹس کی ایک جماعت ہے، سوشل ورک کرتے ہیں ہم...... میرا بس چلے تو سب سے ہاتھ جوڑ کر کہوں کہ خدارا اس پاکستان کو رنگوں، نسلوں، ذاتوں، فرقوں، جماعتوں اور زمینوں میں تقسیم کرنے کی سازش بند کردو۔''

''میں جہاں کھڑا ہوں، وہ پاکستان ہے، میں جس جگہ بیٹھ کر لکھتا ہوں وہ پاکستان ہے، میں جہاں سو جاؤں وہ پاکستان ہے روشنی ہم تو نہیں تھے مگر ہم نے سنا ہے اور پڑھا ہے اس وقت کا حال...... جب بے سروسامانی کا عالم تھا اور لاکھوں مرد و زن لٹے پٹے، پاکستان کی سرحد میں داخل ہو رہے تھے...... روشنی کیا ہم نے یہ وطن اس لیے حاصل کیا تھا کہ اقلیتوں کو تحفظ بھی نہ دے سکیں؟'' وہ خاموش ہوگیا...... جیسے بولتے بولتے تھک گیا ہو، روشنی نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا...... اس کی آنکھوں میں نمی تھی...... وہ فوجی نہیں تھا مگر یوں زندگی گزار رہا تھا گویا محاذ پر ہو، تایا جان اسے باغی کہتے تھے مگر جانے کیوں روشنی کو ہمیشہ اس کی روشن پیشانی پر غازی یا شہید لکھا نظر آتا تھا۔ روشنی نے اپنی نگاہیں پھر سے اس کے پیروں پر جمادیں۔

''میں جس راستے کا مسافر ہوں روشنی...... وہ دو نقطوں کے درمیان کا سفر نہیں ہے، دائرے کا سفر ہے، ایک لامتناہی راستہ...... جس میں منزل اہم نہیں ہوتی...... راستہ بذاتِ خود منزل ہے، تم تھک جاؤ گی...... چچا جان کی بات مان لو، عازم اچھا لڑکا ہے۔'' روشنی نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا ولید اپنی

بات کہہ کر خاموش ہوگیا تھا...... آج سے پہلے اس نے کبھی یوں اپنا آپ نہیں کھولا تھا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو ولید......؟'' وہ جیسے صدمے میں تھی۔

''تم نے راستہ چنا اور میں نے تمہارا نقشِ پا...... تم قدم اٹھاتے گئے...... میں نقش کھوجتی ساتھ چلتی گئی۔ بس اتنا بتادو...... اب کیسے نیا راستہ پاؤں...... بولو......؟'' وہ اسی کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی تھی۔

ولید نے تسلی دینے کے لیے بے اختیار ہی اپنا جھلسا ہوا دایاں ہاتھ آگے کیا...... مگر پھر رک گیا...... اس کے پورے وجود نے ان ہاتھوں کے ذریعے جو تپش گزرے ہوئے دنوں میں جذب کی تھی...... وہ تپش وہ روشنی کو نہیں سونپنا چاہتا تھا...... سو اسے یونہی رونے دیا۔

☆☆☆

تایا اکرام اللہ کے گھر سے، سویرا کے اپنے گھر تک کا فاصلہ صرف ایک دیوار کا تھا...... مگر اسے لگا گویا وہ برسوں کی مسافت طے کرکے آئی ہو۔ یہ محبت نہ تھی...... یہ تو عشق تھا...... مشک کی خوشبو سے لبریز...... مگر روشنی اور ولید نے کبھی اپنی بند مٹھیاں کھولی ہی نہیں تھیں کہ یہ خوشبو پھیلتی۔

''خدایا...... وہ جو دلیلوں سے قائل ہوتے ہیں، انہیں قائل کرنے کے لیے مجھے بہترین لفظ عطا کر۔'' کم گو سی سویرا آج پہلی بار خدا سے اپنے بولنے کے لیے لفظ مانگ رہی تھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک خدا کے حضور یہی دعا مانگتی رہی۔

اس کے دل کو یقین تھا کہ اگر وہ حسنات سے یہ سب کہے گی تو ابو جی اور تایا جان ضرور اس معاملے پر دوبارہ غور کریں گے۔ دعا مانگ کر وہ تیزی سے اپنے بیڈ کی داہنی سائڈ پر آئی جہاں اس کا موبائل رکھا تھا۔ اس نے حسنات کا نمبر ملایا بیل جا رہی تھی۔ وہ حسنات کے فون اٹھانے کی منتظر تھی۔ خدا نے اسے ایک راستہ سجھا ہی دیا تھا۔

☆☆☆

''حسنات...... جانتے بھی ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے تم پر فخر ہے، میں انعام کے سامنے تو کیا خاندان بھر میں اور خاندان کے باہر بھی اگر تمہارا رشتہ لے کر جاؤں تو مجھے یقین ہے تمہیں کوئی نہ نہیں کرسکتا مگر ولید...... اس نے ایسا کیا تیر مارا ہے؟'' وہ اپنی اسٹڈی میں اپنے آگے پیچھے جھولتی کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کے اندر ولید کے لیے استہزا تھا۔

''عازم اور ولید کا کوئی مقابلہ ہی نہیں، باپ کی موت کے بعد نہ تو وہ عدم تحفظ کا شکار ہوا اور نہ ہی کسی بری صحبت میں پڑا ماں اور بہن کو لے کر پاکستان آگیا...... اور اتنی سی عمر میں اس نے اپنے لیڈر کے بزنس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اور ولید...... ہونہہ...... کتنی شرمندگی ہو رہی تھی جب انعام، ناصرہ کو اس کی کارکردگی بتا رہا تھا۔'' غصہ ان کے چہرے سے مترشح تھا۔

''ابا جان...... میں صرف اتنا جانتا ہوں، وہ آپ کا بیٹا ہے اور میرا بھائی ہے، اس کی رگوں میں آپ کا اور اماں جی کا خون ہے، وہ غلط کیسے ہوسکتا ہے، ہم سب میں مونس بھائی کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ وہ اس کی انگلی پکڑ کر اسے چلاتے تھے، ان کے جانے کا سب سے زیادہ اثر اس نے لیا تھا اور ہم میں سے کوئی یہ بات سمجھا ہی نہیں۔'' حسنات کے لہجے میں تاسف تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ مجھ سے اور آپ سے الگ ہوسکتا ہے مگر وہ غلط روش کا شکار ہو...... یہ میں نہیں مان سکتا۔'' حسنات کا لہجہ اٹل تھا۔

''حسنات! زندگی جذباتیت کے سہارے نہیں گزرتی......'' پروفیسر اکرام اللہ کے انداز میں تنبیہ تھی۔

''معاف کیجیے گا ابا جان...... مگر زندگی سمجھوتوں کے سہارے بھی نہیں گزاری جاسکتی...... محبت زندگی کا جزولاینفک ہے۔'' وہ ان کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''کیا مطلب......؟'' انہوں نے غور سے بیٹے کو دیکھا۔

''روشنی اور ولید ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، ایسے میں عازم کے پروپوزل کو روشنی کے لیے قبول کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ میں شاید ولید کی پسندیدگی کو درخورِ اعتنا نہ سمجھوں مگر روشنی...... وہ میری بہن ہے، میں اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں جانتا ہوں وہ عازم کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ اس کی اب تک کی ساری زندگی ان ہی دو گھروں کا طواف کرتے گزری ہے وہ اس گھر کی بیا (چڑیا) ہے وہ کہیں اور اپنا آشیانہ کیونکر بنا سکتی ہے۔'' وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے، ایک ایک لفظ جما جما کر بول رہا تھا۔

''اور انعام......؟'' وہ تذبذب کا شکار تھے۔ ''کیا وہ مان جائے گا؟''

''یہ بات آپ انہیں سمجھائیں گے اور میں بھی کہ خوشیوں کی عمر تھوڑی ہوتی ہے اور زندگی بہت غیر یقینی ہے، مجھے تو خود نہیں معلوم کہ کب دشمن کی کوئی نامعلوم گولی...... مجھے آپ سے دور کردے۔ ایسے میں ہم وہ سب کچھ کیوں نہ کریں...... جو میری، آپ کی اور ہم سب کی خوشیوں کو بڑھادے۔'' وہ اپنی بات ختم کرکے باپ کا چہرہ دیکھ رہا تھا...... انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ حسنات کے ہاتھوں کا دباؤ ان کے گھٹنوں پر مزید بڑھ گیا تھا۔ وہ تشکر کی کیفیت میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب چچا جان بھی مان جائیں گے۔

☆☆☆

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' روشنی نے اٹھلا کر سویرا سے پوچھا۔ سرخ اور سنہرے امتزاج کے عروسی لباس میں جھلمل کرتے وجود کے ساتھ روشنی سویرا کے سامنے کھڑی تھی۔

''میرا آئینہ......'' سویرا مسکرائی۔

''کیا مطلب؟'' روشنی کی خاک سمجھ نہ آیا۔ سویرا اسے کھینچ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے لے آئی۔

''وہ دیکھو۔'' اس نے روشنی کو اپنے ساتھ لگایا اور آئینے میں دیکھنے کا اشارہ کیا...... اور بات سمجھ آتے ہی روشنی مسکرادی۔ وہ واقعی ایک دوسرے کا آئینہ لگ رہی تھیں سرخ، سنہری عروسی لباس میں، سرتاپا ایک جیسی۔ وہ سویرا سے لپٹ گئی۔ اس نے واقعی جڑواں بہن ہونے کا حق ادا کردیا تھا۔

☆☆☆

اس دن ولید کے گھر سے واپسی پر روشنی نے چپ سادھ لی تھی۔ ولید کا کہنا مان کر اس نے احتجاج کا ہر لفظ اپنے اندر ہی اتار لیا تھا۔ بات کیونکر بنی...... دلائل کو ترازو کے کس پلڑے میں تولا گیا۔ سویرا اور حسنات نے دونوں بزرگوں کو کیسے منایا...... وہ ہر بات سے لاعلم تھی۔ جانتی تھی تو فقط اتنا کہ اس کی دعا کو قبولیت کی سند مل گئی تھی۔ منگنی کے چکر میں پڑنے کے بجائے سویرا اور روشنی دونوں کا نکاح حسنات اور ولید سے کیا جارہا تھا کہ یہ حسنات کی خواہش تھی۔ دونوں بولتی، چہکتی چڑیائیں ناصرہ خاتون کے آنگن میں اتر رہی تھیں۔ ان کی خوشی دیدنی تھی، وہ پھرکی کی طرح سارے گھر کا انتظام سنبھالے گھوم رہی تھیں۔ انعام اللہ اور اکرام اللہ کی اپنی تو کوئی بہن نہیں تھی مگر پھوپی زاد بہن، ریحانہ اپنے دو بیٹوں رافع اور شجاع اور بیٹی حنا کے ساتھ ایک رات پہلے سے ہی لاہور سے آگئی تھیں۔ رافع شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی فاطمہ بھی ساتھ آئی تھی۔ رافع اور شجاع حسنات اور ولید کی طرف ہوگئے تھے جبکہ حنا اور فاطمہ نے روشنی اور سویرا کے گھر میں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ روشنی اور سویرا کی ایک ہی خالہ تھیں۔ مدیحہ خالہ، وہ بھی اپنے بیس سالہ بیٹے حذیفہ اور سترہ سالہ بیٹی منال کے ساتھ صبح سے پہنچ چکی تھیں۔ جبکہ ناصرہ خاتون کی دو بہنیں اور ایک ہی بھائی تھا۔ دونوں بہنوں، شاہدہ اور سلطانہ کے بچے چھوٹے تھے جبکہ بھائی حسنین کے دو ہی بیٹے تھے۔ اعصار اور عماد اور دونوں ولید کے ہم عمر تھے۔ صرف نکاح تھا مگر بارات کا سا سماں تھا۔ تمام کزنز نے انعام اللہ کے گھر کے لان کو شادی ہال کی شکل دے دی تھی۔ لڑکے بھنگڑا ڈالتے ہوئے ولید اور حسنات کو اندر لائے تھے۔ رافع کی شادی کے دو سال کے بعد یہ کوئی بڑی تقریب تھی، اس لیے ہر کوئی پرجوش تھا۔ نکاح کے بعد جب سویرا اور روشنی دونوں کو اسٹیج پر لایا گیا تو یہ پہچاننا مشکل تھا کہ سویرا کون ہے اور روشنی کون...... ولید اگر بہت خوبرو اور اسمارٹ لگ رہا تھا تو حسنات بہت پروقار اور ڈیسنٹ...... سب لڑکے ولید اور حسنات دونوں کو اسٹیج پر لے آئے تھے اب ساری چنڈال چوکڑی اسٹیج پر جمع تھی اور سب بزرگ نیچے گھاس پر رکھی کرسیوں پر براجمان پرانے دنوں کی یادیں تازہ کررہے تھے۔

''حسنات بھائی یہ سویرا اور روشنی تو ایک دوسرے کی فوٹو کاپیز بنی ہوئی ہیں، آپ اور ولید کیسے پہچانیں گے؟'' شجاع آگے آیا۔

''ایسے......'' ولید نے کہا اور اطمینان سے جا کر روشنی کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''جی مسز ولید کیسی ہیں آپ؟'' اس نے ہلکا سا جھک کر روشنی سے پوچھا۔ روشنی نے شرما کر سر جھکالیا۔

''واہ......'' سب نے تالیاں بجائیں...... عماد اور حذیفہ تو باقاعدہ سیٹیاں بجانے لگے۔ حسنات بھی مسکراتا ہوا سویرا کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''ویسے ولید بھائی آپ نے پہچانا کیسے...... کہ یہ روشنی ہے؟'' حنا نے اشتیاق سے پوچھا۔ باقی

سب بھی جواب سننے کے لیے بے چین تھے۔

''اس لیے کہ موصوف ہماری روشنی کو دل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں...... غلطی کی گنجائش نہیں......'' حسنات بھائی نے کچھ ایسے مسخرے پن سے کہا کہ سب ہنسنے لگے اور ولید کو داد دینے لگے...... ولید نے مسکراتی آنکھوں سے روشنی کی سمت دیکھا وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''ولید...... فکر نہ کرو، تمہیں اور حسنات دونوں کو تخلیہ ملے گا، تم دونوں جی بھر کر اپنی، اپنی منکوحہ سے باتیں کرسکوگے۔'' فاطمہ بھابی نے ولید کی چوری پکڑلی تھی اور زری کامدار ساڑی کا پلو سنبھالتی وہ اسٹیج پر چڑھ آئیں۔

''آپ مجھے شرمانے پر مجبور نہیں کرسکتیں فاطمہ بھابی...... میں کوئی رافع تھوڑی ہوں، جنہوں نے شادی کے بعد بھی پہلی بار آپ کو ریحانہ پھپو کے... ...پٹے کے پیچھے سے دیکھا تھا۔'' ولید نے مزے سے کہا اور اپنا ایک ہاتھ روشنی کے کندھے پر رکھ دیا...... روشنی نے مزید شرما کر سر جھکالیا...... جبکہ باقی سب کھڑے ہوٹنگ کرتے رہے...... اور رافع بھائی سے تصدیق چاہ رہے تھے کہ کیا واقعی ایسا ہوا تھا۔

''چلیں بھئی...... سب اپنے اپنے جامے میں آجائیں کیونکہ میرے ہاتھ میں کیمرا آگیا ہے۔'' حذیفہ بہت اچھا فوٹو گرافر تھا۔ اس لیے فوٹو سیشن کی ذمے داری اس نے سنبھال لی۔ پہلے دولھا، دلہن کے خوب صورت پوز لیے جاتے رہے پھر گروپ فوٹوز کی باری آئی۔ آخر جب دس بجے کھانا لگا تب یہ سلسلہ رکا۔

''تھینک یو حسنات بھائی اور سویرا...... تھینکس ٹو یو......'' وہ چاروں کھانا کھا رہے تھے جب ولید نے حسنات اور سویرا دونوں کو مخاطب کیا۔ ولید ان دونوں کا بہت ممنون تھا۔ وہ شاید ساری دنیا سے لڑسکتا تھا مگر باپ کے سامنے خود کو اہل ثابت نہیں کرسکتا تھا۔

"کیسی بات کرتا ہے یار...... بھائی ہوں تیرا۔ تیری خوشی سے بڑھ کر مجھے کچھ عزیز نہیں۔" حسنات نے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اور مجھے بھی آپ دونوں بہت عزیز ہیں ولید بھائی......" سویرا نے روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے ولید سے کہا۔ "شکر کرتی ہوں خدا کا کہ اس دن آپ دونوں کی باتیں سن لی تھیں۔ ورنہ میری بہن تو واقعی انارکلی کا روپ دھار لیتی۔" سویرا، ولید سے مخاطب تھی۔

"اور میں...... کتنا عزیز ہوں؟" حسنات نے براہِ راست سویرا پر جملہ پھینکا۔

"حسنات...... پلیز آپ..." سویرا سے شرم کے مارے بات بھی مکمل نہ ہوئی۔ ولید اور روشنی ہنسنے لگے۔

"کہہ دو سویرا...... حسنات بھائی جو سننا چاہ رہے ہیں۔" روشنی نے شرارت سے کہا آج اس کے چہرے پر روشنیوں کا جو عکس تھا اس کے آگے آسمان کے ستارے بھی ماند پڑ رہے تھے۔

"ورنہ میرے حسنات بھائی کا حال بھی ان کے دوست جیسا ہی ہو جائے گا۔ جو بے چارے اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ عید منانے کے لیے آیا تھا مگر نہ اسے چاند ملا تھا نہ روزِ عید......" ولید نے بھی روشنی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ شرم کے مارے سویرا سے کچھ نہ کہا گیا...... وہ شرماتی رہی اور کیپٹن حسنات مسکراتے رہے۔

☆☆☆

ساری اولڈ جنریشن اندر جا چکی تھی مگر نوجوان پارٹی لان میں جمع تھی۔ رات بھیگتی رہی...... باتیں چلتی رہیں...... موسم میں خنکی بڑھتی رہی۔ کافی اور چائے سے ماحول گرم ہوتا رہا...... روشنی اور سویرا بھی کپڑے تبدیل کر کے آ چکی تھیں اور اب ریلیکس انداز میں سب کے درمیان بیٹھی تھیں۔ سارے لڑکے حالاتِ حاضرہ پر باتیں کر رہے تھے جبکہ لڑکیاں قدرے الگ بیٹھی فیشن اور کپڑوں کی باتوں میں مصروف تھیں۔

حسنات بھائی اپنے مخصوص انداز میں کوئی قصہ سب کے گوش گزار کر رہے تھے جب ولید کے موبائل پر مستقل کال آنے لگی۔ وہ کال ریسیو کرنے کے لیے قدرے سنسان گوشے میں آ گیا پھر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا، دس پندرہ منٹ بعد باہر آیا، وہ کپڑے بدل چکا تھا اور اب جینز اور گرین ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ پھر وہ حسنات کی طرف آیا۔

"حسنات بھائی! میرے دوست کی والدہ کی طبیعت کافی خراب ہے...... میں ذرا اسپتال جا رہا ہوں۔"

"اس وقت ولید؟ رات کا ایک بج رہا ہے...... میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" انہوں نے پہلے گھڑی دیکھی اور پھر اس کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔

"ارے نہیں پلیز...... آپ انجوائے کریں...... اتنے دنوں بعد تو سب جمع ہوئے ہیں، ڈونٹ وری میں جلدی آ جاؤں گا۔ اماں یا ابا پوچھیں تو آپ انہیں بتا دیجیے گا۔" حسنات کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے انہیں واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا...... حسنات سے بات کر کے وہ روشنی کی طرف آیا۔ روشنی، فاطمہ بھابی اور منال سے باتوں میں مصروف تھی جبکہ سویرا اور حنا واک کرتے ہوئے باتیں کر رہی تھیں۔

"روشنی...... پلیز ایک منٹ کے لیے اِدھر آنا۔" ولید نے اسے آواز دی۔

"اوہو دیور جی...... ابھی کچھ گھنٹے بھی نہیں گزرے اور آپ نے حق جتانا شروع کر دیا۔" فاطمہ نے منال کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور جملہ کسا۔ سویرا اور حنا جو اپنی واک کا چکر پورا کرتے ہوئے واپس ان سب کے قریب آ چکی تھیں، دونوں نے فاطمہ بھابی کے جملے کا مزہ لیا۔

"جاؤ، جاؤ روشنی، ذرا مجازی خدا کا حال دریافت کر کے آؤ۔" فاطمہ بھابی نے روشنی کو چھیڑا۔

وہ شرماتے ہوئے اپنا دوپٹا سنبھالتی اس کے قریب چلی آئی۔

"جی......" روشنی ولید کے روبرو تھی۔ ولید نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔ قریب تو وہ اس کے ہمیشہ سے تھی پر آج قریب تر لگ رہی تھی۔ بہت خاص اور بہت اپنی سی۔

"آج تم بہت اچھی لگ رہی تھیں۔" ولید نے اپنی نظروں کا ارتکاز اور بڑھایا۔ "دل کر رہا تھا کہ تم اسی عروسی لباس میں موجود رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں...... پر کیا، کیا جائے کہ زندگی میں خوب صورت لمحے بڑے مختصر ہوتے ہیں۔" وہ سینے پر ہاتھ باندھے اس کے سامنے یوں کھڑا تھا کہ پیچھے کا سارا منظر پس منظر بن چکا تھا۔ روشنی کو ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ لان میں موجود سارے لوگ جادو کی چھڑی سے اس پس منظر کا حصہ بن چکے ہیں۔ اگر کوئی ہے آس پاس تو بس وہ ہی ہے...... جو اس کے دل سے قریب ہے۔

"آپ نے یہاں مجھے میری تعریفیں کرنے کے لیے بلایا ہے؟" روشنی نے آہستہ سے پوچھا...... دھنک کے سارے رنگ اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔

"اوہو...... آپ، تم نے تو مجھے سچ مچ مجازی خدا کے درجے پر فائز کر دیا۔" ولید نے شرارت سے کہا۔

"ولید...... نہیں کریں ناں...... ابھی میں ان سب کے پاس جاؤں گی تو وہ لوگ میرا ریکارڈ لگائیں گی اور سب سے زیادہ سویرا کی بچی...... جب سے یہ بات اس کے علم میں آئی ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان گہرا دلی تعلق ہے تب سے بہانے بہانے سے چھیڑے جا رہی ہے۔"

"بھئی وہ تو میری سویٹ سی بہنا ہے اور بہن پر سات خون معاف...... آخر کو اس نے انعام چچا کے سامنے ہمارا کیس لڑا ہے۔"

"یہ تو ہے......" روشنی متفق تھی۔ "ولید، مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں اور آپ ایک ہو گئے ہیں۔"

"روشنی! آ بھی جاؤ...... اب کیا ساری رات ولید سے بات کرتی رہوگی۔ موصوف نے ایک منٹ کے لیے بلایا تھا۔ پانچ منٹ ہو گئے ہیں۔" فاطمہ بھابی نے زور سے ہانک لگائی...... باقی کزنز بھی سیٹیاں بجانے لگے۔

"فاطمہ بھابی کی آواز سن کر بھی تمہیں یقین نہیں آیا کہ ہم ایک ہو گئے ہیں؟" ولید نے مسکرا کر پوچھا اور روشنی بھی ہنس دی۔

"میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ ایک دوست کی والدہ کی طبیعت خراب ہے، کل صبح آپریشن ہے ان کے دل کے دو والو بند ہیں۔ اسے پیسوں کی ضرورت ہے اور کسی بہت اپنے کی بھی...... اس لیے میں اس کے پاس جا رہا ہوں، صبح تک آ جاؤں گا۔ اماں کا خیال رکھنا۔" وہ رخصت ہو رہا تھا۔

"مت جائیں ناں ولید!" اس نے منہ بسورا۔

"تمہیں اور اس خوب صورت ماحول کو چھوڑ کر جانے کا میرا بھی دل نہیں کر رہا مگر علی میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اس نے مدد کے لیے پکارا ہے جانا تو ہے ہی...... اب مجھے خوش دلی سے رخصت کرو۔" ولید مسکرایا۔

"اپنا خیال رکھنا روشنی......" اس نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

"آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔" روشنی نے آہستگی سے کہا۔ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے وہ اس کے نقشِ پا... کھڑی دیکھتی رہی۔

☆☆☆

اگلے دن شہر میں احتجاج تھا موبائل سروس بھی بند تھی سو ولید کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی۔

سارا دن گزر گیا۔ وہ کمرے میں چکر لگاتے لگاتے تھک چکی تھی۔ بیڈ پر آکر بیٹھ گئی...اور گود میں دھرے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگی۔

"تمہارے ہاتھ کی مہندی کا تو خوب ہی رنگ چڑھا ہے، لگتا ہے اپنے میاں کی من چاہی ہو۔" فاطمہ بھابی نے نکاح والے دن اس کی مہندی کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ڈیزائن کے بیچ میں موجود ننھے سے دل کے اندر لکھا ولید کا نام یوں مہندی کے رنگ سے رچا، روشنی کی ہتھیلی پر جگمگا رہا تھا گویا چودھویں کا چاند اکلوتے آسمان پر قبضہ جمالے۔ بہت زیادہ...... بے پایاں خوشی ملنے کے بعد جو سکوت ماحول کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ وہ اس کے دل کو بے سکون کیے دے رہا تھا۔ "کہاں ہو ولید پلیز آجاؤ۔" اپنی دائیں ہتھیلی پر لکھے ولید کے نام کو بائیں ہاتھ کی انگلی سے مس کرتے ہوئے وہ غائبانہ ولید سے مخاطب تھی۔ وہ دن بھی گزر گیا۔

کسی نامانوس شور سے اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے بہت زور لگا کر آنکھیں کھولیں۔ رونے کی وجہ سے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے اور سر درد سے بوجھل...... اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ گھڑی صبح کے ساڑھے چار بجا رہی تھی۔

"یا خدا...... یہ شور کیسا ہے؟" عجیب اضطراب نے اسے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر آئی تھی۔ اس کا رخ تایا اکرام اللہ کے پورشن کی طرف تھا۔ مکھیوں کی طرح بھنبھناتا سا شور اب آہوں اور بین میں بدل چکا تھا۔ ان کے گھر میں دن کا آغاز کبھی اس طرح نہیں ہوا تھا اور نہ تایا اکرام اللہ کے گھر میں۔ پھر آج سب کچھ اتنا بدلا ہوا کیوں تھا؟

رات وہ ولید کا انتظار کرتے ہوئے روتے ہوئے جانے کب یونہی بیڈ پر آڑھی ترچھی سو گئی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ سویرا رات کمرے میں آئی یا نہیں۔

بس اس کے دل کو یقین تھا کہ جب دن نکلے گا تو ولید ضرور آجائے گا۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے کا عادی تھا۔ عام دنوں میں بھی وہ جب ولید کو کال کرتی تھی تو وہ حسب وعدہ پہنچ جاتا تھا۔

"یقیناً وہ آگیا ہے...... اور اب تایا ابا اس کی کلاس لے رہے ہیں۔" روشنی نے دل میں سوچا اور مجمع کو چیرتی ہوئی بڑے کمرے میں آئی۔

"میں اور ولید رات بھر علی کے ساتھ تھے۔ وہ اپنی والدہ کی وجہ سے ٹینس تھا۔ میں اور ولید اسپتال سے ساتھ ہی نکلے تھے، وہ میرے گھر کے پاس والے اے ٹی ایم سے پیسے نکلوانے گیا اور میں گھر چلا گیا کہ کپڑے بدل آؤں۔ میں واپس آیا تو سارا منظر ہی بدل گیا تھا۔ جہاں کچھ دیر پہلے سکون تھا وہاں احتجاج کے نام پر غدر برپا ہو چکا تھا۔ ولید کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں، وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کاش میری زندگی سے وہ بیس منٹ نکل جاتے۔" کوئی حسنات بھائی کو روتے ہوئے بتا رہا تھا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

"کاش کہ کوئی: اسے بتاتا کہ اجل جس کے پاس آنا چاہتی ہے پھر ایک لمحہ نہیں لگاتی......" روشنی کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا...... یہ آواز...... یہ تو تایا ابو کی ہے...... وہ اس شخص کو نظر انداز کرتی اور آگے آگئی۔ پہلی بار...... زندگی میں پہلی بار اس نے تایا اکرام اللہ کو روتے ہوئے دیکھا...... زار و قطار...... ہچکیوں کے ساتھ...... یہ لرزتا، کانپتا وجود اس کے تایا کا تھا پھر اس کی آنکھوں نے زمین پر پُرسکون لیٹے ساکت وجود کو دیکھا۔

"ولید......" اس نے اپنا ہاتھ، ہونٹوں پر رکھ کر سسکی روکی۔

وہ سب لو انتظار کرا کر لوٹ آیا تھا۔ سفید پوشاک میں لپٹا ہوا...... چار کندھوں پر سوار...... روشنی نے بے اختیار آگے بڑھ کر تایا ابو کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا شدتِ گریہ سے ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔

"نہیں تایا ابو، پلیز روئیں مت...... وہ آپ کو کبھی ایسی کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا جس پر آپ روئیں۔ وہ تو ہمیشہ سے چاہتا تھا کہ آپ مونس اور حسنات بھائی کی طرح اس پر بھی فخر کریں۔ اس سے محبت کریں۔ وہ باغی ضرور تھا مگر بے رحم نہیں کہ آپ کو یوں رلاتا، پلیز مت روئیں۔" بولتے ہوئے روشنی کی آواز لرز رہی تھی۔ آنسو جھیل سی آنکھوں کے کناروں پر آکر رک گئے تھے مگر وہ انہیں ہرگز بھی بہنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ولید کے پُرسکون چہرے کو دیکھا۔ جس کے شب و روز کا پتا نہیں تھا۔ نہ جس کے آنے پر کوئی استقبال ہوتا تھا اور نہ واپس جانے پر کوئی الوداعی نظر رخصت کرتی تھی۔ آج ایک جمِ غفیر تھا جو اسے ابدی سفر پر رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔ وہ اس کے جنازے کے قریب بیٹھتی چلی گئی۔

☆☆☆

آج پروفیسر اکرام اللہ جلدی یونیورسٹی سے نکل آئے تھے۔ رت بدل رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی۔ گہرے سرمئی بادل افق پر چھاتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پچھلے دنوں تصوف کے موضوع پر ایشو کرائی گئی کتب تھیں۔ ان کا رخ کتاب گھر کی طرف تھا۔ بہت عرصے سے یہ کتاب گھر جیسے ان کا خاموش دوست بن گیا تھا۔ پہلے مونس کی یاد انہیں یہاں کھینچ لاتی تھی اور اب ولید کی یاد...... کتابوں کی آڑ میں وہ اپنے سارے آنسو لٹا دیتے اور پھر گھر کی راہ لیتے...... مگر آج انہیں یہاں سے گھر نہیں جانا تھا۔ وہ آج...... "the dream" کے نام سے ایک نجی یوتھ کونسلنگ سروس سینٹر میں مدعو تھے۔ پروفیسر اکرام اللہ، ایک دو بار پروفیسر خالد وہاب سے مل چکے تھے اور نئی نسل کے حوالے سے ان کی کوششوں کے معترف تھے۔ پروفیسر خالد وہاب نے بہت اصرار سے انہیں بلایا تھا۔ وجہ دعوت کسی لکھاری کی کتاب کی تقریبِ رونمائی تھی۔

کتاب گھر سے نکل کر انہوں نے روشنی کو کال کی اور اپنی مصروفیت کا بتایا۔

حسنات کو ایمرجنسی میں واپس ڈیوٹی پر بلا لیا گیا تھا کہ فرض، ذاتی دکھ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ روشنی اور سویرا دونوں گھروں کو سنبھالے رکھتیں...... جہاں ولید کے جانے کے بعد خاموشی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ روشنی اکثر تائی اماں کے خیال سے ان کے پورشن میں ہی رک جاتی۔ کتنے ہی لمحے بیت جاتے وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لیے...... ولید کو کھوجے جاتیں۔

تایا اکرام اللہ کے گھر میں ولید کا کمرا، روشنی کی سب سے پسندیدہ جگہ تھی۔ وہ جب بھی تائی اماں کے پاس رکتی رات اسی کمرے میں گزارتی...... اور پھر ولید کی سرگوشیاں، اس کی آوازیں، روشنی کو گھیر لیتیں وہ آج بھی اس کے دل میں تھا۔ وہ آج بھی اس کے پاس تھا۔ جو تعلق روح سے بندھ جائیں، موت انہیں چاہ کر بھی توڑ نہیں پاتی۔

جسے آتشِ عشق نے چھو لیا، اسے پھر فنا سے کیا واسطہ
اِک حقیقت کے دو ہیں رخ، ہجر کیا، وصال کیا

☆☆☆

"حدیثِ دل" اپنی نوعیت کی واحد منفرد کتاب ہے، جس کی تقریبِ رونمائی میں خود اس کا مصنف موجود نہیں ہے مگر یہاں مصنف کا ایک دوست موجود ہے جو خود کو صاحب کتاب کا مقروض کہتا ہے، اس کتاب کی اشاعت کی ذمے داری انہوں نے ہی اٹھائی ہے۔ آئیں ان سے سنتے ہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔" پروفیسر خالد وہاب بڑے سے ہال کمرے میں موجود یوتھ سینٹر کے تمام طلبا، ٹیچرز اور دیگر شرکا

سے مخاطب تھے۔

''میرا نام رمیش کمار ہے اور اس خوب صورت کتاب کا خالق میرا بہت پیارا دوست ولید اکرام اللہ ہے جو آج ہم میں موجود نہیں ہے۔'' مائیک کے ذریعے بلند ہونے والی آواز پروفیسر اکرام اللہ کو اپنی جگہ جما گئی۔

''وہ اکثر کہتا تھا یہ لفظ میں نے خود نہیں لکھے، یوں لگتا ہے کہ مجھ سے لکھوائے گئے ہیں، نیند کی حالت میں دیکھا ہوا خواب، جس نے حقیقت کا سارا سفر مجھ سے طے کروایا۔'' اس کے لکھے ہوئے الفاظ ایک امانت تھے جو مجھے آپ سب تک پہنچانے تھے کیونکہ میں اس کا مقروض تھا، بہت بڑا مقروض...... میں اندرونِ سندھ کا باسی تھا، میرے کچھ رشتے دار یہاں ہیں اور کچھ انڈیا میں ایک چھوٹی سی بات کو بنیاد بنا کر مجھے میرے روزگار سے محروم کردیا گیا، ہیڈ آفس میں میری جواب طلبی تھی اور پیچھے میری برادری پر افتاد ٹوٹ پڑی۔ میں اپنے گھر والوں سے میلوں دور تھا۔ تب یہ میرا محسن، میرا دوست ولید اکرام اللہ میری صرف ایک فون کال پر میرے گھر پہنچ گیا اور بحفاظت اس نے میری فیملی کو کسی ثقافتی گروپ کے ساتھ سرحد پار کروائی۔ جب میں فون پر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رو پڑا تو اس نے فقط اتنا کہا۔''

''جب میرے بزرگ ہجرت کر کے یہاں آئے تھے...... تو کیا تمہارے بزرگوں نے انسان ہونے کا حق ادا نہیں کیا تھا؟''

پروفیسر اکرام اللہ کی آنکھیں بھر آئیں...... گزرے دنوں کی کوئی بات انہیں یاد آنے لگی تھی۔

''مجھے زعم تھا کہ یہ وطن میرا دیس ہے...... پر افسوس میں یہاں ہمیشہ سے تھا پھر بھی اقلیت میں رہا۔ اس سرزمین پر یہ آخری کام میرے ذمے تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میری ''حدیثِ دل'' ہر لائبریری میں رکھوا دینا، لوگوں میں مفت بانٹ دینا...... میرے یوتھ سنٹر کے نوجوانوں میں تقسیم کر دینا...... جو میں نہ کرسکا شاید میرے بعد آنے والے کر جائیں۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا''

رمیش کمار پُرنم لہجے میں شعر ادا کرتا ہوا اسٹیج سے اتر آیا اور اب ہال میں موجود شرکا میں ''حدیثِ دل'' کی کاپیاں تقسیم کر رہا تھا۔ کتاب سفر کرتی ہوئی پروفیسر اکرام اللہ کے ہاتھوں تک پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے سرورق کو دیکھا۔ سبز ہلالی پرچم کے پس منظر میں قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر تھی اور پرچم کے آگے سنہری حرفوں میں ''حدیثِ دل'' لکھا ہوا تھا اور نیچے مصنف کا نام درج تھا ان کا دل چاہا وہ اس نام پر اپنے ہونٹ رکھ دیں۔

رمیش کمار پرایا تھا مگر اپنے ہونے کا حق ادا کر گیا تھا...... اور وہ جو اس کے باپ تھے اسے کبھی سمجھ ہی نہیں سکے۔ بے جان ہوتے ہاتھوں کے ساتھ انہوں نے سرورق پلٹا۔

''کتاب کا انتساب...... اپنے والد پروفیسر اکرام اللہ کے نام۔'' بے اختیار کتاب بند کر کے انہوں نے کتاب کی پشت پر لگی ولید کی تصویر کو سلیوٹ کیا...... وہ جو ہر ایک کو اپنا بنا لیتا تھا آج پروفیسر صاحب کو بھی اپنا بنا گیا تھا۔

پروفیسر خالد وہاب اب مائیک سنبھالے پروفیسر اکرام اللہ کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دے رہے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے کچھ کہیں۔ پروفیسر اکرام اللہ نے نشست چھوڑ دی۔ ان کا رخ ڈائس کی طرف تھا۔ وہ ولید کے مقروض تھے، رمیش کمار سے بھی بڑے مقروض...... وہ جو زندگی بھر اس بات پر شرمندہ رہے کہ ولید جیسا باغی ان کا بیٹا ہے...... آج ساری دنیا کے سامنے فخر سے کہنا چاہتے تھے کہ وہ ولید اکرام اللہ کے باپ ہیں۔

ہارے بھی تو بازی مات نہیں

سائرہ رضا

اس نے ماتھے پر آئے پسینے کو پلّو سے پونچھا اور ہاتھ دے کر روک کے رکشے میں جا بیٹھی۔ ''حق ہا'' یہ اس کی نہ جانے کون سی ٹھنڈی سانس تھی، اول جماعت سے لے کر سولہ جماعت تک وہ باقاعدہ لائق اسٹوڈنٹ رہی پھر سات سال ایک بیکار پُرزے کی طرح گھر بیٹھ کر رشتے کا انتظار کرتی رہی...... اداس، ملول، چڑچڑی...... اس وقت تو وہ واحد تھی جو شادی کی عمر کو پہنچی تھی مگر ان سات سالوں



میں نہ جانے کب اور کیسے گھر کی باقی لڑکیاں اس کے ساتھ کی ہوگئیں اور بڑے ابا نے کہہ دیا۔

”اب جسے بھی پسند کیا جائے گا اس کی ہی کردیں گے۔“ مگر ایسا سوچ کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا، سال بھر میں نہ جانے کہاں سے کوئی بھولا بھٹکا رشتہ گھر میں قدم رکھتا اور شاید سات سالوں کے سات رشتے...... رباب کی شادی کی شائق بہنیں اب کینہ توز نگاہوں سے ایک دوسرے کو کھوجتیں، وہ خود ایک دوسرے کی حریف بن چکی تھیں۔ رباب سے بڑی شاداب، اپنے نام کے الٹ تھی وہ چونتیس برس کی ہوچکی تھی اور اسے ہسٹریا کے دورے پڑتے تھے نہ کسی کام کو ہاتھ لگاتی نہ اچھا پہنتی نہ کھاتی بس گھر میں بندھی بوڑھی بکری کی طرح نیم وا آنکھوں سے اردگرد کے منظر کو تکتی جاتی۔ آج سے پورے سولہ سال پہلے اس کی منگنی بڑی دھوم دھام سے ہوئی یہ خاندان کی پہلی بچی تھی اور پیچھے ابھی چھوٹی بچیوں کی لائن تھی۔ سو اس بے حد اچھی شروعات پر سارے بڑے بہت خوش ہوئے، چار سال تک منگنی قائم رہی۔ شاداب سے چھوٹا آفتاب محض ابھی سولہ سال کا تھا اور ابا اور تایا کے ہمراہ مین مارکیٹ کی اپنی کپڑوں کی دکان پر بس کاؤنٹر پر بیٹھنا سیکھ رہا تھا۔

وہ بڑی محنت اور جدوجہد کا دور تھا، شادی کی تیاری اور شاداب کی کم عمری، چار سال کے طویل عرصے کا باعث تھی اور جب ابا، بڑے ابا، تائی اماں اور اماں نے اپنے نام و مرتبے کے مطابق جہیز اکٹھا کر کے بڑی خوشی و جوش سے تیاری شروع کی تو بڑے ابا دہاڑ رہے تھے چنگھاڑ رہے تھے ان کی آواز...... رباب کو لگا جس برآمدے کے نیچے وہ کھڑے ہیں اس کی چھت ان پر نہ گر جائے۔

”دھوکے باز، دو نمبری لوگ، بھان متی کا کنبہ، گندا خون، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا...... اپنا باپ بھی بدل سکتے ہیں، نام کے ساتھ ہاشمی، قریشی لگا کر سمجھتے ہیں چھپ جائیں گے، خدا کا شکر کس طرح ادا کروں کہ بچ گئے دروازے پر نیم پلیٹ پر سید لگا کر رکھا ہے سارے اصول بھی سیدوں والے......اور اندر سے......“ وہ مزید آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

”میرے سب سنانے پر بھی مانا نہیں مگر وہ اپنے سید عابد حسین شاہ نے اس کا پول کھول دیا، اس کا دادا انڈیا میں ان کے خاندان کا ماشکی رہ چکا تھا۔ نہ جانے کہاں سے ان کا شجرہ اٹھا لیا اور اپنے ڈرائنگ روم میں خوشخط کر کے لٹکا لیا اور ہم جیسے سیدھے سادے لوگ، ہم نے کب جانا لوگ نبی ﷺ کی نسبت بھی جھوٹ بولتے ہیں، نعوذ باللہ اس کے منہ پر مار کے آیا ہوں اس کے ماشکی بیٹے کا رشتہ...... سیدوں کی بیٹی ماشکی کے گھر...... توبہ توبہ......“

”آپ تحمل سے تو کام لیں، کوئی غلط فہمی ہوگئی ہوگی، چار سال سے زیادہ کا عرصہ اتنا آنا جانا...... لین دین، محبت رواداری مجھے تو کبھی شائبہ تک نہیں ہوا آپ...... نے کیسے ایسے اچانک ......“ بڑی اماں نے لڑکھڑاتی زبان میں بولنا چاہا۔

”غلط فہمی......“ انہوں نے اتنے زور سے دانت پیسے کہ بس۔ ”تم عقل کے ناخن لو...... میں سوچ کر گیا تھا...... عابد شاہ میرے ساتھ تھے، وہ ان کو دیکھتے ہی ٹھٹک گئے پھر اگر میں جھوٹا تھا تو ان کا حق تھا کہ میرے گریبان کو چیرتے اگر تو میں نے بہتان لگایا ہوتا ناں ان کے دامن کی سمت انگلی کی تھی وہ بڑھ کر میرا چہرہ طمانچوں سے لال کردیتے کہ کوئی آکر اگر میرے نسب پر انگلی اٹھائے تو میں یہی کروں گا مگر وہ جس طرح منہ چھپائے خاموش تھے...... ہاہ...... چور کی داڑھی میں تنکا۔“ وہ سخت غصے میں ہے۔

”لیکن بات کیسے شروع کی چار سال تو......“ اماں نے پہلی بار زبان کھولنی چاہی، شاداب کا فقط اٹھارہ برس میں ہوجانے والا رشتہ ان کے لیے مسلسل خوشی تھی ایک بہت اچھی شروعات، آگے ایک بیٹا اور

چار بیٹیاں تھیں ادھر بڑے ابا کی بڑی بیٹی اپنے خالہ زاد کے ساتھ بیاہی گئی تھی پھر بیٹا اسی خالہ زاد کی بہن سے پھر رباب سے سال بڑی مریم زہرہ تھی پھر ایک بیٹا تھا خیال یہی تھا کہ مریم کا رشتہ ان کے بھائی آفتاب سے اور یوسف کے لیے رباب کی باقی تین بہنوں میں سے کوئی ایک...... مسئلہ تو ان باقی بچی لڑکیوں کا تھا...... آج کل ویسے ہی رشتوں کا کال اور اس میں مخصوص شرائط...... رباب کالج میں تھی اور یہ بڑی نوعمری کا رنگین زمانہ تھا۔ بہن کی شادی دنیا کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ تایا ابا کے بیٹے بیٹی کی شادی کے وقت وہ فراک نیکر پہننے والی بچی تھی سو کچھ یاد نہیں...... اس نے گردن موڑ کر کمرے میں دیکھا۔ شاداب کے چہرے کی ساری شادابی کھل چکی تھی۔ وہ پورے قد سے کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ دونوں پاؤں ایک دوسرے کے ساتھ فرش پر جڑے تھے اور دونوں مٹھیاں اوپر سینے سے گزرتی ٹھوڑی کے نیچے ٹکی تھیں۔ رباب پر انکشاف ہوا کہ وہ لرز رہی تھی، وہ کمرے کے اندر پہنچی تو حیران رہ گئی اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور ہوا کی زد میں آئے درخت کی طرح آگے پیچھے ہل رہی تھی خود کو کھڑا رکھنے کے لیے اس نے مٹھیاں اور جبڑے اتنی سختی سے بھینچ رکھے تھے کہ گالوں کی ہڈیاں گوشت سے الگ نظر آرہی تھیں۔

”شاداب آپا...... آپی...... آپی......“ اس نے اسے ہلایا، دھم سے وہ اس کے بازوؤں میں آرہی تھی۔

”امی، ابا!“ آپی، اس نے چیخ چیخ کر سب کو اکٹھا کرلیا۔

☆☆☆

گھر میں گھستے ہی اس کی نگاہ سامنے تخت پر بیٹھی تائی اماں پر پڑی، وہ ڈھیروں سبزیاں لیے ساتھ ساتھ یقیناً نایاب کو کوس رہی تھیں۔ امی بہت خاموش کچن میں تھیں۔

”کیا ہوا، دے آئیں آخری پرچہ......“ تائی نے اس کے لیے جگہ بنائی۔

”جی تائی اماں...!“ اس کی آواز بے حد دھیمی اور افسردہ تھی۔

”کیا فائدہ ہوا بنو دو سال دھوپ میں جل جل کر رنگ کا ناس مار لیا تم نے۔ ارے، اب تم نہ گوری ہو نہ کالی...... پیلی دکھتی ہو پیلی......!“

”خون کی کمی......“ نایاب نے انٹری دی۔

”گاجر...... گاجر کھایئے آپ کے لیے بھلی رہے گی۔“ اس نے چھلی ہوئی لمبی سرخ گاجر اس کی سمت بڑھائی۔

”آج بہت گرمی تھی۔“

”پاگل ہوئی ہیں بجو، دسمبر میں گرمی......؟“ نایاب چیخی۔

”نہیں پتا نہیں، رکشے کا انتظار...... سورج سر پر کھڑا تھا، دیکھو میرا سر ابھی تک دہک رہا ہے۔“ اس نے دوپٹا سر کا کر نایاب کی طرف سر جھکایا۔

”واقعی سر بہت گرم ہے۔“

”تمہیں بخار تو نہیں؟“ تائی نے نبض پکڑی۔

”نہیں تائی اماں، بخار نہیں بس پتا نہیں کیا ہوجاتا ہے، یہ دیکھیں کہنی کے پاس دونوں طرف یہ رگ کتنی زور زور سے ہل رہی ہے اور آنکھیں جل رہی ہیں۔“ اس نے ان کی انگلیاں نبض پر دھریں۔

”دیکھو بیٹے یہ مسئلہ تم کب سے کہہ رہی ہو، اب اچھے ڈاکٹر کو دکھالو...... سارا جسم نارمل ہے اور صرف سر۔“

”اوہ، لگتا ہے آخری پیپر کا دکھ بہت زیادہ ہے اب پھر وہی کاہلی وہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس کمرے سے اس کمرے......

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر کیسے تمام ہوتی ہے“

نایاب بولی۔

”کیسے...... کیسے؟“ وہ ایڑیوں کے بل

گھومی۔ ”کیسے نہیں لفظ ایسے ہے بلکہ یونہی ہے۔“ اس نے تصحیح کی۔

”صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے“

”وہ شاعر کی عمر تھی اس کی بہر حال تمام ہوگئی...... ہم سے ہو نہیں رہی...... ویسے بھی عورتوں کی پاکستان میں عمر کی اوسط 64 فی صد ہے یہ چونسٹھ برس اب کتنی صدیوں میں ہوں گے۔“

”خدا کے لیے نایاب...... اتنی کڑوی باتیں، اور وہ بھی ذو معنی ابھی میں سہہ نہیں سکتی۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر لگائے۔ ”میرا سر پھٹ رہا ہے۔“ وہ جوتے تخت کے نیچے دھکیل کر اندر بڑھ گئی۔

”لو اسی لیے تو میں بولتی نہیں کہ جو بولوں تو بولے گی کہ بولتی ہو۔“ وہ مزید دوگاجریں اور ایک چھلی مولی لیے بیرونی دروازے کے ساتھ اپنے پارلر کے چھوٹے دروازے میں گھس گئی پھر سر واپس نکالا۔

”بجو بات سنو، آج میرے یہاں تین دلہنیں ہیں ابھی سو جاؤ پانچ بجے آجانا تھوڑی ہیلپ چاہیے ہوگی۔“

”پلیز نایاب مجھے معاف رکھو، میں صرف سونا چاہتی ہوں۔“

”عمر بھر سونا ہی تو ہے۔“ شاداب کی بڑبڑاہٹ وہ کمرے کے اندھیرے میں گول تکیے کے سہارے بیٹھی تھی گھٹنوں تک چادر ڈھکی تھی۔

”اچھا نایاب، میں آجاؤں گی تمہاری ہیلپ کو۔“

”یا اللہ!“ نایاب کہہ کر پچھتائی۔ اس نے بے ساختہ اپنے سر پر چپت رسید کی یہ سب سے بڑی مصیبت تھی۔ جب وقت دھیمے دھیمے گزرا تو زندگی میں اتنی تبدیلیاں آئیں کہ جن کا کبھی خیال بھی نہیں تھا۔ آفتاب نے باہر جا کر امریکی خاتون سے شادی کرلی اب پتا نہیں امریکا میں سیّد ہیں کہ نہیں۔ وہ مسلمان بھی ہوگئی، آفتاب نے بڑوں کو خوش کرنے کے لیے اس کا نام سیّدہ ماریہ آفتاب حسین رکھا۔ ابا اور بڑے ابا پورے سوا سال خوش رہے امریکا جیسے لعنتی ملک میں آفتاب نے گوہرِ مقصود ڈھونڈا کیسے سوا دو سال بعد کسی آنے والے نے بتایا۔

”دراصل وہ ”میری فرنڈس“ تھی شادی کے بعد اسلام قبول کیا تو یہ نام آفتاب بھائی نے دیا ہے، اب سیّدوں کی بہو سید ہی تو ہوگی۔“ آنے والے نے بڑی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ پھر بڑے ابا کا حق دق کھلا منہ دیکھ کر اسے کچھ اور خیال آیا...... ”اچھی لڑکی ہے، شادی کے بعد شراب وغیرہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ شروع، شروع میں قرآن وغیرہ کے لیے اسلامک سینٹر گئی تھی پھر بعد میں جاب اور بچے کی مصروفیت اب ویک اینڈ پر دونوں جاتے ہیں دس سپارے پڑھ لیے ہیں البتہ بچے لازمی جاتے ہیں۔ اب تو اس کی ڈریسنگ بھی بہت ڈیسنٹ ہوگئی ہے۔ جینز کے ساتھ فل سلیوز جرسی پہنتی ہے، اسکارف البتہ لازمی لیتی ہے۔“

”ڈیسنٹ ڈریسنگ......؟ آہم!“ نایاب نے آنکھیں گھمائیں۔ ”ویسے بجو جینز تو ابا بھائیوں کو بھی نہیں پہننے دیتے تھے یقیناً یہ بہوؤں کا ڈریس ہوگا ویسے اسے دھڑ پر چڑھاتے ہیں یا ٹانگوں پر......“

”خدا کے لیے نایاب!“ رباب نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے...... فاطمہ آپا کی بیٹی ثمن اور ان کی دونوں بہنیں اقصیٰ اور ارتضیٰ ہنس ہنس کر بے حال ہوگئیں۔ ثمن نے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے بنایا جانے والا فیڈر نایاب کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

”چلیں آپ اپنے کمرے میں، آپ کے فیڈر کا ٹائم ہے بڑوں کی باتوں میں نہیں بولتے۔“ وہ سب کھلکھلا کر ہنس دیں رباب نے گھر کا۔ وہ سب ڈرائنگ روم سے کان لگائے کھڑی تھیں۔

یہ بہت بڑا انکشاف تھا۔ تکلیف دہ، باعث شرمندگی اسے وہاں کی قومیت مل چکی تھی۔ اس نے

یوسف کو بھی بلوالیا، گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگئی مگر ابا اور بڑے ابا اس پیسے کو ہاتھ تک نہ لگاتے۔ البتہ امی اور بڑی اماں نے پیٹیاں خرید کر بھر بھر کر رکھ دیں۔ بیٹیوں والا گھر...... متوقع شادیاں سوئی سے جہاز تک...... کاش دولھے بھی بازار سے مل سکتے۔

”بجو چائنا والے دولھے کب بنانا شروع کریں گے؟“ نایاب انگلی ہونٹوں میں دبائے پوچھتی۔

”ضرور بنائیں گے، آپ یہ بتائیں 70 والی سیل سے لیں گی یا 110 والی۔“ ارتضیٰ کو گدگدی ہوئی وہ ابھی محض بیس کی تھی ہر سوچ و فکر سے ماورا۔

”معیار پر سمجھوتا نہیں۔“ نایاب قطعیت سے کہتی۔ رباب بے تاثر نگاہوں سے سب کے چہرے دیکھتی۔ اس کی زندگی میں ہلچل نام کو نہ تھی۔ شاداب علی الاعلان نفسیاتی مسئلہ تھی تو رباب اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی...... حبس زندگی...... ایم اے کے بعد وہ پورے سات برس تائی اماں کے ساتھ سبزی بنواتی، کپڑے دھلواتی... کبھی موڈ ہوتا تو سلائی کرلیتی یا شاداب کی فل ٹائم نرس، وہ ایک تو خاموش طبع پھر بے تاثر یا پھر بے چین واداس نگاہیں لیے خاموش رہتی۔ دوستوں کے ہمراہ کہیں جاب کا ارادہ کیا تو ابا اور بڑے ابا ایسے تڑپے جیسے کند چھری نرخرے پر پھری ہو۔ اس نے توبہ کرلی۔ دوستوں سے دوری ہوئی کچھ شادی کر پیا دیس سدھاریں، کچھ کیریئر کے چکر میں...... بس وہی تھی جو گھن کھایا درخت بن رہی تھی۔ اندر سے کھوکھلا مگر جب تک گرے گا نہیں تن کے کھڑا ضرور رہے گا اور گھن لگا تنا آہستہ آہستہ ختم نہیں کھاتا ہمیشہ دھم سے گرتا ہے۔

رباب کو دنیا کیا کہے گی کا بہت خوف تھا جبکہ نایاب فطرتاً بے حد بے پروا، موڈی اور اپنی من مانی کرنے والی لڑکی تھی۔ اس نے بی اے کے بعد کالج کو خیر باد کہا تو انڈسٹریل ہوم سے کروایا جانا والا ہر کورس کر ڈالا۔ سارے گھر میں اس کے ہنر کی جھلکیاں تھیں۔ بڑوں کے نزدیک یہ سب سلیقہ مندی کی نشانیاں تھیں سو سب خوش...... اعتراض بلکہ شدید ترین اعتراض اس دن ہوا جب اس نے بیوٹی پارلر میں کام کرنے کا اعلان کیا اور اتنا بڑا طوفان شاید اس دن بھی نہ آیا تھا جب بڑے ابا اور تائی اماں کی نمبر دو بیٹی مریم گھر سے نکل گئی تھی۔

”سیّدوں کی بیٹی اور نائنوں کی طرح مالشیں کرے گی، قینچی سے بال کترے گی؟“ بڑے ابا نے کراہیت کے مارے زمین پر تھوک دیا۔ نایاب کے ہاتھ میں اس وقت چاٹ مسالا چھڑکے کھیروں کی پلیٹ تھی جنہیں وہ تواتر سے کھاتے ہوئے یوں کھڑی تھی جیسے کسی اور کی بابت گفتگو ہو رہی ہو گزشتہ پندرہ دنوں سے چلنے والی خاموش بحث آج برآمدے کے بیچوں بیچ اٹھی تھی۔

”بڑے ابا......“ نایاب نے بڑے اطمینان سے کھیروں کی بڑی پلیٹ ہضم کی جبکہ باقی چھوٹی بڑی خواتین تھوک نگلنا بھی بھول چکی تھیں۔ ”نہ تو میں آپ کی طرح اندھیروں میں جینا چاہتی ہوں، نہ بجو کی طرح ٹکر ٹکر بینا ہوتے ہوئے نابینا زندگی گزار سکتی ہوں، ہم پانچوں جس راستے پر کھڑی ہیں کبھی منزل ہمارا مقدر نہیں ہوگی۔ منزل تو دور، ہمارے مقدر میں زندگی بھی نہیں ہوگی...... مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا گائیڈ ادھوری معلومات کے سہارے ہمیں ادھورے رستے پر ہی چھوڑے گا۔ آپ کو پتا ہے لانچوں کے ذریعے دبئی جانے والوں کو کسی بھی ساحل پر دبئی کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ آگے تم خود جاؤ گے اور پھر پتا ہے سالوں بعد گزرنے والوں کو وہاں ڈھانچے ملتے ہیں تین اطراف ریت ہی ریت اور سامنے نمکین پانی...... اس گھر کی لڑکیاں اسی بے نام ریت پر ادھر سے اُدھر سر پٹخ رہی ہیں۔ پیچھے تاحد نگاہ ریت اور آگے ہماری آنکھوں سے نکلتا نمکین پانی کتنی یکسانیت ہے ان میں اور ہم میں۔ آپا بے دم ہو کر

ڈھانچے میں بدل چکی ہیں، رباب بجو پانی کی سمت دوڑتی ہیں مگر مجھ میں ابھی جان باقی ہے میں وہاں تک بھاگوں گی کہ مجھے اصل کنارہ مل جائے میں اتنی بے کسی کی موت نہیں مرنا چاہتی۔ مرنے سے پہلے پھڑکنا میرا حق ہے اور بڑے ابا اگر ایسے روزن نہ تلاش کروں تو یا تو شاداب آپا کی طرح اندھیرے کمرے میں ملوں گی یا بجو کی طرح قطرہ قطرہ پگھلتی......اور....."

"نایاب اب بس......" ابا جسے چونک گئے نایاب کا کھلتا منہ بند ہوگیا۔ "تم کمرے میں جاؤ اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی، چلیں بڑے بھیا......"

وہ دونوں کھڑے ہوگئے۔

"آپ مجھے ہاں کیے بغیر نہیں جاسکتے۔" نایاب پیچھے لپکنا چاہتی تھی مگر امی نے اسے کہنی سے گھسیٹ کر تخت پر گرادیا۔

"اب چپ کر، ہمیں پتا ہے تُو بہت اچھا بولنا جانتی ہے مگر ہر جگہ پر بولتے نہیں۔" نایاب کی آنکھیں یک بیک بھر آئیں اس نے بدتمیزی سے کہنی چھڑائی اب آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"ابا آپ سن لیں، مجھے سانس لینے کی جگہ دے دیں، میں ان لوگوں کی طرح زندہ نہیں رہ سکتی۔" اس نے شاداب اور رباب کی طرف اشارہ کیا۔ "اور ابا میں مریم بھی نہیں ہوں، عزت سے زندہ رہوں گی یا پھر مٹی اوڑھ لوں گی۔ مجھے زندہ لاش بن کر اس گھر کے کمروں میں نہیں پھرنا۔" وہ پوری طاقت سے چلائی اور آخر میں آواز مدھم ہوگئی اب وہ رو رہی تھی۔

دونوں ایسے مڑے تھے جیسے بجلی کے ننگے تاروں پر پیر پڑ گئے۔ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اقصیٰ نے سب کچھ یوسف کو کہہ سنایا اس نے آفتاب سے ذکر کیا واصف بھائی کو بھی خبر ہوگئی، نہ جانے بھائیوں میں کیا بات ہوئی، تین ماہ بعد گھر کا بیرونی کمرا آفتاب اور یوسف کے بھیجے دس لاکھ روپوں سے ایک خوب صورت ٹی پنک کلر کے اسٹائلش پارلر کا روپ دھار چکا تھا۔

☆☆☆

پتا نہیں نایاب کی کہی باتوں کا اثر تھا یا معلوم نہیں کیا...... ابا اور اور خصوصاً بڑے ابا گھر کے اس حصے سے جیسے کٹ سے گئے۔ امی نے بڑی اماں کے بہتے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے اور نایاب کی بدزبانی کو سن کر جیسے چپ سادھ لی اور وہ اب خاموش رہتیں۔ جیٹھانی سے معافی مانگی۔

"آپا معاف کردیں، میری تربیت میں جھول ہوگا اس نے بڑوں کا احترام نہیں کیا، زبان درازی کی، وہ بچپن ہی سے منہ پھٹ اور منہ زور ہے، میں سب بھول بھی جاؤں مگر تب بھی مریم کا ذکر اسے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا، مجھے معاف کردیں۔ کاش میرے ہاتھوں میں جان ہوتی تو گدی سے زبان کھینچ لیتی۔" امی بھیگے لہجے میں اب خجالت میں غرق تھیں۔

"چھوڑو مہر النسا!" بڑی اماں کی آواز ابھری ہوئی تھی۔ "ہم سب مریم کا ذکر کرتے ہیں، ایک دوسرے سے نہیں تو اپنے آپ سے تو کرتے ہیں رات کو سونے لیٹتی ہوں تو وہ چھم سے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے، بُھلائے نہیں بھولتی، میں تو لاحول تک پڑھ لیتی ہوں مگر تمہیں پتا ہے کتنی ضدی اور ڈھیٹ تھی۔ انتقام پسند، فیصلہ کُن...... وہ اپنے ابا کی ہی فطرت لے کر پیدا ہوئی تھی، ایک میان میں دو تلواریں کیسے رہتیں، دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اسے جیتنے کا خبط تھا اور تمہارے بھائی بھی بھول گئے، تم نے بھی تو سنا ہے وہ بہت اطمینان بھری زندگی گزار رہی ہے، بیٹا بیٹی بھی مل گئے، خود بھی کمالی ہے اسے کبھی میری یاد بھی نہیں آتی۔ کہتے ہیں عورت جب ماں بنتی ہے تب اسے اپنی ماں کے اصل مقام کی پہچان ہوتی ہے، اسے تب بھی میں یاد نہیں آئی۔"

"آپ مت روئیں۔" امی نے خود کو باز رکھتے ہوئے انہیں تلقین کی۔

"روتی نہیں ہوں، مہر النسا بس سوچتی یہ ہوں کہ کوئی بتائے ہم میں سے صحیح کون تھا اور کون غلط۔"

اور پاس بیٹھی رباب جو اب 29 برس کی تھی تھیلیسیمیا کی مریض تھی مستقبل کی امید تھی نہیں، وہ ماضی میں رہنا پسند کرتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اسے کوئی نہ کوئی پرانا قصہ یاد آجاتا اور اپنی پوری جزئیات کے ساتھ وہ شعوراً اسے سوچتی۔ نہیں ایسے نہیں ایسے اس نے یہ کہا فلاں نے یہ سنا...... امی اور تائی کے اس مکالمے نے اسے پھر ماضی میں دھکیل دیا۔

☆☆☆

کالج کا زمانہ تھا رباب اور مریم دونوں تھرڈ ائیر کی طالبہ تھیں۔ سبجیکٹس بھی ایک سے تھے اکٹھے آتی جاتیں مگر کالج میں دوستیں الگ تھیں۔ رباب، شاداب کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد خاموش، اداس اور تنہا ہی رہتی۔ اس کی ایک آدھ دوست بھی اس جیسی لڑکیاں تھیں جبکہ مریم کالج آتے ہی جیسے آزاد پرندہ بن جاتی۔ وہ تتلی بن اڑتی بہت ساری آرٹی فیشل اینٹیک جیولری سے خود کو آراستہ کرتی، بیگ کی لیس بغلوں سے گزار کر کمر پر لٹکا دیتی، کبھی کتابیں بلا رنگین بیگز...... سینے سے لگی فائل، وہ دل کھول کر قہقہے لگاتی، دھڑ دھڑ سیڑھیاں پھلانگتی، ڈراموں میں حصہ لیتی، بیت بازی کرتی، رباب اسے دیکھ کر ہمیشہ پتنگ کا سوچتی یا تتلی...... گھر میں بھی وہ اپنے بستر پر کتابیں بکھرائے اپنے آپ میں گم ہوتی...... ایف ایم ریڈیو سنتی، پی ٹی وی سے دکھائی جانے والی بلیک اینڈ وائٹ فلمیں سب سے زیادہ شوق سے وہی دیکھتی تھی۔

"آج کل آپ ایک ہی گانا گاتی ہیں، ہمیں ریڈیو سے زیادہ آپ کو سننا پڑتا ہے مگر خدا کے لیے گانا تو بدل دیں۔" نایاب نے اس کے مسلسل ایک ہی جگہ ٹک جانے پر جیسے دانت پیسے۔

"تمہیں کیا مسئلہ ہے ہونہہ، اے بہاروں گواہ رہنا دو دلوں نے زندگی بھر ساتھ رہنے کی قسم کھائی ہے......اے ے ے ے بہاروں"

"بہاریں ہمیشہ نہیں رہتیں ان کی گواہی کا اعتبار نہ کریں۔" نایاب پیر پٹختی باہر نکل جاتی۔

"ایک ہمارے دروازے کی چوں چوں اور دوسرے آپ کا ریڈیو۔" اس کا ٹیسٹ تھا اور وہ ڈسٹرب ہورہی تھی۔

"تجھے دیکھا تو یہ جانا صنم پیار ہوتا ہے دیوانہ صنم، اب یہاں سے کہاں جائیں ہم، تیری بانہوں میں مرجائیں ہم......" وہ آنکھیں موندے تکیہ بازوؤں میں بھینچے بیڈ پر گر جاتی۔

"ذرا سا جھوم لوں میں ارے ناں رے ناں رے ناں......ذرا سا گھوم لوں میں ارے......"

"اگر تم اتنی ہی فرمانبردار ہوچکی ہو تو جاؤ بڑے ابا ہی سے پوچھ آؤ، ہمارے کہنے سننے میں تم ہو کب مگر خدارا یہاں سے جاؤ، میں نے آپا کو دوائی دی ہے۔" رباب بھی تنگ آجاتی اس کے جلے کٹے انداز پر مریم قل قل ہنس پڑتی۔

"ظالم حکمران کے آگے کلمۂ حق کہنے والے منصور حلاج ہم تیری عظمت کو سلام کہتے ہیں اور۔" مریم نے ہتھیلی کنپٹی سے لگا کر سلامی دی۔

"خدا کے واسطے مریم کون سا ظالم حکمران...... اور منصور حلاج...... سوال گندم جواب چنا تم تو جھومنے اور گھومنے کی اجازت مانگ رہی ہو، ہاں وہ ابا دیں گے کبھی نہیں...... تم ہوتی کہاں ہو اور یہ فیری کے واک مین سے سارا دن تم لوگ گانے سنتی ہو ناں۔" رباب کو یاد آیا مگر مریم ان دنوں چکنا گھڑا تھی سب پھسل جاتا...... بھید اس دن کھلا جب ایک بہت ڈیسنٹ خوب صورت پڑھی لکھی خاتون اپنے بے حد فربہ گنجے اور دبنگ شوہر کے ہمراہ مریم کا رشتہ لینے آ پہنچی تھیں۔ یہ کوئی حیران کُن بات نہیں تھی، رشتے آئے روز کسی نہ کسی کے لیے آتے ہی تھے۔ انجان

لوگ پہلی شرط سن کر ہی معذرت کرتے ہوئے اٹھ جاتے، گھر کے چاروں بڑوں کا رویہ ایسے مہمانوں کے ساتھ بہت احترام لیے ہوتا وہ انہیں عزت سے نوازتے اور خلوص سے خدا حافظ کہہ دیتے، نہ اِدھر سے خفگی نہ اُدھر کوئی ناراضی مگر تبدیلی یہ ہوئی کہ وہ خاتون مُصر ہوگئیں۔ پہلے فقط سوال پھر گزارش آخری حربہ وہ منتوں ترلوں پر اتر آئیں۔ یہ بے حد حیران کُن بات تھی۔ خاتون کا اصرار اِدھر سے مروت بھرا انکار، پھر تکرار۔ اس فیملی کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی مگر مسئلہ یہ ہوا کہ ان کا اکلوتا لاڈلا ہزاروں منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والا بیٹا مریم پر بری طرح سے فریفتہ ہوچکا تھا۔ وہ جس کی ہونٹوں پر آنے سے پہلے پوری ہونے والی خواہشیں تھیں وہ کسی طرح مریم سے دستبردار نہ ہوا۔ یہ بڑی گمبھیر صورتِ حال تھی۔ خاتون نے بلا مبالغہ اپنا دوپٹا تک اتار کے رکھ دیا مگر یہاں نہ صرف ذات برادری کی شرط تھی بلکہ بڑے ابا کی انا کو لگنے والی کاری ضرب تھی، مریم نے کب اور کیسے سب کچھ جانتے بوجھتے اپنے گھر کی روایات واقدار سے انحراف کرلیا وہ اتنا آگے کیسے بڑھ گئی۔ یہ سوال ہر وقت نیزے کی انی بنا گڑا رہتا۔ مریم کو ڈانٹ کر دھمکا کر سمجھا کر باز رکھنے کی پوری کوشش کی گئی اور وہ دب بھی گئی اس کا گھر سے نکلنا بند کردیا گیا۔ بڑے ابا اتنا بولے، اتنا بولے کہ ساری زندگی نہ بولے ہوں گے۔ مریم سہم بھی گئی بہت زیادہ شور شرابے کے بعد خاموشی ہوگئی۔ بظاہر مریم بھی ٹھنڈی ہوگئی مگر نہ جانے کب اور کس سے اس تک یہ خبر پہنچی کہ یاور اشفاق نے خودکشی کی کوشش کی اسے جب بے حد مشکلوں سے بچانے کی کوششیں کی جارہی تھیں اس نے تب بھی تو چاناچی کر ڈالی۔ ایک بے حد عام سی لڑکی جو بی اے فائنل میں تھی ادھوری تعلیم، متوسط گھرانا اس کے لیے یہ سب......

''اللہ کسی کا دروازہ بجا کر رزق نہیں دیتا کہ یہ لو آج کا کھانا، جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور نہ ہی او... راست کہتا ہے کہ یہ کرو یہ تمہارے لیے ہے، بلکہ اشارہ سمجھنا چاہیے۔'' پتا نہیں اس نے شاداب کی بات کے جواب میں دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔ رباب چونک گئی مریم کی آنکھوں میں بے حد ... ہوئی اجنبی کیفیت تھی۔

''تم کیا سوچ رہی ہو مریم؟'' رباب نے نرمی سے پوچھا۔

''میں......؟'' وہ دور خلاؤں میں دیکھ رہی تھی۔ ''میں سوچ چکی ہوں۔'' اس کا لہجہ اتنا ٹھنڈا تھا کہ رباب کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی اس نے بغور اس کا چہرہ جانچا مگر اب ایک بار پھر وہ بے تاثر نگاہوں سے اس قد آور لکڑی کے منقش دروازے پر انگلیاں پھیر رہی تھی جو پاکستان بننے سے پہلے ان کے دادا نے امرتسر میں اپنے بڑے سے گھر کے لیے بنوایا تھا جب وہ بے حد زبوں حالی کے دنوں میں سب کچھ چھوڑ کر پاکستان کے لیے ہجرت کررہے تھے تو جن دو بیلوں کے ساتھ ریڑھا گڈا بنایا گیا اس کے پچھلے حصے میں نشست کے لیے اس نئے بنے ہوئے دروازے سے بہتر پھٹا اس وقت دستیاب نہیں تھا تو دروازے پر بیٹھ کر دادا، دادی بڑے ابا اور پھوپھو جان اور گھر کا تھوڑا بہت سامان آیا تھا پھر یہ دروازہ سالوں اسٹور میں پڑا رہا یہاں تک کہ جب یہ گھر بنا تو بڑے ابا نے اپنے ابا کی یاد میں اسے گھر کے اندرونی حصے کی چوکھٹ پر اِستادہ کردیا۔ وقت نے اپنے اثرات اس پر چھوڑے تھے مگر دونوں بھائیوں کی خصوصی توجہ اسے اتنے سال بعد بھی قابلِ استعمال بنا رہی تھی یہ تھا کہ وہ رات میں بند ہوتا اور صبح سویرے کُھلتا، بولتا بہت تھا بعض اوقات ہاتھ لگنے سے بھی اس کی چُولیں چوں چوں کرتیں ہر دوسرے دن تیل روئی میں بھگو کر لگایا جاتا سارے گھر میں آواز گونجتی ہر آئے گئے کی خبر رہتی۔ رباب کو اچھی طرح یاد تھا گھر والوں کا بائیکاٹ

کر کے بیٹھی مریم اس دن کافی فعال تھی۔ اس نے دنوں بعد اپنی چادر جھاڑی، کتابیں سمیٹیں، وہ کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔

''آج آپ کی آواز بہت دھیمی ہے، مریم آپی کیا گا رہی ہو......؟''

''پیار کیا تو ڈرنا کیا۔'' وہ بہت دن بعد ہونٹ پھیلا کر مسکرائی تھی۔ نایاب نے حیرت سے اسے دیکھا اور شانے اچکا کر چل دی۔ مریم نے دروازے کی چولوں پر بہت اچھی طرح تیل لگایا۔

''وہ صبح ساڑھے سات بجے آئی سی یو میں یاور کے کمرے میں پہنچی تھی۔ یاور ہوش میں تھا اور شور مچا رہا تھا۔ مسز اشفاق پر شادیِ مرگ طاری ہوگئی۔ یاور شانت ہوگیا۔ نکاح صبح دس بجے ہوا۔ سال بعد وہ بیٹے کی ماں بنی پھر بیٹی پھر بیٹا اشفاق صاحب کو اپنی ذلت کبھی نہ بھولی مگر بیٹے کی خوشی ہر جذبے پر حاوی تھی۔ اس بے حد تاریک قصے کا روشن پہلو یہ تھا کہ بے حد لاڈلا، بگڑا، ضدی، من مانی کرنے والا اشفاق، مریم کو کبھی بھولا نہیں۔'' یہ سب فیری نے بتایا تھا۔ پتا نہیں مریم کی شکل زیادہ اچھی تھی یا قسمت...... رباب کو اچھی طرح یاد تھا کہ دروازہ اس صبح چوں نہیں بولا تھا اور آج دس سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی تائی اماں دروازے کی چولوں میں تیل نہیں ڈلواتیں۔ دودھ سے جل جانے کے بعد چھاچھ کو پھونکو نہ پھونکو دودھ کی جلن بھولنے والی نہیں ہوتی۔ جلنے کا نشان کبھی جاتا نہیں۔

☆☆☆

اقصیٰ کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ نایاب کی پارلر میں آنے والی ہر تیسری عورت اسے اپنے کسی نہ کسی بھائی بیٹے کے لیے پسند کرلیتی تب نایاب بہت فخر و مان سے بتاتی کہ اس کی بات بچپن سے تایا زاد سے طے ہے اور عنقریب شادی ہونے والی ہے۔

''جب تک تم آؤ گے عورتوں نے اپنے رنڈوے اور گنجے ماموں، چاچوؤں کے رشتے دے دینے ہیں پھر میں بوڑھی گھوڑی لال لگام اچھی لگوں گی۔'' وہ یوسف سے فون پر ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھیں۔ تائی اماں اسے مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں امی جانتے بوجھتے انجان اپنے کام میں بظاہر مگن تھیں مگر اس ایک بیٹی کا سکھ ان کے ہر عضو کی خوشی کو ظاہر کرتا تھا۔ نایاب اسے مسلسل پیچھے سے چارج کررہی تھی۔ ارتضیٰ اپنی باری کی منتظر۔

''اس سے کہو کبھی باپ سے بھی بات کرلے، وہ پوچھتے ہیں روز۔'' تائی نے کہا۔

''اچھا ہوتا جانے سے پہلے نکاح کرہی دیتے تو بس کاغذ بنوا پیچھے روانہ کردیتے اسے۔'' وہ بڑبڑا رہی تھیں۔

''لو خواہ مخواہ خاندان کی سالوں بعد ہونے والی شادی بلکہ میں تو پہلی شادی کہوں گی بڑی آپا اور واصف بھائی کی شادی میں ہمیں بمپر لگتا تھا۔'' نایاب جھنجلائی۔ ''اب اس کی ہوگی یا ثمن کی۔'' اس نے چودہ سالہ بھانجی کا نام لیا جو اپنے تایا زاد سے منسوب تھی۔ ارتضیٰ زور سے ہنس پڑی اقصیٰ فون پکڑے پکڑے اندر بڑھ گئی۔ نایاب اس کی پشت پر دیکھتی کہیں خیالوں میں گم ہوگئی۔ اقصیٰ نے اردو میں ماسٹرز کے بعد تعلیم کو خیرباد کہا۔ وہ نایاب کے پارلر کے سارے ٹوٹکے خود پر آزماتی، نایاب بھی ہر شے اس پر چیک کرتی، بالوں میں اسٹریکنگ...... وہ بس کیچر میں جکڑی آدھی بندھی آدھی کُھلی چہرے کے گرد جھولتی سنہری لٹیں، سارے فیشلز کروانے کے بعد اس کا چہرہ چم چم کرتا، وہ صبح نو بجے اٹھ کر مارننگ شوز سے دن کا آغاز کرتی، چینل بدل بدل کر سب کو دیکھتی، پروگرام میں سوالوں کے جواب دیتی۔ ایس ایم ایس کرتی۔ ایک شو سے میک اپ کٹ جیتی مارننگ وِد ہم میں ونیزہ احمد کی لان کا سوٹ اور نادیہ خان کا پہنا ہوا سوٹ بھی گھر آگیا، یہ سب سے زیادہ

انٹرسٹنگ تھا چوکور قمیص لمبی چوڑی...... کسی لائیو شو میں سب سے زیادہ ایس ایم ایس کر کے انعام جیتنا ہوتا تو وہ پورا پورا دن ٹک ٹک کرتی آئے دن نمبر بلاک ہو جاتے مٹ جاتے مگر وہ شغل سے باز نہیں آتی۔

”زیادہ ایس ایم ایس کرتیں تو باجی کسی سیلبریٹی کے ساتھ ڈنر جیت لیتیں۔“ ارتضٰی نے حسرت دکھائی۔

”تو پھر وہ تائی اماں کا یوسف ثانی میرا دنیا سے کھانا پینا بند کروا دیتا۔“ اقصٰی یاد کرواتی۔

”ہاں آپ کے ساتھ تو یہ مسئلہ ہے۔“ اس نے افسوس ظاہر کیا۔ ”آپ میرے لیے کر لیتیں۔“ اسے جیسے یاد آیا۔

”تم اپنے ابا کو بھول گئیں۔“ نایاب چیخی تھی۔

”نہیں ناں، ابا کو تو ساتھ لے کر جاتی کوئی اعتراض کرتا تو کہہ دیتی۔ ابا کالج چھوڑتے ہیں کوچنگ لے کر جاتے ہیں لاتے ہیں تو یہاں کیسے اکیلے آتی۔“

”ابا آل ویز آل ٹائم تو پھر تم باتیں کیا کرتیں اس سے۔“ اقصٰی نے سر پیٹ لیا۔

”باتیں کیا کرنی زیادہ وقت تو وہی بولتا میں نے یہی دیکھنا تھا وہ واقعی شاہ رخ سے ملتا ہے یا نہیں۔“ وہ سادگی سے بولی اقصٰی نے سر پکڑ لیا نایاب ہنس پڑی۔ ان کے قہقہے دیواروں سے ٹکرا کر پورے گھر میں گونجتے جیسے مندر میں گھنٹیوں کی گونج پلٹ پلٹ کر آتی ہے، گھر کے در و دیوار بھی ایسی آواز سے نامانوس تھے وہ اس اجنبی شور کو خود میں ضم کر ہی نہیں پاتے تھے۔ رباب نے آکر گھر کا۔

”ابھی ابھی آپا سوئی ہیں تم لوگ کیسے اتنا ہنس لیتی ہو؟“ رباب ناگواری سے بولتی اندر آئی۔

”میں بتاتی ہوں۔“ ارتضٰی شروع ہونے لگی۔

”رہنے دو پلیز آپا ابھی سوئی ہیں، کل رات کتنا چیخی تھیں اب خود سے آنکھ لگی ہے تو اچھا ہے، گولیاں تو ان کی رہی سہی جان بھی ختم کر دیں گی۔“ رباب کی نظریں نایاب پر ٹکیں اس نے منہ پھیر لیا۔

رباب چند لمحے اس کے بولنے کی منتظر رہی پھر خفا خفا سی اندر بڑھ گئی۔ مسئلہ اصل یہ تھا کہ جب بھی نایاب کے پارلر میں دلہن تیار ہونے آتی اور شاداب کو خبر ہوتی تو وہ تیر کی طرح آکر کرسی پر براجمان ٹکٹکی باندھے اس کی شکل دیکھتی سب نے اس کی دلچسپی پر شکر ادا کیا مگر وہ ننھے بچے کے مانند قدم قدم بڑھتی گئی اس نے پہلے اپنی کرسی دلہن کے بہت نزدیک رکھ لی پھر وہ آنکھیں موندے بیٹھی دلہن کو اتنی گہری نگاہوں سے تکتی کہ اس کی نگاہوں کی تپش سے دلہن آنکھیں کھول دیتی اور اکثر تو چیخ پڑی تھیں نایاب نے انہیں شانت کیا شاداب کو پیار سے سمجھایا۔ اس کے پاس اول کوئی جبر نہیں تھی رباب مجبوراً اور اقصٰی موڈ میں آکر تھوڑی بہت ہیلپ کر دیتی تھیں۔ امی کو بتایا تو وہ خفا ہونے لگیں۔

”اچھا ہے اس کا دھیان بدلے گا۔ ڈاکٹر تو یہی کہتا ہے، میں تو سوچتی ہوں تمہارے ساتھ ہی مصروف ہو جائے۔“ ان کے لہجے میں امیدیں تھیں۔ نایاب نے سر ہلا دیا مگر ایک دن نایاب کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دلہن کا بھاری دوپٹا اپنے سر پر ڈال لیا اور ٹیکا جھومر ماتھے پر رکھ کر دیوار پر لگے آئینے میں خود کو حیرت سے دیکھنے لگی پھر دائیں کھولی پھر بائیں وہ کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔

دلہن کی آنکھیں بند تھیں ساتھ آئی خالہ صوفے پر نیم دراز اونگھ رہی تھیں۔ نایاب نے گھور گھور کر دیکھنے سامان رکھ دینے کے اشارے کیے پھر نظروں نظروں میں دھمکایا۔ شاداب نے ڈر کر چیزیں رکھ دیں۔ نایاب نے سکھ کی سانس لی مگر دوسری بار وہ دوپٹا اوڑھ باقاعدہ کرسی پر گھونگٹ نکال کر بیٹھ گئی نایاب کے اشارے کام نہ آئے اس نے غیر محسوس انداز سے آگے بڑھ کر کھینچنا چاہا تو وہ دینے پر راضی نہیں ہوئی۔ دلہن نے بھی آنکھیں کھول کر دیکھا اور سامنے صوفے پر بیٹھی دلہن کی خالہ بھی اسی پل چونکیں۔

دلہن تو حق دق رہ گئی خالہ نے آگے بڑھ کر دوپٹا چیل کی طرح جھپٹ لیا۔ اب آگے صورتِ حال نایاب نے کیسے سنبھالی اس نے چیخ چیخ سب کو بتایا۔

”آپ ہی کا مشورہ تھا یہ۔“ وہ امی پر بے طرح برسی۔ ”میرے پارلر کی ریپوٹیشن کا سوال ہے، یہ بات باہر نکل گئی تو کوئی بھی ادھر نہیں آئے گا۔ خدا کے لیے......“ اس نے ہاتھ جوڑے سب نے اسے ٹھنڈا کیا۔ ”آپ لوگ کیا چاہتی ہیں کہ میں بھی اس گھر میں ایک دیوار سے دوسری دیوار ناپوں؟“ اس نے ٹہلتی رباب پر گہرا طنز کیا جو بیٹھ بیٹھ کر تھک جاتی تو گھر کے اسکوائر کو ناپتی رہتی۔ ”یا شاداب کی طرح جلا کباب بن جاؤں۔“ وہ دہاڑی۔ ”امی میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن ہوں مگر خدارا مجھے جینے دیں۔“ شاداب ایک بار پھر کمرے تک محدود ہو گئی۔ نایاب نے اندرونی دروازہ لاک کرنا شروع کر دیا پھر بھی کبھی کبھار شاداب شیشے کے ساتھ چہرہ چپکائے اندر جھانکتی نایاب پردہ برابر کر دیتی۔

☆☆☆

یہ سب ماضی کے قصے ہو گئے ہر گزرا پل ماضی...... مگر...... ماضی میں جینے والی رباب کو تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا مگر حال اتنا سیاہ اور کریہہ ہوگا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اقصٰی کی صورت دیکھی اس کے بال آج بھی کھلے تھے مگر پہلے وہ کھولتی تو گھٹاؤں کا خیال آتا تھا آج وہ بھٹکتی روح لگ رہی تھی۔ سفید بے رنگ بے روح جسم لیے۔

امریکا میں رہنا اب بہت مشکل تھا۔ آئے دن لوگ واپس آتے۔ کہیں کوئی رستہ نہیں...... یوسف نے رستہ تلاش کر لیا تھا اس نے ایک بڑی عمر کی تین جائز ناجائز بچوں کی ماں سے شادی کر لی۔ آفتاب بھائی نیویارک میں تھے اور یہ سال پہلے کینیڈا شفٹ

ہوا تھا کام کی وجہ سے کرسمس پر جب آفتاب بھائی اپنے تایازاد اور ہونے والے بہنوئی سے ملنے گئے۔ وہاں بھائی بیوی بچوں سمیت موجود تھا۔ یہ خبر بجلی بن کر اس گھر پر گری سب کچھ جل کر تہس نہس ہو گیا۔ نایاب جیسی پتھر دل بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کچھ دنوں تو اقصٰی روئی نہیں پھر جب وہ روئی تو در و دیوار بھی اس کے ساتھ اشک بار تھے۔ اس گھر کی بڑی بڑی دیواروں نے ہمیشہ اس گھر کی بیٹیوں کے آنسو اپنے اندر جذب کیے، باہر والوں کو خبر تک نہیں ہونے دی مگر آج اقصٰی اور اقصٰی کے ساتھ بڑی اماں کا تڑپ تڑپ کر رونا...... دیواریں ناکارہ ہو گئیں۔ دنوں لوگ افسوس کرنے آتے رہے پھر سب کے آنسو خشک ہو گئے مگر اقصٰی اور تائی اماں کا رونا بند نہیں ہوا۔

”جہاں باقی چار کھڑی ہیں وہاں ایک اور سہی...... کیا فرق پڑتا ہے۔“ امی کا بظاہر خشک آنکھوں سے اور بے پروائی کے انداز میں دیا گیا بیان بڑے ابا تک کو رُلا گیا۔ وہ بھائی کے پیر چھو چھو کچھ بولتے تھے مگر جواب کون دیتا۔

”اقصٰی ضروری تو نہیں کہ سب لڑکیاں شادی کریں۔“ رباب نے بہت ہمت کر کے اسے رونے سے روکنا چاہا۔

”مگر لڑکیاں شادی کرتی ہیں۔“ وہ تڑخ کر تڑپ کر جھپٹ کر بولی۔

”ہم سب بھی تو ہیں۔“ نایاب نے کچھ کہنا چاہا۔

”تم میں اور مجھ میں فرق ہے، تم سدا اس کنویں میں رہیں۔ میں سمندر کی وسعت دیکھ آئی تھی۔ تمہیں کیا خبر میں دھنک کے کیسے رنگوں میں لپٹی تھی۔ روشنی ہی روشنی...... سنہری روپہلی روشنی جو میرے وجود پہ چھائی ہوئی تھی۔ یہ دیکھو اب یہ میرے ہاتھ کالے ہیں اور میرا... چہرہ مجھے آئینے میں اپنے نقش نظر نہیں آتے۔ میرے چہرے سے سب کچھ مٹ گیا ہے، تم لوگ جی سکتی ہو، تمہارے

پاس امید ہی نہیں تھی ایک تاریک سیدھا راستہ...... اس...... اس نے مجھے کہکشاں کی سیر کروائی تھی، تمہیں پتا ہے اس کے دکھائے ہر راستے کی شاخیں تھیں اور ہر شاخ کے ہزار نئے رستے...... میں واپس کیسے آؤں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ "خدا کرے...... اللہ کرے...... تم مرجاؤ، یوسف...... تمہاری لاش نہ ملے چیل، کوؤں کی خوراک بنو تم...... یوسف میں طاق راتوں میں عبادت کروں گی لوگ دعائیں مانگتے ہیں میں بددعائیں مانگوں گی۔" وہ اپنے آپے میں نہ رہی اس نے اپنا چہرہ پیٹ ڈالا سینہ کوٹ دیا، امی سمیت ان تینوں نے بڑھ بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ تائی اماں سامنے بیٹھیں اور آنسو... جھریوں میں گم ہوجاتے تھے۔

"بولنے دو بولنے دو مہرالنسا میرا دل ٹھنڈا ہورہا ہے میں بھی یہ سب کہنا چاہتی ہوں منہ سے نکلتا نہیں، تم سب بھی کہو میرے ساتھ آواز ملا کر آمین، آمین۔" وہ بہ آواز بلند رونے لگیں اور اگلے پل بیڈ پر لڑھک گئیں۔

"تائی اماں!" سب سے پہلے آگے بڑھ کر اقصیٰ ہی نے ان کا چہرہ گود میں بھرا، وہ ان کا منہ چوم رہی تھی۔

تائی اماں اور اقصیٰ کا رشتہ بہت پرانا تھا، مریم کے جانے کے بعد وہ اقصیٰ سے بہت قریب ہوگئی تھیں، اپنا ہر دکھ سکھ کہتی تھیں، انہوں نے محض بات طے کرلینے ہی سے اقصیٰ کو بہو مان لیا تھا وہ اس کے بہوؤں والے ناز ہی اٹھاتیں کبھی کبھار امی کی نگاہ سے بچ کر اسے اقصیٰ بہو کہتیں اور پھر پوپلے منہ کے ساتھ ہنستیں۔ اقصیٰ کو گدگدی ہوتی اور اب اس رشتے کے ساتھ جیسے یہ رشتہ بھی دم توڑنے کو تھا۔

"وہ کیا سمجھتا ہے، میں شادی نہیں کروں گی، میں ضرور کروں گی عنقریب کروں گی اس سے بہتر آدمی سے...... نایاب تم اس دن آنے والی مسز قیوم کو فون کرکے کہو ہماری طرف سے ہاں ہے، وہ باقاعدہ رشتہ ڈالیں۔" وہ بہ آواز بلند بولی۔

"خدا کے لیے اقصیٰ۔" امی نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیا کررہی ہے تو......"

"ہاں، شادی...... شادی کروں گی، میں ضرور کروں گی، جلد از جلد کروں گی۔" اس کا لہجہ یقین بھرا تھا۔ "میں عالم برزخ میں ہوں، درمیانی راہ، مجھے کنارے لگنا ہے، نایاب میں ایسے جی ہی نہیں سکتی اور امی آپ تایا ابا کی کیا بات کرتی ہیں، آپا بنی اپنے گھر بار والی، بڑے واصف بھیا نے اپنی دنیا بسالی، مریم نے اپنی راہ خود چن لی اور ایک آخری یہ رہ گئے تھے سو یہ بھی کیسے پیچھے رہتے۔ آپ غور تو کریں جائز یا ناجائز...... بڑے ابا کی ساری اولادیں زندگی کے پھل کے سارے رس کشید کررہی ہیں، یہ سب بے فیض لوگ ہیں اور آپ یہاں سے فیض کی امید رکھتی ہیں۔" وہ سب باادب ہوکر مجلسی آداب کے ساتھ بیٹھی تھیں اور وہ جیسے کچھ بیان کررہی تھی۔

"ہم سب ایسی ہی زندگی گزاریں گے تو تم بھی اب صبر کرلو، اب اتنا شور بھی ٹھیک نہیں۔" نایاب ٹھہرے لہجے میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اقصیٰ جواباً کچھ نہ بولی وہ بے حد جتاتی طنزیہ نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

"ایک کام تو تم کررہی ہو لو مفت مشورہ ہے۔" نایاب نکلتے نکلتے پلٹی۔ "موبائل ہاتھ میں لو اور یہ جو تم ہر لائیو شو میں کال کرتی ہو ناں اور یہ جو ڈھیروں مذہبی چینلز کھل گئے ہیں ناں ہر فرقے کے ان سے ذرا معلوم کرلو آئے دن فتوے دیتے رہتے ہیں۔ سوال تم بھی کر ڈالو کہ فتویٰ دیں کیا واقعی سیدوں کی لڑکیوں کی شادی غیر سیدوں میں نہیں کرنی چاہیے، کیا غیر سید میں کردینے سے زلزلہ آجائے گا، طوفان آجائے گا، ہوا اور پانی کی طرح شادی اور اولاد بھی سب کا حق ہے تو ہم اس سے محروم کیوں......؟ آئے دن

مذاکرے، مناظرے کرتے ہیں بڑے بڑے آفاقی مسائل حل کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ بس ہمارا یہ ایک زمینی مسئلہ بھی حل کردیں۔ جائز ہو تو ہم بھی امید رکھیں اور گناہ ہو تو صبر و شکر سے بیٹھ جائیں۔ دل سے ملال اور پچھتاوا تو نکلے کم از کم ثواب و جزا کی کیفیت ہی پیدا ہوجائے پھر باقی کی سانسیں اسی زعم میں گزار لیں گے، ہم باقیوں سے اعلیٰ ہیں۔ برتر ہیں کچھ الگ ہیں۔ یہ تین اور تیرہ والی کیفیت سے تو جان چھوٹے......" نایاب نے اقصیٰ سے زیادہ تیکھی نگاہوں سے گھورتے ہوئے چبا چبا کر کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

"اوہ......" اقصیٰ نے ہونٹ سکوڑے۔ "تھینکس فار دی آئیڈیا......" اس نے موبائل لہرایا۔ "بلکہ گڈ آئیڈیا...... تو کیا میں نہ کروں گی...... ضرور کروں گی...... آر یا پار، دل ٹھنڈا رکھو۔" وہ بے حد پُرسکون لہجے میں بولی۔

"اللہ کی بندی......" امی نے اسی سرعت سے موبائل جھپٹا۔ "خدا کا لکھا مان کر چپ کیوں نہیں ہوجاتی۔ صبر شکر کرلے۔"

"ان سب نے کیا تھا؟" اقصیٰ نے موبائل دوبارہ پکڑ لیا۔

"ضروری ہے کہ ہر چیز چھین کر ہی لی جائے؟" امی نے کہا۔

"پانچ بیٹیوں میں سے کسی ایک کو تو ملنی چاہیے۔"

"میری کوکھ میں آگ لگی تھی، بانجھ فصل اٹھی ہے نظر آئی، بڑھ گئی، ڈھے گئی، بے ثمر، بے چھاؤں......" امی مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔

"جب آپ کو ہمارے بانجھ ہونے کی اتنی پکی خبر تھی تو بلاوجہ انویسٹمنٹ کی، نکلتے ہی کاٹ ڈالتیں خلاص......" اس نے ہاتھ جھاڑے۔

"کمزور بیل کو اگر سہارا نہ ملے تو وہ مرتی گھلتی زمین پر قطرہ قطرہ بڑھتی ہے پھر لوگوں کے پیروں تلے آکر ہر روز مرتی ہے، ہم کمزور بیلیں تھیں، ہر آنے جانے والے نے کچلا، آپ لوگوں نے ہمیں کسی بھی قریبی درخت سے لپٹ کر بڑھنے کیوں نہ دیا اور میں یہ ضرور کروں گی۔" وہ موبائل کو ہاتھوں میں تول رہی تھی۔ امی نے سر پکڑ لیا۔

☆☆☆

"آپ کا کیا خیال ہے وہاں امریکا میں آفتاب بھائی اور اب یوسف کل کلاں اس بے حد مشینی جہان میں بیٹھے اپنے بچوں کے لیے مخصوص کوڈ ڈھونڈیں گے، انہوں نے تو ابھی سے اپنی راہ الگ کرلی ہے۔" نایاب اور رباب بڑی اماں کے تخت پر براجمان تھیں، رباب گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بازو لپیٹے ذرا سا ہلتے ہوئے دونوں کو سن رہی تھی۔ نایاب بہت دلگرفتہ تھی۔ پارلر میں آنے والی خاتون رشتہ ختم ہوجانے کی بات سن کر دوبارہ آئیں اور باقاعدہ پھل مٹھائی کے ہمراہ رشتہ ڈال گئیں۔ بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔ بڑے ابا کے بولنے سے پہلے ابا نے وجہ بتائی اور صاف انکار کردیا۔ اقصیٰ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ بند کمرے میں اتنا بولی اتنا بولی کہ لگا آج کے بعد بولنے کو قوتِ گویائی نہ رہے گی اس نے مسکراتی آنکھوں اور خوب صورت چہرے والے اس نوجوان کی تصویر کو دیکھے بنا پاس کردیا۔

"مجھے قبول ہے، مجھے قبول ہے۔" وہ گردان کرتی جاتی پھر تھک ہار دہاڑیں مار مار روتی پلنگ پر گر گئی۔ رباب دیکھ آئی تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے آنکھیں سوجی پلکیں جڑی جڑی اور ہونٹ پھولے سے...... سوتے میں بھی ماتھے پر تیوریاں تھیں۔

"سوچ رہی ہوں اقصیٰ کو پُرسکون رکھنے کے لیے کوئی دوائی دے دوں۔" رباب سوچ سے باہر نکلی۔

"خواہ مخواہ ڈبل ایم اے کیا، نرسنگ کرلیتیں...... شاداب آپی کی تیمارداری سے دل ٹھنڈا ہوتا تو ایدھی سینٹر جوائن کرلیتیں ثواب تو درج ہوتا۔" نایاب جھلاگئی۔

"میں تو بس یونہی......" رباب لڑکھڑا گئی۔

"اقصیٰ شانت ہو ہی نہیں رہی۔"

"ہو جائے گی۔" نایاب تحمل سے بولی۔ اس کا لہجہ ندی کی طرح پُرسکون تھا۔ "بکرا ذبح کرو تو تھوڑی دیر تڑپنا تو حق ہے ہی...... تڑپے گا۔" وہ اپنے پارلر کی سمت بڑھ گئی۔ رباب ویسے ہی آگے پیچھے جھولتی رہی۔

بہت دیر رات گئے، رباب اور نایاب پارلر کی بڑی بڑی شیشے کی دیواروں کے بیچ بڑی سی بیک والی کرسیوں پر ہلکا ہلکا ہلتے ہوئے اس ایک حیران کُن ناقابلِ یقین انکشاف پر تبصرہ کرنے کی ہمت پیدا کر رہی تھیں۔

"کم و بیش ایک صدی پہلے گدی نشین پیر حاکم شاہ گیلانی کی بیٹی کی شادی نہ جانے کس طرح وہاں آنے والے زائرین میں تبرک بانٹنے والے غیر سیّد مگر بے حد شریف النفس نمازی، پڑھے لکھے عبداللہ حفیظ سے ہوگئی۔ یہ جانے انجانے میں کیسے ہوا کیونکر ہوا، صحیح یا غلط، گناہ یا ثواب چُھپ کر یا علی الاعلان بس ہوگیا۔ دونوں میاں، بیوی بہت کم عمر لکھوا کر لائے تھے، چار بچوں کے بعد محض پینتیس برس کی عمر میں عبدالحفیظ اور تین سال بعد اکیس برس میں بی بی بھی فوت ہوگئیں۔ چار بچے نانا اور ماموں کی کفالت میں چلے گئے۔ باپ کی ذات برادری کیا تھی پتا نہیں مگر نانا، ماموں ایک عالم کے سامنے تھے۔ بچوں کی بے حد محبت سے پرورش کی ایک بیٹی ماموں نے اپنی غیر سید بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے کی بہو بنادی، دوسری کم عمری میں چیچک میں مبتلا فوت ہوگئی رہ گئے بہن کے غیر سیّد بیٹے ان کے لیے نانا' ... ماموں کا نام کافی تھا۔ نانا کی زندگی میں بڑے کو ایک بے حد کھاتے پیتے عزت دار آدمی کا داماد بننے کا موقع مل گیا اور نانا کے بعد ماموں کا بوڑھا اور نحیف ہو جانا، بیٹے کا بہت چھوٹا ہونا چھوٹے کو ہر چیز پر قبضے کا موقع مل گیا اس نے ماموں زاد سے شادی کرلی مگر عمر بہت کم تھی۔ ان کے گزر جانے کے بعد ہونے والی اولادوں نے خود کو پیر حاکم شاہ گیلانی کے نواسے کی حیثیت سے دنیا کے سامنے متعارف کروایا...... تقسیم ہند کے بعد جب سب تتر بتر ہوا تو اس کانی کھوئی حقیقت کو جاننے والے بھی اِدھر اُدھر ہوگئے۔ انہی اولادوں میں دو بھائی بڑے ابا اور ابا بھی تھے۔ اس دنیا میں شاید اب کوئی ایک بندہ بھی ایسا نہ ہوگا جو اس حقیقت سے واقف ہوگا۔ مگر بڑے ابا آخری انتہا تک اور ابا ان کے نقشِ پا پر چلتے ہوئے اس معاملے میں بے حد کٹر تھے۔ باپ غیر سید اچھا بُرا جیسا بھی تھا ماں کی جانب سے ملنے والا یہ اعلیٰ نسب وہ اسے خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ اچانک مل جانے والی دولت، یوں مٹانے کے لیے نہیں تھی۔ شاید اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہوتے تو اتنے انتہا پسند بھی ہوتے، اعتدال پسندی کی راہ اپنا بھی لیتے مگر جھوٹا...... اسے لگتا ہے ہر ایک بس اسی کو دیکھ رہا ہے ہر انگشت اسی کی سمت اٹھی ہے، کیا دنیا میں اب کہیں بھی کوئی سچائی، سچائی نہیں رہے گی۔"

"اتنے بہت سارے چہرے ان کا ظاہر باطن کیسے کھنگالیں مجھے تو تا حدِ نگاہ سیاہی نظر آتی ہے۔" رباب بہت دھیمے کہہ رہی تھی۔

"اور میں تو بس زندگی میں صرف ایک انسان ہونا...... چاہتی تھی، اپنی نہ جانے کس چیز کی تسکین کے لیے ہمارے بڑوں نے ہمیں صلیب پر چڑھایا۔ حالانکہ ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہوتی ہے۔" نایاب نے ٹکڑا لگایا۔

"دل چاہتا ہے بڑے ابا کو کٹہرے میں کھڑا کردوں پھر جس سمت منہ اٹھاؤں چلی جاؤں مگر...... کیا ہم پانچوں کی اس قربانی سے ابا لوگ بخشے جائیں گے؟ اللہ کی حلال کی ہوئی چیزیں کوئی انسان کیسے حرام کرسکتا ہے؟ تم کچھ بولتی کیوں نہیں

نایاب؟" رباب نے اس کا ہاتھ ہلایا جو بہت گہری سوچ میں تھی پتا نہیں رباب کو سن بھی رہی تھی۔

"کیا بولوں......؟" اس نے بے حد تلخ سانس بھری۔ "کچھ نہیں تھا نہ ہونے کی امید تھی مگر اک غرور تھا جس کے سہارے میں ہر طرح کی آندھی طوفان اور زلزلے میں بھی تن کے چلتی تھی۔ میری گردن میں ہڈی نہیں اسٹیل کا سریا ڈلا تھا۔ میں نے کبھی بانو...... گردن بھی نہیں گھمائی' جھکانا تو دور کی بات...... پانی کی مسلسل ٹھوکر بڑے بڑے پہاڑوں کو اندر سے کھا جاتی اور وہ ایک دن سمندر بُرد ہو جاتے ہیں، میں آج ویسے ہی کھڑی ہوں لمحہ جاتا ہے، جب بس اندر مجھے گم ہونے سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے خوفزدہ نظروں سے لپک کر رباب کا ہاتھ تھام لیا، وہ کسی بچے کی طرح اندھیرے سے ڈر جانے پر سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔ رباب نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"مجھے نہیں معلوم صحیح کیا غلط کیا...... مگر میں اس ایک جھوٹ کے سہارے ساری زندگی گزار سکتی ہوں۔ اب کیا ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ ان چاروں کو بیچ آنگن کھڑا کر کے الزامات کی بوچھار کریں۔ وہ سر نہوڑائے سنتے رہیں اور ہم بھی یوسف، مریم اور آفتاب کی طرح جدھر سینگ سمائیں بھاگ جائیں، نہیں رباب تم دنیا سے کیا کہو گی...... ہمارا نسب جھوٹا تھا اور یہ ستر سال کے بڑے ابا اور ہمارے دادا، پردادا سب جھوٹے، مکار فریبی تھے اور اب جبکہ ہمیں حقیقت معلوم ہوگئی ہے تو ہم اپنی من مانی کریں گے۔ نہیں رباب جھوٹا ہی صحیح مگر میں اپنے مقام اور مرتبے سے نیچے آکر نہیں جی سکتی۔ سیّدہ نایاب زہرہ میرا نام اپنے سابقے لاحقے بغیر کتنا ادھورا اور بے مایہ لگتا ہے۔ میرا نام میرا غرور ہے، تمہیں پتا ہے مجھ سے ہر روز ایک بار یہ سوال کوئی نہ کوئی ضرور پوچھتا ہے تو میں کہتی ہوں ہم دوسروں میں رشتے داری نہیں کرتے، ہم سیّد ہیں اور ان

پیمائش

نہ کبھی ہماری محبت کی آزمائش کرسکو گے
جاں سے زیادہ کیا فرمائش کرسکو گے
چاہتے ہیں تم کو اتنا جتنا سمندر میں ہے پانی
کیا سمندر کے پانی کی پیمائش کرسکو گے

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

آنکھوں میں آنے والا احترام...... بس پھر مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔"

"احترام......؟ نایاب احترام یا ترحم؟" رباب نے بہت سادہ لہجے میں پوچھا۔

"تم کچھ بھی کہو...... آئینہ آپ کو وہی دکھاتا ہے جو آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔" نایاب سرعت سے کرسی سے اٹھی اب وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی اس نے چٹکی سے قمیص کے بل نکالے دوپٹا ہاتھ سے پریس کیا۔ "میں سیّدہ نایاب زہرہ...... آہم...... ہوں۔" اس نے طمانیت بھری سانس بھری تھی۔ وہ تن کر کھڑی تھی، چہرے پر غرور وانبساط کی گہری ترین لکیریں تھیں۔ رباب بھونچکی رہ گئی۔

"تم بھی ہمارے بڑوں کی سی فطرت لیے پیدا ہوئی تھیں۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ شاید دوسری جماعت میں پڑھ لیا تھا ایک جھوٹ کو سنبھالنے کے لیے سو زندگیاں لینی پڑتی ہیں، یہ کسی جماعت میں جائے بغیر سمجھ آگیا۔" نایاب ابھی تک تن کر کھڑی تھی جیسے کسی اسکول کی اسمبلی میں کھڑی ہو، رباب، نایاب کی بظاہر ہنستی مسکراتی چلاتی تصویر کے اصل رخ کو دیکھ کر حیران تھی۔ اس کی حیرانی دو چند ہوگئی۔ اتنی بڑی تقریر تو پھر آنکھوں میں نمی کس چیز کی...... لمبی لمبی پلکوں تلے یہ جھلملاہٹ کیسی تھی۔ کیا خوشی کے آنسو...... یہاں چار سو شیشے کی دیواریں اور چھت تھی۔ اتنے آئینے جھوٹ تو بولنے سے رہے...... رباب نے سر

گود میں رکھ لیا کوئی نہ کوئی آئینہ اس کی چوری بھی پکڑ لیتا۔ اس کا دامن نم ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

اقصیٰ کی حالت ..... روز بروز قابلِ رحم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ گھنٹوں خاموش رہتی یا پھر ٹی وی پر اونچی آواز میں میوزک چینل لگائے ہم آواز گاتی شاید اندر کا شور کم کرنے کو...... زندگی ایک بار پھر سیدھی سڑک تھی۔ اندھی کالی اور گرم۔

"میں اس گھر سے بھاگ جاؤں گی......" اقصیٰ بے حد اطمینان سے اعلان کرتی۔

"کس کے ساتھ؟" رباب بہت دیر بعد خود کو بولنے کے قابل کرتی۔

"تم بے وقوف ہو رباب بجو...... کس احمق نے یہ غلط فہمی اُڑائی ہے کہ بھاگنے کے لیے کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ بھاگنے کے لیے بس تھوڑی سی ہمت اور پیروں میں جان ہونی چاہیے۔" وہ مدھم لہجے کو پُراسرار کر لیتی...... ارتضیٰ ہونٹوں پر انگلیاں جمائے یک ٹک اسے دیکھتی نایاب کا چہرہ تاثر سے عاری ہوتا۔

"لیکن یہ لفظ بھاگ گئی کچھ پریکٹیکل نہیں لگتا بھاگنے والیاں چھُپ کر دبے دبے قدموں نکلتی ہوں گی۔ اب تصور کی آنکھ سے دیکھو ایک لڑکی ہاتھ میں بریف کیس یا پوٹلی لیے اندھا دھند بھاگ رہی ہو کہ جی میں بھاگ رہی ہوں۔ ابا پیچھے لگے ہیں، سو چیپ یار۔" وہ ہنسی روکتی مگر پھر ہنس پڑتی۔

"اردو لغت کو دوبارہ ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔" نایاب کا چہرہ مزید پتھر ہو جاتا۔ رباب کا اور حق دق...... البتہ ارتضیٰ نے شاید تصور کی آنکھ سے منظر بغور دیکھا وہ اقصیٰ کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

"دراصل میں نے کبھی کسی کو اس طرح بھاگتے دیکھا نہیں۔ وہ اپنی مریم بھی چپ چپاتے نکل پڑی ورنہ کچھ تجربہ رہتا۔" وہ اتنی اونچی آواز میں بولی کہ بڑی اماں سن لیں...... اور وہ سب سنتی تھیں۔

"اتنی کمزور بے بس لڑکیاں آپ کے نسب کا اتنا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر کیسے اور کب تک اٹھا سکیں گی۔" بڑی اماں نے لفظ آپ کے کہہ کر اپنا عندیہ بھی دیا اور مقدمہ پیش بھی کر دیا۔ بڑے ابا گہری پُرسوچ نگاہوں سے شریکِ حیات کو دیکھتے رہے پھر ہنکارا اُبھرا۔

"نسب بوجھ نہیں اعزاز ہوتا ہے۔"

"ہاں ہوتا ہوگا پر ان کے لیے جن کے ماتھے پر سجا ہو۔ یہاں سینے میں تیر کی طرح گڑا ہے، زور سے سانس بھی لیں تو تکلیف بیان سے باہر ہے۔"

"آپ کہنے کیا آئی ہیں؟" ان کا لہجہ غیر معمولی پُرسکون تھا۔

"وہی جو آپ سمجھ نہیں رہے یا سمجھتے ہیں تو انجان بن جاتے ہیں۔" وہ تیزی سے بولیں۔

"سو سال سے زائد عرصے کی محنت کو میں ان فضولیات میں برباد نہیں کر سکتا۔" ان کا لہجہ حتمی تھا۔

"سید صاحب ہم اپنی قبروں پر سات نسلوں تک کا نسب لکھوا لیں گے، آپ ان بچیوں کی زندگی کو کتبوں میں مت بدلیں۔" ان کا لہجہ التجائیہ ہو گیا۔

"جب آپ جانتی ہیں کہ ہم نے فیصلہ نہیں بدلنا تو اچھی بری ہر مثال بیکار ہو گی۔" انہوں نے بحث ہی ختم کر دی۔

"مجھے کیا فرق پڑے گا، وہ پانچوں یا تو منہ سے یا آنکھوں سے کہتی ہیں بڑے ابا کی اولاد جائز ناجائز خواہ کسی بھی ذریعے سے اپنی زندگی کی خوشیاں کشید کر رہی ہے۔ بیگار بھرنے کو ہم ہی کیوں؟ وہ صبح شام مجھے جتاتی ہیں اور......"

"تو پھر وہ اپنے باپ سے بات کریں، تم کیوں درمیان میں پڑی ہو۔" وہ غضبناک ہو گئے۔ "چلی جاؤ...... میری رائے یا فیصلہ اہم ہے تو سب کچھ ٹھیک ہی ہے ورنہ چھوٹا اپنا فیصلہ خود کرے......" اور چھوٹو، ان پانچوں کے ابا وہ تو سانس بھی بھائی کی اجازت

کے بعد لیتے تھے۔ بڑی اماں ناکام لوٹ آئیں، آفتاب بھائی نے فون پر دنیا کے گلوبل ولیج بن جانے کی اطلاع دی اور سمجھایا کہ اس بیکار بحث سے باز آجائیں مگر انہیں اتنی باتیں سننے کو ملیں کہ دوبارہ فون نہیں کیا۔ یوسف نے بھی شاید فون کیا واصف بھائی نے بھی ڈھکے چھپے حمایت کی مگر لاحاصل...... گھر ایک بھوت بنگلا تھا جہاں یہ بدروحوں کی طرح گھومتی گھر کے کاموں میں مگن تھیں۔ ارتضیٰ نے گریجویشن کر لیا تو جامعہ میں ایڈمیشن لے لیا۔ رباب ایک دن جا کر پرائیویٹ کالج میں لیکچرار بن گئی۔ نایاب اپنے پارلر اور شاداب بستر پر بے حد مصروف رہتی۔ بس ایک اقصیٰ...... کبھی وہ اتنا چیختی کہ اسے کمرے میں بند کر دینا پڑتا۔ اسے آگے پڑھنے پر اکسایا گیا، جاب کرنے کی اجازت دی، پارلر میں آنے کو کہا مگر اس کی بس ایک ہی رٹ تھی۔ مجھے بس شادی کرنی ہے۔ کبھی پیروں میں جوتی ڈال کر سر پر اوڑھنی لیے وہ اپنے چند کپڑے پوٹلی میں باندھ کر سی پر ایسے ٹک جاتی جیسے اسٹیشن پر کوئی دیہاتی دوشیزہ گاڑی کا انتظار کر رہی ہو۔

"میں جا رہی ہوں۔ اس گھر سے جا رہی ہوں۔" ابا اور امی نے دروازہ دیکھ بھال کر بند کرنے شروع کر دیے۔ امی نے اقصیٰ کے ساتھ کے پلنگ پر بستر ڈال لیا۔ بڑی ابتر صورتِ حال تھی پھر ایک روز نایاب اور رباب اسے زبردستی باندھ کر پچکار کر نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں...... مہینے بعد ہی بہتر رزلٹ ملا، وہ کافی حد تک نارمل ہو گئی۔ گھر کے کام بھی دیکھنے لگی۔ نایاب کی مدد بھی کرنے لگی۔ ارتضیٰ کو نوٹس بنا کر دیے۔ رباب کی کاپیاں چیک کیں ابھی کلمۂ شکر منہ میں ہی تھا کہ اس دن.....

☆☆☆

بڑے ابا کو فالج کا اٹیک ہوا اور ان کو زمین پر اس طرح ٹیڑھا میڑھا پڑے...... دیکھ ابا برداشت نہ کر پائے اور دل پکڑ کر بیٹھ گئے پورے گھر میں انتہائی ایمرجنسی نافذ ہو گئی سب آپا دھاپی چھوڑ کر اسپتال کے برآمدوں میں چکراتے پھرے۔ ان سب نے یہ جانا کہ یہ دو بزرگ ان کے گھر کے لیے اور ان کے وجود کے لیے کس قدر اہم ہیں۔ سارا گھر تیمارداری اور دعاؤں میں لگ گیا۔ وظائف، نفل، پرہیزی کھانے، مالشیں، عیادت کے لیے آنے والوں کی خاطر داری، ہر بندہ اپنا آپ بھولے جیسے ایک نئے مشن پر لگ گیا۔ باہر والوں کے تسلی بھرے فون اور بھیجے گئے ڈالرز ہی ادائیگیِ فرض ہوئے، بظاہر بہت پریشانی والے مگر بے حد مصروف دنوں میں جب ایک کے بعد ایک آتا جاتا تھا، سارے گھر کے کھلے منہ اور حیرت سے پھٹی آنکھوں کو نظر انداز کرتی مریم یاور بڑے گیٹ سے بہت اعتماد کے ساتھ داخل ہوئی اور سیدھے اپنے ابا کے کمرے میں جا رکی جو جہاں تھا وہاں رہ گیا۔ اس نے تیمارداری کو آئی بڑی آپا سے بہت مدھم لہجے میں ابا کا حال معلوم کیا۔ بڑے ابا ٹیڑھے منہ کے ساتھ لاچار بند آنکھوں اور منہ سے بہتی مسلسل رال کے ساتھ بے حس و حرکت پڑے تھے۔ مریم کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ اس نے ایک بہت اچھے فزیشن کا کارڈ آپا کو تھمایا۔ وہ بے حد خود اعتمادی کے ساتھ ہر شے کو نظر انداز کرتی پورے سترہ منٹ ابا کے بیڈ کے سامنے کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت کا رنگ تھا۔ نایاب نے سوچا کہ پھر وہ اِدھر لینے کیا آئی تھی۔ رباب نے سوچا کہ اسے ڈر کیوں نہ لگا...... ہاں وہ ہمیشہ سے نڈر تھی اور اس کے آنے نہ آنے سے کسی پر کیا فرق پڑا۔ اس نے ایک نگاہ چچا پر ڈالی جو سوائے حیرانی کے دوسرا تاثر چہرے پر نہ لا سکے۔ ان پانچوں کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جتاتا طنز بتاتی ہوئی ہمت اور چلّاتا ہوا ترحم تھا۔ یہ سب اچنبھے سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان سب کو زبان سے کیا کہنا ہوگا یا آنکھوں سے کیا جتلائیں سمجھ نہ آیا۔ خوف بھرے تعجب کے بعد بڑی امی کا چہرہ بے تاثر ہو گیا۔ امی چوکی پر بیٹھی تھیں اور خالی آنکھوں کے ساتھ

منہ اٹھائے مریم کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں وہ فیصلہ نہ کر پائیں کہ وہ کس چیز کا اظہار کریں۔

"تم جو سمجھو کہ یہ بے خوفی اور خود اعتمادی ہے تو ایسا گمان بھی نہ کرنا، وہ اپنے چہرے پر کور چڑھا کر آئی ہے۔ دنوں ہمت پیدا کی ہوگی اس نے خود میں...... تم نے نوٹ نہیں کیا کہ وہ بلی کی چاپ چل رہی تھی۔ وزن کی ذرا سی کمی بیشی اسے منہ کے بل گراتی...... بے خوفی اور بے غیرتی...... خود اعتمادی اور ڈھیٹ پنے میں فرق صرف اردو لغت میں نہیں لکھا ہوتا، تھوڑی عقل بھی ہونی چاہیے۔" اس کے جانے کے بعد رات میں نایاب نے ارتضٰی کو سمجھایا تھا۔ واپس جانے سے پہلے اس نے فون پر آما کو اندر بلایا جس کے ہمراہ دو بیٹے اور ایک بہت پیاری بیٹی تھی۔

"یہ آپ کی بڑی نانو جان یہ چھوٹی نانو ہیں اور یہ سب خالائیں......" مریم کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ اس نے بچوں کو بڑوں سے نہیں بلکہ بڑوں کو بچوں سے ملوایا ہے۔ بچے بہت پیارے تھے امی کے چہرے پر نرمی پھیل گئی۔ رباب، نایاب اور ارتضٰی کی آنکھیں بھی پل بھر کو چمکیں۔ بڑی امی نے ایک سرسری نگاہ کے بعد دوبارہ سامنے دیوار کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک اقصیٰ تھی جو منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اور شاید سانس روکے ساکت نگاہوں سے مریم کو دیکھتی رہی اس کے چہرے پر آسودگی و خود اعتمادی کی چمک تھی۔ اس کا جتلاتا انداز سب پر عیاں تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی مگر اس نے اپنا اندر ان کے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔ بچوں کو آیا کے سنگ آگے کر کے اس نے دو انگلیوں سے بڑی اماں کے پیر چھونے کی کوشش کر کے جیسے اجازت چاہی مگر وہ ایسے اچھلیں جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ مریم بھونچکی رہ گئی۔ چند ساعت انہیں دیکھتے رہنے کے بعد اس کی آنکھوں میں تاسف اور طنز امنڈ آیا۔ اگلے پل وہ تیز قدموں باہر لپکی۔ دروازہ زور سے کھولا اور پھر بند کیا آواز بہت اونچی تھی۔

☆☆☆

اس روز رات بہت جلدی اس آنگن میں اتری، سیاہ، خاموش اور سرد...... بڑی اماں اپنے کمرے میں نہیں گئیں، وہ کروٹ کے بل تخت پر ہی لیٹی رہیں۔

"نہ میں نے کبھی اسے دعا دی نہ بددعا...... مگر سچی کہوں تو دل یہ کہتا تھا کہ وہ اچھے حالوں میں نہ ہوگی بھلا ماں، باپ کا دل دکھا کر منہ کالا کرنے کے بعد وہ سکھ سے کیسے رہ سکتی ہے؟ مجھے یقین تھا وہ پچھتاتی ہوگی گھر سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کا انجام تو الٹ ہی ہوتا ہے ناں، ایسی کسی بھی لڑکی کی بدحالی میں مجھے یہی نظر آتی۔ میں سوچتی وہ آئے گی...... کبھی یہاں پچھتائے گی اور میں...... میں اسے معاف بھی کر دوں گی، دوبارہ سینے سے لگا لوں گی مگر وہ تو یہاں جتلانے آئی تھی۔ بجھی چنگاری کو ہوا دینے، اچھا ہوا تمہارے بڑے ابا ہوش میں نہ تھے اور جو ہوتے تو اس کی آنکھوں کی جیت...... پھر صحیح معنوں میں ایک ہوتا...... کتنی عجیب بات ہے بنو...... مریم کا سکھ دیکھ کر مجھے کتنا دکھ ہو رہا ہے۔" وہ منہ پر دوپٹا رکھ کر بے آواز رونے لگیں۔ "میں چاہتی تھی وہ ایک مثال بنے کہ دیکھو گھر سے رات کے اندھیرے میں نکلنے والی لڑکی کا کتنا برا انجام ہوا۔ میں چاہتی تھی وہ روتی، پیٹتی، سسکتی یہاں آتی سب کے لیے نشانِ عبرت بن کر...... میں کیسی ماں ہوں جو اس کا اعتماد دیکھ کر ہل گئی۔"

"نہ روئیں بڑی اماں نہ۔" نایاب نے ان کے آنسو پونچھے۔

"میں نے اسے بددعا کبھی نہیں دی مگر کبھی یہ بھی نہیں چاہا کہ وہ خوش رہے۔ ہم سب کو ذلت کے اتنے گہرے گھڑے میں دھکیل کر وہ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔" وہ معصومیت سے چہرہ اٹھائے ان چاروں سے پوچھ رہی تھیں۔ نایاب جواباً کچھ نہ بولی اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کی آنکھیں دوبارہ

صاف کیں اور گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اقصیٰ ساری رات پلر سے سہارا لیے بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ رباب صوفے پر دراز ہو گئی، نایاب بڑی اماں کے تخت پر ہی پائنتی جگہ بنائے لیٹ گئیں پتا نہیں وہ سوئی ہوئی تھیں کہ جاگ رہی تھیں۔ نایاب نے ذرا سی آنکھیں کھول دیکھا۔ بڑی اماں کے ہاتھ میں تیل کی شیشی تھی اور ہاتھ میں روئی کا پھایا بنائے وہ نقشین دروازے کے ساتھ کھڑی تھیں۔ نائٹ بلب کی سہمی پیلی روشنی میں وہ عفریت دکھائی دیتی تھیں۔ نایاب نے آنکھیں چندھی کر کے دیکھنا چاہا کہ وہ کیا کر رہی تھیں۔

"اوہ...... نہیں۔" سمجھ آتے ہی وہ سرعت سے بھاگی۔

"یہ...... آپ کیا کر رہی ہیں بڑی اماں؟" اس کی آواز بے یقینی کے احساس سے پھٹ سی گئی۔

"یہ...... یہ کیا......؟" رباب بھی اٹھ آئی اقصیٰ نے وہیں سے گردن موڑ کر صورتِ حال جانچنی چاہی۔

"قبضوں میں تیل ڈال رہی ہوں۔" وہ بہت سکون سے بولیں۔

"مگر...... کیوں...... اس وقت؟" رباب نے مانو سر پیٹا۔ اقصیٰ اٹھ آئی، مریم کے بے حد خاموشی سے سالوں پہلے گھر سے بھاگ جانے پر بڑی اماں نے نہ جانے کیا سوچ کر پھر اس سالخوردہ دروازے میں تیل نہیں ڈالا تھا وہ اکثر سوچتیں کہ اگر اس رات دروازہ چوں بول جاتا تو مریم گھر سے کبھی نہ نکل پاتی مگر مریم سارے انتظامات کر کے نکلی تھی۔ بڑی اماں ہمیشہ دروازے کو موردِ الزام ٹھہراتی رہیں۔ دروازہ بول، بول سب کے کان کھا جاتا مگر وہ تیل نہ ڈالنے دیتیں۔ یہ نفسیاتی وجہ تھی یا کیا...... مگر آج اس طرح رات کے اس پہر وہ کیا سوچ کر قبضے تیل بھری روئی سے بھگو رہی تھیں۔ اقصیٰ آن کے آن صورتِ حال سمجھ گئی۔ وہ تیر کی طرح ان تک آئی جو اب زمین پر بیٹھی آخری قبضے کو روئی لگا رہی تھیں۔

"یہ کیوں کر رہی ہیں آپ؟" وہ الجھ کر بولی۔

"کیا کر رہی ہوں، دیکھ نہیں رہی ہو یہ دروازہ ایک بار پھر بولنے سے محروم کر دیا میں نے......"

"مگر کیوں؟" رباب کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ اقصیٰ بے یقین تھی...... کیا بڑی اماں وہی کہہ رہی تھیں جو انہیں سمجھ آ رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ بڑی اماں کو پشت سے جکڑ لیا۔ ان کے شانے پر منہ ٹکایا پھر آگے ہو کر ان کے بھیگے گال پر بوسا دیا۔

"نہیں بڑی اماں...... نہیں کبھی نہیں......" اس کی آواز بہت دھیمی ہو گئی۔

"کمال کر دیا بڑی اماں، آپ نے مسئلے کا یہ حل ڈھونڈا۔" نایاب کی ہنسی زہر خند تھی۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔

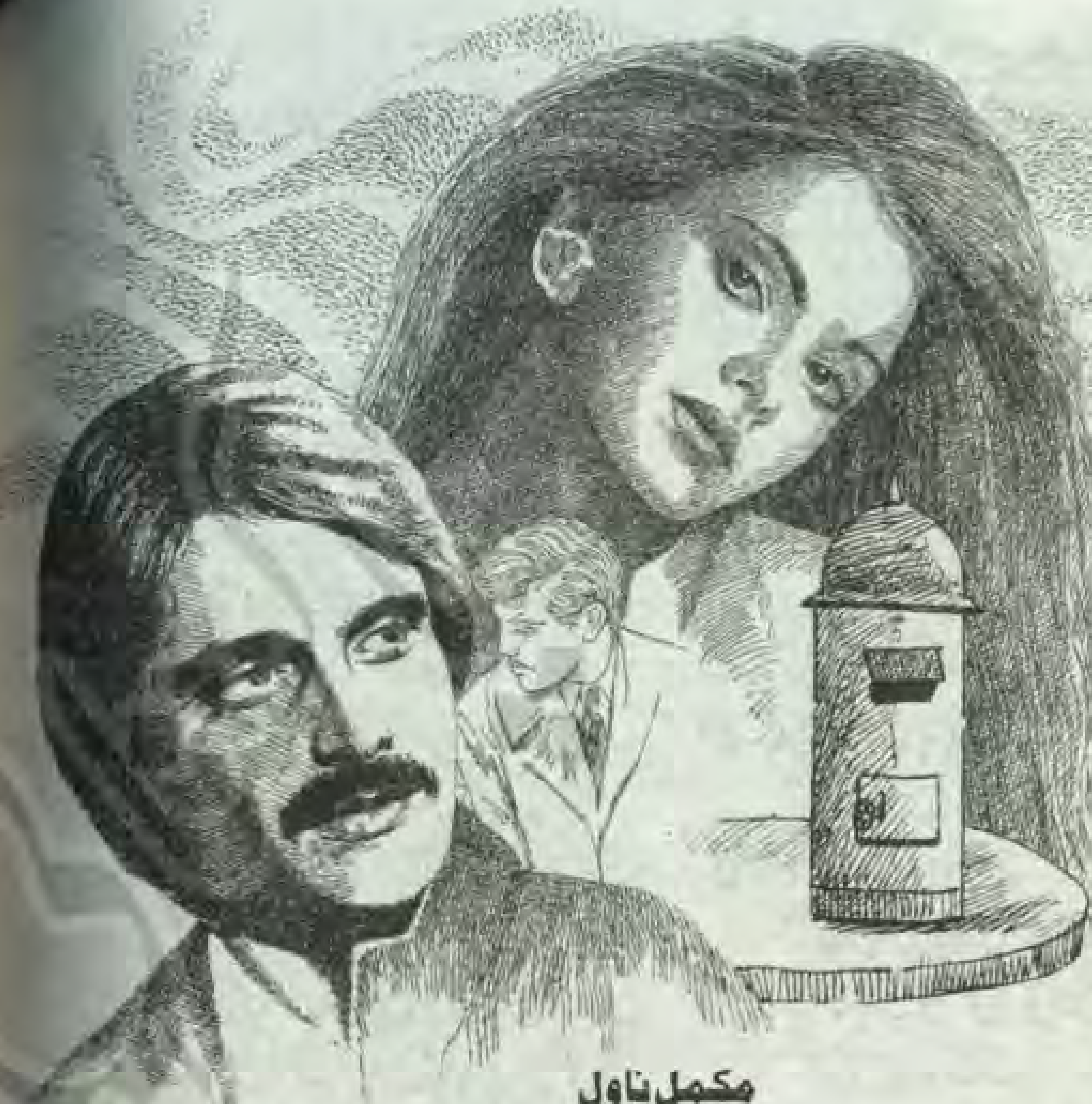
"میں نے سوچا شاید...... ایسا ہی کرنا چاہیے۔" بڑی اماں نے معصومیت سے تینوں کے چہرے دیکھے...... جملے ان کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔

"ایسا نہیں ہوتا بڑی اماں......" رباب نے تیل کی بوتل ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے رندھی آواز میں کہا۔

"چوں دروازے کی نہیں، ضمیر کی ہوتی ہے جب بندہ اسے چپ کروا دے تو پھر باہر کی آوازیں کس گنتی کی۔" نایاب بدقت بولی۔

"میں اس کے علاوہ اور کچھ کر نہیں سکتی۔" وہ بے چارگی سے بولیں۔ "تم لوگوں کے بجھے چہروں کے آگے اس کا چمکتا چہرہ طمانچہ بن کر گال پر لگا ہے۔" وہ رو دیں۔

"ہمیں کسی ایسے راستے کی ضرورت کبھی تھی بھی نہیں۔" اقصیٰ نے یقین سے کہتے ہوئے ان کے گال کو چوم لیا اور انہیں سہارا دیے بستر کی سمت بڑھی۔ نایاب اور رباب بھی پیچھے تھیں۔



مکمل ناول

جانِ جاناں

عتیقہ محمد بیگ

تیسرا اور آخری حصہ

خود اپنے سے ملنے کا تو یارا نہ تھا مجھ میں
میں بھیڑ میں گم ہو گئی تنہائی کے ڈر سے
بے نام مسافت ہی مقدر ہے تو کیا غم
منزل کا تعین کبھی ہوتا ہے سفر سے
نکلے ہیں تو رستے میں کہیں شام بھی ہو گی
سورج بھی مگر آئے گا اس راہ گزر سے

ہجر و فراق کے بحر میں غوطہ زن معصوم دلوں کی دلگداز داستان

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی...... اور خود کو آئینے میں دیکھ رہی تھی کہ وہ اس حسیب کی دلہن بنی ہے...... جس کے ساتھ اس کا دل کا کوئی رشتہ نہیں...... وہ ارمغان کی یاد میں کھو سی گئی، اس نے سارے خطوط شاید آخری مرتبہ نکالے اور بے صبری سے پڑھنے لگی اِک خط میں اس نے لکھا تھا...... ”جب تم میرے نام کی مہندی ہاتھوں پر سجاؤں گی...... تو ایسا لگے گا جیسے آسمان سے سورج اتر آیا ہو، خوب مہندی کا رنگ آئے گا یہ بھی

محبت کی نشانی ہے۔'' اس نے اپنی ہتھیلیوں کو کھولا...... مہندی کا رنگ بہت گہرا چڑھا تھا۔ وہ رونے لگی۔ اور اس کے آنسو ہتھیلیوں پر گرنے لگے۔

''ارمغان...... تم نے مجھے ایسی محبت کا احساس کیوں دلایا...... جبکہ تم تو مجھ سے محبت کرتے ہی نہیں ہو۔'' اس نے روتے روتے خط کو مٹھی میں دبایا...... پھر وہ روتے ہوئے گھٹے گھٹے انداز میں چیخنے لگی۔ ''تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا...... کیوں؟'' وہ بے قابو سی ہوگئی۔ اس نے ارمغان کے ہر خط کو سچ مان لیا تھا... وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس محبت کا احساس ارمغان نے نہیں...... بلکہ اکرم نے اسے دلایا ہے، اس کی باتوں سے بے پناہ محبت جھلکتی تھی...... وہ رحما کو ٹوٹ کر پیار کر بیٹھا تھا مگر صرف خطوط کے ذریعے...... اور رحما بھی ان لفظوں کی دیوانی تھی کیونکہ اس کے نزدیک تو وہ ارمغان کے الفاظ تھے۔ ان خطوط کے سہارے وہ اب تک امید بھری سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر سر جھکا لیا...... آنکھیں موند لیں، یہ خطوط دیکھ کر اسے کچھ سکون مل رہا تھا جیسے وہ اس کے پاس بیٹھا ہو، اس نے بڑی بے صبری سے دراز میں سے سیل فون نکالا اور ارمغان کے نمبر پر کال کرنے لگی...... دوسری طرف نمبر آف جا رہا تھا۔ وہ کانپتے ہونٹوں سے بولی۔

''ارمغان فون آن کرو...... میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں تمہارے بغیر رہ سکتی ہوں ہاں...... میں تمہارے بغیر رہ سکتی ہوں۔'' وہ روتی چلی گئی۔

☆☆☆

صبح صبح اس کی آنکھ سیل فون کی رنگ پر کھلی۔ اس نے فون کی اسکرین پر دیکھا تو حسیب کا نام جگمگا رہا تھا۔ کل رات ہی اسے یہ سیل فون گفٹ میں ملا تھا۔ اس نے مجبور ہو کر Yes کا بٹن دبا دیا۔

''گڈ مارننگ۔'' دوسری طرف حسیب خوشگوار موڈ میں بولا۔

''جی۔'' اس نے ہلکی سی آواز میں جواب دیا۔

''آپ مجھے گڈ مارننگ نہیں کہیں گی۔ میں تو ساری رات سو نہیں پایا۔ پوری رات آنکھوں میں کاٹی کہ اس فون پر پہلی آواز آپ میری سنیں۔ کیا مجھ سے پہلے اس نمبر پر آپ سے کوئی بات کر چکا ہے؟'' وہ شوخ ہوا۔

''نہیں تو...... آپ نے تحفہ دیا ہے تو آپ کے علاوہ کیسے کسی سے بات کر سکتی ہوں۔'' اس نے خفگی سے جواب دیا حالانکہ کل رات ارمغان کو کال اس نے اسی فون سے کی تھی مگر اس کا فون آف جا رہا تھا۔

''اوہو...... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' وہ اس کی بات پر شرمندہ ہوا۔ ''آپ اس فون پر کسی سے بھی بات کر سکتی ہیں۔'' اس نے ہنس کر جواب دیا۔

''تھینک یو۔'' رحما نے شائستگی سے کہا۔

''آج آپ کا کیا پروگرام ہے؟'' وہ خوش دلی سے پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں۔''

''تو پھر میں آپ کو لنچ کے لیے لینے آ رہا ہوں۔ آپ ایک بجے تک ریڈی رہیے گا۔'' اس نے گویا حکم دیا۔

''جی...... اور کچھ؟'' اس نے شائستگی سے پوچھا۔

''آپ خفا ہیں کیا؟ اگر آپ کا باہر چلنے کا موڈ نہیں تو کوئی بات نہیں پھر کسی دن چلتے ہیں۔'' اس نے بجھے بجھے انداز میں کہا۔

''نہیں...... میں تیار رہوں گی۔'' اس نے ایک تابعدار کی طرح اس کی ہر بات پر ہاں کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کی ہاں میں ہی سب کی بہتری تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے خوشی کا اظہار کیا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ رحما اپنی الماری کی طرف کپڑے نکالنے بڑھ گئی۔

☆☆☆

اس نے پوسٹ آفس سے آج چھٹی کی تھی۔ وہ صبح اٹھ نہیں پایا تھا اور اٹھتا بھی کیسے رات کو اس کی دنیا جو لٹ گئی تھی۔ سکینہ دروازے پر کئی دفعہ دستک دے کر

جا چکی تھی۔

''کل رات دیر سے گھر آیا ہے، تھکا ہوا ہوگا کیوں پریشان ہو رہی ہو؟'' قیوم صاحب نے بیوی کو سوچ میں پایا تو تسلی دینے لگے۔

''ہاں...... ہاں، بس ایسے ہی فکر مند ہو جاتی ہوں۔'' سکینہ نے اپنی چائے کا کپ ٹیبل سے اٹھا لیا۔

''تم مجھ سے کوئی بات تو نہیں چھپا رہیں؟'' سکینہ کے چہرے پر سے فکرمندی کے بادل چھٹ نہیں رہے تھے تو قیوم صاحب نے پوچھ ہی لیا۔

''نہیں...... نہیں میں کیوں آپ سے کوئی بات چھپاؤں گی اور کوئی بات ہو تو چھپاؤں۔'' اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجالی، وہ قیوم صاحب کو بیٹے کے دل کی کیفیت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اکرم نے اسے روک رکھا تھا۔

''شکر ہے تم مسکرائیں تو۔'' وہ ہنس کر بولے۔

''عمر کا کچھ تو لحاظ کر لیا کریں۔ اب تو آپ کے بیٹے کی عمر بیاہنے والی ہوگئی ہے۔'' سکینہ نے چھیڑتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاہاہا...... دل تو جوان ہے بیگم۔'' وہ مسکرائے اور چائے کا سپ لیا۔

''دل کو قابو میں رکھیے۔'' یہ کہہ کر وہ نظریں چرا گئی۔

''اکرم کو سونے دو۔ اب دروازے پر دستک نہ دینا۔''

''نہیں بھئی، میں تو اپنے بابا جی کے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے کچن میں جا رہی ہوں۔'' اس نے برتن ٹرے میں اٹھا کر رکھے اور مسکرا کر بولی۔

''ہاہاہا...... چلو بابا جی ہی سہی مگر تمہارا ہی ہوں۔'' قیوم صاحب شوخی سے بولے تو سکینہ ہنستے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

کوئی آدھے پون گھنٹے بعد آ کر اس نے پھر دروازے پر دستک دی اور اسے پکارا۔

''اکرم...... اکرم تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہے، سب خیریت تو ہے؟'' وہ اب واقعی ڈر رہی تھی۔ اکرم جو اَب نیند سے بیدار ہو چکا تھا ماں کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر کافی فکر مند ہوا اور اپنے بکھرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ سکینہ نے ایک بھرپور نظر بیٹے پر ڈالی، اکرم نے نظریں چرا لیں۔

''کیا بات ہے...... کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' سکینہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''اماں بس ہلکا سا سر میں درد تھا اور دیکھیں بخار بھی لگ رہا ہے۔'' اکرم نے بخار کا بہانہ بنا کر اپنے ٹوٹے دل کو چھپایا۔ سکینہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا وہ بخار میں تپ رہا تھا۔

''ہاں بیٹا بہت تیز بخار ہے۔'' سکینہ سنبھل سی گئی وہ اپنے بیٹے کے دل کے راز سے انجان تھی۔

''چل ہاتھ منہ دھولے میں ناشتے کے بعد تجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی ہوں۔'' سکینہ نے پیار سے ہدایت دی۔ وہ اماں کی بات پر مسکرایا۔

''اماں میں خود کلینک چلا جاؤں گا۔ میں کوئی چھوٹا بچہ تھوڑی ہوں۔''

''نہیں، نہیں آج چھٹی ہے، مجھے تھوڑی سی چیزیں بھی خریدنی ہیں۔'' سکینہ نے اپنا پروگرام بتایا۔

''اچھا اماں جیسا آپ کا حکم۔'' وہ ماں کے چہرے کی خوشی چھیننا نہیں چاہتا تھا جو اپنے بیٹے کے ساتھ شاپنگ پر جانا چاہتی تھی۔

''باہر سے کھانا بھی کھلاؤ گے کیا؟'' سکینہ نے مسکرا کر پوچھا۔ اس نے قہقہہ لگا دیا، وہ ماں سے اس بات کی امید نہیں کر رہا تھا اور وہ ہنستا چلا گیا۔

''ابا کے ساتھ چلی جائیں۔'' اس نے ہنستے ہنستے جواب دیا جبکہ اندر سے اس کا دل رو رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کو اپنی کیفیت کا بالکل بھی کچھ اندازہ نہیں لگانے دینا چاہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ بازار اک بہانہ ہے اس کی ماں صرف اسے خوش دیکھنا چاہتی ہے۔

''قیوم صاحب ہوٹل کا کھانا اب برداشت نہیں کر سکتے ورنہ شاید انہیں ساتھ لے جاتی۔'' سکینہ نے

ہنستے ہنستے شوہر کی کیفیت بتائی۔ جو اکرم کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ وہ انہیں قیوم صاحب ہی کہتی تھی۔

”کیا بات چیت ہو رہی ہے؟“ قیوم صاحب مسکرا کر بستر پر آ بیٹھے۔

”ابا، اماں آپ کے ساتھ بازار جانا چاہتی ہیں۔ آپ انہیں ساتھ لے جائیں۔“ اکرم نے خوش دلی سے بتایا۔

”بازار...... توبہ، توبہ۔“ قیوم صاحب کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔

”آپ کے ساتھ میں کب جا رہی ہوں۔ ہمیشہ آپ نے بازار کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگایا۔ میں نہیں جانے والی۔“ سکینہ نے خفگی ظاہر کی۔

”ہاہاہا...... بس عورتوں کو غصہ دلانا ہو تو انہیں شاپنگ سے منع کر دو۔ جنگلی بلی کی طرح جھپٹ پڑتی ہیں۔“ اکرم نے باپ کی بات پر قہقہہ لگا دیا۔

”ٹھیک ہے، مت جاؤ باپ بیٹا، میں اکیلی ہی بازار چلی جاؤں گی۔“ سکینہ منہ بسورے کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ دونوں ہنسنے لگے۔

”تیری ماں زیادہ خفا ہو جائے گی۔ جا بول اسے کہ تو بازار لے جائے گا۔“ انہوں نے بیٹے کا کندھا تھپتھپا کر اسے مشورہ دیا۔

”ابا، میں اماں کو ضرور لے کر جاؤں گا۔“ وہ ہنسا اور کمرے سے باہر نکل گیا اور ماں کو آوازیں دینے لگا۔

”اماں...... اماں میں آپ کے ساتھ بازار جاؤں گا اور ہم باہر سے کھانا بھی کھائیں گے۔ آپ میرے لیے کپڑے نکال دیں۔“ اس نے صحن سے ماں کو آوازیں دیں جو چھت پر لگے تار سے کپڑے اتار رہی تھی۔ بیٹے کی بات سن کر خوشی سے کھل اٹھی۔

☆☆☆

ایک شاندار ہوٹل کے پاس گاڑی جا رکی۔ ہوٹل کے دربان نے ان کی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ گاڑی سے اتری اور اس کے ساتھ لابی میں بڑھ گئی۔ اندر جاتے ہی ہوٹل کا منیجر بھاگا بھاگا ان کے پاس پہنچا۔ اس نے ادب سے سلام کیا اور انہیں خوش دلی سے اندر لے آیا۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس نے ٹیبل ریزرو کروا رکھی تھی۔ وہ بینکوئٹ ہال کی طرف بڑھ گئے۔ اس خوب صورت ہال سے باہر سڑک کا بہ خوبی نظارہ ہو سکتا تھا۔ منیجر کی سربراہی میں وہ اپنی ٹیبل تک گیا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے ٹیبل کے پاس جا کر کرسی نکالی اور رحما سے پیار سے بولا۔

”بیٹھو۔“ رحما خاموشی سے بیٹھ گئی۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھا۔

”اس سب پروٹوکول کی کیا ضرورت تھی؟“ رحما نے دبے لفظوں میں کہا۔

”تمہیں اس کی ضرورت نہیں مگر مجھے تھی۔ میں نے تم سے......“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”اچھا چھوڑو تم کھانے میں کیا لو گی؟“ حسیب نے مینو کارڈ اُسے کھول کر دیا۔

”جی...... آپ جو منگوانا چاہتے ہیں منگوا لیں، میں کھا لوں گی۔“ اس نے مینو کارڈ بند کر کے جواب دیا۔

”او کے۔“ اس نے بیرے کو اشارہ کیا جو اسی کا منتظر تھا۔

”جی سر۔“ بیرا پاس آ کر ادب سے بولا۔

”آپ Sea food کی ساری اسپیشل ڈشز لے آئیں۔“ اس نے مسکرا کر آرڈر دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ وہ Sea food پسند نہیں کرتی تھی۔

”آپ کچھ فکرمند سی لگ رہی ہیں۔ کیا کچھ کہنا چاہتی ہیں؟“ اس نے رحما کو اپنے ہاتھوں کو مسلتے دیکھا جو نروس ہو رہی تھی کہ وہ تو Sea food پسند نہیں کرتی تو کیسے کھائے گی۔

”نہیں تو۔“ اس نے خود پر قابو پا کر جواب دیا۔

”آپ میرے نام کی مہندی لگا چکی ہیں۔ میرے نام کی انگوٹھی آپ کی انگلی میں چمک رہی ہے۔ اس کے باوجود آپ مجھ سے دور ہیں۔ اگر آپ Sea food پسند نہیں کرتیں تو مجھے انکار کر سکتی ہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”آپ کیسے جانتے ہیں کہ میں Sea food پسند نہیں کرتی؟“ اس نے جھٹ سے پوچھ لیا۔

”ہاہاہا...... نورین بھابی سے۔“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔

”اوہ...... اچھا۔“ وہ خفا سی ہو گئی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ”نورین کی بچی میں تمہیں دیکھ لوں گی۔“

”پلیز بھابی سے کوئی بات مت کیجیے گا ورنہ پھر وہ آپ کے متعلق مجھے کوئی بات نہیں بتائیں گی۔“ اس نے معصوم چہرہ بنا کر کہا۔

”آپ پلیز بیرے کو بلا کر آرڈر کینسل کروا دیں۔“ وہ فکرمندی سے بولی۔ وہ ہنسا۔

”فکر نہ کرو ہمارا آرڈر دیسی کھانے کا ہے۔ وہ تو میں نے آپ کو تنگ کیا تھا۔“ وہ شوخی سے بولا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی اور شیشے کے پار دیکھنے لگی۔ باہر سڑک پر کچھ دیکھ کر وہ چونکی۔ اسے اکرم ایک بوڑھی خاتون کے ساتھ نظر آیا۔

”آپ کے دوست......“ جملہ اچانک اس کے منہ سے پھسل گیا۔ وہ ایسا بولنا نہیں چاہتی تھی۔

”کون......؟“ اس نے بھی مڑ کر باہر دیکھا۔

”ارے اکرم اور آنٹی، یہ شاید اِدھر ہی آ رہے ہیں۔“ وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا اور ہوٹل کے باہر چل پڑا۔ وہ اکرم کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی تھی۔

”اکرم...... اکرم۔“ حسیب نے تیزی سے وہاں پہنچ کر اسے آواز دی۔

”حسیب تم؟“ اکرم نے پلٹ کر اسے دیکھا تو خوش ہو گیا۔ حسیب، اکرم سے مل کر سکینہ سے مخاطب ہوا۔

”آنٹی آپ کیسی ہیں، آپ میری منگنی پر کیوں نہیں آئیں؟“ حسیب نے شکوہ کرنا شروع کر دیا۔

”بیٹا تیری دلہن دیکھنے ضرور آؤں گی تو میرے لیے اکرم جیسا ہے۔“

”آنٹی چلیں، ابھی میں آپ کو اپنی دلہن دکھا دیتا ہوں۔“ اس نے شوخی سے جواب دیا۔

”کیسے؟“ سکینہ حیرت سے بولی۔ اکرم بھی اس کے جواب پر ایک دم گھبرا سا گیا۔ وہ رحما کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”آنٹی آئیں ناں، وہ یہیں ہوٹل کے اندر بیٹھی ہے۔ آج میں نے اسے دعوت دی تھی اور اتفاق سے آپ لوگ بھی یہاں آ گئے۔ وہ میرے ساتھ نروس ہو رہی تھی، اچھا ہوا آپ لوگوں کے ساتھ کم از کم کھانا تو آرام سے کھا سکے گی۔“ اس نے سکینہ کا ہاتھ تھام لیا اور اندر لے آیا۔ اکرم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ نظریں جھکا کر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ حسیب کے تعارف کروانے پر وہ سکینہ سے بہت پیار سے ملی۔

”السلام علیکم آنٹی۔“ اس نے ادب سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، کیسی ہو بیٹا! ہم نے تمہیں آ کر ڈسٹرب تو نہیں کر دیا؟“ سکینہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں آنٹی۔“ اس نے اپنے ساتھ والی کرسی پر انہیں عزت کے ساتھ بٹھایا۔

”بہت پیاری بچی ہے۔“ سکینہ نے حسیب پر نظریں جما کر اس کی تعریف کی۔ رحما نے اکرم کی طرف اک نظر کی، وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ وہ اکرم کے رویّے پر فکرمند سی ہوئی مگر پھر خود پر کسی حد تک قابو پا لیا۔

”یار تم لوگ انجوائے کرو پھر کبھی......“ اس نے حسیب کے کان میں سرگوشی کی۔

”آنٹی ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گی... تو جانا چاہتا ہے تو شوق سے چلا جا۔“ اس نے ہنس کر کہا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اکرم، رحما کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سکینہ نے پرس میں سے ایک ہزار روپے کا نوٹ نکالا اور بڑے پیار سے رحما کے ہاتھ میں تھمایا۔ رحما گھبرا کر بولی۔

”نہیں آنٹی، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے وہ نوٹ واپس سکینہ کے ہاتھ میں تھمایا۔

”آنٹی مجھے دے دیں رحما کو چھوڑیں۔“ حسیب نے ہنس کر کہا تو اکرم کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی اور یہ مسکراہٹ وہ مجبوراً لایا تھا۔ سکینہ ہنس کر بولی۔

"نہیں بیٹا، یہ تمہارا حق ہے۔" سکینہ نے واپس وہ نوٹ رحما کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس کے سر پر پیار کیا۔

"آنٹی اب جلدی سے اکرم کا بھی سوچیں اور میرے ساتھ ساتھ اس کے بھی ہاتھ پیلے کر دیں۔" وہ اکرم کا ہاتھ دبا کر بولا۔ سکینہ نے آہ بھری اور افسردگی سے کہا۔

"بیٹا بہو لانے کا مجھے بھی بہت ارمان ہے مگر یہ وہ خط والی لڑکی کو بھولے تو ہی میں اپنے گھر بہو لا سکتی ہوں۔" سکینہ نے رحما کے سامنے یہ بات کہہ دی۔ رحما کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اکرم نے سر جھکا لیا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ رحما کو یوں پتا چلے گا اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ ماں کیا بات کرے گی۔

"یار کون ہے وہ خط والی لڑکی؟" حسیب نے اکرم کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے پوچھنے لگا۔ "مجھے بتا میں اسے ڈھونڈ لاتا ہوں۔" حسیب نے نگاہیں اکرم پر جما دیں۔ رحما کی نظریں اکرم کے وجود سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ اس کا دل پریشان ہو چکا تھا کہ کہیں وہ خطوط' کہیں وہ باتیں، وہ پیارا اکرم کا تو نہیں تھا۔ اکرم نے خود کو بہ مشکل سنبھالا اور سنجیدگی سے بولا۔

"اماں آپ کون سی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے حسیب کو جواب دیا پھر وہ رحما سے نظریں نہ ملا سکا جو بجھے چہرے سے اس کو گھورتی جا رہی تھی اور وہ اس کے سامنے چور بنا بیٹھا رہا۔

تم ہی نے سوار کیا تھا
محبت کی کشتی میں وصی
اب نظریں نہ چرا
مجھے ڈوبتا دیکھ کر

☆☆☆

وہ گھر پہنچی اور اس نے دراز میں سے سارے خطوط نکالے، وہ بے تابی سے خطوط کے لفافے دیکھنے لگی تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے کسی بھی لفافے پر لندن کا کوئی ٹکٹ نہیں لگا تھا۔ وہ بڑبڑائی۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ سارے خط اکرم نے مجھے لکھے ہیں۔" وہ رو پڑی۔

"اس نے مجھے کیوں دھوکا دیا۔ وہ مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ رو رہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ سیل پر نورین کا نام دیکھ کر اس نے جھٹ سے فون اٹھایا۔ دوسری طرف نورین نے خوشگوار موڈ میں ہیلو کہا۔

"ہیلو رحما کیسی ہو، آج لنچ کیسا رہا؟" وہ جانتی تھی کہ حسیب اسے لنچ پر لے کر جا رہا تھا اس نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نورین گھبرا سی گئی۔

"کیا ہوا؟" نورین نے حیرت سے پوچھا۔ رحما کی تو جیسے جان نکل رہی تھی۔ رونے سے آواز مزید درد بھری ہو گئی۔

"نورین...... نورین وہ خط...... وہ خط......" اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ حقیقت جان کر وہ بوکھلا سی گئی تھی کہ قسمت نے اس کے ساتھ کیا کھیل رچایا تھا، وہ تو ان سب خطوط کو ارمغان کے خط سمجھ کر اپنے دل کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی اور اسے آج بھی یہ سب خطوط اپنے جینے کا سہارا محسوس ہوتے تھے۔ جنہیں وہ تنہائی میں پڑھ لیتی اور اپنے آنسو بہاتی۔

"پلیز رحما، خدا کے لیے کچھ تو بولو۔ کون سے خط...... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" نورین، رحما کے لیے فکر مند سی ہو گئی ... وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ رحما نے روتے روتے کہا۔

"نورین وہ خطوط ارمغان نہیں اکرم لکھتا رہا۔" رحما نے روتے روتے سچ بتایا۔

"کون اکرم؟" نورین نے حیرانی سے پوچھا جو اکرم کو بالکل نہیں جانتی تھی اور رحما نے اس سے چھپا رکھا تھا۔ وہ روتے روتے بولی۔

"پوسٹ آفس میں کام کرنے والا اکرم...... جس سے میں نے مدد لی تھی اور ارمغان کو اس کے گھر کا ایڈریس لکھا تھا۔ وہ مجھے خود سے خط لکھتا رہا اور میرے

سارے خطوط بھی اسی کے پاس ہوں گے۔" اس نے سب کچھ نورین کو بتا دیا تو نورین کو یوں لگا جیسے آسمان اس کے سر پر آ پڑا ہو۔

"تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟" نورین نے خود پر قابو پایا اور سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"خود اکرم سے۔" رحما نے روتے روتے جواب دیا۔

"تم اس شخص سے کیسے ملی ہو۔ آج تو تمہیں حسیب کے ساتھ لنچ پر جانا تھا پھر اکرم اور یہ بات...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" نورین بے چین سی ہو گئی۔

"اکرم، حسیب کا دوست ہے اور اکرم کی والدہ سے میری ملاقات ہوئی۔ ان سے یہ بات میں نے سنی کہ اکرم ایک خط والی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔" رحما نے ایک درد انگیز آہ بھری اور سسکیاں لیتے ہوئے نورین کو بتایا۔

"کیا......؟" وہ بے ساختہ بولی۔

"نورین میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس شخص نے مجھے بے وقوف بنا کر رکھا۔ میرے احساسات سے کھیلتا رہا۔ اسے میری ذات کے متعلق ہر بات کا علم ہے اور میرے لکھے خطوط بھی اس کے پاس ہوں گے۔" وہ سہم سی گئی۔

"دیکھو رحما تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب تم اس شخص سے کل ملو اور اس سے اپنے تمام لکھے خطوط لے آؤ۔ دیکھو اماں اور خالہ ثریا سے کسی قسم کی کوئی بات نہ کرنا۔ وہ لوگ بہت خوش ہیں، تمہیں یہ قدم بہت بہادری سے لینا ہوگا اور جتنی جلدی ہو سکے وہ خط حاصل کر لو کہیں حسیب کے علم میں یہ بات آ گئی تو کچھ بُرا نہ ہو جائے۔ خالہ ثریا تو پہلے ... ہی بہت فکر مند رہتی ہیں۔" نورین نے سنجیدگی سے اپنے دل کا ڈر بیان کیا۔ رحما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" وہ روتے روتے بولی۔

"یہ تو خیر میں نہیں جانتی...... یہ تو اس شخص سے پوچھ کر ہی تمہیں جواب مل سکے گا کہ اس نے تمہارے ساتھ ایسا کیوں کیا......؟" نورین، رحما کے لیے بہت اپ سیٹ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ صبح گھر کے کام انجام دے کر تیار ہو گئی اور پھر ماں سے کہنے لگی کہ اسے اپنی سہیلی قیصرہ کے ہاں جانا ہے، اسے کوئی کام ہے، قیصرہ اس کے بچپن کی سہیلی تھی اور ثریا اسے بھی اچھی طرح سے جانتی تھی، پہلے پہل تو وہ اسی کالونی میں رہتی تھی پھر ان لوگوں نے گھر شفٹ کر لیا۔ ثریا نے رحما کو بے فکر ہو کر اجازت دے دی۔ کل رات سے رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں وہ ہمت کر کے پوسٹ آفس پہنچی، اکرم اسے اپنی سیٹ پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ خود پر قابو پا کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اکرم نے اسے دیکھا تو بوکھلا سا گیا، وہ بھی کل رات سے سو نہیں پایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سرخی چھائی ہوئی تھی جیسے وہ کسی اذیت میں ہو۔

"مسٹر اکرم! آپ جانتے ہیں کہ میں یہاں آپ کے پاس کیوں آئی ہوں؟" رحما نے درشت لہجے میں بات کی۔

"میں سمجھا نہیں؟" اکرم نے خود پر قابو پا کر جواب دیا۔

"آپ نے میرے احساسات سے جو کھیل کھیلا ہے، میں اس کے بارے میں بات کرنے یہاں آپ کے پاس آئی ہوں۔" رحما نے تیکھا لہجہ اختیار کیا اس کا پورا وجود لرز رہا تھا...... اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" اس نے نظریں چرا کر جواب دیا۔ وہ اس کی کیفیت دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اسے خود بھی اپنی محبت کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ رحما کو پریشان دیکھتا تو وہ خود بے چین ہو جاتا۔

"یہ خط آپ نے مجھے لکھے ہیں؟" وہ تڑپ کر بولی اور ساتھ ہی سارے خطوط اپنے بیگ میں سے نکال کر دکھانے لگی۔ وہ گھبرا سا گیا مگر اس نے نفی کی۔

"نہیں، میں نے یہ خط نہیں لکھے۔" اس نے صاف جھوٹ بول دیا۔ رحما کی آنکھوں سے آنسو ٹپک

رہے تھے۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" وہ چیخی۔

"نہیں...... میں نے یہ خط نہیں لکھے اور میں کیوں لکھوں گا۔" اس نے دوسرا جھوٹ بولا تا کہ اسے تسلی ہو کہ یہ سارے خط ارمغان نے ہی اس کے لیے لکھے تھے جس سے وہ بے پناہ محبت کرتی تھی۔

"میں یہاں اسی لیے آئی ہوں کہ آپ سے جان سکوں کہ آپ نے یہ خط کا سلسلہ کیوں جاری کیا جبکہ میں آپ کو نہیں جانتی تھی اور نہ آپ مجھے...... پھر یہ اتنا گھٹیا مذاق میری زندگی سے آپ نے کیوں کیا؟" وہ کانپتے وجود سے سچ جاننے کی منتظر تھی۔

"دیکھیں مس رحما آپ خود پر قابو رکھیے اور میں نے آپ سے مذاق نہیں کیا...... بھلا میں کیوں آپ سے مذاق کروں گا۔ واقعی یہ خط میں نے نہیں لکھے ہیں۔" اس نے ایک دفعہ پھر نفی کی۔ وہ اسے سچ نہیں بتا سکتا تھا اگر سچ بتاتا کہ یہ خط اس نے لکھے تھے اور وہ اس سے محبت کر بیٹھا ہے تو کیا فائدہ ہوتا۔ اس کے ہاتھ میں تو اب حسیب کے نام کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ وہ بری طرح سے اس کی نظروں سے گرنا چاہتا تھا تا کہ وہ ان خطوط سے آزاد ہو جائے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ بہت حساس دل رکھتی ہے۔

"ٹھیک ہے جو بھی ہوا مجھے اس پر کوئی بات نہیں کرنی۔ یہ خطوط جو آپ نے مجھے لکھے ہیں، یہ میں آپ کے حوالے کر رہی ہوں اور پلیز میرے لکھے ہوئے خطوط آپ مجھے واپس کر دیجیے۔" اس نے وہ تمام خطوط اس کی ٹیبل پر رکھ دیے اور بیگ کی زپ بند کر کے بولی۔ "میں کل ہی اپنے خط لینے آجاؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے خط میرے حوالے کر دیں گے۔" وہ رُندھی آواز میں کہہ کر تیزی سے پوسٹ آفس سے باہر نکل گئی اور وہ اس سارے حالات سے بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ وہ ڈھیلے سے انداز میں کرسی پر ڈھے سا گیا کہ وہ بے جان سا ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"حسیب کی دو دفعہ کال آئی تھی۔ تم اس کا فون کیوں نہیں اٹھا رہی ہو؟" وہ دوپہر میں بستر پر بے سُدھ لیٹی تھی کہ خالہ عظمت نے آ کر کہا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے سے ڈر گئی تھی۔ اسے خبر نہ ہوئی کہ سیل فون کب بجتا رہا اور کب بند ہوا۔ خالہ عظمت نے اسے آ کر اطلاع دی تو وہ زندگی میں واپس آئی۔

"خالہ وہ بس خیال ہی نہیں رہا۔" اس نے اپنا سیل فون بیگ سے نکالا تو حسیب اور نورین کی کئی کالز آئی ہوئی تھیں۔

"بیٹا، سب خیریت تو ہے؟" خالہ عظمت نے اس کے سر پر پیار دے کر پوچھا جو اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر فکر مند سی ہو گئی تھیں۔

"نہیں خالہ بس قیصرہ کے ساتھ بازار میں گھومتی رہی اس وجہ سے تھکان ہو گئی۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بیٹا تو خوش تو ہے؟" خالہ عظمت نے اس کا ہاتھ تھام لیا جو ارمغان کے متعلق اس کے درد سے واقف تھیں۔

"ہاں خالہ، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کل حسیب کے ساتھ میں لنچ پر گئی تھی۔ اس کے ساتھ خوشگوار موڈ میں باتیں ہوئیں۔ آپ فکر نہ کریں، میں خوش ہوں۔" اس نے نظریں چرا کر حسیب کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔

ثریا بھی کمرے میں آ گئیں۔ بیٹی کو خوشی سے حسیب کی تعریفیں کرتے دیکھ کر اُن کے دل کا ڈر بھی دور ہو گیا۔ جو ہر وقت رحما کے لیے سوچ رہی تھیں کہ وہ خوش تو ہے یا پھر انہوں نے رحما پر دباؤ ڈال کر اسے حسیب کے ساتھ منسوب کر کے غلطی کی ہے۔

"یہ خالہ بھانجی میں کیا گفتگو چل رہی ہے؟" ثریا نے پیار سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اپنے داماد اور بیٹی کی کل ہونے والی دعوت کے متعلق پوچھ رہی ہوں۔ حسیب بہت نیک بچہ ہے۔" عظمت نے خوشی خوشی اس کی تعریف کی۔ رحما نے تو اس کی تعریف میں ہزار پُل باندھ دیے تھے۔ ثریا

مسکرائیں۔

"مجھے بتاؤ کہ کل کیا کیا کھانا کھایا؟" ثریا نے شریر لہجے سے بیٹی کا ہاتھ تھام لیا۔

"اماں سب کچھ۔" اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر ایک معصوم بچے کی طرح ماں کو خوش رکھنے کے لیے جھوٹ بول دیا۔

"آج شاید پھر وہ کہیں رحما کو لے کر جا رہا ہے۔" خالہ عظمت نے مسکرا کر بتایا۔ وہ چونکیں۔

"نہیں تو خالہ۔" اس نے حیرت سے انکار کیا۔ خالہ عظمت مسکرا کر بولیں۔

"بیٹا وہ تمہیں آج شاپنگ پر لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے اجازت مانگ لی ہے اور میں نے انکار بھی نہیں کیا، کیوں ثریا میں نے ٹھیک کیا ناں؟" عظمت نے سنجیدگی سے ثریا کو مخاطب کیا۔

"ہاں...... ہاں رحما تمہاری بھی تو بیٹی ہے۔ ضرور رحما جاؤ۔ یہی تو دن انجوائے کرنے کے ہیں۔ خدا نے تمہارے نصیب میں حسیب جیسا اچھا انسان لکھا ہے جو تمہاری ہر خواہش پورا کر سکتا ہے۔" ثریا نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ وہ رحما کے لیے بہت خوش تھیں۔

"جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔" اس نے نگاہیں جھکا کر ماں کو جواب دیا اور پھر ثریا اور خالہ عظمت نے اس کی شادی کی پلاننگ شروع کر دی۔ وہ ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی مگر اس کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ تنہا ہے، بہت تنہا۔

☆☆☆

"ہائے کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟" ریما نے مسکرا کر اکرم کے گھر کے کھلے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

"ہاں...... ہاں آؤ بیٹی۔" سکینہ صحن میں جھاڑو دے رہی تھی۔ اتنی پیاری لڑکی اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی دیکھ کر فوراً اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ شاید وہ اسے رحما سمجھ رہی تھی۔ ریما نے ادب سے سکینہ کو سلام کیا اور پھر اپنا تعارف کروایا۔

"آنٹی میں ریما ہوں۔ ریما...... حسیب کی بہن۔ آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی شاید پانچ سال پہلے۔" اس نے سکینہ کو یاد کروایا۔

"ریما...... تم اور اتنی پتلی۔" سکینہ اسے یاد کر کے ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاہاہا۔" اس نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ "شکر ہے میرے موٹاپے کی وجہ سے آپ نے یاد تو رکھا۔ اکرم تو ہمیں بھول گیا تھا۔ ہمیں تو نئے گھر کی بھی اس نے اطلاع نہ دی۔ وہ تو خدا نے اس دن اکرم سے ملوا دیا۔ یہ بتائیں آپ حسیب کی منگنی پر کیوں نہیں آئی تھیں؟" ریما نے شکوہ کرنا شروع کر دیا۔

"آؤ بیٹی، پہلے بیٹھو تو۔" سکینہ نے اسے پیار سے چارپائی پر بٹھایا اور قیوم صاحب کو پکارنے لگی۔ "قیوم صاحب، سنیں۔"

"انکل کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بس بیٹا، اتار چڑھاؤ ہوتا رہا ہے، تمہارے انکل کی طبیعت کی وجہ سے حسیب کی منگنی پر نہیں آ سکی مگر شادی پر ضرور آ جاؤں گی۔" سکینہ نے مسکرا کر بتایا۔

"جی کیوں نہیں...... آپ کو ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔" ریما شوخ ہوئی۔

"کون آیا ہے؟" قیوم صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر کمرے سے نکلے۔ سکینہ جلدی سے بڑھی اور قیوم صاحب کو سہارا دے کر صحن میں لائی۔

"ریما آئی ہے، حسیب کی چھوٹی بہن۔" سکینہ نے اس کا تعارف کروایا۔

"کیسی ہو بیٹی؟" قیوم صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

"جی انکل، میں ٹھیک ہوں اور آپ اتنے کمزور کیوں ہو گئے۔ کیا لسی پینا چھوڑ دی ہے۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاہاہا...... تمہیں یاد ہے۔" قیوم صاحب کرسی پر بیٹھ کر ہنستے ہوئے بولے۔

"اور کیا آپ سب لوگوں نے تو ہمیں

بُھلا دیا۔" وہ منہ بسور کر شکوہ کرنے لگی اور سکینہ اور قیوم اسے صفائیاں دیتے رہے۔

☆☆☆

"آج کیا ریما آئی تھی؟" اکرم نے گھر آ کر حیرت سے پوچھا۔ اس نے اسے واپسی پر دیکھ لیا تھا جب وہ کچھ کام سے پوسٹ آفس سے باہر نکلا تھا۔

"ہاں، ہاں دوپہر کو آئی تھی۔ کھانا کھا کر گئی ہے...... بہت پیاری بچی ہے۔" سکینہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اماں کھانے میں کیا ہے؟" اس نے ماں کی بات کو پلٹا۔

"آلو شوربا بنایا ہے، گرم کر کے لاؤں؟" سکینہ بستر سے اٹھیں۔

"ہاں اماں، بہت بھوک لگی ہے۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا۔ سکینہ کمرے سے نکلنے لگی... پھر رک کر بولی۔

"رحما کا کچھ پتا چلا؟"

"جی...... نہیں تو۔" اکرم نے نظریں چرالیں وہ ماں کو سچ کیا کہتا کہ جس لڑکی سے وہ محبت کرتا ہے وہ حسیب کی دلہن رحما ہے۔

"بیٹا رحما کا کچھ پتا نہ چلا تو؟" وہ افسردگی سے کہنے لگیں۔

"تو اماں میں کسی اور لڑکی سے شادی کرلوں گا۔" اس نے مجبوراً مسکرا کر ماں کو جواب دیا۔

"سچ...... تو ریما کے متعلق کیا خیال ہے۔ تیرے ابا جی کو بہت پسند ہے اور مجھے اس کی آنکھوں سے لگا کہ تو اس کے دل میں کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔" سکینہ نے ہنستے ہنستے بتایا۔

"نہیں اماں، ریما اور میرا جوڑ نہیں۔ وہ بہت امیر گھرانے سے ہے اور ہم لوگ......" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"دیکھو اکرم جب وہ لڑکی ایسا نہیں سوچتی تو پھر تو کیوں سوچ رہا ہے؟"

"اماں وہ میرے متعلق ایسا نہیں سوچتی۔ آپ غلط فہمی میں ہیں۔" اس نے ماں کا ہاتھ تھام کر انہیں ریما کی سوچ سے آزاد کرنا چاہا جبکہ درحقیقت ریما اسے پسند کرتی تھی اور وہ بھی جانتا تھا اور اسے کالج کے دنوں میں انکار بھی کر چکا تھا۔ وہ کالج کے ان سنہری دنوں کو یاد کرنے لگا جب ریما کے انداز کچھ اور ہی اس سے کہنے لگے تھے۔

"بیٹا کہاں کھو گئے؟" سکینہ نے کافی دیر بعد اسے پکارا تو وہ ماں کی آواز سے چونکا۔

"جی اماں۔" اس نے خود کو سنبھالا۔

"کھانا گرم ہے جلدی سے کھا لو پھر ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔" سکینہ ٹرے رکھ کر بولی۔

"ابا نے دوا لے لی؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"اوہ مجھے باتوں میں یاد نہیں رہا۔" سکینہ گھبرا کر بولی اور پھر وہاں سے چلی گئی۔ اکرم نے مسکرا کر کھانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

وہ صبح پوسٹ آفس پہنچا تو اسے پوسٹ آفس کے باہر بینچ پر رحما بیٹھی نظر آئی۔ اس نے اپنے قدم اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ پنک کلر کے سوٹ اور سفید دوپٹے میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔

"جی آپ؟" اکرم نے اسے دیکھ کر حیرت ظاہر کی۔

"آپ نے میرے خط واپس کرنے تھے۔ آپ لے آئے؟" اس نے اکرم کے دونوں ہاتھ خالی دیکھ کر خفگی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یقین کریں وہ خطوط میرے پاس نہیں ہیں۔" اس نے صاف انکار کر دیا، وہ رحما کو ہرگز نہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ خط اس نے لکھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

"کیا مطلب؟ آپ مجھے خطوط کیوں نہیں دے رہے۔ پلیز میرے لکھے خطوط مجھے واپس کر دیجیے۔" اس نے کچھ سوچ کر نرم لہجے میں کہا تا کہ اس کے لکھے

خطوط اکرم واپس کر دے۔

"رحما آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتا۔" اس نے پھر صاف صاف جھوٹ بول دیا۔

"نہیں، آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیے کہ آپ دوسروں کی زندگی کو اپنے لیے مذاق سمجھتے ہیں۔ دیکھیں اگر آپ نے میرے خطوط مجھے واپس نہیں کیے تو مجبوراً مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔" اس نے غصے سے دھمکی دی، وہ کانپ رہی تھی وہ بینچ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اکرم نے سر جھکا لیا وہ رحما کی کیفیت پر افسردہ سا ہو گیا۔

"آپ...... آپ کو پیسے چاہئیں؟" اس نے روتے روتے پوچھا۔

"نہیں...... نہیں پلیز آپ مجھے شرمندہ مت کیجیے۔" وہ اس کی بات سن کر تڑپ اٹھا۔

"بولیں...... آپ کو کتنے پیسے چاہئیں۔ آپ پیسوں کی خاطر لڑکیوں کے خطوط اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور وقت گزرنے کے بعد ان خطوط کو کیش کروا لیتے ہیں۔ یہی آپ کا کاروبار ہے ناں......!" وہ تقریباً چیخ اٹھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" وہ گھبرا گیا کہ رحما اسے بہت گھٹیا سمجھ رہی ہے کہ وہ شادی کے بعد ان خطوط کے ذریعے اسے بلیک میل کرنے والا ہے۔

"اگر ایسی بات نہیں تو آپ میرے خطوط واپس کیوں نہیں کر رہے؟" اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ اکرم کا گلا ہی دبا دے گی۔

"رحما آپ میری بات کو سمجھیں۔" اس نے نظریں چرا کر کہا۔

"کیا بات ہے، کون سی بات؟ آپ میرے خطوط واپس کیجیے۔ نہیں تو...... نہیں تو......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اس کی سانسیں اٹکنے لگیں۔

"دیکھیں، آپ خود کو ریلیکس رکھیں۔" وہ روتے روتے بینچ پر بیٹھ گئی تو اکرم نے سنجیدگی سے اسے تسلی دی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رحما کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے رونا شروع کر دیا۔

"دیکھیے۔" اکرم نے گھبرا کر اس کا کندھا ہلکے سے چھوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا رحما نے غصے میں اسے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

"آپ نے مجھے چھونے کی جرأت کیسے کی؟" اس نے غصیلی نظریں اس پر جما دیں۔ اس سے پہلے کہ اکرم کے لب ہلتے، رحما روتے روتے پوسٹ آفس سے باہر نکل گئی۔ ریما جو اکرم سے ملنے کے لیے پوسٹ آفس آ پہنچی تھی اس نے اکرم اور رحما کے درمیان یہ منظر دیکھ لیا اور وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اکرم اور رحما کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

☆☆☆

اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خالہ عظمت نے اس کے افسردہ چہرے کو بھانپ لیا اور اس کے پیچھے کمرے میں آ گئیں۔ رحما کو روتا دیکھ کر وہ بے چین سی ہو گئیں۔

"کیا ہوا رحما؟ کیوں رو رہی ہو۔ کچھ تو بولو؟" خالہ عظمت نے اسے اپنے سینے سے لگا کر پوچھا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ اپنا درد کیسے سناتی کہ ارمغان کے بجائے اکرم نے اسے خط لکھے تھے۔

"رحما کیا ہوا ہے؟ کچھ تو بتا میری بچی؟" خالہ عظمت نے افسردگی سے پوچھا۔

"بس خالہ اپنی قسمت پر رونے کو دل کر رہا ہے۔" وہ روتے روتے بولی۔

"نہ میری بیٹی۔ تیری قسمت بہت اچھی ہے۔ بدقسمت تو وہ ارمغان ہے جس نے تجھے دھوکا دیا تو بھول جا اسے۔ جتنا تو اسے یاد کرے گی وہ اتنا ہی اذیت تیرے لیے بن جائے گا۔" خالہ عظمت نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے تسلیاں دینے لگیں۔

"خالہ خدا سے ہر وقت تو دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے اپنے پاس بلا لے۔ میں جینا نہیں چاہتی۔" رحما نے روتے روتے کہا۔

''نہیں، میری بچی۔ تیرے مرنے کے بعد ہم کیا زندہ رہ سکیں گے؟ اپنی ماں ثریا کا سوچ، میرا سوچ۔ ارمغان کو نکال کر حبیب کا سوچ جس کے نام کی انگوٹھی تو نے پہنی ہے۔'' خالہ عظمت نے جو اکرم کے مسئلے سے انجان تھیں..... اسے حبیب کے متعلق سوچنے کی ہدایت دی۔ ثریا گھر پر نہ تھیں وہ سودا لینے بازار گئی تھیں۔ آج حبیب اور ریما نے رات کا کھانا کھانے آنا تھا۔ خالہ عظمت نے پھر اسے سر پر پیار دیا۔

''بیٹی حبیب اور ریما آج رات گھر پر آرہے ہیں۔ وہ شادی کے تاریخ کی بات کرنے آرہے ہیں۔ کیا تم جانتی ہو؟'' خالہ عظمت نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں، خالہ۔'' وہ خالہ عظمت کی بات پر روتے روتے انہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔

''ہم تو ایک سال کے بعد تمہاری شادی کا سوچ رہے تھے۔ ہم نے سمجھا کہ شاید تم نے اور حبیب نے جلد شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' خالہ عظمت نے سنجیدگی سے بتایا۔

''نہیں خالہ، ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''اب میں نے اور ثریا نے فیصلہ کیا ہے کہ جب شادی کرنی ہے تو دیر کیوں کی جائے۔'' خالہ عظمت نے اسے اپنی کل کی بات چیت کے متعلق بتایا۔ وہ خاموش رہی۔ وہ نہ بھی تو اس رشتے سے نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے نظریں جھکالیں جیسے وہ ہار گئی ہو۔

''بیٹی ہم تمہارا اچھا سوچ رہے ہیں۔'' خالہ عظمت نے اس کا ہاتھ تھام لیا جو سرد پڑا ہوا تھا جیسے وہ بے جان ہوگئی ہو۔

''رحما، ثریا کے ارمانوں کو تم پورا کرسکتی ہو۔ خود کو سنبھالو بیٹی۔ سب کچھ بھول جاؤ۔'' خالہ عظمت نے اسے سمجھایا۔ وہ خالہ عظمت کے سینے سے لگ گئی اور لرزتی آواز میں بولی۔

''خالہ آپ لوگ جو کررہے ہیں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں حبیب سے شادی کروں گی اور ارمغان تو میرے دل سے کب کا اتر چکا ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''ایسی بات ہے تو پھر رو کیوں رہی ہو؟'' خالہ عظمت نے اس کے سر پر پیار دیا۔ رحما کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور جواب بھی کیسے ہوتا۔ وہ خود نہیں جان پارہی تھی کہ وہ کس لیے رورہی ہے۔

☆☆☆

وہ پریشان حالت میں خاموش بیٹھا رہا۔ خیر دین نے اسے دوبارہ چائے کا پوچھا مگر اس نے نفی کردی آخرکار خیر دین اس کے پاس آبیٹھا۔

''بیٹا پریشان کیوں ہو، کیا بات ہے؟ مجھ سے اپنا دل ہلکا کرسکتے ہو۔'' خیر دین نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''چاچا وہ......وہ مجھے برا آدمی سمجھتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں اس کے خطوط سے اسے بلیک میل کروں گا۔'' اکرم، رحما کی سوچ پر بوکھلا سا گیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑلیا۔

''بیٹا اکرم، تو فکر نہ کر۔ اب کی دفعہ میں رحما سے بات کروں گا۔ میں اسے بتاؤں گا کہ تو اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔'' خیر دین نے افسردگی سے اسے سمجھایا جس کی آنکھیں سرخ ہوچکی تھیں۔

''نہیں چاچا، وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ میں نے خطوط کا اعتراف بھی نہیں کیا۔'' اس نے ہلکی آواز میں بتایا۔ اس کے حلق سے آواز نکلنا مشکل ہورہی تھی۔

''بیٹا تو اسے سچ کیوں نہیں بتارہا۔ اس طرح تو وہ تجھے برا سمجھتی رہے گی۔ تو اس کو بتادے کہ تو نے اس کی صرف جان بچانے کے لیے خط لکھے تھے اور شاید تیری جگہ وہ ہوتی تو وہ بھی ایسا کرگزرتی۔ وہ سچ جان کر سمجھ جائے گی کہ تو برا آدمی نہیں ہے۔ بیٹا تو فرشتہ ہے فرشتہ۔'' خیر دین نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''نہیں چاچا، میں سچ نہیں بتا سکتا اور اب سچ کا فائدہ بھی نہیں۔ وہ میرے بچپن کے دوست حبیب کی منگیتر ہے۔ سچ سن کر وہ مزید اپ سیٹ رہے گی۔ میں اس کی زندگی میں خوشیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اسے تکلیف میں دیکھتا ہوں تو بے چین رہتا ہوں نہ جانے کیوں۔'' اس نے اپنی کنپٹی رگڑی۔

''بیٹا تو اس طرح خود کو اور اسے بھی تڑپاتا رہے گا۔ تجھے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہیے باقی خدا پر چھوڑ دے۔'' خیر دین نے اسے بجھے دل سے مشورہ دیا جو رحما کو سچ بتانے سے نفی کرچکا تھا۔

''وہ مجھ سے کبھی محبت نہیں کرے گی۔'' اس نے لمبی سانس لی۔

''ایسا تو سوچ رہا ہے..... تم دونوں میں یہ لفظوں کا سلسلہ چلتا رہا ہے جب تجھے اس سے محبت ہوگئی ہے تو اسے کیوں نہیں ہوسکتی۔'' خیر دین نے اسے تسلی دے کر جواب دیا۔

''چاچا اس نے وہ سارے خط ارمغان کو لکھے تھے، مجھے نہیں۔'' اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

''بے شک مگر اب وہ جان چکی ہے کہ وہ خطوط تم نے لکھے تھے۔ ہاں تم نے...... وہ تم سے بات چیت کرتی رہی۔ وہ تمہاری ہر بات اور تم اس کی ہر بات جانتے ہو تمہیں کیا اچھا لگتا ہے اور وہ کیا پسند کرتی ہے۔ تم دونوں جانتے ہو۔ جس طرح تمہارے لیے وہ خط تمہارے جینے کا سہارا بن گئے ہیں اس طرح رحما کے لیے بھی تمہارے ان خطوط کو بھولنا ناممکن ہے۔'' خیر دین نے افسردگی سے جواب دیا۔

''چاچا، وہ میرے لکھے سب خطوط مجھے واپس کرگئی ہے۔'' اکرم نے تڑپ کر کہا۔

''بیٹا اگر تو اسے خطوط واپس کردے گا تو کیا وہ تیرے دل سے نکل جائے گی؟ بیٹا وہ سمجھ نہیں پارہی ہے۔ میں نے دنیا دیکھی ہے وہ تیرے پاس لوٹ کر آئے گی تو نے اس کے دل میں نہ چاہ کر بھی محبت کا بیج بودیا ہے۔ وہ تجھے بھول نہیں سکتی اور نہ تو اسے اپنے دل سے نکال پائے گا۔'' خیر دین نے آہ بھری۔

''چاچا، میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے پاس لوٹ آئے۔ میں نے اسے خدا سے تب مانگا تھا جب وہ حبیب کے رشتے میں نہیں تھی اب تو وہ میرے جگری

دوست کا پیار ہے۔ میں اس کی خوشیاں کیسے چھین سکتا ہوں۔'' اکرم نے حبیب کا سوچ کر بتایا۔

''بیٹا، تو اپنی زندگی خدا پر چھوڑ دے۔ خدا تیری سچی محبت کو دیکھ چکا ہے۔ اگر وہ رحما کے نصیب میں تیری محبت لکھ چکا ہے تو پھر کوئی بھی اس بات کو مٹا نہیں سکے گا۔'' اکرم کے لبوں پر بے بسی کی مسکراہٹ تھی۔ اسے ایسی کوئی امید نہیں تھی کہ رحما اس کی ہوجائے گی۔

☆☆☆

ثریا اور عظمت نے اسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا۔ وہ اپنے دل کا دکھ چھپا کر حبیب کے لیے تیار ہوئی۔ گرین رنگ کے موتیوں کے کام والے سوٹ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ خالہ عظمت کے کہنے پر اس نے ہلکا میک اپ کرلیا مگر اپنی سونی سونی آنکھوں میں وہ کیسے خوشی کے رنگ بھر سکتی تھی۔ اس لیے وہ حبیب سے نظریں چرانے لگی۔

''رحما آپ کی کوکنگ بہت اچھی ہے۔ مجھے بھی سکھا دیں۔'' ریما نے کھانا کھاتے ہی کہا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھارہی تھی۔ تب ہی ریما نے اسے مخاطب کیا جو اکرم اور رحما کے اس منظر کو سوچ سوچ کر رحما کی طرف زیادہ توجہ کررہی تھی۔

''جی ضرور۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' اس کے کافی دیر خاموش رہنے پر حبیب نے اس سے پوچھ لیا۔

''ہاں ہاں بیٹا، رحما کو کل سے بخار تھا۔'' خالہ عظمت نے ساری صورتِ حال کو سنبھالا۔

ریما نے دل میں سوچا کہ کل تو اس نے رحما کو اکرم کے پاس دیکھا تھا اور آج جو حالت رحما کی ہے ضرور رحما اور اکرم کے درمیان کوئی رشتہ ہے مگر کیسا رشتہ؟ وہ زیادہ سوچ نہ پائی۔ خالہ عظمت نے ریما کو کھیر کی ڈش تھمائی۔

''بیٹی میٹھا تو لو۔'' خالہ عظمت نے مسکرا کر کہا۔

''جی......جی ضرور۔'' اس نے تھوڑی سی کھیر ایک پیالے میں ڈالی اور مسکرا کر بولی۔ ''رحما کو بھی

زیادہ کھیر کھلائیں۔ زیادہ میٹھا ان کو کھانا چاہیے۔ ان کی شادی جو ہونے والی ہے۔'' ریما نے کھیر سے بھرا چمچ اس کی طرف بڑھایا۔ خالہ عظمت مسکرانے لگیں۔ رحما نے سر جھکا لیا۔ حبیب بھی کچھ نروس ہو گیا۔

''ہاں...... ہاں، کیوں نہیں۔ رحما آپ لوگوں کی امانت ہے جب آپ تاریخ بتا دیں۔'' ثریا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''بھائی جان اگلے ماہ کی پانچ تاریخ ٹھیک ہے کیا؟'' اس نے بھائی سے مسکرا کر پوچھا۔ حبیب مسکرانے لگا اور ریما نے بھائی کی مسکراہٹ دیکھ کر پانچ تاریخ پکی کر دی۔ رحما کچھ لانے کی غرض سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے چلے جانے پر حبیب گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے رحما کچھ الجھی الجھی سی نظر آ رہی تھی۔ خالہ عظمت نے حبیب کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر بات سنبھالی۔

''بیٹا رحما شرما گئی ہے اور پھر ماں کی جدائی سے بھی وہ ڈرتی ہے۔ بہت حساس بچی ہے۔'' خالہ عظمت نے رحما کی کھوئی کھوئی کیفیت کی وضاحت کی۔

''ہاں، خالہ میں سمجھتا ہوں۔'' وہ مسکرانے لگا۔

''میں رحما سے بات کرتا ہوں۔'' وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''رحما چائے بنا رہی ہوگی۔ ابھی آ جاتی ہے تم گرمی میں وہاں کیا کرو گے؟'' خالہ عظمت نے اسے روکا۔

''خالہ وہ بھی تو گرمی میں کھڑی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا اور پھر باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ ثریا اور ریما شادی کی باتوں میں مشغول تھیں اور خالہ عظمت کو رحما کی فکر لگی ہوئی تھی جس کا دل کسی اور سفر پر تھا۔

☆☆☆

''ہیلو...... جناب! آپ مجھ سے خفا ہیں کیا؟''

وہ باورچی خانے میں چائے بناتے بناتے کچھ سوچ رہی تھی کہ آخر وہ سب کچھ ٹھیک ہو جانے پر خوش کیوں نہیں ہو رہی کہ حبیب کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''نہیں تو۔'' اس نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا اور ابلتے پانی میں چائے کی پتی ڈالی۔

''شکر ہے، آپ کو یاد تو ہوگا میں پہلے بھی یہاں آپ سے ملا تھا جب آپ دوستی کرنے پر رضامند نہیں تھیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں...... ہاں۔'' اس نے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجالی۔

''آپ شادی کی تاریخ پر خوش ہیں؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی اور اس نے دودھ دیگچی میں ڈال دیا۔

''مگر میں خوش نہیں ہوں۔'' وہ ایک دم سنجیدگی سے بولا۔ اب رحما نے اس کی طرف نظریں جما دیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ کہیں اس کے سارے خطوط جو ارمغان کو اس نے لکھے تھے جو اکرم کے پاس تھے وہ دیکھ تو نہیں چکا ہے۔

''آپ پریشان ہو گئیں؟'' وہ اس کے گُن ہونے پر مسکرایا۔ رحما نے خود پر قابو پایا اور اپنی نظریں حبیب کے چہرے سے ہٹا دیں۔

''میں اس لیے خوش نہیں کہ ایک ماہ کی تاریخ پڑی جبکہ میں تو صرف دو دن ہی آپ لوگوں کو شادی کے لیے دینا چاہتا تھا۔'' اس نے شریر لہجے سے بات کی۔

''کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتی ہوں؟'' اس نے حبیب سے نظریں ملا کر پوچھا۔

''ہاں ہاں، ضرور۔ بندہ حاضر ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''آپ مجھ سے شادی کیوں کر رہے ہیں؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''آپ نے مشکل سوال پوچھ لیا۔'' وہ ہنسا اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ رحما اس کے جواب کی منتظر تھی۔

''کیا جواب دینا ضروری ہے؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''جی...... میں جاننا چاہتی ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''بس آپ مجھے اچھی لگتی ہیں، اس لیے۔'' اس نے ہنستے ہنستے بتایا۔

''بس ایک دو ملاقات ہونے پر آپ نے میرے ساتھ شادی کا فیصلہ کر لیا۔ کیا یہ غلط بات نہیں؟'' وہ اپنے ماضی کو اس پر ظاہر کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ حبیب کے ساتھ زندگی شروع کرنے سے پہلے ارمغان اور اکرم کے متعلق سب کچھ سچ سچ بتا دے۔ اسے اپنی سانسوں میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی کہ وہ حبیب کو دھوکے میں رکھ رہی ہے۔

''آپ حبیب احمد کی پسند ہیں اور یہ ضروری تو نہیں کہ کسی کو جان کر اس سے شادی کی جائے اور آپ جیسی لڑکیاں تو بات کرنے کو گناہ سمجھتی ہیں۔ میں منگنی نہ کرتا اور آپ سے ویسے بات کرنے کی کوشش کرتا تو کیا آپ مجھے گھاس ڈالتیں۔ وہاب کی شادی پر آپ نے مجھے لفٹ تک نہ دی جبکہ وہاں شادی پر ہر لڑکی مجھ سے بات کرنے کی خواہش رکھتی تھی۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میں...... میں......'' اس نے ارمغان کے متعلق بتانے کے لیے لب کھولے کہ خالہ عظمت باورچی خانے میں برتن اٹھائے چلی آئیں۔

''بیٹی رحما چائے تیار ہے تو لے آؤ، ریما اور ثریا تم دونوں کی منتظر ہیں اور بیٹا تم ثریا کو بتا دو تمہارے لیے کون سے رنگ کا سوٹ بنوائے۔'' خالہ عظمت نے مسکرا کر سنک میں برتن رکھے اور حبیب سے مخاطب ہوئیں۔

''خالہ جان آپ میرے لیے نہیں بلکہ آپ نے جو کچھ میرے لیے کرنا ہے وہ رحما کے لیے کر دیں۔ رحما آپ کل میرے ساتھ شاپنگ پر چلیں گی۔ آپ کو جو پسند ہوگا آپ اپنی مرضی کا خرید لیں۔'' اس نے خوشگوار موڈ میں آفر دی۔

''نہیں، پہلے ہی آپ نے بہت کچھ لے کر دیا ہے۔'' اس نے چولہا بند کیا اور چائے تھرماس میں ڈالی۔

''میں بھی رحما بیٹی کے ساتھ چلتی ہوں۔ کیوں بیٹا مجھے بھی ساتھ لے چلو گے؟'' خالہ عظمت نے حبیب کا دل رکھنے کے لیے خوشی خوشی کہا۔

''ہاں کیوں نہیں، کل چلتے ہیں۔'' حبیب مسکرا کر بولا۔

''نہیں، میں نہیں جا سکوں گی۔ مجھے قیصرہ کے گھر جانا ہے۔'' اس نے فوراً نفی کی۔

''بیٹا قیصرہ کے گھر پرسوں چلی جانا۔'' انہوں نے حبیب کی سائڈ لی۔ وہ رحما کو حبیب کی زندگی میں لانا چاہتی تھیں جو اس کا مستقبل تھا۔

''سوری حبیب، میں اپنی دوست سے وعدہ کر چکی ہوں۔ میں پرسوں آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' اس نے حبیب کو مخاطب کیا جو اس کے بار بار انکار کرنے پر کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگا تھا۔

''چلیں کوئی بات نہیں...... خالہ عظمت آپ رحما کو مجبور مت کیجیے۔ وہ پرسوں میرے ساتھ چلی جائیں گی۔''

''ہاں...... ہاں، کیوں نہیں۔ میں تو بس اپنے لیے کہہ رہی تھی۔'' خالہ عظمت نے مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجائی جبکہ رحما کے بار بار انکار کرنے پر وہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئیں۔

☆☆☆

''بھائی، کل آپ رحما کے ساتھ جا رہے ہیں؟'' وہ گاڑی چلاتے ہوئے بولی۔ وہ دونوں بہن بھائی واپس گھر لوٹ رہے تھے جب ریما نے بھائی سے پوچھا۔

''کل نہیں پرسوں۔'' حبیب نے آہ بھری۔

''پرسوں کیوں؟ پرسوں تو آپ کے دوست جواد نے ہمیں ڈنر کی دعوت دی ہے۔'' اس نے حبیب کو یاد کروایا۔

''اوہ نو...... مجھے تو یاد نہیں رہا، چلو میں کل رحما کو فون کر کے اطلاع دے دوں گا۔''

''بھابی کل کیوں نہیں جا رہیں؟'' ریما نے تشویش سے پوچھا۔ اس کے ذہن میں اکرم اور رحما کی ملاقات تھی۔

''رحما نے اپنی دوست قیصرہ کے ساتھ پروگرام

بنایا ہوا تھا اس لیے رحما نے انکار کردیا۔'' اس نے بجھے دل سے بات ختم کی اور پھر سوچ میں ڈوب گیا کہ پہلے سے رحما کا لہجہ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔

''رحما مجھے اپ سیٹ لگ رہی تھی۔'' ریما نے فکر مندی سے کہا۔

''نہیں تو۔'' حسیب نے اسے مطمئن کیا جبکہ وہ خود بھی ایسا ہی سوچ رہا تھا۔

''بھائی وہ آپ سے محبت تو کرتی ہیں ناں؟'' ریما نے فکر مندی سے اپنے اندر چلنے والی کُھد بُد کو پوچھ ہی لیا۔

''محبت...... یہ تو میں نہیں جانتا مگر پسند ضرور کرتی ہے تو ہی اس نے شادی کا فیصلہ لیا ہے۔'' حسیب نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر کر جواب دیا جبکہ وہ اندر سے بوکھلا سا گیا تھا۔

''بھائی جان، آپ کو رحما سے اور دوستی کرنی چاہیے۔ دوستی کرنے کے بعد ہی آپ دونوں ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ سکیں گے۔'' اس نے بھائی کے چہرے پر فکر مندی کا تاثر دیکھا تو اسے مشورہ دیا۔

''ریما وہ بخار میں مبتلا تھی اس لیے شاید تمہیں اپ سیٹ نظر آئی اور دوسری بات تم جانتی ہو کہ تمہارے بھائی کو جو چیز پسند آجاتی ہے تو وہ اسے حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتا۔'' اس نے مسکرا کر اپنی ذات کا وصف بیان کیا۔

''بھائی میں بھی آپ ہی کی طرح ہوں۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ حسیب نے بھی اس کی ہنسی میں ساتھ دیا جبکہ وہ ریما اور رحما کی باتوں کو سوچنے لگا جس سے وہ خود کافی اپ سیٹ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ صبح صبح تیار ہوگئی۔ اسے اکرم کے پاس جانا تھا اپنے خطوط لینے کے لیے۔

''اماں میں دوپہر کو آجاؤں گی اگر دیر ہوگئی تو آپ کھانا کھا لیجیے گا۔'' اس نے چادر سنبھالی اور ماں کو باورچی خانے میں آواز دی۔

''دھوپ سے بچ کر رہنا اور جلدی آجانا۔'' ثریا نے اسے ہدایت دی وہ اپنے گھر سے باہر آنکلی۔ موسم بہت گرم تھا سورج اپنی آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھانے پر اس کا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا مگر اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے اکرم سے اپنے خطوط لینے تھے، اپنے ماضی کو جلانا تھا اور اکرم سے پوچھنا تھا کہ اس نے کیوں ایسا کیا۔ وہ شاید حسیب کا دوست نہ ہوتا تو وہ خطوط اس کے پاس رہنے دیتی۔ نورین نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ کسی بھی صورت میں اکرم سے اپنے خطوط لے آئے۔ وہ اکرم کی ذات سے واقف نہ تھی، نورین کو برے برے خیالات گھیرے ہوئے تھے کہ حسیب سے شادی کے بعد کہیں اکرم، رحما کی زندگی برباد نہ کردے۔ وہ ہر ثبوت ارمغان کا مٹا دینا چاہتی تھی مگر اکرم اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا جس پر وہ پھر اس سے ملنے پوسٹ آفس جا پہنچی تھی۔

وہ اسے اپنی سیٹ پر ملا جو سر جھکائے کام کررہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی خود پر کسی کا سایہ محسوس ہوا تو اس نے نظریں اٹھائیں۔ اس نے رحما کو دیکھا تو سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا میں آپ سے بات کرسکتی ہوں؟'' رحما نے سنجیدگی سے کہا۔

''جی ہاں۔'' وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور پوسٹ آفس کے احاطے میں بچھی بینچ پر دونوں جا بیٹھے۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔ رحما نے ہی خاموشی کو توڑا۔

''دیکھیں اکرم صاحب میں بار بار آپ سے یہاں ملنے آرہی ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا یہاں آنا مناسب نہیں، پلیز آپ میری امانتیں مجھے لوٹا دیں۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

''جی۔'' اس نے سر جھکا لیا۔ وہ رحما کی زندگی میں پریشانیاں دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے خطوط دینے کی ہامی بھرلی۔

''کیا آپ مجھے میرے خطوط کل واپس کردیں گے؟'' اس نے پھر پوچھا جو اس کو ہاں میں جواب دے چکا تھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے نظریں چرا کر اعتراف کیا کہ رحما کے لکھے خطوط اس کے پاس ہیں۔ رحما کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' اس نے لرزتی آواز سے پوچھا۔ اکرم بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''آپ کل اپنے خطوط لینے آجایئے گا۔'' پھر وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ رحما کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ اس کو تو صرف اپنے خطوط پانے تھے وہ اکرم سے جھگڑا مول لے کر خطرہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے روتے روتے پوسٹ آفس سے باہر نکلی کہ اسے لگا کہ کسی نے پکارا ہو۔

''رحما...... رحما...... رحما۔'' وہ پلٹی تو اس نے خیر دین کو دیکھا جو افسردہ کھڑا تھا۔

''بابا، آپ......؟'' وہ خیر دین کو اکثر سلام کرکے آتی جاتی تھی۔

''بیٹا میں تیرا گناہ گار ہوں۔ مجھے معاف کردے۔'' خیر دین نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''بابا، آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ حیرت زدہ سی ہوگئی اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''بیٹا، اکرم بے قصور ہے۔ اکرم نے کبھی تیرے دل سے نہیں کھیلنا چاہا وہ تو صرف تیری جان بچانا چاہتا تھا۔'' خیر دین نے سنجیدگی سے بتایا۔

''میری جان......!'' وہ چونکی۔

''ہاں، ہاں بیٹا، تیرے پہلے خط میں جان دینے کی بات سے وہ گھبرا گیا تھا۔ تو جانتی نہیں کہ اس نے خط لکھنے کا سلسلہ صرف تیری جان بچانے کے لیے شروع کیا تھا اور میں نے بھی اسے اجازت دے دی تھی۔'' خیر دین نے اپنا جرم قبول کیا۔

''بابا، اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اور وہ کون ہوتا ہے میری جان بچانے والا۔'' وہ خفا سی ہوگئی۔

''بیٹا، تو اسے اب بھی غلط انسان سمجھ رہی ہے۔ اس کی بہن نے بھی محبت کی خاطر خودکشی کرلی تھی۔ وہ تیرے خط میں بھی جان دینے کی بات پر بوکھلا سا گیا اور اس نے تجھے بچانے کے لیے ارمغان بن کر خط لکھنا شروع کردیا۔'' خیر دین نے اسے تمام اصلیت بتا کر اکرم کو بے قصور ثابت کرنا چاہا۔

''بابا کسی کا خط پڑھنا بہت بری بات ہے۔ شاید اس وقت میں بہت کمزور ہوگئی تھی اور میں نے غصے میں آکر جان دینے کی بات لکھ دی تھی۔'' اس نے کانپتے ہونٹوں سے کہا۔ خیر دین نے آہ بھری۔

''بیٹی اصل گناہ گار تو میں ہوں۔ میں نے ہی تمہارا دکھ اس سے بیان کیا کہ تم ہر ہفتے ایک خط پوسٹ کرجاتی ہو۔'' خیر دین نے افسردگی سے بتایا۔

''بابا، آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ حقیقت جان کر میں کتنی ٹوٹ چکی ہوں۔'' وہ رونے لگی۔

''بیٹی مجھے معاف کردو اور اکرم کو بھی۔'' خیر دین نے ہاتھ جوڑے۔

''نہیں...... نہیں بابا...... آپ ہاتھ کیوں جوڑ رہے ہیں۔'' اس نے خیر دین کے ہاتھ تھام لیے جو کانپ رہے تھے۔

''بابا جو میرے نصیب میں لکھا تھا وہ تو ہونا ہی تھا۔ بس میں نے آپ کو معاف کردیا۔ آپ خود کو قصوروار مت سمجھیں۔'' اس نے تسلی دی۔

''بیٹی رحما، اکرم کو بھی معاف کردو مگر وہ بے چارہ تمہاری معافی کے بعد بھی شدید اذیت میں رہے گا۔'' خیر دین کی آواز میں نمی در آئی۔

''بابا، آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ حیرت زدہ سی ہوگئی۔

''بیٹا تمہاری جان بچاتے بچاتے وہ...... وہ تمہیں اپنی جان بنا بیٹھا۔ تمہارے لیے بہت تڑپا ہے۔ اس نے تمہیں کہاں، کہاں تلاش نہیں کیا مگر خدا کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ تم اسے جب ملیں تو اس کے جگری

دوست حبیب کی منگیتر بن چکی تھیں۔ خدا نے اسے بہت بڑی سزا دے دی ہے۔ بس اب تم بھی اسے دل سے معاف کر دینا۔ وہ برا انسان نہیں ہے اور نہ ہی وہ تمہیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے سارے خطوط اس کے جینے کا سہارا تھے۔ بس خود کی جان کو زندہ رکھنے کے لیے وہ خطوط واپس نہیں کر رہا تھا۔'' خیر دین نے اکرم کی ساری حقیقت اس کے سامنے رکھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے وہ جو اسے بہت برا سمجھ رہی تھی۔ خود کو اس کا گناہ گار سمجھنے لگی اسے اپنا وجود زمین میں دھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا پھر وہ بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ ریما جس نے اکرم اور رحما کے درمیان ایک ملاقات دیکھ لی تھی اور کل رات حبیب کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکل کر نے پر وہ پوسٹ آفس آ پہنچی۔ اس نے اپنی گاڑی پوسٹ آفس سے دور ایک سائڈ پر کھڑی کر رکھی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ رحما، اکرم سے مل کر اب جا رہی ہے۔ اسے رحما پر شدید غصہ آ رہا تھا اس کی وجہ اس کا اپنا دل تھا جو اکرم کی محبت پانے کے لیے تڑپ رہا تھا، بجھ گیا تھا۔ وہ گاڑی سے اتری اور سیدھی پوسٹ آفس کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

وہ گھر بہت اداس پہنچی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کو اپنا مقدر سمجھا۔ اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے اس نے عزیز از جان دوست نورین کو فون کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ بھی رحما کے لیے فکرمند تھی۔

''ہیلو رحما! ہاں تم نے صحیح سے بات کر لی؟'' نورین نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اکرم سے جھگڑا کرنے کے بجائے اس سے التجا کر کے خطوط واپس لے لینا۔

''ہاں، میں نے بات کر لی...... وہ راضی ہو گیا۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ اب وہ اکرم سے ڈر نہیں رہی تھی بلکہ خود کو اس کا گناہ گار سمجھ رہی تھی کہ اس کی وجہ سے وہ محبت جیسے سفر پر نکل پڑا ہے اور اس کے ہاتھ ہمیشہ خالی رہیں گے۔

''اچھی خبر سنائی ہے۔ تمہارے لکھے خطوط تمہیں مل جائیں تو پھر اکرم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' نورین نے ایک سکون کی آہ بھری۔

''وہ اچھا انسان ہے۔'' رحما نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''کیا...... کیا مطلب؟'' نورین گھبرائی۔

''ہاں نورین، مجھے اسے جاننے میں غلطی ہوئی۔ وہ میرے لکھے خطوط مجھے اس لیے واپس نہیں دے رہا تھا کہ وہ...... وہ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''کیا ہوا ہے رحما؟ وہ تمہیں خطوط کیوں واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے بتاؤ؟'' نورین مزید فکرمند ہو گئی پہلے پہل رحما، اکرم کے حوالے سے اسے طرح طرح کی باتیں سنا رہی تھی کہ وہ اسے بلیک میل کر کے پیسے لینے کے لیے خطوط واپس نہیں کر رہا اب رحما کے منہ سے اس کے لیے اچھے الفاظ اسے ہضم نہیں ہو رہے تھے۔

''نورین...... وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے میری جان بچانے کے لیے مجھے ارمغان بن کر خطوط لکھے تا کہ میں خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکوں۔'' اس کی آواز کانپنے لگی۔

''کیا...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''ہاں...... ہاں، یہ سچ ہے۔ وہ سارے محبت بھرے خطوط اس نے مجھے لکھے تھے اور میں پگلی یہ سمجھ ہی نہ پائی کہ یہ خط ارمغان نے نہیں لکھے ہیں۔ شاید مجھے خدا نے یہ احساس دلایا کہ میں جو ارمغان سے محبت کا دعویٰ کر رہی تھی وہ جھوٹا تھا۔ میں ارمغان کو کبھی سمجھ ہی نہیں پائی تھی اگر سمجھتی ہوتی تو اس کی تحریر، اس کے لفظوں کو ایک پل میں جان لیتی کہ یہ ارمغان نہیں ہے کوئی اور ہے۔'' وہ رونے لگی۔ نورین افسردہ سی ہو گئی۔

''دیکھو رحما جو بھی ہوا سب کچھ بھول جاؤ...... سب کچھ۔ ارمغان تمہارے قابل نہیں تھا اور آج تمہیں بھی احساس ہو گیا ہے کہ تم ارمغان سے محبت نہیں کرتی تھیں۔ تم دونوں اچھے دوست تھے اگر محبت ہوتی تو ارمغان اور تم ایک ہوتے۔ کبھی کبھی انسان کو کوئی اچھا

لگنے لگتا ہے تو وہ اسے محبت کا نام دے دیتا ہے جبکہ درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ محبت تو شاید اس انسان نے تمہارے ساتھ کی ہے وہ جانتا تھا کہ تم کسی اور کی ہو پھر بھی اس نے تمہارا خیال رکھا، تمہاری جان بچائی کسی غرض کی خاطر نہیں۔ ارمغان کو بھول جانا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔'' نورین نے اسے اکرم کی محبت کی مثال دے کر ارمغان کو بھول جانے کا مشورہ دیا۔ رحما کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

☆☆☆

''تم...... ریما......'' وہ اسے دیکھ کر گھبرا سا گیا کہ کہیں اس نے رحما کو جاتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔

''کیوں...... آپ کسی اور کے منتظر تھے؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں جملہ پھینکا۔ اس کا معصوم رویہ تلخ لہجے میں بدل چکا تھا۔

''تم یہاں...... گھر آجاتی ناں۔'' وہ نروس سا ہوا۔

''کیوں، میرا آنا بہت برا لگا اور میری جگہ کوئی اور آجائے تو وہ تمہیں اچھا لگتا ہے۔'' اس نے مزید لہجہ کڑوا کرلیا۔

''ریما کیا بات ہے، تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟'' وہ ریما کی رگ رگ سے واقف تھا جو اکثر اس کے لیے بہت حساس ہوجاتی تھی۔ اس نے ریما کی وجہ سے تو حسیب سے دوری بڑھادی مگر مقدر نے پھر اسے ریما سے ملادیا۔

''میں غصے میں نہیں ہوں بس اک بات جاننا چاہتی ہوں۔'' اس نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

''کیسی بات؟'' اکرم گھبرا گیا۔ اس کے رونے سے وہ جان چکا تھا کہ ریما نے رحما کو یہاں پوسٹ آفس میں دیکھ لیا ہے۔

''مجھ میں کیا کمی ہے؟'' وہ چیخی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ برداشت ہی نہیں کرپائی جب اس نے خود کو رحما کی سہیلی بتا کر سارا سچ خیر دین سے سن لیا کہ اکرم، رحما کے لیے تڑپ رہا ہے۔

''کیا ہورہا ہے ریما تمہیں...... پلیز خود کو سنبھالو۔'' وہ اس کے چیخنے پر اسے پوسٹ آفس سے باہر لے آیا تاکہ پوسٹ آفس کے باقی لوگ اسے تشویشی نگاہوں سے نہ دیکھیں۔

''مجھے چھوڑ دو۔'' وہ اسے پوسٹ آفس کے باہر بازو پکڑ کر لے آیا۔

''ریما...... ریما، ہوش میں آؤ۔'' وہ چیخا۔

''میں ہوش میں ہی ہوں مگر آپ ہوش میں نہیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ حسیب بھائی رحما سے شادی کررہے ہیں پھر بھی آپ اور رحما چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔ ہوش آپ کو نہیں ہے...... ہوش رحما کو نہیں ہے۔'' وہ چیخی۔

''الزام لگا رہی ہو تم رحما پر۔'' وہ اس پر چیخا۔

''بے شرم، بدذات ہے رحما۔ ایک طرف دولت کی خاطر میرے بھائی کو پھانس لیا اور دوسری طرف آپ کو۔'' وہ رحما کے خلاف بولتی چلی گئی۔ اکرم نے ایک زوردار طمانچہ ریما کے منہ پر رسید کیا۔

''خبردار جو تم نے رحما کے خلاف ایک لفظ بھی نکالا۔ وہ...... وہ تو جانتی تک نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ شدید غصے میں چیخا۔ اس نے غصے سے اکرم کا گریبان پکڑلیا۔

''تو کیا آپ...... آپ...... رحما سے محبت کرتے ہیں؟'' وہ چیخی۔

''ہاں، ہاں میں محبت کرتا ہوں۔'' وہ پاگل سا ہوگیا۔ ریما نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بھاگ گئی۔ اکرم اس کے ردِعمل پر گھبرا سا گیا۔ وہ ریما کے پیچھے بھاگا۔ وہ غصے سے گاڑی اسٹارٹ کرکے روتے روتے تیزی سے نکل گئی اور وہ بے حد فکرمند وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

وہ تیزی سے گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''نہیں، رحما کو نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے میری بت کو مجھ سے چھیننے کی جرأت کی ہے۔ اس نے یرے پیارے بھائی کو دھوکے میں رکھا ہے۔ میں اس ی جان لے لوں گی۔'' وہ اس کے گھر کی طرف جارہی ھی۔ وہ رو رہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین ر گھر کے خاص ملازم حیدر کا فون آرہا تھا۔ اس نے ھے سے فون اٹھایا۔

''ہیلو حیدر کیا کام ہے؟'' وہ چیخی۔

''بی بی جی وہ تصویر پینٹر نے تیار کردی ہے۔'' اس نے ریما کو بتایا۔

''اب اس تصویر کا کوئی فائدہ نہیں رہا۔'' وہ رونے لگی۔

''بی بی جی، آپ کہاں ہیں اور آپ رو کیوں رہی ہیں؟'' حیدر گھبرا سا گیا۔

''حیدر اس تصویر کو جلادو، پھینک دو۔'' وہ پھر چیخی۔

''جیسا آپ کا حکم۔'' حیدر نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

''اس تصویر کا بھائی کو کبھی پتا نہیں چلنا چاہیے کہ یں نے اکرم کی تصویر پینٹر سے بنوائی تھی۔'' اس نے ھے سے حکم دیا۔

''جی بی بی جی، آپ مطمئن رہیں۔'' حیدر نے اسے تسلی دی۔

''اور کچھ؟'' اس نے غصے سے کہا۔

''جی بی بی جی کیک اور پھل، مٹھائی کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے احتراماً پوچھا۔

''انہیں بھی کہیں پھینک دو۔'' وہ چیخ کر بولی اور اس نے فون بند کردیا۔

''اکرم میں تم سے خود سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں۔ آج تمہاری سالگرہ پر سرپرائز دینے کے لیے یں نے اپنی اور تمہاری کاج کی تصویر ایک پینٹر سے نوائی۔ تمہارے ساتھ ڈنر کرنا چاہتی تھی مگر تم تو رحما کے لیے تڑپ رہے ہو۔ رحما...... جو ایک مڈل کلاس لڑکی ہے۔ تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا اس لڑکی کی خاطر جو میرے بھائی کے ساتھ بھی محبت کا ڈراما رچائے بیٹھی ہے۔ میں اس کی اصلیت اس کے گھر میں جا کر کھولتی ہوں۔'' وہ غصے میں بڑبڑاتی چلی گئی پھر اس نے گاڑی کی اسپیڈ تیز کردی۔ اس کے ذہن پر رحما کا خون سوار تھا۔ اس لیے وہ موڑ کاٹتے کاٹتے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ ایک زور کی چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ گاڑی قلابازی کھاتے کھاتے ایک دیوار کے ساتھ جاٹکرائی اس کے سر سے خون بہنے لگا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا مگر اس کے لب ہل رہے تھے۔ جن پر اکرم...... اکرم...... اکرم کا نام تھا۔

☆☆☆

وہ پریشان حالت میں کب سے ریما کو فون کررہا تھا مگر اس کا سیل فون آف جارہا تھا۔

''ریما فون کیوں نہیں اٹھا رہی؟'' حسیب مزید فکرمند ہوگیا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے اور اس کا کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔

''شاید رحما کے گھر چلی گئی ہو، میں رحما سے پوچھتا ہوں۔'' اس نے رحما کو کال کی۔ دوسری طرف رحما نے کال ریسیو نہ کی۔ وہ اکرم کے متعلق سوچوں میں گم تھی کہ کل وہ اکرم سے معافی مانگ لے گی اور اس سے خط لے کر پھر کبھی اس سے ملنے نہیں جائے گی۔ اس نے رحما کو پھر خالہ عظمت کو فون کیا۔ دوسری طرف خالہ عظمت نے فون اٹھالیا۔ ثریا بھی وہیں بیٹھی تھیں۔

''خالہ، ریما آپ لوگوں کی طرف ہے؟''

''نہیں تو۔'' حسیب نے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرکے فون آف کردیا۔ وہ شدید پریشان ہوگیا۔ اس نے پھر ریما کے سیل پر کال کی بیل جارہی تھی مگر فون کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔

اس نے پھر کچھ سوچ کر اکرم کو فون کیا۔ اکرم جو ڈیوٹی سے آکر کافی پریشان تھا اور کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ حسیب کا نمبر دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور فون اٹھالیا۔ دوسری طرف حسیب نے فکرمندی سے ریما کے متعلق پوچھا۔

"اکرم کہیں ریما تمہارے گھر پر تو نہیں آئی تھی۔ صبح سے گئی ہوئی ہے۔ نو بجنے کو آرہے ہیں فون بھی نہیں اٹھا رہی ہے تو میں نے سوچا کہ تم سے پوچھ لوں۔" حسیب نے ریما کے متعلق تفصیل بتائی۔ اکرم گھبرا سا گیا اس نے نفی کی۔

"نہیں، وہ گھر پر نہیں آئی۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا حسیب نے اسے ہولڈ کرنے کو کہا۔

"ہاں حیدر، کیا ریما بی بی کا کچھ پتا چلا؟" حسیب کی آواز اکرم کو سنائی دی شاید حیدر کمرے میں آگیا تھا۔

"جی، وہ اسپتال میں ہیں ان کی کار الٹ گئی تھی۔" حیدر نے فکرمندی سے بتایا۔

"کیا......" حسیب پر جیسے آسمان آن گرا۔ "وہ...... وہ ٹھیک تو ہے۔ کس اسپتال میں ہے؟" حسیب بے حد پریشان ہوگیا۔ اکرم نے فون پر ساری بات سن لی تھی۔ وہ ہیلو، ہیلو کرتا رہ گیا اور پھر حسیب کا نمبر بزی جاتا رہا۔

☆☆☆

"رحما...... رحما۔" خالہ عظمت نے اس کے کمرے میں آکر پکارا۔ وہ لائٹ آف کرکے بیٹھی تھی۔ خالہ عظمت نے لائٹ آن کی وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھیں۔

"بیٹا، ریما...... ریما کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ بے چاری اسپتال میں ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ، ہمیں ابھی وہاں جانا ہے۔" خالہ عظمت نے اسے گہری سوچوں سے نکالا۔

"خالہ یہ سب کیسے ہوا؟" وہ گھبرا سی گئی۔

"بیٹی یہ تو وہاں جاکر ہی پتا چلے گا۔ خدا بچی کو سلامت رکھے۔" خالہ عظمت نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کردیے۔

"خالہ میں تیار ہو جاتی ہوں، ان لوگوں کو ہماری ضرورت ہوگی۔" رحما نے تیزی سے الماری کھولی اور اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

"ہاں میری بچی ثریا رکشا لینے گئی ہے۔ میں ذرا گھر سے اپنا پرس لے لوں۔" خالہ عظمت نے سوچ کر کہا اور پھر اپنے گھر چلی گئیں۔

"خدا ریما کی زندگی کو بچالے۔" رحما نے دعا کی۔

وہ تینوں اسپتال پہنچیں تو حسیب کو نہایت غمزدہ حالت میں پایا۔

"بیٹا کیا ہوا، سب خیریت تو ہے؟" خالہ عظمت اور ثریا کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ رحما سہم سی گئی۔ حسیب باقاعدہ رو رہا تھا۔

"خالہ، ریما...... میری پیاری بہن کومے میں چلی گئی ہے۔" اس نے روتے روتے بتایا۔

"یا خدا...... بچی پر رحم فرما۔" ثریا کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ خالہ عظمت، حسیب کو تسلی دینے لگیں۔ رحما بھی نہایت فکرمند تھی۔ وہ ریما جیسی پیاری دوست کے لیے دعائیں مانگنے لگی۔ وہ دعا کررہی تھی کہ اس نے اپنے سامنے سکینہ اور اکرم کو آتے دیکھا۔ ایک عجیب سی کسک اس کے دل میں اٹھی۔ اس نے اکرم سے نظریں چرالیں۔ سکینہ حسیب کے پاس آبیٹھی۔

"خالہ میری چھوٹی بہن زندہ لاش بن کر رہ گئی ہے۔ خالہ میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہ سکوں گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اکرم نے حسیب کو دلاسا دیا۔

"حسیب خود کو سنبھالو۔ ریما بہت جلد صحت یاب ہوجائے گی انشاء اللہ۔" اکرم نے حسیب کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں بہت برا ہوں۔ میں نے اپنی خوشیوں کے لیے اسے زبردستی پاکستان بلوایا تھا۔ میں اس کی حالت کا ذمے دار ہوں۔" حسیب خود کو کوسنے لگا۔ اکرم اسے تسلی دے رہا تھا۔ حیدر نے ایک تیکھی نظر اکرم پر ڈالی جو کب سے حسیب کے ساتھ خاموش کھڑا تھا۔

"شاید قصوردار کوئی اور ہے۔" حیدر نے اکرم سے نظریں نہ ہٹائیں اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ اکرم کو یوں محسوس ہوا جیسے حیدر اسے قصوروار سمجھ رہا ہے اور اسے علم ہے کہ وہ کل صبح اس سے جھگڑا کرکے نکلی تھی۔ اس کے کار حادثے کی خبر سن کر اکرم نے ہزار دفعہ خود کو

ریما کا گناہ گار جانتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو کیا وہ ریما کی ایسی حالت ہونے دیتا۔

"جو قصوروار ہے خدا اسے بھی بہت بری سزا دے گا۔" اس نے حیدر کو دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

"جی...... میں یہاں ریما کے پاس رہوں گی۔" اس نے حسیب کی طرف دیکھ کر کہا جو سب کو گھر جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"ہاں...... ہاں رحما، ریما کے پاس رہے گی۔" ثریا نے رحما کی بات سن کر اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"خالہ یہاں نرسیں ہیں پھر رحما کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں۔" حسیب نے فکرمندی سے کہا۔

"نرسیں ہیں مگر اپنا تو کوئی نہیں ناں!" رحما نے خفگی سے کہا۔

"اوکے، جیسا تم مناسب سمجھو۔" ثریا اور عظمت خالہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں آپ دونوں کو چھوڑ آتا ہوں۔" حسیب بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے گھر پر کام بھی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

"ہاں...... رحما، ریما کے ساتھ ہے، فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" ثریا نے حسیب کے کندھے کو تھپتھپایا۔

"آپ لوگ ریما کے لیے دعا کیجیے گا۔" حسیب نے ثریا اور خالہ عظمت سے گویا التجا کی۔

"کیوں نہیں بیٹا، ضرور تمہارے کہنے سے پہلے ہی ہم اپنی بچی کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔" ثریا نے افسردگی سے جواب دیا۔

"حیدر تم بھی چلو، مجھے تم سے کام ہے۔" حیدر ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ حسیب نے اسے مخاطب کیا۔

"جیسے آپ کا حکم۔" حیدر نے شائستگی سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ حسیب نے ایک نظر ریما پر ڈالی اور پھر اپنے آنسوؤں کو روک کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"بیٹا رحما، ریما کا خیال رکھنا اور اپنا بھی۔" خالہ عظمت نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے ہدایت دی۔

"جی خالہ اور آپ لوگ گھر جاکر کھانا ضرور کھا لیجیے گا۔ اماں آپ اپنی دوا لینا مت بھولیے گا۔" اس نے ماں کو تاکید کی۔

"بیٹی یہ پیسے رکھ لو۔ یہاں اسپتال کی کینٹین سے اپنے لیے کچھ منگوا لینا۔" ثریا نے اپنے پرس میں سے کچھ پیسے اس کی مٹھی میں دبائے۔

"چلو ثریا، حسیب گاڑی میں ہمارا انتظار کررہا ہوگا۔" خالہ عظمت نے ایک نظر ریما پر ڈالی جو یوں لگ رہا تھا جیسے سو رہی ہو۔ دونوں ریما کو ڈھیر ساری دعائیں دے کر اسپتال کے کمرے سے باہر نکلیں۔ رحما نے وضو کیا اور ریما کے پاس کرسی پر بیٹھ کر درود پاک پڑھ پڑھ کر اس کی سلامتی کے لیے دعائیں کرنے لگی۔

☆☆☆

"حیدر...... مجھے صبح سے لے کر شام تک کی ساری کارروائی ریما کی چاہیے۔ اس کے سیل نمبر پر کس کس کے فون آئے تھے۔ وہ کس کس سے ملی تھی ساری تفصیل مجھے جلد سے جلد مل جانی چاہیے۔"

"جی سر اور کوئی حکم؟"

"نہیں، تم جاسکتے ہو۔" اس نے حیدر کے سپرد کام کیا پھر اس نے آفس فون کرکے منیجر کو کچھ ہدایات دیں۔ اس کا سر شدید دکھ رہا تھا بہن کی وجہ سے وہ سخت تناؤ کا شکار تھا۔

☆☆☆

"مجھے ریما سے یوں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ آج جو حالت اس کی ہے وہ میری وجہ سے ہے۔ وہ صحت یاب ہوجائے گی تو میں اس سے شادی کرلوں گا۔ میرا انکار رحما کی خوشیوں کو چھین لے گا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد حسیب کو سب کچھ سچ بتادے گی جس سے رحما کو بدکار لڑکی سمجھ کر وہ اس سے رشتہ توڑ دے گا۔ میں نے رحما کو پہلے بھی خطوط لکھ کر دکھ دیا ہے اور اب میرے انکار کی وجہ سے پھر اس کی زندگی دکھوں میں مبتلا

ہو جائے گی۔ میں ریما سے شادی کرلوں گا۔ میں رحما کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔" وہ خود کلامی کی کیفیت میں تھا۔

☆☆☆

وہ ریما کے سر پر پیار کرنے لگی۔ اس نے نمازِ فجر ادا کی اور تسبیح لے کر اس کے پاس آبیٹھی۔

"ریما تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔" اس نے ریما کو مخاطب کیا۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی کہ اس سے باتیں کرتے رہیں۔

"ریما تم سے مل کر مجھے ایک اچھی سہیلی کی کمی پوری ہوتی محسوس ہوئی۔ تم سے دل کھول کر بات کرنا چاہتی تھی مگر تب شاید حالات ایسے نہ تھے۔ میں تمہیں اپنے ماضی سے آگاہ کرنا چاہتی تھی مگر کر نہ سکی۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"ریما...... میں ارمغان نامی ایک شخص سے محبت کرتی تھی مگر وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا۔" اس نے اب ریما کا ہاتھ تھام لیا تھا جو بالکل بے جان تھا۔

"ریما میں نے اسے بہت خط لکھے مگر اس نے کبھی مجھے جواب نہیں دیا پھر ایک دن مجھے اس کے خط ملنے لگے۔ میں بہت خوش ہوگئی مگر میری خوشی زیادہ دیر تک نہ رہی وہ خط ارمغان نہیں بلکہ اکرم مجھے لکھتا رہا صرف اس لیے کہ وہ میری جان بچانا چاہتا تھا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ریما کچھ تو بولو۔ مجھے تسلی تو دو۔ میرے ساتھ جو ہوا اس پر مجھے تسلی تو دو۔" وہ روتے روتے اسے حرکت دینے لگی۔ ریما بے جان سی پڑی رہی۔ وہ روتے روتے ریما کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔

"میرے لیے دعا کرو کہ میں حسیب جیسے نیک انسان کی زندگی میں خوشیاں بھر سکوں اور ارمغان کی یاد کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دوں۔" اس نے روتے روتے اپنے دل کا دکھ بیان کیا۔ دوسری طرف سے اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد ریما کو حسیب نے گھر پر شفٹ کروالیا اور نرس کا بھی انتظام کرلیا۔ وہ اپنی بہن کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے آفس کا زیادہ تر کام گھر پر ہی دیکھنا شروع کردیا۔

ریما میں اتنی بہتری آئی تھی کہ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ صرف چھت کو گھورے جاتی۔ وہ فائلوں میں بزی تھا جب رحما کی اسے کال آئی۔

"ہیلو...... السلام علیکم، ریما کیسی ہے؟" اس نے شائستگی سے پوچھا۔

"بالکل ویسی جیسی کہ تم چھوڑ کر گئی تھیں۔" حسیب نے افسردگی سے جواب دیا۔

"آپ فکر مند نہ ہوں۔ مایوسی کفر ہے خدا نے چاہا تو ریما بالکل بھلی چنگی ہو جائے گی۔ اب آہستہ آہستہ تو ریکوری ہوگی ناں۔" اس نے حسیب کو تسلی دی۔

"رحما میں ابھی کل ہی سوچ رہا تھا کہ کتنی خوشی سے وہ ہماری شادی کے لیے یہاں آئی تھی اور میں نے اس کی خوشیاں ہی چھین لیں۔" اس کی آواز میں نمی بھر آئی۔

"آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ آپ کی وجہ سے ایسا کچھ نہیں ہوا۔" رحما نے اسے تسلی دی اس کی آواز میں بہت اداسی تھی۔

"میں تمہاری بھی خوشیوں کا قاتل ہوں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"حسیب ایسا کچھ نہیں ہے۔ ریما جب صحت یاب ہو جائے گی تو پھر ہم شادی کرلیں گے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، میں آپ کا انتظار کرسکتی ہوں۔" اس نے ہمت کر کے بات کی جبکہ اس کی ماں ثریا اور خالہ عظمت اس کی شادی کے لیے بہت فکر مند تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"نہیں رحما، میں چاہتا ہوں کہ جو شادی کی تاریخ ریما نے ہمارے لیے رکھی تھی ہم اسی تاریخ پر نکاح کرلیں۔ تم اس گھر میں آجاؤ گی تو میں ریما کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں گا۔ نرس خیال تو رکھتی ہے پر وہ اپنا تو نہیں۔" حسیب نے فکر مندی ظاہر کی۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" اس نے شائستگی سے جواب دیا اور اسے ڈھیر ساری تسلیاں دے کر فون بند کردیا۔ وہ حسیب کی بات پر غور کرنے لگی کہ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اسے اس کا ساتھ چاہیے جو ریما کے حادثے کی وجہ سے بہت مرجھا سا گیا تھا۔

☆☆☆

شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی ساری شاپنگ مکمل کرلی وہ قیصرہ کے ساتھ شاپنگ کر کے گھر لوٹی تھی کہ خالہ عظمت نے اسے خوش خبری دی کہ نورین امید سے ہے۔

"واہ...... خالہ عظمت اس کا مطلب ہے کہ میں خالہ بن رہی ہوں۔" اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

"ہاں...... ہاں، اب دعا کرو کہ جو بھی اللہ دے لڑکی ہو یا لڑکا بس خدا تعالیٰ ماں اور بچے کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔"

"آمین! وہ شادی پر تو آرہی ہے ناں؟" اچانک اسے خیال آیا۔

"اب وہ تمہارے بھانجے یا بھانجی کو لے کر ہی آئے گی۔ اسے ڈاکٹر نے سفر کرنے سے منع کیا ہے۔"

"اوتو، اس کا مطلب ہے کہ وہ میری شادی پر نہیں آئے گی۔" وہ اداس سی ہوگئی۔

"سوچ لو، بھانجا، بھانجی چاہتی ہو تو وہ نہیں آئے گی اور اگر تم ضد کرو گی تو شاید وہ آجائے مگر بچے کو نقصان ہوسکتا ہے۔" ثریا نے مسکرا کر اسے سمجھایا۔

"میں خود نورین سے بات کرتی ہوں۔" اس نے بیگ سے سیل فون نکالا تو نورین کی کال آئی ہوئی تھی۔

"اوہو...... سیل آف تھی اس لیے مجھے پتا نہیں چلا۔ نورین نے تو بہت کالز کی ہیں۔" وہ سیل پکڑ کر کمرے میں کہتے کہتے آگئی۔ ثریا اور خالہ عظمت مسکرانے لگیں کہ رحما اس کے ساتھ ضد بھی نہیں کرسکے گی وہ امید سے جو تھی۔ اس نے نورین کو کال لگائی دوسری طرف جھٹ سے نورین نے فون اٹھالیا۔

"نورین کی بچی، یہ تو نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ ہنسی دبا کر بولی۔

"اچھا...... میں امید سے ہوں یہ اچھی بات نہیں؟" نورین نے قہقہہ لگایا۔

"جناب بہت بہت مبارک ہو۔" وہ مسکرا کو بولی۔

"ابھی سے مبارک باد کیوں...... جب تمہارے لیے موٹا سا گول مٹول تمہارا بھانجا لے کر آؤں گی تب مجھے مبارک باد دینا۔"

"مجھے تو بھانجی چاہیے جو بالکل میری طرح ہو۔"

"نہیں، نہیں بھانجا۔ مجھے بیٹا چاہیے۔" وہ ہنسی۔

"نہیں بیٹی۔" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

"تمہیں بھی وہاب کی طرح بیٹی چاہیے۔ وہ بھی تمہاری طرح روز مجھ سے کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی ہونی چاہیے۔" وہ مسکرانے لگی۔

"اچھا تم شادی پر نہیں آرہی ہو تو پھر تمہیں میری ایک بات ماننی ہوگی۔"

"ہاں بولو' ایک کیا دو تین چار ہزار باتیں تمہاری مان لوں گی۔"

"ہزار نہیں توبہ توبہ اب ہزار تمہارے بچے تو ہو نہیں سکتے۔ جن کے میں نام رکھنے لگوں۔ بس میری یہ شرط ہے کہ تمہارے بچے کا نام میں رکھوں گی۔"

"ہاہا...... بہت پیاری شرط ہے۔ ضرور بتاؤ لڑکا ہوگا تو کیا نام ہوگا اور لڑکی کا کیا سوچا ہے؟" نورین بے تابی سے بولی۔

"لڑکا ہوگی تو گوگا پہلوان اور لڑکی ہوگی تو ماسی کلثوم۔" اس نے قہقہہ لگا کر اسے نام بتائے۔ نورین نے قہقہے پر قہقہہ لگایا۔

"دونوں نام اپنے بچوں کے لیے رکھ لینا۔"

"اتنے پیارے نام ہیں، تم نہ رکھو میں رکھ لوں گی۔"

"ہاہا...... ماسی کلثوم کو تمہاری شادی کی خبر مل گئی کیا؟"

"نہیں، وہ اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے اور دو ماہ بعد آئے گی تب تک میں چلی گئی ہوں گی۔" اس نے

قہقہہ لگایا۔

”تمہیں یاد ہے کہ وہ ہمیشہ چوہدری صاحب کا رشتہ لے آتی تھی۔ بے چارے چوہدری کا کیا ہوگا تم نے رحما کبھی سوچا ہے۔“ اس نے رحما کو چھیڑا۔

”توبہ کرو ماسی کلثوم اور چوہدری سے۔“

”اچھا بتاؤ شادی میں کون سا رنگ پہن رہی ہو؟“ نورین نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

”پنک کلر۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”یار پنک کلر میں تم باربی ڈول نظر آؤ گی۔ ریئلی میرا دل کر رہا ہے کہ میں اُڑ کر آ جاؤں اور ہاں مجھے یاد آیا میں نے تمہاری شادی کے متعلق ارمغان کو بھی بتا دیا۔“ اس نے رحما کو بتایا۔

”کیوں...... پلیز نورین میرے سامنے اب اس کا نام بھی مت لینا۔“

”پتا ہے، وہ مجھے ایک مارکیٹ میں ملا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اس مارکیٹ میں بھی، میں اسے دیکھ کر آئی ہوں مجھے کیا علم تھا کہ یہ بھی اسی مارکیٹ سے شاپنگ کرتا ہے۔ میں نے تو اسے کھری کھری سنا ڈالیں کہ میری سہیلی رحما اس منحوس شخص کو کب کا بھول چکی ہے۔ تب میں نے تمہاری شادی کا ذکر بھی کیا تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مجھے بہت مزہ آیا اس کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ تم نے حبیب سے شادی کرنے کا جو فیصلہ کیا وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ خدا تعالیٰ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے اور تم دونوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہ ہو۔“ نورین نے اسے دعائیں دی۔

”نورین آئندہ پلیز میرے سامنے ارمغان کا نام مت لینا۔“ اس لہجہ بجھا ہوا تھا۔

”سوری، میں تمہارا دل نہیں دُکھانا چاہتی تھی۔“ نورین کو بھی یوں محسوس ہوا کہ اس خوشی کے موقع پر اسے ارمغان کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔

”نہیں، سوری کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ پیار سے بولی۔

”میں خدا تعالیٰ سے تمہارے لیے دعائیں کرتی رہتی ہوں کہ تم ہمیشہ خوش رہو اور مجھے یقین ہے کہ حبیب تمہیں بہت خوشیاں دے گا اور ہاں مجھے یاد آیا یہ بتاؤ کہ تم نے اس لڑکے سے اپنے خط واپس لے لیے تھے؟“ نورین کو اکرم یاد آیا۔

”خط نہیں لے سکی، ریما کے ساتھ یہ حادثہ ہوگیا اس لیے پھر میری اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔“

”رحما...... اپنے ماضی کی غلطی کا ثبوت مٹا دو، اکرم بے شک اچھا انسان ہوگا مگر وقت کا کیا بھروسا۔“ اس نے فکرمندی ظاہر کی۔

”ہاں، میں کل اس سے ملنے جاؤں گی تم بے فکر رہو۔ ایسی حالت میں زیادہ پریشان رہنا اچھی بات نہیں ہے۔“ وہ شوخ سی ہوئی۔

”ہاں، ہاں دادی اماں...... جیسا آپ کا حکم اور ہاں پلیز اب اکیلے اس سے ملنے مت جانا میرا دل بہت گھبراتا ہے کہ کہیں وہ تمہیں اپنی محبت کے لیے اغوا ہی نہ کر لے۔“

”اوہو نورین، وہ برا انسان نہیں ہے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اس کی تعریف تمہارے منہ سے سن کر گھبراہٹ ہوتی ہے۔“ نورین نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”توبہ کرو نورین، کیسی باتیں کر رہی ہو، میں نے کبھی اکرم کے متعلق نہیں سوچا۔“ وہ خفا سی ہوگئی۔

”اوہو رحما بس میں تو ایسے ہی بات کر جاتی ہوں تمہیں تو اندازہ ہے کہ میں تمہارے لیے کتنی حساس ہوں۔ میں تمہیں اب مزید پرابلمز میں دیکھنا نہیں چاہتی اس لیے تو تمہاری ہر طرح سے فکر کرتی ہوں۔“ نورین نے پیار سے اسے احساس دلایا کہ وہ اسے صرف خوش دیکھنا چاہتی ہے۔

☆☆☆

وہ صبح صبح اپنی شادی کا کارڈ اکرم کے نام کا لکھ کر پوسٹ آفس آ پہنچی۔ اماں کو اس نے اپنی سہیلی قیصرہ کے گھر کا کہہ دیا تھا۔ وہ پوسٹ آفس کے باہر بینچ پر بیٹھ گئی۔ اکرم اسے اپنی سیٹ پر نظر نہیں آیا تو اس نے اپنی

نگاہیں پوسٹ آفس کے گیٹ پر لگا دیں۔ اس نے اپنی گھڑی میں دیکھا صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے، وہ آج لیٹ تھا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے اکرم کو گیٹ سے اندر آتا دیکھا اکرم کی جونہی نظریں رحما پر پڑیں اس کا دل جو پچھلے ایک ہفتے سے اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا اس پر سکون چھا گیا۔ وہ آف وائٹ اور پنک کلر کے سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کی زلفیں ہوا سے اُڑ رہی تھیں اور اس کا دوپٹا بار بار اس کے سر سے اتر رہا تھا جسے وہ سنبھال رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ رحما نے اسے سلام کیا اور حال احوال پوچھنے لگی۔

”میں اپنے خطوط واپس لینے آئی ہوں۔“ وہ دل کڑا کر کے بولی۔ اکرم نے اسے ہاتھوں کو مسلتا دیکھا تو سنجیدگی سے بولا۔

”آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ کی امانت آپ کو واپس دے دوں گا۔“ اور پھر اس نے اپنی جیب سے ہزار کے چند نوٹ نکال کر دیے۔

”یہ بھی آپ کی امانت ہے۔“ اس نے وہ نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

”یہ کیا ہے؟“ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”رحما یہ آپ کے وہ پیسے ہیں جو آپ مجھے رجسٹری کروانے کے لیے دے جاتی تھیں۔“ اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

”اوہو، آپ پلیز مجھے بس میرے خطوط دے دیجیے۔“ وہ شرمندگی محسوس کرنے لگی۔

”میں کل آپ کے خطوط بھی واپس کر دوں گا، میں تو لے کر آیا تھا مگر ریما کے حادثے کی وجہ سے آپ مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آئیں، اب ریما کیسی ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ریما، بس ویسی ہی ہے جیسا آپ نے اسے دیکھا تھا۔ حبیب نے اس کی رپورٹس باہر بھیجی ہیں۔ آپ ریما کے لیے دعا کیجیے گا شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔“ رحما نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”آپ کی شادی کب ہو رہی ہے؟“ اکرم نے نظریں چرا کر پوچھا۔

”جی بس آپ کے لیے شادی کا کارڈ بھی لے کر آئی ہوں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کارڈ اسے تھمایا۔

”تھینکس۔“ اکرم نے شادی کا کارڈ تھام لیا اور کارڈ پڑھ کر اسے مبارک باد دی۔

”آپ شادی میں ضرور آئیے گا۔“ وہ بجھے دل سے بولی۔ اسے اکرم کو شادی کا کارڈ دے کر کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اپنی شادی کا کارڈ دے کر اس نے اکرم کو زیادہ اذیت دی ہے، وہ اکرم کے لیے حساس ہوتی جا رہی تھی۔

”میں آپ کی شادی میں آنے کی کوشش ضرور کروں گا مگر وعدہ نہیں کر سکتا۔“ اکرم نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اسے بتایا۔

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ اکرم خاموش رہا۔

”میں چلتی ہوں کل آپ خطوط لے آئیے گا۔ میں آ کر اسی وقت لے جاؤں گی۔“ اس نے جلدی جلدی سے بات ختم کی اور پھر خدا حافظ کہہ کر پوسٹ آفس سے باہر نکلی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اکرم کا سامنا کرنے سے کیوں گھبرا رہی ہے۔

☆☆☆

”شٹ اپ حیدر...... ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ چیخا۔

”سر آپ بے شک میری جان لے لیجیے۔ یہی سچ ہے۔“

”حیدر اگر یہ باتیں جھوٹ نکلیں تو میں تمہاری جان لے لوں گا۔“ حبیب کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو چکی تھیں۔

”سر میرے پاس ثبوت ہے۔“ اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ حبیب لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ وہ اپنا

غصہ قابو کرنے کے لیے ایسا ہی عمل کرتا تھا اس نے ایک قہر بھری نظر حیدر پر ڈالی۔

''حیدر...... میں ثبوت دیکھنا چاہتا ہوں ابھی اسی وقت۔'' اس نے غصے سے بات ختم کی۔

''سر آپ گھر کے اسٹور روم میں......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' حسیب حیدر پر چیخا۔

''ریما بی بی نے مجھے منع کیا تھا۔'' حیدر نے مزید اپنا سر جھکا لیا۔ حسیب اپنی جگہ سے اٹھا اور حیدر کا گریبان پکڑ کر بولا۔

''اگر تمہاری بات سچ نہ ہوئی تو اپنا انجام تم جانتے ہو؟''

''جی سر! شاید آپ کے ہاتھوں مر جاؤں گا تو خود کو خوش قسمت سمجھوں گا کہ میں اپنے مالک کے ہاتھوں یہ دنیا چھوڑ کر گیا ہوں۔ سر میں نے جو چھان بین کی ہے اس سے ایک اور بات بھی نکلی ہے۔'' اس نے نظریں چرالیں۔

''کیسی بات؟'' حسیب نے حیرت سے پوچھا۔

''سر...... میں وہ بات منہ سے نکالنا نہیں چاہتا۔''

''شٹ اپ حیدر، صاف صاف بات کرو ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''سر...... سر وہ...... وہ......'' حیدر کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ حسیب نے حیدر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بتاؤ کیا بات ہے ورنہ میں تمہیں ابھی کے ابھی دوسری دنیا میں بھیج دوں گا۔''

''سر وہ رحما بی بی اور اکرم صاحب......'' اس کے منہ سے رحما کا نام سن کر حسیب آگ بگولہ ہو گیا۔ حسیب نے حیدر کو زور زور سے طمانچے مارنے شروع کر دیے۔ حیدر طمانچے کھانے کے باوجود ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم صاحب، رحم صاحب پکارنے لگا۔ وہ حسیب کا بہت خاص ملازم تھا اس کے دادا جان نے اسے حسیب کے لیے خاص مقرر کیا تھا جب وہ خود بھی چھوٹا بچہ تھا۔

حسیب جب مار مار کر تھک گیا تو اس نے حیدر کو چھوڑا۔ حیدر کے منہ سے خون ٹپکنے لگا مگر اس کا سر حسیب کے آگے جھکا ہوا تھا۔ حسیب کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس نے پاس پڑی ٹیبل پر سے چیزیں اٹھا اٹھا کر دیوار پر مارنا شروع کر دیں۔ حیدر نے پھر حسیب کو سنبھالا جو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''میں اکرم کی زندگی برباد کر دوں گا۔ میرے ہاتھوں اکرم اب بچ نہیں سکے گا۔'' وہ حیدر کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ حیدر نے اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی جو جانتا تھا کہ ایسی حالت میں حسیب کو چھوڑ دیا تو وہ بہت نقصان کر بیٹھے گا۔ حیدر اس کا بہت وفادار ملازم تھا حسیب اسے گھونسے مار رہا تھا مگر اس نے حسیب کو اپنے حصار سے باہر نکلنے نہیں دیا۔

☆☆☆

وہ بہت اداس سی گھر پہنچی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دل اس کے جسم میں نہیں ہے۔

''تو آ گئی رحما۔'' ثریا نے اسے دیکھا تو پیار سے بولیں۔

''جی اماں اور یہ کیا ہو رہا ہے؟'' کمرے میں سارے صندوق کھلے پڑے تھے اور خالہ عظمت ایک صندوق سے برتن نکال رہی تھیں۔

''تمہارے لیے جہیز کا سامان دیکھ رہے تھے۔'' ثریا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''یہ دیکھو، سفید ٹی سیٹ، یاد ہے ثریا یہ ہم دونوں نے تب خریدا تھا جب نورین اور رحما تقریباً دس سال کی تھیں۔'' خالہ عظمت نے ایک ڈبے کو آہستگی سے نکال کر ہنستے ہنستے بتایا۔

''ہاں، ہاں اور یہ دیکھو واٹر سیٹ جب یہ لوگ میٹرک میں تھیں۔'' ثریا نے ایک ڈبا نکال کر دکھایا۔

''اماں یہ سب کچھ آپ اپنے پاس رکھیں مجھے جہیز نہیں لینا۔'' رحما نے مسکرا کے ثریا کے گلے میں

بانہیں ڈال دیں۔ اس نے اپنے اندر کے موسم کو ماں سے چھپا لیا تھا۔

''کیوں، کیا تمہیں یہ سب کچھ پسند نہیں...... میں تمہیں نئی چیزیں خرید دوں گی۔'' ثریا نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ارے نہیں اماں، آپ جو بھی دیں گی میں خوشی خوشی لے جاؤں گی مگر پھر میری بھی ایک شرط ہے۔'' وہ ہنستے ہنستے بولی پھر وہ دونوں رحما کو تکنے لگیں۔

''کیسی شرط؟''

''آپ دونوں کو بھی میرے ساتھ رہنا ہوگا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاہاہا۔'' خالہ عظمت اور ثریا کا قہقہہ چھوٹ گیا۔ ثریا نے رحما کا ہاتھ تھام لیا اور خالہ عظمت اس کے سر پر پیار دینے لگیں۔

''آپ دونوں اکیلے کیسے گھر سنبھالیں گی۔ مجھے آپ لوگوں کی فکر ہو رہی ہے آپ کا بی پی اور آپ کا دمہ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

''اچھا جن لڑکیوں کی مائیں کسی مرض کا شکار ہوتی ہیں تو کیا انہیں اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنی چاہیے۔ پگلی، تو اپنے گھر کی ہو جائے گی تو تیری ماں کا بی پی بھی اوپر نیچے نہیں ہوگا اور نورین کی شادی کے بعد مجھے دیکھ رہی ہے۔ دیکھ کیسے میرے گال سرخ گلابی ہو رہے ہیں جیسے سو انسانوں کا خون پی لیا ہو۔'' خالہ عظمت نے قہقہہ لگا کر بات ختم کی۔ ثریا بھی ہنسنے لگیں۔

''عظمت بالکل صحیح کہہ رہی ہے تو اپنے گھر کی ہو جائے گی تو شاید کمبخت میرا بی پی بھی ٹھیک رہے گا۔'' انہوں نے رحما کو تسلی دی۔ ''تو نورین کی طرح دور تھوڑی ہے جب ہمارا دل کرے گا تیرے گھر آ جائیں گے اور اگر تو اداس ہو تو حسیب کے ساتھ یہاں چلی آنا۔ حسیب میرا داماد بہت اچھا انسان ہے۔ تجھے تو فکر نہیں ہونی چاہیے، کیوں عظمت؟'' ثریا نے عظمت کو بھی شامل کیا جو رحما کے یوں افسردہ ہونے پر بجھ سی گئی تھیں۔

''ہاں، ہاں اور کیا۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میں روز رحما تیرے گھر کا چکر کاٹنے آ جاؤں گی سیانی بلی کی طرح۔'' خالہ عظمت نے اداس ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے مذاق کیا۔ رحما کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''خالہ تو پھر آج سے آپ کا نام خالہ بلی ہو گیا۔'' دونوں رحما کی بات پر ہنسنے لگیں اور وہ ان دونوں کو خوش پا کر مطمئن سی ہو گئی۔ جس کی کل کائنات وہ دونوں تھیں۔

☆☆☆

''ریما میں تمہارا بدلہ لے کر رہوں گا۔ اکرم نے مجھے دھوکا دیا...... تمہیں دھوکا دیا...... وہ میرے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس اکرم کی وجہ سے آج تمہاری یہ حالت ہے۔ ریما میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔'' حسیب، ریما کے سامنے بیٹھ کر بولتا چلا گیا۔ وہ بے جان پڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ ناشتا کر رہا تھا جب حیدر کا فون آیا۔ اس نے چائے کا سپ لے کر فون اٹھایا۔

''ہیلو حیدر کیا بات ہے؟''

''سر وہ آج پھر پوسٹ آفس آئی ہیں۔''

''کون رحما؟'' اس کی آواز میں تلخی بھر آئی۔

''جی سر، وہ ابھی ابھی اکرم سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔'' حیدر جس کی ڈیوٹی اس نے رحما پر لگا رکھی تھی اس نے صبح صبح حسیب کو اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔ میں خود دیکھ لیتا ہوں۔'' حسیب نے چائے کا کپ ٹیبل پر چھوڑا اور گاڑی لے کر تیزی سے گھر سے نکل گیا۔

''سر وہ پوسٹ آفس کے بینچ پر......'' حیدر نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ رحما، اکرم کے ساتھ بینچ پر بیٹھی تھی۔ حسیب کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس سے یہ منظر برداشت نہیں ہو رہا تھا مگر اس نے بہ مشکل خود پر قابو پا کر اپنا غصہ پینا شروع کر دیا۔ وہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ حیدر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''سر کوئی حکم؟'' حیدر نے سر جھکا کر پوچھا۔
''تم جا سکتے ہو۔'' حسیب نے خفگی سے کہا۔
''سر جیسا آپ کا حکم۔'' وہ وہاں سے چلا گیا۔
''رحما ایسا کیوں کر رہی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے مجھ سے شادی کر رہی ہے پھر اکرم سے ملاقات کیوں......؟'' وہ سخت تذبذب کا شکار تھا۔ اس نے دور بیٹھی رحما کو دیکھا جو افسردہ دکھائی دے رہی تھی۔
''یہ کیا......؟'' اس نے اکرم کو ایک پیکٹ رحما کی طرف بڑھاتے دیکھا۔ رحما نے وہ پیکٹ تھام لیا اور پھر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دور سے آتی رحما کو دیکھا جو پیکٹ کو بے تابی سے کھول کر کچھ چیک کر رہی تھی۔
''یہ پیکٹ کیسا ہے۔ اس میں ایسا کیا ہے جسے رحما نے بے صبری سے چیک کیا ہے۔ مجھے تصویر کا ایک رخ نظر آرہا ہے۔ دوسرا رخ مجھے جاننا ہوگا'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر آفس کے راستے پر روانہ ہو گیا۔
''حیدر تم پوسٹ آفس کے لوگوں سے معلوم کرو کہ رحما کیوں اکرم سے ملنے آتی ہے۔ ایسا کوئی تو ہوگا جو جانتا ہوگا کہ ان دونوں کے درمیان کیا سلسلہ ہے۔'' اس نے گھر آکر حیدر کو خصوصی ہدایات دیں۔
''جی سر۔'' حیدر نے سر جھکا کر جواب دیا۔
''تمہیں یہ کام بہت جلدی کرنا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ شادی میں بہت کم دن باقی رہ گئے ہیں۔'' حسیب نے اسے تاکید کی۔
''سر آپ کو رات تک انفارمیشن مل جائے گی۔'' حیدر نے اسے تسلی دی۔
''اب تم جا سکتے ہو۔'' حسیب نے کہا۔
''جی سر۔'' حیدر سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ جب سے اس نے رحما کی شادی کا کارڈ دیکھا تھا وہ بہت بے چین تھا۔ کچھ دیر تو اس نے سونے کی کوشش کی مگر پھر اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کر دی اور تکیے کے نیچے سے اس نے رحما کی شادی کا کارڈ نکال لیا۔ سرخ رنگ کے کارڈ پر سنہری روشنائی سے رحما اور حسیب کا نام بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس نے رحما کے نام پر اپنی انگلیاں پھیریں۔ دونوں کا نام ایک ساتھ دیکھ کر اسے عجیب احساس ہوا۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ کارڈ پھاڑ دے یا کمرے کی ہر چیز تہس نہس کر دے پھر اس نے رحما کے نام پر نظریں جمائیں اور اسے رحما سمجھ کر باتیں کرنے لگا۔
''میں نے تمہیں اپنا بنانے کی غرض سے محبت نہیں کی تھی۔ میں تو تمہاری جان بچانا چاہتا تھا مگر میں خود ہی جان نہ پایا کہ کیسے میرے دل پر تمہاری حکمرانی ہوتی چلی گئی اور میں تمہارا غلام بنتا چلا گیا۔ ایسا غلام جو اپنے مالک سے دور، بہت دور ہو کر بھی اس کے تابع ہے۔ مجھے آزادی چاہیے...... رحما مجھے آزادی چاہیے۔'' وہ تڑپنے لگا۔
''رحما اب میں تمہارے احساس سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ تمہارے لفظوں سے آزاد ہونا چاہتا ہوں، میں تمہارے دیدار کا طالب نہیں ہوں مگر تمہارے احساسات کا طالب ہوں۔ مجھے وہ خطوط واپس لوٹا دو۔ تمہارے لیے وہ معمولی خط ہوں گے مگر میرے لیے وہ میری سانسیں ہیں اور تمہیں لگتا ہے کہ تم مجھ سے خطوط لے گئی ہو تو میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ تمہارے سارے خطوط جو میں تمہیں دے چکا ہوں ان کا ہر لفظ میرے دل کی سرزمین پر لکھا ہوا ہے۔ بے شک تم میرا سینہ چاک کر کے دیکھ سکتی ہو۔ تم حسیب کی ہونا چاہتی ہو...... میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں مگر میں تمہیں بھول نہیں سکتا۔ تمہیں بھولنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے اپنا وجود بے جان لگتا ہے۔ رحما میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ میری محبت صرف یہیں تک ہے کہ تم خوش رہو تو میں بھی سکون سے رہوں گا۔ اگر اس کا نام محبت ہے تو ہاں...... ہاں مجھے محبت ہے تم سے...... بے پناہ محبت کرتا ہوں تم سے۔ رحما...... رحما...... ہاں!''

☆☆☆

وہ اپنے لکھے خطوط دیکھ رہی تھی کہ نورین کی کال آگئی۔ اس کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور کال ریسیو کر لی۔
''ہیلو! رحما کیسی ہو؟'' نورین نے خوشگوار موڈ میں پوچھا۔
''بالکل فٹ۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا جبکہ وہ بہت افسردہ تھی۔
''کہاں تھیں...... کب سے فون پر فون کر رہی تھی۔ صبح بھی کئی دفعہ فون کیا۔ تم نے اکرم سے ملاقات کی؟ اس نے تمہارے سارے خطوط دے دیے؟'' نورین ایک سانس میں پوچھتی چلی گئی۔
''ہاں...... ہاں، سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اکرم نے سب خطوط واپس کر دیے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ اکرم کا اداس چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔
''یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔'' نورین گرم جوشی سے بولی۔
''ہاں...... شاید۔'' اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔ وہ اکرم سے مل کر اسے سمجھ چکی تھی کہ اکرم اسے کبھی دکھی نہیں دیکھ سکتا۔
''ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' نورین نے حیرت سے پوچھا۔
''بس مجھے انسانوں کی پرکھ نہیں۔ ارمغان جو مجھے دھوکا دے رہا تھا اسے میں دیوتا سمجھ بیٹھی اور اکرم جس نے مجھے خوش دیکھنے کے لیے خود کو اذیت میں رکھا اسے برا انسان سمجھ رہی تھی۔ کتنی بے وقوف ہوں میں۔'' اس نے بے بسی سے بتایا۔ اکرم کا اداس چہرہ جو آخری پل وہ دیکھ آئی تھی اس کی آنکھوں سے ہٹ نہیں رہا تھا۔
''تم ٹھیک تو ہو؟'' نورین پُرتشویش لہجے میں بولی۔
''ہاں، میں ٹھیک ہوں اور خوش بھی۔'' رحما نے اس کے اطمینان کے لیے کہا۔

☆☆☆

اس نے حسیب کے گھر کی بیل بجائی۔ گھر کے ملازم اشرف نے دروازہ کھولا۔
''اکرم صاحب آپ...... آیئے۔'' اشرف نے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔
''حسیب گھر پر ہے کیا؟'' اکرم نے شائستگی سے پوچھا۔
''نہیں، وہ شاپنگ پر گئے ہیں کل حسیب بھائی کا نکاح ہے ناں۔ آپ کو کارڈ تو مل گیا ہوگا؟'' اشرف نے خوشی خوشی پوچھا۔
''ہاں...... ہاں۔'' اس نے نظریں چرالیں۔ ''اب ریما کیسی ہے؟'' اکرم نے پوچھا۔
''آپ ریما بی بی سے مل لیں۔'' اشرف نے ریما کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اکرم خود ریما کو دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ اس لیے خاموشی سے چل پڑا۔ اشرف نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ اسے بستر پر لیٹی نظر آئی...... اس کے دائیں بائیں مشینیں تھیں جو دل کی دھڑکن، بی پی اور دیگر چیزوں سے آگاہ کر رہی تھیں۔ ملازم اشرف اسے ریما کے پاس چھوڑ کر اس کے لیے چائے لینے چلا گیا۔
اس نے ریما کو دیکھا جو بالکل بے سُدھ پڑی تھی۔ قریب رکھے صوفے پر نرس بیٹھی تھی مگر اس کی نگاہیں ریما کے چہرے اور اس سے منسلک مشینری پر تھیں۔
''ریما تم مجھ سے اتنی زیادہ خفا ہو گئیں کہ تم نے بولنا چھوڑ دیا۔ میں تو تمہیں بہت بہادر لڑکی سمجھتا تھا کہ تم مجھ سے جھگڑا کرتی رہو گی اور اپنا غصہ نکال کر نارمل ہو جاؤ گی۔'' اس نے ریما کا ہاتھ تھام لیا...... وہ اس سے تقریباً سرگوشی میں بات کر رہا تھا۔
''ریما تم میری بہت پیاری دوست ہو میں نے تم سے غصے میں بات کی اس کے لیے تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ مجھے معاف کر دو اور جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ۔ تم بستر چھوڑ دو گی تو میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ میں تمہارا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ تم جانتی ہو کہ میں نے ہمیشہ تمہاری محبت پر خاموشی اختیار کی۔

میں تمہاری نفی کرے تمہارا دل دُکھا نہیں سکتا تھا مگر رحما کے مسئلے پر میں بول پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رحما تمہارے بھائی کی بیوی بننے جا رہی ہے، میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے نام سے رحما کی زندگی بلاوجہ برباد ہوتی مگر تم سچ سننا ہی نہیں چاہ رہی تھیں۔ میرے اور رحما کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں تھا اور جو تعلق تھا وہ صرف خطوط کا تھا جو میں اسے لوٹا چکا ہوں۔ وہ تمہارے گھر کی بہو ہے اس نے حسیب کے ساتھ ہرگز بے وفائی نہیں کی۔'' وہ نہایت افسردگی سے سب کچھ کہتا چلا گیا مگر ریما بے جان پڑی رہی۔ اس نے ریما کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''ریما اگر تم نے بستر نہیں چھوڑا تو میں خدا سے اپنے لیے بھی ایسے ہی بستر کی دعا کروں گا۔'' اس نے افسردگی سے کہہ کر نگاہیں جھکا لیں۔ کچھ دیر کے بعد ریما کی سانسوں میں تیزی آنے لگی۔ اس نے نرس کی طرف دیکھا۔ نرس نے ریما کی حالت دیکھ کر دراز میں سے انجکشن نکال کر اسے لگایا اور پھر ڈاکٹر کو کال کرنے لگی جو ہر وقت رابطے میں رہتے تھے۔

''ریما...... ریما، ٹھیک تو ہے؟'' اکرم نے گھبرا کر پوچھا۔

''جی ...... جی یہ ردِعمل ان کے لیے اچھا ہے باقی ڈاکٹر صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔'' اس نے ماہرانہ انداز میں جواب دیا اور وہ دل ہی دل میں ریما کے لیے دعا گو ہو گیا جو اس کی ایسی حالت کا خود کو ذمے دار ٹھہرا رہا تھا۔

☆☆☆

''تم نے اسے ریما سے ملنے کیوں دیا؟''

''سر وہ...... وہ آپ کے اور ریما بی بی کے دوست تھے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے جملہ ادا کیا۔

''شٹ اپ اشرف، تم مجھے فون کر سکتے تھے۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''حسیب خود کو سنبھالو اور اشرف کو کیا پتا کہ کیا کرنا ہے۔ اشرف، تم کھانا ٹیبل پر لگاؤ۔'' وہ اور جواد گھر پہنچے تو اشرف نے اکرم کی آمد کے متعلق بتایا تو حسیب آپے سے باہر ہو گیا۔

''وہ شخص میرے گھر پر کیسے آ سکتا ہے۔ ضرور وہ ریما سے رحم کی اپیل کرتے آیا ہوگا۔'' وہ شدید غصے میں تھا۔ جواد نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

''ہم لوگ اس کا بندوبست کر آئے ہیں۔ پرسوں جب تم نئی زندگی میں قدم رکھنے لگو گے تو اس کی زندگی تاریکی میں ڈوب جائے گی۔'' جواد نے اسے تسلی دی۔

''ہاں...... ہاں پرسوں کا دن میرے لیے بہت بڑا دن ہے۔ میرے دشمن کا خاتمہ ہو جائے گا۔'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تم نے حیدر کو سب سمجھا دیا ہے؟'' اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''ہاں...... ہاں، تم بس اپنی شادی کے بارے میں سوچو اور باقی کا کام ہم دونوں پر چھوڑ دو۔'' حیدر سر جھکائے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تو جواد نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ اچانک نرس کی آواز ابھری۔

''سر...... سر میڈم کو اسپتال لے کر جانا پڑے گا ان کی حالت زیادہ بگڑ رہی ہے۔'' نرس نے تیزی سے آ کر حسیب کو بتایا۔ حسیب، ریما کے کمرے کی طرف دوڑا۔ نرس بھی اس کے پیچھے لپکی۔ جواد نے حیدر کو گاڑی نکالنے کا کہا اور حسیب کے لیے مزید فکر مند ہو گیا۔

☆☆☆

وہ حسیب اور رحما کی شادی کے لیے تحفہ خریدنے مارکیٹ پہنچا تو وہاں اسے رحما کسی کے ساتھ شاپنگ کرتی نظر آئی۔ وہ اس سے نظریں بچا کر نکلنا چاہتا تھا مگر رحما نے اسے دیکھ لیا وہ اس کے پاس آ گئی۔

''آپ اور یہاں؟'' اس نے شائستگی سے پوچھا۔

''جی...... وہ آپ کے لیے تحفہ لینے آیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''پھر کیا لیا؟'' وہ بھی مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کچھ نہیں، سمجھ ہی نہیں آ رہا کیا لوں۔'' اس

نے مسکرا کر کہا اور ساتھ ہی رحما کے ساتھ آنے والی پر نظر پڑی۔

''قیصرہ، یہ اکرم صاحب ہیں اور اکرم صاحب یہ میری بیسٹ فرینڈ ہیں۔'' اس نے مسکرا کر ایک دوسرے کا تعارف کروایا۔

''رحما آپ بتا دیں کہ آپ کو کیا تحفہ چاہیے۔ میں وہ خرید لیتا ہوں۔'' پچھلے ایک گھنٹے سے وہ رحما کے لیے تحفہ خریدنا چاہ رہا تھا مگر کسی چیز پر مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ قیصرہ گھڑی دیکھ کر چونکی۔

''اوہ نو...... تین بج چکے ہیں۔ مجھے تو اپنے تایا ابو کے گھر جانا تھا۔ انہوں نے میلاد پر بلایا ہے۔'' قیصرہ کو اچانک یاد آیا۔

''ابھی تو اماں اور خالہ کے کپڑے بھی درزی سے لینے ہیں۔'' اس نے قیصرہ کو اپنی باقی شاپنگ بتائی۔

''تم اکرم صاحب کے ساتھ شاپنگ کر لو اور ان کی بھی مدد کر دینا۔ یہ تمہیں گھر بھی چھوڑ دیں گے...... کیوں اکرم صاحب، آپ میری سہیلی کا سامان اٹھا لیں گے؟'' قیصرہ نے مسکرا کر پوچھا۔ رحما قیصرہ کی بات پر گھبرا سی گئی۔

''نہیں، نہیں میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ خالہ عظمت خود کپڑے لینے آ جائیں گی ابھی درزی نے کچھ وقت مانگا ہے۔'' رحما نے صاف انکار کیا۔

''یار خالہ عظمت کو اور بہت کام ہوں گے اور اکرم صاحب تمہارے ساتھ ہیں۔ آپ کو کوئی اور کام تو نہیں؟'' قیصرہ نے اکرم سے پوچھا۔

''نہیں...... نہیں، میں حاضر ہوں۔'' اکرم نے گھبراہٹ کے ساتھ جواب دیا جو رحما کے نفی کرنے پر پشیمان تھا۔

''تو ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔'' قیصرہ نے مسکرا کر کہا۔ رحما نے اکرم کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ شاید یہ وقت اسے اسی لیے ملا تھا کہ وہ اس سے اپنے بدلے رویّے کی معافی مانگ سکے اور اکرم کا شکریہ ادا کر سکے کہ ان نازک دنوں میں اس نے ارمغان کی امید دے کر اسے زندگی بخشی تھی۔ شاید ان حالات میں وہ اپنی جان لے لیتی جو ارمغان کی محبت میں اندھی تھی۔

''آپ گرین ٹی لیں گی؟'' اس نے چلتے چلتے پوچھا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ وہ ایک کیفے میں چلے آئے۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے بیرے نے گرین ٹی ٹیبل پر لا کر رکھ دی اور چلا گیا۔ دونوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں پھر کچھ دیر بعد رحما نے ہی بات شروع کی۔

''اکرم میں نے آپ کے ساتھ بہت برا رویّہ رکھا، مجھے اس کے لیے معاف کر دیجیے گا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں، شاید کوئی اور ہوتا تو وہ بھی آپ کی طرح مجھ پر غصہ ہوتا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''آپ کب شادی کر رہے ہیں؟'' اس نے یکدم اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''شادی......! ہاں بہت جلد۔'' اس نے صاف جھوٹ بولا۔

''کیا آپ مجھے اپنی شادی پر انوائٹ کریں گے؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔ حسیب میرا بہت پیارا دوست ہے۔ تم لوگوں کو ضرور اپنی شادی پر انوائٹ کروں گا۔'' اس نے ہنستے ہنستے کہا۔ رحما نے گھڑی دیکھی تو پانچ بج چکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلیں، زیادہ دیر نہ ہو جائے ابھی کافی چیزیں لینی ہیں۔'' اس نے بہ مشکل مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کہا۔

''جی، بالکل۔'' وہ بھی اس کی بات پر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے درزی سے کپڑے اٹھائے۔ رحما نے چند چھوٹی موٹی چیزیں لیں اور پھر گھر چلنے کا کہا۔

''آپ نے میری تو مدد نہیں کی۔ کچھ اپنی رائے

ہی دے دیں۔'' اس نے رحما سے تحفے کے متعلق پوچھا۔

''اوہ نو...... میں بیچ میں بھول گئی۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ کی بھولنے کی عادت اچھی ہے۔'' اس نے ایک گہری نظر اس کے اوپر ڈال کر کہا۔ رحما شرمندہ سی ہوگئی۔

''میرے لیے...... میرے لیے...... آپ مجھے اچھا سا سوٹ خرید لیں۔'' اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

''سوٹ...... گرین رنگ کا ٹھیک ہے؟'' اس نے جھٹ سے کہا۔

''جی ہاں، گرین رنگ میرا فیورٹ ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''اور سرخ بھی، گرین نہیں ملتا تو آپ کی دوسری چوائس سرخ ہوتی ہے۔'' اکرم نے مسکرا کر اس کی پسند ظاہر کی۔

''جی ہاں۔''

''مجھے آپ کی ہر بات یاد ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور پھر نظریں چرالیں۔ رحما اس کی بات پر پشیمان سی ہوگئی اور اپنے دھڑکتے دل کو قابو کرنے لگی۔ اکرم پھر ایک جیولری شاپ کی طرف بڑھ گیا۔

''مجھے جیولری پسند نہیں ہے۔'' وہ فوراً بولی وہ اکرم سے کوئی قیمتی تحفہ نہیں لینا چاہتی تھی۔

''کیوں، آپ کو تو انگوٹھیوں کا بہت شوق تھا۔'' وہ حیرت سے بولا۔

''ہاں...... ہاں مگر مجھے نہیں چاہیے۔'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''کیوں......؟ آپ یقیناً یہ سوچ رہی ہیں کہ شاید میری جیب میں انگوٹھی خریدنے کے پیسے نہیں ہیں۔'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں، نہیں ایسی بات نہیں۔ اتنا قیمتی تحفہ میں نہیں لے سکتی۔'' اس نے فکرمندی سے کہا۔

''آپ مجھے اپنا عزیز سمجھتی ہیں تو پھر تحفہ لینے سے انکار کیوں۔ کیا آپ نے مجھے معاف نہیں کیا؟'' اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''نہیں...... نہیں ایسی بات نہیں۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔'' وہ گھبرا سی گئی۔

''اچھا...... اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر چلیں ایک اچھی سی انگوٹھی اپنے لیے پسند کرلیں۔'' اس نے شاپ کا دروازہ کھول کر اسے اندر بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے قدم خود بخود شاپ کے اندر بڑھ گئے جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی پتا نہیں اسے کیا ہو رہا تھا۔

''رحما یہ دیکھیں۔'' سیلز مین نے ایک سنہری ڈبا انہیں کھول کے دکھایا جس میں ترتیب کے ساتھ بے شمار انگوٹھیاں سجی ہوئی تھیں۔

''جی...... جی بہت پیاری ہیں۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔ وہ مسکرایا۔

''کیوں بھئی، ساری خریدنی ہیں؟'' اس نے چھیڑا اکرم اس کے ساتھ کسی اور ہی دنیا میں کھو گیا تھا۔

''نہیں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں۔ آپ گھبرائیے مت۔'' وہ ہنسا۔

''آپ بیچ میں زیادتی کر رہے ہیں۔'' اس نے پھر انکار کیا۔

''یہ انگوٹھی کیسی ہے؟'' اس نے سفید موتی والی انگوٹھی ہاتھ میں لی اور اس کی جانب کرکے پوچھا۔

''جی بہت پیاری ہے۔'' اس نے انگوٹھی تھام لی۔

''آپ کو سفید موتی اچھے لگتے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے اعتراف کیا۔ اس نے خط میں بھی ارمغان سے سفید موتی والی انگوٹھی کی فرمائش کی تھی۔ اکرم نے رقم ادا کی۔ وہ انگوٹھی تھام کر اسے دیکھتی رہ گئی کہ اکرم کو اس کی ہر بات یاد ہے اور اسے بھی اکرم کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ وہ سوچوں میں تھی کہ اکرم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''رحما...... رحما۔'' اس نے آہستگی سے پکارا۔

''جی۔'' وہ گھبرا کر اس کے خطوط سے آزاد ہوئی۔

''کدھر کھو گئیں؟'' وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''جی، کچھ نہیں۔ اب آپ مجھے گھر چھوڑ دیجیے بہت وقت ہوگیا ہے۔'' اس نے گھڑی کی طرف دیکھ کر فکرمندی ظاہر کی۔

''جیسے آپ کا حکم۔'' وہ مسکرا کر بولا اور پھر رحما کا سامان لے کر اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھانے لگا۔ وہ لوگ مارکیٹ سے باہر نکلے تو اکرم اپنی بائیک کی طرف بڑھا۔ رحما نے بائیک دیکھی تو وہ فکرمند سی ہوگئی۔

''آپ فکر مت کریں میں اپنی خستہ حال بائیک پر آپ کو بیٹھنے کی دعوت نہیں دوں گا۔ بس یہ، میں اور آپ تینوں پیدل چلتے ہیں۔'' اس نے بائیک کا ہینڈل گھسیٹ کر اسے بے فکر کردیا جو اس کے ساتھ بائیک پر سوار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''آپ مجھے رکشا کروا دیں۔ میں رکشے پر چلی جاتی ہوں۔ آپ اتنی بھاری بائیک کہاں تک گھسیٹتے رہیں گے۔'' وہ کچھ پریشان سی ہوگئی تھی کہ اس کے بائیک پر سوار نہ ہونے پر وہ بھی پیدل چل رہا ہے۔

''آپ کو اکیلے کیسے جانے دے سکتا ہوں۔ آپ تو گھر پہنچ جائیں گی مگر مجھے آپ کی فکر لگی رہے گی۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''چلیں یہ بھی اِک یادگار سفر ہوگا۔'' اس نے اپنا دوپٹا سنبھال کر کہا...... ہوا تیز چلنے لگی تھی۔

''ہاں...... یہ تو آپ نے سچ کہا کچھ لوگ، کچھ سفر ہماری زندگی میں یاد بن کر رہ جاتے ہیں جیسے میں آپ کی زندگی میں یاد بنا رہوں گا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں...... آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ آپ حسیب کے دوست ہیں اور ہماری پھر بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''نہیں پھر شاید میں آپ کو کبھی نہ مل سکوں۔'' اس نے آہ بھری۔ وہ گھبرا سی گئی۔ اس کی بات پر دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں، آپ کہیں جا رہے ہیں؟'' اس نے نگاہیں اس پر ٹکا دیں۔

''ہاں، میں کویت جا رہا ہوں۔ مجھے ایک اچھی جاب کی آفر آگئی ہے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''بہت اچھی خبر ہے۔'' وہ اس کی بات پر بجھ سی گئی۔ وہ خود اپنی اس کیفیت پر حیرت زدہ سی ہونے لگی اور دل ہی دل میں بولی۔

''رحما تجھے کیا ہو رہا ہے تو کیوں اکرم کے جانے پر ناخوش سی ہوگئی ہے۔''

''رحما گول گپے کھائیں گی؟'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے اس سے بولا۔

''ہاں، ہاں۔'' اکرم کی آواز نے اسے خود سے نکالا۔

''آپ کو گول گپے بہت اچھے لگتے ہیں۔ چلیں گول گپے کھاتے ہیں۔''

''نہیں...... بس تھینک یو۔'' اس نے نفی کی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم گول گپوں سے کبھی انکار نہیں کرسکتیں۔ نورین کے ساتھ تم نے زندگی میں سب سے زیادہ گول گپے ہی کھائے ہیں۔'' اس نے خط والی بات کا تذکرہ کیا وہ بھی ہنسنے لگی۔

''ہاں...... ہاں، آپ نے سچ کہا...اور پتا ہے کہ ہم دونوں املی والے پانی پر ضرور جھگڑا کرتے تھے۔'' اس نے نورین کو یاد کرکے جواب دیا۔

اکرم مسکرانے لگا وہ مسکراتے مسکراتے یک دم بجھ سی گئی اور پھر اسے اپنے دل کی آواز سنائی دی۔

''رحما تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ تم اکرم کے ساتھ کیوں خوشی محسوس کر رہی ہو۔'' اکرم یہ خوشی اس کے لیے گول گپوں کی پلیٹ لے آیا اور اسے پیار سے تھمائی۔

''یہ لیجیے، آپ کے من پسند گول گپے۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

''تھینک یو آپ نے اپنے لیے نہیں لیے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، میرا گلا خراب ہو جاتا ہے۔''

''اوہو...... ہاں آپ کا گلا بہت نازک ہے۔'' اس نے گول گپے کھاتے کھاتے کہا۔

""آپ نے کچھ محسوس کیا؟"" اس نے اچانک سنجیدگی سے پوچھا۔

""کیا؟""

""میں اور آپ پرانی باتوں میں کھو جاتے ہیں۔"" اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

""ہاں۔"" اس نے نظریں چرالیں اور خاموشی سے گول گپے کھانے لگی۔ وہ بھی کافی دیر تک خاموش رہا پھر رحما نے ہی خاموشی کو توڑا اور سنجیدگی سے بولی۔

""خیر دین بابا نے مجھے کچھ باتیں بتائی تھیں کہ آپ مجھ سے......"" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

""نہیں......نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے میری طرف سے... میں نے کبھی آپ کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔"" اس نے رحما کو اپ سیٹ دیکھا تو فوراً اپنی محبت کی نفی کی۔

""تھینک گاڈ، میں آپ کے لیے اذیت نہیں بنی اگر ایسا ہوتا تو شاید میں خود کو بھی معاف نہیں کرتی۔"" اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

""اوہو آپ کن باتوں کو لے کر اپ سیٹ ہو رہی ہیں۔ آپ صرف میری بہت اچھی دوست ہیں بس یہ بات اپنے ذہن میں رکھیے گا۔"" اس نے رحما کو ان تمام باتوں سے آزاد کیا جو خیر دین نے اس کے بارے میں کہی تھیں۔ وہ پُرسکون دکھائی دینے لگی اور خوشی خوشی اس نے گول گپے کی پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

""چلیں پھر نئی دوستی کرنے پر منہ کھٹا کریں۔"" اس نے مسکرا کر کہا۔ اس نے ایک گول گپا منہ میں رکھ لیا۔

""شکریہ۔"" دونوں مسکرا رہے تھے۔ جب حسیب نے انہیں دیکھا وہ رحما کے سیل فون نہ اٹھانے پر پہلے اس کے گھر پہنچا وہاں سے ثریا نے اسے شاپنگ سینٹر کے متعلق بتایا تو وہ رحما کو تلاش کرتے کرتے اس گول گپے والی ریڑھی تک آن پہنچا۔ اس نے گاڑی ایک کونے میں کھڑی کر دی تھی۔ رحما کو اکرم کے ساتھ مسکراتا دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ اکرم کے اوپر گاڑی سمیت چڑھ دوڑے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے رخصت کر دے مگر وہ اسے تڑپا تڑپا کر مارنے کا پلان بنا چکا تھا۔ رحما اور اکرم وہاں سے چل پڑے تھے وہ ان کا تعاقب کرنے لگا۔ رحما کی ہر مسکراہٹ پر وہ تڑپ اٹھتا مگر صرف نورین کی وجہ سے وہ رحما کو معصوم سمجھنے لگا تھا کہ وہ اکرم سے اپنے خطوط لینے کی وجہ سے ایسا کر رہی ہے۔ نورین نے اسے سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ وہ گھر کے دروازے پر آ پہنچی۔

""آجائیے، میں آپ کو اماں سے ملواتی ہوں اور خالہ عظمت سے بھی۔"" اس نے شاپر تھام کر اسے گھر آنے کی دعوت دی۔

""نہیں، مجھے چلنا چاہیے۔ آپ لوگوں کو بہت کام ہوں گے۔"" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کا دل بہت اداس ہو گیا تھا وہ رحما سے بچھڑ جو رہا تھا۔

""اچھا، آپ اپنا خیال رکھیے گا۔"" اس نے مسکرا کر کہا۔

""ہاں ضرور۔"" وہ مسکرایا۔

""تحفے کے لیے بہت بہت شکریہ۔"" اس نے انگوٹھی کو یاد کر کے کہا۔ وہ مسکرایا۔

""شکریہ کیسا، وہ تو آپ کی شادی کا تحفہ تھا۔"" اس نے کندھے اچکائے۔

""میں بھی آپ کی شادی پر آپ کو اچھا سا تحفہ دوں گی۔"" اس نے مسکرا کر کہا۔ وہ ایک سنجیدہ ہو گیا۔

""کیا آپ مجھے میری پسند کا تحفہ دے سکتی ہیں؟"" وہ معلوم نہیں کیا مانگنے جا رہا تھا۔

""جی ہاں، آپ کو کیا تحفہ چاہیے؟"" رحما کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

""سوچ لیں۔"" اس نے افسردگی سے پوچھا۔

""ہاں، سوچ لیا۔"" اس نے بے صبری سے کہا۔

""کیا آپ مجھے وہ خطوط واپس دے سکتی ہیں؟"" اکرم نے سنجیدگی سے کہہ کر نظریں دوسری طرف کرلیں۔

""خطوط......؟"" وہ ہکا بکا رہ گئی۔ ""یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"" وہ ہنسا۔

""میں مذاق کر رہا ہوں۔"" وہ اس کے زرد چہرے کو دیکھ کر مسکرایا تا کہ وہ فکر سے رہا ہو جائے۔

""اکرم میرے ماضی میں جو کچھ ہوا اسے میں بھول چکی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی یہ سب کچھ بھول جائیں اور یاد کرنے سے جب اذیت ہی ہونی ہے تو پھر کیوں خود کو اذیت دی جائے۔ میں نے ارمغان سے محبت کی تھی اس نے مجھے دھوکا دیا۔ اب میرا مستقبل صرف حسیب ہے اور میں چاہتی ہوں کہ حسیب اور میرے درمیان کبھی میرا ماضی نہ آئے۔"" اس نے نہایت سنجیدگی سے دوٹوک انداز میں کہا اور پھر گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ اکرم نے کچھ دیر دروازے پر نظریں جمائے رکھیں اور پھر لبوں پر مسکراہٹ سجائے بائیک گھسیٹتا وہاں سے چلا گیا۔

معلوم ہے تم غیر کے ہو جاؤ گے
پھر بھی تمہیں پانے کی دعا مانگ رہا ہوں

☆☆☆

اس نے بجھے دل سے اپنی شاپنگ ماں اور خالہ کو دکھائی اور کمرے میں آ گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں اکرم کو دکھ دینے پر افسردہ ہے۔ اس نے اپنے بیگ سے سیل فون نکال کر چیک کیا حسیب کی کئی کالز دیکھ کر ڈر گئی۔

""مجھے حسیب کو فون کرنا چاہیے۔"" اس نے حسیب کا نمبر پریس کیا۔ حسیب گھر آ کر غصے میں ٹہل رہا تھا۔ کئی دفعہ اس نے رحما کو کال کی تھی مگر دوسری جانب سے کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔

""ہیلو! حسیب ہاں میں بزی تھی اس لیے آپ کی کال نہیں دیکھ سکی۔"" اس نے آرام سے بتایا۔

""رحما تم کہاں تھیں؟"" وہ حسیب کے غصے سے ڈر سی گئی۔

""جی......جی......وہ اکرم......"" اس نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ رحما کے منہ سے سچ سننے پر وہ مطمئن سا ہوا اس نے رحما کی بات کاٹی۔

""رحما تمہیں اس سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے نورین نے سب کچھ بتا دیا ہے۔""

""جی......!"" رحما کے حلق سے کوئی لفظ نہ نکل سکا وہ بت بن کر رہ گئی۔

""میں اکرم کو دیکھ لوں گا اس نے ریما کی زندگی کو بھی یہاں تک پہنچایا ہے۔""

""ریما کی زندگی؟"" وہ گھبرا کر بولی۔

""ہاں...... ریما کی اس حالت کے پیچھے اکرم ہے۔ ریما، اکرم سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس نے ریما کی محبت کو انکار کیا جس کی وجہ سے ریما نے اپنی جان لینے کی کوشش کی۔"" وہ غصے سے بولتا چلا گیا۔

""ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"" اسے اکرم کے متعلق یہ سن کر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

""تم اس شیطان سے دور رہو صرف میرے ڈر کی وجہ سے تم اس سے بار بار ملنے جاتی ہو...... مجھے تمہارے ماضی سے کوئی غرض نہیں۔ تم میرا مستقبل ہو، حسیب احمد کا...... آئندہ میں تمہیں اس شخص کے ساتھ نہ دیکھوں۔"" اس نے ایک، ایک لفظ چبا چبا کر اسے کہا۔

""جی!"" وہ اس کے غصے پر کچھ بول نہ سکی۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے بتا دے کہ اکرم نے اسے خطوط کے لیے بلیک میل نہیں کیا مگر دوسری طرف حسیب غصے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ رحما کو یوں لگ رہا تھا جیسے حسیب، اکرم کا خون کر دے گا۔ اس لیے رحما نے اکرم کی حمایت کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔

""حسیب پلیز خود پر کنٹرول کریں۔"" اس نے حسیب کا غصہ ٹھنڈا کیا جو اکرم کے خلاف آگ بگولہ ہوتا جا رہا تھا۔

""دوست نہیں میرا سب سے بڑا دشمن ہے وہ۔ میری بہن...... اور میری ہونے والی بیوی پر اس نے نظر رکھی ہے۔ میں اس کا بہت برا حال کروں گا۔"" اس نے چیختے ہوئے کہا۔

""بس حسیب...... پلیز آپ غصہ مت کریں۔ میں آپ کی ہوں اور ریما بھی بہت جلد صحت یاب

ہو جائے گی۔ آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے جس سے آپ کی زندگی پر کوئی اثر آئے۔'' اس نے پیار سے اسے روکا جو اکرم کی جان لینے کی باتیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر اور باتیں کر کے رحما نے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ وہ اس سے شادی کے انتظامات پر بات کرنے لگی۔

☆☆☆

شادی کا بھی دن آن پہنچا تھا۔ ثریا بڑی دیر سے اس کے پاس بیٹھی اسے تکے جا رہی تھی۔

''آج میری بیٹی یہ گھر چھوڑ کر اپنی سسرال جا بسے گی۔ بیٹی اُس گھر کو اپنا گھر سمجھنا اور کسی کا دل نہ دُکھانا۔ وہ امیر لوگ ہیں، ہمارا اُن کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں جیسا جیسا حسیب کہتا جائے ویسا ہی کرنا۔'' اس نے پیار سے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

''اماں...... اگر آپ نے رونا ہی تھا تو میری شادی کا کیوں سوچا۔'' اس نے پیار سے ماں کا ہاتھ چوم لیا۔

''بس...... بیٹیاں اپنے گھر کی ہو جائیں تو ماں کے دل کو ٹھنڈک پڑتی ہے۔'' خالہ عظمت بھی مسکرا کر کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

''خالہ میں نورین سے خفا ہوں کتنے دنوں سے اس کا فون نہیں آیا۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''نہ میری بچی، نورین کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رات وہاب نے فون کر کے بتایا تھا وہ سو رہی تھی۔'' خالہ عظمت نے فکرمندی سے بتایا۔

''بچی کا صدقہ دیا کیا؟'' ثریا نے خالہ عظمت سے پوچھا۔

''ہاں، اس کا بھی اور بیٹی رحما کا بھی دے دیا۔'' خالہ عظمت نے رحما کا ہاتھ تھام لیا۔

''خالہ اور اماں آپ لوگ مجھے اس گھر سے نکالنے پر کتنی خوش ہیں۔'' اس نے دونوں کو چھیڑا۔

''لو جی ہم تو تمہاری خوشی دیکھ رہے ہیں۔ حسیب کا گھر اتنا بڑا ہے وہاں پر راج کرے گی تو۔'' خالہ عظمت نے اسے پیار سے دیکھ کر کہا۔

''اماں میرے بعد آپ دونوں اکیلی رہ جائیں گی۔ آپ دونوں کا وقت کیسے گزرے گا'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''تم لوگ اپنا، اپنا ایک بچہ ہمارے حوالے کر دینا۔'' خالہ عظمت نے ہنس کر ثریا کو دیکھا۔

''ہاں، یہ کمال کا خیال تم نے سوچا ہے عظمت۔'' وہ خالہ عظمت کی بات پر شرما سی گئی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب کدھر جا رہی ہو دلہن؟'' خالہ عظمت نے مسکرا کر پوچھا۔

''خالہ چائے بنانے جا رہی ہوں۔'' وہ کمرے سے نکل گئی۔

''ارے، آج تو رہنے دو بیٹی۔'' خالہ عظمت یہ کہتے کہتے اس کے پیچھے لپکیں۔

☆☆☆

سرخ لہنگے اور بھاری خوب صورت جیولری میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''آپ تو مسٹر حسیب کو قتل ہی کر دیں گی۔ آپ بہت حسین لگ رہی ہیں۔'' بیوٹیشن نے اس کے دوپٹے کو سر پر سجا کر اس کی دل کھول کر تعریف کی۔ وہ مسکرانے لگی۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو خود کو ہی پہچان نہیں پائی تھی۔ وہ ہمیشہ میک اپ سے دور رہی تھی اس لیے میک اپ کرنے کے بعد وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''آپ اور مسٹر حسیب کی یہ لو میرج ہے؟''

''ارینج میرج ہے۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

''اچھا پھر تو آپ بہت لکی ہیں۔ آپ کے ہونے والے شوہر کی مجھے تین دفعہ کالز آ چکی ہیں کہ آپ کو بہت پیار سے ڈیل کیا جائے۔'' وہ شرما گئی۔

''لگتا ہے مسٹر حسیب آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''جی۔'' اس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ بیوٹیشن نے اس کی اجازت سے اس کے کلوز ایس لیے

کہ اپنے پارلر میں لگائے گی اس نے مسٹر حسیب سے پوچھ لیا تھا۔

''آپ کا کام مکمل ہے آپ جا سکتی ہیں۔''

''سنو مسٹر حسیب کے ڈرائیور کو اطلاع دو کہ گاڑی نکالے۔'' ریسپشنسٹ نے ملازم کو انٹرکام کر کے کہا۔

''جی میڈم۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھا اور ڈرائیور کو آواز دینے لگا۔

''آپ کو شادی بہت بہت مبارک ہو۔'' بیوٹیشن نے اس کے ساتھ آخری دفعہ ہاتھ ملا کر الوداع کرتے ہوئے کہا اور وہ آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ملازم لڑکی نے پیچھے سے اسے پکارا۔

''میڈم...... میڈم آپ کا سیل فون رہ گیا۔'' ایک لڑکی نے اسے آ کر سیل فون دیا۔ سیل فون یک دم بج اٹھا۔ اسکرین پر اکرم کا نمبر دیکھ کر وہ اپ سیٹ ہو گئی۔

''اس وقت اکرم!'' اور پھر اس نے فوراً بٹن دبا دیا۔ دوسری طرف اکرم کے بجائے سکینہ کی آواز ابھری۔

''بیٹی رحما، پولیس والے اکرم کو دہشت گردی کے کیس میں ملوث کر کے گھر سے مارتے مارتے لے گئے۔ انہیں ہمارے چھت والے کمرے میں سے اسلحہ ملا ہے جبکہ میرا اکرم ایسا نہیں ہے۔ کل حسیب کا ملازم حیدر ہمارے گھر کارڈ دینے آیا تھا وہ کسی بہانے ہماری چھت پر بھی گیا تھا۔ تم حیدر سے پوچھ سکتی ہو بیٹا؟ حسیب کو میں کئی دفعہ کالز کر چکی ہوں سنو حسیب کو بتاؤ کہ پولیس والے اکرم کو مار مار کر لے گئے ہیں۔ اکرم کے ابا بے ہوش پڑے ہیں۔ رحما میرا بیٹا بے قصور ہے۔'' سکینہ روتے روتے بولے گئی اور رحما کا وجود کانپنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹ گیا۔ بھاری لہنگے کی پروا کیے بغیر تیزی سے گاڑی کی طرف لپکی۔ حیدر کار کے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''حیدر...... حیدر تم نے اکرم کے گھر پر اسلحہ رکھوایا تھا؟'' حیدر اس کے اچانک حملے پر گھبرا گیا۔

"نن...... نہیں تو۔" اس نے گھبرا کر انکار کیا۔
"حیدر مجھے سچ بتاؤ۔ تم نے اکرم کے گھر پر اسلحہ رکھوایا ہے؟ تم ان کے گھر کی چھت پر کل گئے تھے۔ میں تمہارے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرادوں گی۔" رحما کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے مار ڈالے۔ وہ نظریں جھکائے بت بنا رہا۔
"حیدر بولو...... سچ کیا ہے؟" اس نے اب حیدر کا گریبان جھنجوڑ کر پوچھا۔
"بی بی جی، آپ مسٹر حسیب سے پوچھ لیں۔ جیسا ان کا حکم تھا میں نے ویسا ہی کیا۔" اس نے ادب کے ساتھ سر جھکا کر سچ بتا دیا۔
"اکرم...... اکرم بے قصور ہے۔ اکرم بے قصور ہے۔" وہ رو دینے کو تھی۔ "مجھے اکرم کے پاس جانا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا چاہیے وہ لوگ اسے مار دیں گے؟" وہ روتے روتے بولی۔ حیدر گھبرا کر اسے دیکھنے لگا جس کا تمام میک اپ بہہ رہا تھا۔
"بی بی جی، آپ کی آج شادی ہے اور بارات ہال میں پہنچ چکی ہے۔ سب لوگ آپ کے منتظر ہیں۔" اس نے رحما کو اکرم کی سوچ سے آزاد کرنا چاہا۔
"نہیں...... میں اپنی خوشیوں کے لیے اس بے قصور کی جان کیوں لوں۔" اس نے گاڑی کا دروازہ زور سے بند کیا جو حیدر نے اس کے لیے کھول دیا تھا اور وہ ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ حیدر چیخا۔
"بی بی جی، آپ...... آپ کہاں جا رہی ہیں؟" وہ رحما کے اس ردعمل پر بوکھلا سا گیا اس نے فوراً جیب سے سیل فون نکالا اور حسیب کو فون کیا۔ دوسری طرف حسیب کا نمبر بزی جا رہا تھا۔ حیدر دور جاتی رحما کے لیے مزید پریشان ہوگیا اور اس نے حسیب کے پاس جانے کے لیے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆☆☆

وہ دلہن کے لباس میں روڈ پر بھاگتی چلی جا رہی
"ہمارا ایک گھر ہوگا جس میں ہمارے پیارے پیارے بچے ہوں گے۔ تم میرے بچوں کی دیکھ بھال کرو گی اور میں تمہاری دیکھ بھال کروں گا۔ میں کبھی تمہیں کوئی دکھ نہیں دوں گا۔ تم پر آنے والی ہر آفت کو خود پر لے لوں گا۔ نہیں، میں تمہارے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ تم کیا مجھے زندہ چھوڑ دوگی اگر میں کسی اور کا سوچنے لگوں تو؟ بہت محبت کرتا ہوں...... مذاق میں بھی اب ایسا نہ لکھنا کہ تم جان دے دوگی۔ تمہاری جان میری جان ہے اور اپنی جان کو بچانے کے لیے میں اپنی جان دینے سے بھی نہیں ڈروں گا۔" خط میں لکھی اس کی باتیں اس کے ذہن سے امڈ امڈ کر باہر آ رہی تھیں۔ وہ ہانپتے ہانپتے پولیس اسٹیشن جا پہنچی اور چیخ چیخ کر اس کا نام پکارنے لگی۔
"اکرم...... اکرم...... اکرم۔" دلہن کے لباس میں ایک لڑکی کو چیختا دیکھ کر پولیس کے سب اہلکار گھبرا گئے۔ وہ انسپکٹر کے پاس گئی اور تمام صورتِ حال بتائی کہ اکرم بے قصور ہے اس کے خلاف یہ سب سازش ہوئی ہے۔
"دیکھیں محترمہ اکرم کے گھر سے ہمیں ثبوت ملا ہے۔"
"جھوٹ...... جھوٹ ہے وہ سب۔ یہ سب اس کے خلاف سازش کی گئی ہے۔ آپ اکرم کو چھوڑ دیں۔"
"بی بی جی، آپ کون ہیں اور کس حالت میں آ گئی ہیں اور یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" انسپکٹر اس سے کہنے لگا۔
"مجھے اپنے انچارج سے ملواؤ۔ کہاں ہیں ایس ایچ او؟" وہ ہذیانی انداز میں کہہ رہی تھی۔
اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ بولتا اسے حسیب کی آواز سنائی دی۔
"رحما...... رحما آپ......؟" حسیب اپنی بارات چھوڑ کر حیدر کی بات پر یہاں بھاگا چلا آیا۔ اس نے رحما کو اتنی بری حالت میں دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔
"حسیب، اکرم بے قصور ہے۔ اسے یہ لوگ مار رہے ہیں۔" وہ حسیب کی طرف لپکی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور سارا میک اَپ خراب ہو چکا تھا۔ اس کا دوپٹا آدھا زمین پر اور آدھا اس کے کندھے پر لہرا رہا تھا۔
"رحما...... تم ہوش میں تو ہو؟" حسیب نے اسے

جھنجوڑا۔
"حسیب...... حسیب یہ لوگ اکرم کو مار دیں گے۔ وہ بے قصور ہے۔ اس نے مجھے کبھی بلیک میل نہیں کیا تھا۔ حسیب میری بات کا یقین کریں۔" وہ رونے لگی۔
"رحما...... تم ...... تم میری رحما نہیں رہیں۔" حسیب نے اسے خود سے دور پھینکا۔
"حسیب، اکرم کو بچا لو۔ وہ بے قصور ہے اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔" وہ چیخ چیخ کر بولی اور حسیب کے سامنے اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔
"تم اکرم سے محبت کرتی تھیں؟" اس نے رحما کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا۔
"محبت...... محبت......!" وہ حسیب کے سوال پر چونکی۔
"کیا تم اکرم سے اب بھی محبت کرتی ہو؟" اس نے رحما سے نظریں ملا کر پوچھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے وہ رحما کا قتل کر دے گا۔
"نہیں...... نہیں حسیب۔" وہ رونے لگی۔
"تو پھر اپنی شادی چھوڑ کر تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ مجھے بتاؤ تم یہاں کیوں اکرم کے لیے تڑپ رہی ہو؟" اس نے رحما سے غصے میں پوچھا۔
"نہیں...... میں اس سے محبت نہیں کرتی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"تم رو کیوں رہی ہو۔ یہ آنسو کس لیے ہیں؟" وہ چیخا۔ "تم جواب کیوں نہیں دے رہیں۔ بتا کیوں نہیں رہیں کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟" اس نے رحما کو غصے سے دیکھا۔ دونوں اس بات کی بھی پروا نہیں کر رہے تھے کہ سب پولیس اہلکار انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
"میں...... میں...... بس اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔" اس نے لرزتی آواز میں جواب دیا۔
"کیوں تم اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتیں؟" وہ چیخا۔
"پلیز حسیب، اکرم کو آزاد کروا دو۔ وہ بے قصور ہے۔" وہ منت کرنے لگی۔ حسیب، رحما کو اکرم کے لیے تڑپتا دیکھ کر پاگل سا ہو گیا۔ وہ چیخا۔
"انسپکٹر فیض، اکرم آپ کے حوالے ہے، وہ دہشت گرد ہے اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دہشت گرد کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے، آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔"
"نہیں...... نہیں حسیب یہ ظلم مت کرو۔ اس کی ماں مر جائے گی۔" وہ چیخی۔ حسیب اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹ کر باہر لے کر جانے لگا وہ تڑپ اٹھی۔
"چھوڑیں مجھے۔ یہ ظلم ہے...... اکرم بے قصور ہے پلیز حسیب اسے بچا لیں۔" اس نے خود کو چھڑواتے ہوئے کہا۔
"رحما تم یوں بے وفائی کرو گی...... میں نہیں جانتا تھا۔ تم نے مجھے سوسائٹی میں ذلیل کر دیا۔ آج ہماری شادی ہے اور میری دلہن کسی اور مرد کے لیے تڑپ رہی ہے۔" وہ اسے پولیس اسٹیشن کے باہر گھسیٹتے لے آیا۔
"حسیب، اکرم بے قصور ہے۔ اسے اتنی بڑی سزا کیوں دے رہے ہیں؟" وہ روتے روتے بولی۔
"اس کے لیے تڑپ کر تم مجھے جو سزا دے رہی ہو تمہیں اس کا کوئی احساس نہیں۔ اگر تمہیں اکرم سے محبت تھی تو مجھ سے شادی کا ڈراما کیوں رچایا؟" اس نے رحما کو غصے سے دیکھ کر پوچھا۔
"محبت...... محبت...... محبت یہ لفظ میں سن کر تنگ آ گئی ہوں۔ میں اس سے محبت نہیں کرتی مگر وہ تکلیف میں ہے تو میں انسان ہونے کے ناتے تکلیف محسوس کر رہی ہوں۔ اگر اس کو آپ محبت کا نام دیتے ہیں تو ہاں حسیب صاحب مجھے اکرم سے محبت ہے۔" اس نے حسیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غصے سے جواب دیا۔
حسیب نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ رحما کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ حسیب کی گرفت سے آزاد ہو کر پولیس اسٹیشن کے اندر بھاگی اور ایک روم کے سامنے جا پہنچی۔ اس نے دروازہ

کھولا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اکرم پر بری طرح تشدد کیا جارہا تھا۔ وہ اکرم کو ایسی حالت میں دیکھ کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے گھر میں موجود تھی اور خالہ عظمت اسے اپنے پاس فکرمندسی بیٹھی دکھائی دیں۔

''خالہ...... میں یہاں کیسے آئی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''رحما یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کل بیوٹی پارلر سے کہاں چلی گئی تھیں اور پھر اس بری حالت میں حبیب تمہیں یہاں چھوڑ گیا...... یہ سب کچھ کیا ہے بیٹی؟''

''خالہ وہ...... وہ ان لوگوں نے اکرم کو دہشت گرد قرار دے دیا۔ اکرم کو وہ لوگ مار رہے ہوں گے۔'' وہ کچھ بدحواسی کے عالم میں بول رہی تھی۔

''بیٹی کون اکرم؟ تیرا اس کے ساتھ کیا لین دین ہے؟'' خالہ عظمت نے اسے سینے سے لگا کر پوچھا۔

''خالہ میرا...... میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔'' وہ رونے لگی۔

''بیٹی خود کو سنبھال۔ حبیب رشتہ توڑ چکا ہے۔ کل رات اس نے صاف صاف لفظوں میں شادی سے انکار کر دیا۔ ثریا اس کے پاس گئی ہوئی ہے۔''

''کیا...... اماں...... اماں کہاں گئیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''حبیب کے پاس معافی مانگنے اور دوبارہ اسے آمادہ کرنے کے لیے کہ وہ تم سے شادی کر لے۔''

''مجھے اماں کے پیچھے جانا چاہیے۔ حبیب...... حبیب تو انہیں بہت ذلیل کرے گا۔ میں اس کے غصے کو اچھی طرح جان چکی ہوں۔ اس نے اکرم جیسے شریف انسان کی زندگی تباہ کرنے میں دو منٹ دیر نہیں کی۔'' وہ غصے اور رنج کی ملی جلی کیفیت میں تھی۔

''نہیں رحما، تم نہیں جاؤ گی۔ تم نے بہت کچھ اپنی مرضی سے کر لیا اب ہم بڑے ہیں۔ ہم حبیب سے اکرم کے بارے میں بات کریں گے اور ثریا بھی اسی مقصد کے لیے وہاں حبیب کے آفس گئی ہے۔''

''اس کے سر پر اکرم کا خون سوار ہے۔ وہ میری وجہ سے اکرم کو سزا دے رہا ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

''بس، خدا سے مدد مانگو۔'' خالہ عظمت نے آہ بھر کر جواب دیا۔ یک دم زور سے دروازے پر دستک ہوئی۔ خالہ عظمت گھبرا سی گئیں۔ رحما بھی کانپ اٹھی۔ دروازہ بہت بری طرح سے پیٹا جارہا تھا۔ خالہ عظمت نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو سامنے ایک محلے کی عورت ذکیہ کو پایا۔

''وہ ثریا بہن...... وہ ثریا بہن......'' اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''کیا ہوا ثریا کو؟'' خالہ عظمت اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''خالہ، اماں...... اماں کو کیا ہوا ہے؟'' ذکیہ کی آواز رحما کے کانوں میں پڑی تو وہ بھاگی بھاگی دروازے کی طرف لپکی۔

''وہ...... وہ رحیم کی دکان کے پاس گری ہوئی ہے اور سب وہاں جمع ہیں۔'' ذکیہ نے اٹکتے اٹکتے رحما کو بتایا۔ رحما نے یہ سنا تو باہر کی جانب بھاگی۔ خالہ عظمت بھی چادر سنبھال کر ذکیہ کے ہمراہ رحیم کی دکان کے پاس پہنچیں۔ ایک بڑے ہجوم کو چیرتی رحما گھستی چلی گئی۔ زمین پر ثریا بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالے جارہے تھے۔ اس نے ماں کو بانہوں کے حصار میں لے لیا اور تقریباً چیخنے لگی۔

''ارے کوئی ڈاکٹر کو بلا کر لائے۔ دیکھو نہیں رہے میری اماں آنکھیں نہیں کھول رہیں۔'' اس نے روتے روتے ماں کو ہلا کر کہا۔

''خالہ عظمت دیکھو تو اماں کو کیا ہو گیا ہے؟'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔ خالہ عظمت نے رحما کو سینے سے لگایا اور زور زور سے رونے لگیں۔

''رحما بیٹی، میری بہن ثریا مجھے چھوڑ گئی۔ تیری

ماں نہیں اب اس دنیا میں۔'' وہ تڑپ رہی تھیں۔

''نہیں خالہ...... نہیں خالہ۔'' وہ چیخی۔

''ہاں بیٹی۔'' انہوں نے رحما کو گلے سے لگا لیا۔ وہ بری طرح چیخنے لگی۔ جب محلے کے کچھ لڑکوں نے مل کر ثریا کو چارپائی پر ڈالا اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی ماں دنیا چھوڑ کر چلی گئی ہے اور وہ بے آسرا ہو چکی ہے۔

☆☆☆

''آپ نے میری ماں کو مار دیا۔ نہ جانے کیا کچھ غلط سلط میرے بارے میں کہا میری ماں صدمے سے دنیا چھوڑ گئیں۔'' وہ حبیب کے آفس میں کھڑی تھی۔

''اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو ہاں جس طرح تم نے مجھے سوسائٹی میں ذلیل کیا ہے اس طرح میں نے تمہاری ماں کو ذلیل کیا حساب برابر۔ اب وہ برداشت نہیں کر سکیں تو اس میں میرا کیا قصور۔'' حبیب نے بڑی بے مروتی سے کہا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم وہی حبیب ہو۔'' وہ نفرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اور رحما تم...... تم خود کو کیوں نہیں دیکھ رہیں۔ تم کیا وہی ہو؟'' وہ طنزیہ ہنسا۔

''حبیب تم نے جو کیا وہ سوچ سمجھ کر کیا مگر میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا جس کی سزا تم نے میری ماں کو دی ہے۔ تم نے انہیں ذلیل کر کے اپنے آفس سے نکالا۔ مجھے تمہارے ملازم نے سب بتا دیا ہے۔ تم نہایت گھٹیا انسان ہو۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ حبیب کا منہ نوچ لے۔

''اور...... اور تم نے مجھے پولیس اسٹیشن میں سب کے سامنے ذلیل کیا...... اس کا کیا؟ سب دیکھ رہے تھے کہ حبیب کی ہونے والی دلہن اکرم کے لیے تڑپ رہی ہے۔'' وہ حلق کے بل چیخا۔

''حبیب تم ایک پاگل شخص ہو۔ تمہیں صرف خود سے پیار ہے...... صرف خود سے۔'' وہ اس سے بھی زیادہ چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ہاں...... ہاں میں شروع سے ایسا ہی ہوں جو چیز مجھے پسند آجاتی ہے وہ میری ہوتی ہے اور جو چیز مجھے ٹھکرا دیتی ہے اس کی زندگی میں تباہ کر دیا کرتا ہوں۔ میں ایسا ہی ہوں۔''

''حبیب تمہارا اصلی چہرہ اتنا ڈراؤنا ہوگا میں یہ نہیں جانتی تھی۔''

''رحما...... ہاں دیکھ لو میرا چہرہ غور سے، یہ چہرہ تمہاری زندگی میں صرف تباہی لانا چاہتا ہے جس طرح تم نے میری زندگی کو تباہ کیا، اکرم نے میری بہن کو تباہ کیا اب تم اپنا انجام بھی دیکھ لینا۔'' وہ غصے سے پاگل ہوا جارہا تھا۔

''حبیب تم میرے ہوتے ہوئے اکرم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں اپنی ماں کو نہیں بچا سکی مگر اکرم کو ضرور بچا لوں گی۔'' اس نے اونچی آواز سے جواب دیا۔ وہ ہنسا اور اس کے سامنے کسی کو فون ملایا۔

''فیض صاحب میرا آپ کے پاس جو مہمان ہے اسے آرام کی نیند سلانا ہے۔ آپ مجھے بس اپنی قیمت بتا دیں۔'' وہ فیض نامی انسپکٹر سے بات کر رہا تھا رحما دہل گئی۔

''حبیب تم پاگل ہو رہے ہو، میرے اور اکرم کے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں آج بھی تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ اس کے قریب جا پہنچی۔

''ہاہاہا...... اگر وہ کچھ نہیں تو پھر اسے بچانے کے لیے مجھ جیسے خبیث انسان سے شادی کیوں کر رہی ہو جس نے تمہاری ماں کو ذلیل کر کے اس کی جان لی۔''

''حبیب پلیز...... فیض کو فون کرو کہ وہ ایسا کچھ نہ کرے۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''دیکھو رحما میں ریما کو لے کر کل امریکا جارہا ہوں۔ تم نے مجھے ابھی دھمکی دی ہے کہ تم اکرم کا بال بھی بیکا ہونے نہیں دو گی، جاؤ تم اسے چھڑوانے کی کوشش کرو اور میں اسے یہاں سے دوسری دنیا پہنچانے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا کہ رحما وہاں سے چلی جائے۔ رحما نے ایک

تلخ نظر اس پر ڈالی اور قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔

☆☆☆

''تُو...... تو پاگل ہوگئی ہے، یہ گھر فروخت کردے گی تو پھر کہاں تیرا ٹھکانا ہوگا؟''

''خالہ عظمت میں آپ کے گھر میں رہ لوں گی، مجھے اکرم کی ضمانت کے لیے ایک اچھا وکیل کرنا ہوگا جو بے قصور اکرم کو رہائی دلوا سکے۔ اس کے لیے مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔''

''میرا گھر...... وہ تو میں نے فروخت کردیا ہے۔'' خالہ عظمت نے سنجیدگی سے بتایا۔

''کب خالہ؟'' وہ زور سے بولی۔

''تیری اور نورین کی شادی کا انتظام اسی پیسے سے تو کیا تھا۔ ثریا اپنا گھر فروخت کررہی تھی مگر میں نے جن لوگوں سے پہلے رقم لی تھی انہی سے مزید رقم لے کر وہ گھر ان کے نام لکھ دیا۔ بیٹی تم بھول جاؤ اکرم کو اور پھر وہ تمہارا لگتا ہی کیا ہے؟'' خالہ عظمت نے خفگی سے کہا۔

''خالہ عظمت میری وجہ سے وہ مصیبت میں ہے، اس کا قصور اتنا ہے کہ اس نے میری جان بچانے کے لیے وہ خطوط لکھے۔ نہیں خالہ میں اسے یوں مرتا نہیں دیکھ سکتی۔'' رحما نے افسردگی سے کہا۔

''تو...... تو کیا اس سے پیار تو نہیں کرنے لگی؟'' خالہ عظمت نے اس کے بازو کو جھنجوڑ کر پوچھا وہ گھبرائی ہوئی سی دکھائی دینے لگی۔

''خالہ محبت اصل میں کیا ہے...... یہ میں نہیں جانتی ہوں۔ اماں کو کھو چکی ہوں مگر اب اکرم کو نہیں کھونا چاہتی۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''نورین کا فون آیا تھا تمہاری شادی ٹوٹنے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔ میں نے تو ثریا کا دکھ بھی چھپالیا۔ کہیں اس کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔''

''آپ نورین سے کچھ مت کہیے گا اور جب حسیب اسے سچ نہیں بتا رہا تو ہمیں بھی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے خالہ عظمت کو سختی سے کہا۔

''بیٹی تو پھر کیسے پیسوں کا انتظام کرے گی؟'' خالہ عظمت نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''خالہ اللہ تعالیٰ رستہ دکھا دے گا، میں پولیس اسٹیشن جا رہی ہوں۔ آپ گھر کا خیال رکھیے گا۔''

''بیٹی جلدی آجانا۔'' خالہ عظمت نے اس کے سر پر پیار دیا۔ انہیں معصوم سی رحما بہت مضبوط دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

''فیض صاحب آپ جانتے ہیں... کہ اکرم بے قصور ہے۔'' وہ پولیس اسٹیشن جا پہنچی اور فیض کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔

''آپ آئے ہمارے گھر خدا کی قدرت ہے کبھی ہم آپ کو دیکھتے ہیں تو کبھی اپنے غریب خانے کو۔'' اس نے شعر کی تشریح اپنے الفاظ میں کی۔

''دیکھیں میں یہاں آپ کی شاعری سننے نہیں آئی ہوں۔ مجھے اکرم سے ملنا ہے۔ اگر آپ نے حسیب کے کہنے پر اسے کوئی بھی اذیت دی تو میں آپ کو کورٹ لے جاؤں گی۔''

''آپ مجھے جہاں مرضی لے جائیں، بندہ آپ کے ساتھ ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہے۔'' اس کے لہجے میں خباثت تھی۔

''دیکھیں، میں یہاں آپ کی فضول بکواس سننے کے لیے نہیں آئی ہو۔ آپ اپنی ڈیمانڈ بتائیں جس طرح آپ نے حسیب سے رقم لے کر اکرم پر دہشت گردی کا کیس ڈال دیا ہے اب اس کی رہائی کے لیے آپ کو کتنے پیسے چاہئیں؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''تو کیا آپ مجھے خریدنے آئی ہیں۔ آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''آپ کو کتنے پیسے چاہیے، آپ اپنی زبان کھولیں۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''غصے میں آپ بہت کمال کی لگتی ہیں۔'' اس نے رحما کے وجود پر گہری نظر ڈال کر کہا۔

''دیکھیں مسٹر فیض میں جس کام کی نیت سے آئی ہوں آپ مجھے اس کا جواب دیں۔'' اس نے انگلی اٹھا کر اسے سمجھایا۔

''اچھا...... تو آپ اکرم کو رہا کروانے کے لیے مجھے پیسے دینا چاہتی ہیں یعنی رشوت......؟'' اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور معنی خیزی سے کہا۔

''جی ہاں، آپ بتائیں آپ کو کتنے پیسے چاہئیں؟''

''حسیب صاحب سے دُگنی رقم کیا آپ دے سکتی ہیں؟'' اس نے رحما پر گہری نظر ڈالی۔

''دیکھیں آپ اپنی رقم بتائیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''آپ کہاں سے اتنا پیسہ لے کر آسکتی ہیں میڈم رحما؟'' وہ مسکرایا۔

''آپ کو اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ غصے سے چیخی۔

''فکر کیسے نہ کروں، میرا دل آپ کے لیے دھڑکنے لگا ہے اور فیض کا دل پہلے کبھی کسی کے لیے نہیں دھڑکا۔'' اس نے مکروہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ وہ نروس سی ہوگئی۔

''فیض صاحب آپ سوچ لیں میں کل پھر آؤں گی۔''

''مجھے پیسے نہیں چاہیے۔'' وہ جو کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے عجیب انداز سے یہ جملہ کہنے پر رحما کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''تو پھر......؟'' اس نے کانپتے ہونٹوں سے پوچھا۔

''نکاح کرلو مجھ سے...... میں اکرم کو چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''کیا...... آپ پاگل ہوگئے ہیں؟'' وہ چیخی۔

''ہاں جناب، پاگل ہوگیا ہوں۔ میں نے اپنی ڈیمانڈ بتادی آگے جو آپ کی مرضی۔'' وہ غصے سے اسے گھورنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔

☆☆☆

وہ گھر بوجھل قدموں کے ساتھ پہنچی تو سامنے اکرم کی ماں سکینہ کو پایا جو خالہ عظمت کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ رحما کو دیکھ کر وہ اس کی جانب لپکی۔

''بیٹی رحما! حسیب، ریما کے ساتھ امریکا چلا گیا ہے اور میرے بیٹے کو عذاب میں چھوڑ گیا۔ وہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔ تو حسیب سے کہہ کر میرا بیٹا چھڑوا دے میں تیری ہمیشہ احسان مند رہوں گی۔'' سکینہ نے روتے روتے رحما کا ہاتھ تھام لیا۔

''خالہ...... خالہ سکینہ آپ ...... آپ حوصلہ رکھیں۔'' وہ سکینہ کے رونے پر پریشان سی ہوگئی کہ وہ کیسے ان کے بیٹے کو رہا کروائے گی۔ حسیب کی دولت کے آگے فیض نے اس کی زندگی کا سودا کیا ہے۔ خالہ عظمت نے سکینہ کو پانی کا گلاس تھمایا۔

''بہن! حسیب کا ہم سے کوئی تعلق نہیں اب۔ رحما بیٹی خود سے کوشش تو کررہی ہے مگر کیس بہت مضبوط ہے، آپ کے گھر سے اسلحہ برآمد ہوا ہے۔''

''میرا بیٹا دہشت گرد نہیں۔ رحما تم جانتی ہو میرا بیٹا کسی کی جان نہیں لے سکتا۔ وہ ملک سے غداری نہیں کرسکتا۔ حسیب نے یہ سب تمہاری وجہ سے کیا ہے تم جو اکرم سے ملنے اس کے پوسٹ آفس جاتی تھیں۔'' سکینہ نے روتے روتے بتایا۔ خالہ عظمت نے سر جھکا لیا۔

دل کی باتیں

''تم ایک بہت حسین لڑکی ہو۔''

''مجھے معلوم ہے تم دل میں ایسا نہیں سمجھتے لیکن پھر بھی کہہ رہے ہو۔''

''میں اصل میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر میں ایسا نہیں کہوں گا تب بھی تم دل میں ایسا سمجھتی رہو گی۔''

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

"خالہ آپ فکر نہ کریں اکرم جلد رہا ہو جائے گا، آپ سب مجھ پر چھوڑ دیں۔" اس نے سکینہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"بیٹی تو حسیب سے بات کر اس کو کہہ کہ اکرم نے تجھے کبھی بلیک میل نہیں کیا۔" سکینہ نے روتے روتے کہا۔

"ہاں...... ہاں خالہ میں ضرور بات کروں گی بس آپ مضبوط رہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں۔" اس نے تسلی دی۔ خالہ عظمت بہت فکر مند تھیں کہ رحما بے چاری کیسے اکرم کو آزادی دلوائے گی جس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔

☆☆☆

وہ رات کمرے میں بیٹھی فیض کی آفر پر غور کر رہی تھی کہ خالہ عظمت اس کے لیے کھانا لے آئیں۔

"خالہ مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے کھانا دیکھ کر کہا۔ عظمت نے روٹی کا نوالہ توڑ کر تھوڑی سی آلو کی بھجیا لے کر اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔

"خالہ! میری وجہ سے اماں......" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے۔

"بس بیٹی...... تیرے نصیب میں یہی لکھا ہوا تھا، چل منہ کھول کھانا کھا لے۔" عظمت نے پیار سے نوالہ اس کے منہ میں دے دیا۔

"میں نورین سے کچھ پیسے منگوا لوں، تیرے کام آ جائیں گے۔" خالہ عظمت نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

"نہیں خالہ، آپ اسے کچھ نہ بتائیں ابھی وہ ایسی حالت میں ہے کہ اس سے کوئی غم برداشت نہیں ہو سکے گا۔ وہاب سب جانتا ہے، وقت کے ساتھ وہ خود ہی نورین کو بتا دے گا۔"

"بیٹی مجھ سے سکینہ بہن کی حالت نہیں دیکھی جا رہی تھی...... حسیب کی فطرت ایسی ہو گی یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا...... اور تیری شادی اگر اس سے ہو جاتی تو شاید تو اتنی خوش نہ رہ پاتی...... جو شخص کسی مظلوم کو اتنی بڑی سزا دلوا سکتا ہے وہ کتنا ظالم ہو گا۔" عظمت نے سنجیدگی سے کہا۔

"خالہ! جو خدا کو منظور تھا وہ ہو گیا اور جو آگے منظور ہو گا وہ بھی ہوتا جائے گا۔"

"میں تو دعا کر رہی ہوں کہ اکرم کو کسی طرح رہائی مل جائے...... اور تیری روح پر جو بوجھ ہے وہ اتر جائے۔" خالہ عظمت نے اس کے سر پر پیار کیا اور پھر وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی مگر اس کا ذہن فیض کی بات کو ہی سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ مرے مرے قدموں سے پولیس اسٹیشن کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ آج کچھ سوچ کر آئی تھی۔ سکینہ کی حالت دیکھ کر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس بات کا یہی حل ہے۔ اپنے اندر ہمت مجتمع کر کے وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔ وہ اگر اعلیٰ پولیس افسران کے پاس جاتی بھی تو کیا کہتی۔ پولیس والوں نے اکرم کے خلاف مضبوط کیس بنا لیا تھا۔ اکیلی جان میں کیونکر اتنی ہمت آتی جو اس کے بس میں تھا اس نے وہی کیا اور انسپکٹر فیض سے نکاح کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ ابھی وہ پولیس اسٹیشن میں ہی بیٹھی ہوئی تھی کہ دو کانسٹیبل فیض کے کہنے پر اکرم کو سامنے لے آئے۔ آج اس کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ شکل سے وہ کافی لاغر نظر آ رہا تھا۔ وہ رحما کو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔

انسپکٹر فیض نے سفاکی کی حد کر دی تھی۔ وہ اپنے اور رحما کے نکاح کے بارے میں اکرم کو بتانے لگا جسے سن کر اکرم کا خون کھول اٹھا۔

"خبردار جو رحما کا نام بھی اپنی گندی زبان سے لیا۔" اکرم غصے سے چیخا۔

"ہاہاہا...... بہت پیار کرتا ہے رحما سے۔" فیض مسکرایا۔

"دیکھو فیض تمہارا مقصد مجھے سزا دینا ہے تو مجھے لہولہان کر دو... میں اف تک نہیں کروں گا مگر معصوم رحما کو اس مسئلے میں مت گھسیٹو۔" اکرم نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔ "دیکھو فیض تم میرے منہ پر ہزار مرتبہ تھوک دو مگر میری وجہ سے اس کو سزا مت دو۔ اسے چھوڑ دو۔"

"کیسے چھوڑ دوں جیسے تم اس کے لیے تڑپ رہے ہو میرا دل بھی اس کے لیے تڑپ رہا ہے اور ہاں کل ہمارا نکاح یہیں ہو گا۔ تمہیں بھی دعوت دے رہا ہوں۔" وہ بے بسی سے رحما کو دیکھ رہا تھا اور رحما منہ نیچے کیے اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتی رہی۔

☆☆☆

"تم...... رحما...... اور یہ سب کیا ہے؟" وہ سرخ دوپٹا ہاتھ میں لیے اس کے سامنے تھی۔ وہ حوالات میں بند تھا۔

"کیا تم سچ میں فیض سے نکاح کر رہی ہو؟" وہ چیخا۔ وہ خاموش رہی اس نے سر جھکایا ہوا تھا۔

"تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟" اس نے چیخ کر پوچھا۔

"آپ میری وجہ سے یہاں ہیں۔" اس نے لرزتی آواز میں جملہ ادا کیا۔

"رحما...... رحما یہ میری قسمت میں تھا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم ابھی اسی وقت یہاں سے گھر چلی جاؤ۔" اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"نہیں، آپ کی یہ حالت میری وجہ سے ہوئی ہے۔" اسے دیکھ کر اس کے آنسو ٹپک پڑے۔

"تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم فیض کی کسی بات کو نہیں مانو گی۔" اکرم نے رحما سے نظریں ملا کر کہا۔

"نہیں اکرم، میں آپ کو یہاں چھوڑ کر کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"اور تمہیں یہاں اس حالت میں دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں۔"

"اکرم میں آپ کو یہاں مرتا نہیں دیکھ سکتی۔" وہ لرزتی آواز میں بولی۔

"دیکھو رحما مجھے بھول جاؤ کہ کوئی اکرم بھی کبھی تمہاری زندگی میں آیا تھا اور ہم دونوں میں ایسا کوئی بھی رشتہ نہیں ہے، جس کے لیے تم فیض سے شادی کر رہی ہو۔" اس نے خفگی سے نظریں چرا کر کہا۔

"ہاں اکرم، ہم دونوں میں ایسا کوئی خاص رشتہ نہیں۔ میں نے ارمغان سے محبت کی تھی اور وہ محبت نہیں تھی۔ میں نے اپنی دوستی کو محبت سمجھ لیا تھا۔ محبت کیا ہوتی ہے اس کا احساس مجھے آپ نے دیا۔ آپ نے مجھے چاہا مگر مجھے پانے کی غرض سے نہیں...... محبت دو وجود کے ملاپ کا سودا نہیں، یہ آپ کی محبت نے مجھے احساس دیا۔ آپ میری خوشی کی خاطر حسیب کا نام نہیں لے رہے۔ آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں اور میری خوشی کی خاطر آپ نے مجھے پانے کی دعا بھی کرنا چھوڑ دی۔ اس کے باوجود ہم دونوں میں کوئی خاص رشتہ نہیں ہے۔"

"رحما ان باتوں کو بھول جاؤ اور لوٹ جاؤ۔ حسیب کی دنیا میں، میں جانتا ہوں وہ غصے کا برا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ وہ سب سمجھ جائے گا۔" اکرم نے گویا اسے تسلی دی۔

"نہیں اکرم نہیں، میں آپ کو یہاں ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" وہ اس سے دور جانے لگی۔

"نہیں رحما نہیں...... تم فیض سے شادی نہیں کر سکتیں۔" وہ اپنا سر سلاخوں سے ٹکرانے لگا۔ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو وہ چیخنے لگا۔

"رحما...... رحما...... رحما مت کرو ایسا۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔" مگر وہ روتے روتے اس سے دور ہو گئی۔

☆☆☆

ان کا نکاح پولیس اسٹیشن کے احاطے میں قریبی کوارٹر میں ہونا تھا۔ رحما، خالہ عظمت کو بتائے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر بیٹھی تھی اور اب فیض کی طرف سے دو گواہان اور مولوی صاحب کے سامنے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے فیض سے اکرم کی رہائی کا بڑا مہنگا سودا کیا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور اکرم ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ فیض اکرم کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا اور رحما کے آنسو اس کی جھولی میں گرنے لگے۔ آناً فاناً اکرم نے ایک حوالدار کا پستول اپنے قبضے میں کیا۔ مولوی صاحب گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ فیض بھی بوکھلا سا گیا۔

"دیکھو اکرم پستول نیچے پھینک دو۔ تم یہاں آئے

کیسے...... اوئے سارے لوگ کہاں مر گئے۔'' فیض نے اپنا پستول اس کے سینے پر تان دیا۔

''کون کمبخت فرار ہونا چاہتا ہے فیض۔ میں تو اپنی رحما کو تمہارے جیسے ذلیل انسان سے رہائی دلوانا چاہتا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر رحما کی طرف دیکھا اور پستول کی نلی اپنی کنپٹی پر رکھ دی۔ رحما چیخی۔

''نہیں...... نہیں اکرم۔'' وہ اکرم کی طرف لپکی۔

ایک زوردار آواز آئی اکرم فرش پر جا پڑا۔ رحما، فیض اور باقی سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اکرم کو دیکھنے لگے۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی جو اس نے رحما کو آخری وقت دیکھ کر دی تھی۔

رحما، اکرم کے اوپر جھک گئی۔ فیض کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا تھا۔ وہ اکرم کی لاش کے پاس آ کر منہ ہی منہ بڑبڑایا۔

''کیا کوئی ایسی بھی محبت کر سکتا ہے۔'' رحما نے فیض کا گریبان پکڑ لیا۔

''ہاں...... ہاں یہ تھی میری محبت۔ میری خوشیوں کی خاطر اکرم نے اپنی جان دے دی اور تم جیسے ذلیل انسان کے چُنگل سے مجھے بچا لیا مگر مجھے اس کی محبت کے بغیر جینا نہیں ہے۔ میری محبت ہی نہیں تو میں کیوں پھر سانس لے رہی ہوں۔'' اس نے فیض کا فرش پر پڑا ہوا پستول جھٹ سے اٹھا لیا۔

''رحما...... رحما دیکھو میری بات سنو۔'' اس سے پہلے کہ فیض اس سے پستول چھین پاتا رحما نے کئی گولیاں اپنے سینے میں اتار لیں اور اکرم کے قریب ہی فرش پر جا پڑی۔

وہاں افراتفری سی مچ گئی۔ فیض دل تھام کر ان دونوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک حوالدار نے اس کا کندھا ہلایا تو وہ ڈر سا گیا۔

''میں نے انہیں نہیں مارا۔ میں بے گناہ ہوں، میں بے قصور ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے ان لوگوں کی محبت کی سچائی کا علم نہیں تھا۔'' وہ پولیس اسٹیشن سے گھبرا کر باہر آ نکلا۔ پولیس کے اہلکار ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگے۔ فیض نے باہر آ کر زمین پر سے پتھر اٹھا لیے اور پولیس اسٹیشن کی طرف مارنے لگا۔ مجبوراً پولیس کے اہلکاروں نے اسے پکڑ لیا۔

''مجھے لگتا ہے فیض صاحب اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں اسپتال لے کر جانا چاہیے۔'' چند اہلکاروں نے اسے زبردستی گاڑی میں بٹھایا۔ اسی اثنا میں فیض کا فون بجنے لگا۔ اس نے گھبرا کر اپنی جیب سے فون نکالا اور حسیب کا نمبر دیکھ کر فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

''میں نے رحما اور اکرم کی محبت کو نہیں مارا...... تم ان کی محبت کے گناہ گار ہو۔'' وہ بے سر دیا بول رہا تھا۔

''فیض...... فیض، کیا کہہ رہے ہو میری بات سنو، میری بہن ریما کو ہوش آ گیا ہے اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے کہ اکرم اس کی اس حالت کا ذمے دار نہیں تھا بلکہ وہ خود تھی۔'' اس نے جھنجلاہٹ میں کہا۔ فیض قہقہے لگانے لگا۔

''فیض تم ہوش میں تو ہو تم اکرم...... ہاں اکرم کو چھوڑ دو میں واپس آ رہا ہوں، میں سب اعتراف کر لوں گا کہ اکرم کے خلاف میں نے ہی یہ سب کیا تھا۔'' اسے فیض کی حالت سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''رحما اور اکرم تو آسمان پر چلے گئے... یہ زمین ان کی محبت کے قابل جو نہیں تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے دیوانہ وار قہقہہ لگایا اور پھر اپنا فون گاڑی میں سے دور پھینک دیا اور تالیاں بجانے لگا۔

''دیکھو...... دیکھو رحما اور اکرم وہ آسمان پر ہیں...... دیکھو آسمان پر رحما اور اکرم کا گھر ہے۔'' اور پھر اس نے اپنی نظریں آسمان کی جانب کر لیں وہ کبھی ہنستا تو کبھی روتا۔ اسے شاید علم نہیں تھا کہ اُن کی محبت ایک دوسرے کو پانا نہیں بلکہ ایک دوسرے کو خوشی دینا تھی اور انہوں نے ایک دوسرے کو خوشی دینے کے لیے خود کو فنا کر دیا۔ فیض کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔ وہ اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ محبت ایسی بھی ہوتی ہے۔

دریا میں قطرے کی صورت گم ہو جاؤں
میں اپنے آپ سے باہر نکلوں اور تم ہو جاؤں

(ختم شد)

نزہت اصغر

مجھے دل سے نہ بھلانا



''مجھے دل سے نہ بھلانا'' یہ گیت گلوکارہ مہناز نے فلم ''آئینہ'' کے لیے گایا تھا مگر آج ان کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے پر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ گویا وہ جاتے جاتے اپنے مداحوں سے یہ تمنا کر گئیں کہ انہیں کبھی نہ بھلایا جائے۔

یہ خبر کافی رنج وغم سے سنی گئی کہ ہمارے ملک کی نامور گلوکارہ مہناز بیگم دورانِ پرواز طبیعت بگڑنے پر خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ انہیں بحرین کے ایک اسپتال میں پہنچادیا گیا تھا مگر وہ جانبر نہ ہوسکیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

گلوکارہ مہناز نے ریڈیو، ٹی وی اور فلم کے لیے ڈھائی ہزار سے زائد گانے گائے۔ اُن کی وفات سے گلوکاری کا ایک عظیم دور ختم ہوا اور محض 55,54 سال کی عمر میں انہوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ بلاشبہ وہ ایک لیجنڈری شخصیت ہیں۔ مہناز کو نیم کلاسیکی گائیکی کے انداز ٹھمری، دادرا اور خیال پر گائیکی میں عبور حاصل تھا۔ انہیں ستر کی دہائی میں فلموں میں پلے بیک گلوکاری سے شہرت ملی وہ غزل گائیکی میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتی تھیں۔ انہیں نعت، منقبت، سلام، نوحے اور مرثیے کی ادائیگی میں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے کام سے پوری دنیا میں پاکستان کا نام روشن کیا۔ ملکۂ ترنم نور جہاں کی زندگی ہی میں مہناز کو غیر معمولی پزیرائی نے انہیں صفِ اوّل کی فنکارہ بنادیا تھا۔ اپنی سُریلی آواز میں گایا امیر خسرو کا گیت "چھاپ تلک سب چھین لی ری موسے نیناں ملائی کے" گاکر انہوں نے خود کر امر کرلیا۔ انہیں فنِ موسیقی کے مختلف رموز سے آگاہی حاصل تھی۔ فلموں کے لیے بہترین گائیکی پر انہیں دس نگار ایوارڈز ملے۔ مہناز بلاشبہ ایک بڑی اور کامیاب گلوکارہ تھیں۔ آج وہ ہم میں نہیں مگر ان کا فن اور آواز ہمیشہ موسیقی کی تاریخ میں محفوظ اور تابندہ رہے گا۔

ہمارے ادارے نے ہمیشہ کوشش کی کہ اپنے Celebrities کو ہر ممکن پزیرائی دی جائے خواہ وہ کسی بھی شعبے سے متعلق ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ جب 2005ء میں ادارے کی جانب سے ہمارے پانچویں پرچے "دلکش" کا اجرا ہوا تو ہم نے مختلف شخصیات سے باقاعدہ وقت لے کر انٹرویوز کیے جبھی گلوکارہ مہناز سے ملاقات کا بھی اعزاز ملا اور ان سے بہت دوستانہ ماحول میں ایک غیر رسمی انٹرویو کیا جسے قارئین نے بہت سراہا تھا۔ یہ انٹرویو ادارے سے وابستہ ہماری شاعرہ اور رائٹر یمنیٰ احمد نے لیا تھا۔ ہمارے خیال میں کسی بھی میگزین کے لیے یہ مہناز کا آخری انٹرویو تھا جو فروری 2007ء کے ماہنامہ دلکش میں شائع ہوا تھا۔ آج مہناز بیگم کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ہم ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے وہی انٹرویو من وعن آپ کے ذوق کی نذر کررہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ بھی اس عظیم فنکارہ کی گفتگو سے محظوظ ہوں گے۔

☆☆☆

گلوکارہ مہناز بیگم سے یادگار ملاقات

یمنیٰ احمد: آج کل کیا مصروفیات ہیں مہناز جی آپ کی؟

مہناز: تمہارا نام بہت پیارا ہے یمنیٰ! (شکریہ) آج کل کی مصروفیات کے بارے میں کیا پوچھتی ہو...... بس آج کل میں وہی کررہی ہوں جو اپنی شوبز کی مصروفیات کی وجہ سے نہیں کرسکی یعنی اپنے بھائیوں سے ملنا، ان کے بچوں کے درمیان وقت گزارنا اور سچ بتاؤں کہ میں ان احساسات کو بہت انجوائے کررہی ہوں کیونکہ انہیں بہت شکایت رہی ہے ہمیشہ مجھ سے کہ میں نے انہیں بہت کم وقت دیا ہے۔ میں ابھی پچھلے دنوں ہی امریکا سے لوٹی ہوں کیونکہ میرے بھائی امریکا میں ہوتے ہیں۔ یہاں آتے ہی میری پھر سے وہی مصروفیات شروع ہوگئی ہیں۔ جہاں محفلوں میں مجھے بلایا جاتا ہے میں جاتی بھی ہوں مگر کئی جگہوں پر اب انکار بھی کردیا ہے کیونکہ اب محرم آگیا ہے تو ان دنوں آپ جانتی ہی ہیں کہ میری مصروفیات صرف اور صرف مرثیہ خوانی اور امام بارگاہوں تک محدود ہوجاتی ہیں۔

یمنیٰ احمد: آپ کی آواز ماشاءاللہ نہ صرف آپ



کی شناخت بنی بلکہ پاکستان کی شناخت کا بھی باعث بنی تو کیا آپ اس کے علاوہ کچھ اور شوق بھی رکھتی ہیں؟

مہناز: (ہنستے ہوئے) ارے، نہیں مجھے گلوکاری سے ہی فرصت نہیں ملتی تو اور بھلا کیا کروں گی اور پھر میرا اصول رہا ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا چاہیے لہٰذا میں اس پر عمل کرتی ہوں۔

یمنیٰ احمد: آپ بہت سادہ مزاج ہیں تو اس فیلڈ میں آپ کو اپنی سادگی کی وجہ سے بھی کوئی مشکل پیش آئی؟

مہناز: (چونکتے ہوئے) اوہ...... بہت اچھا سوال کیا ہے یمنیٰ تم نے...... مجھے واقعی بہت مشکلات کا سامنا ہوا اپنے ابتدائی زمانے میں اور آج بھی میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ سچ بولتی ہوں جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر...... مجھ سے جھوٹ نہیں بولا جاتا اور آپ جانتی ہیں کہ سچ بہت کم لوگ بولتے ہیں اور اس سے بھی کم لوگ ہیں جو سچ برداشت کرتے ہیں بہرحال سادگی کی علامت یہی ہے کہ سادہ آدمی سچ بولتا ہے۔

یمنیٰ احمد: کئی بار آپ سے پوچھا گیا ہوگا کہ اس فیلڈ کی جانب کیسے آنا ہوا تو ہمارے دلکش کے قارئین کو بھی بتائیں کہ کیا آپ اپنی والدہ کی وجہ سے یہاں آئیں؟ کجن بیگم جنہیں خود بھی کلاسیکی موسیقی میں کمال حاصل تھا اور مرثیہ خوانی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

مہناز: قطعاً نہیں بھئی قسم سے میری والدہ تو بالکل نہیں چاہتی تھیں کہ میں اس فیلڈ میں آؤں اور سچ بتاؤں کہ انہیں یہ تک نہیں علم تھا کہ میری آواز اچھی ہے (قسم سے کہنا بہت اچھا لگا مہناز جی) میرے خالو تھے سید ابوتراب نقوی جو ریڈیو میں پروگرام منیجر تھے جب بھی وہ گھر آتے یا کہیں بھی مجھے اتفاقاً گاتے ہوئے سنا کرتے تھے کبھی گانے کبھی نوحے، مرثیے تو وہ امی سے کہتے تھے کہ بڑی آپا اس کی اتنی خوب صورت آواز ہے اس کو تو آپ لے آئیں تو اماں سختی سے کہتی تھیں کہ نہیں ہم نہیں گوائیں گے بلکہ اس کی شادی کردیں گے جلد ہی بس...... یہ ہوتا تھا میرے ساتھ یمنیٰ (قہقہہ) مگر مجھے گانے کا بے حد شوق تھا اور اس کی وجہ سے بڑی مار کھائی ہے امی سے...... کبھی کھانا بناتے ہوئے گنگنا رہی ہوں اور اس کی وجہ سے اسی میں کھوگئی اور ادھر ہانڈی جل رہی ہے اور مجھے ہوش نہیں بس آپ ہی آپ گنگنا رہی ہوتی تھی۔ جیسے ہی جلنے کی بُو امی تک پہنچی تو ڈوئی سے مار پڑتی تھی مجھے کہ ساری ہانڈی کا ستیاناس کر دیا...... اسی طرح اگر آنگن میں جھاڑو لگا رہی ہوں تو کئی کئی گانے ختم ہوگئے مگر آنگن کی جھاڑو نہیں ختم ہو رہی تو اماں کہتیں کہ تو کیا مسجد میں صفائی کررہی ہے جو اتنی دیر ہوگئی اور جھاڑو ختم نہیں ہورہی...... تو بس کام کوئی بھی کرتی تو گاتی رہتی تھی اب چاہے مار پڑے

رہی ہو چاہے کام خراب ہو رہا ہو مگر میرا گانا ختم نہیں ہوتا تھا اور ہاں مزے کی بات بتاؤں کہ میں خواب دیکھا کرتی تھی بہت کہ میں میڈم نور جہاں اور مہدی حسن کے ساتھ گانا گا رہی ہوں، اللہ نے میرے سارے خواب سچ کر دیے۔

یمنیٰ احمد: کتنا عرصہ ہو گیا آپ کو اس فیلڈ میں؟

مہناز: مجھے تقریباً تیس سال ہو گئے ہیں۔ ایک عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں۔

یمنیٰ احمد: یہ ایک لمبا عرصہ ہے اور انسان کی فطرت ہے کہ یکسانیت سے اکتا جاتا ہے تو آپ کو بھی کبھی ایسا محسوس ہوا؟

مہناز: نہیں...... نہیں، آپ یقین کریں بالکل ایسا لگتا ہے کہ جیسے کل ہی کی بات ہو...... اور پھر انسان کے پاس اکتانے کے لیے بھی وقت ہونا چاہیے ناں...... میرے پاس تو اکتانے کے لیے بھی وقت نہیں تھا تو پھر کیسی بیزاری اور کیسی اکتاہٹ۔ آپ اگر مصروف ہوں تو آپ کا ذہن کیسے فضول باتیں سوچے گا...... میں نے خود کو ہمیشہ مصروف رکھا، آج بھی میں باقاعدگی سے ریاض کرتی ہوں اس سے وقت بچے تو گھر کے کاموں کی طرف توجہ دیتی ہوں۔ گھر کی سیٹنگ کرتی ہوں۔ کھانا پکانے کا بے حد شوق ہے کوکنگ کرتی ہوں اور ہاں ایک راز کی بات بھی بتاؤں کہ میں نے ہمیشہ ایک روزنامچہ لکھا ہے جو آج تک جاری ہے کبھی شاید وہ بھی منظرِ عام پر آئے۔ اس میں، میں باقاعدگی سے لکھتی ہوں جو میری پوری تیس سالہ زندگی کا نچوڑ ہے۔ ابھی میں جب امریکا گئی تو میں نے اس دوران زیادہ لکھا اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پاکستان میں شور بہت ہے وہاں سکون ہے سناٹا ہے...... یہاں تو اب سبزیاں بھی لاؤڈ اسپیکر پر بکتی ہیں اور اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

یمنیٰ احمد: کچھ اندازہ ہے کہ آپ کتنا کام کر چکی ہیں اب تک؟

مہناز: (مسکراتے ہوئے) بے شمار کام کر چکی ہوں بھلا کیسے اندازہ کر سکتی ہوں...... میرا خیال ہے کہ نور جہاں کے بعد اب سب سے زیادہ کام میں نے کیا ہے۔

یمنیٰ احمد: اچھا یہ یاد ہے کہ مہناز کی شناخت کس گیت نے بنائی کہ یہ آواز مہناز کی ہے؟

مہناز: (ماضی میں جھانکتے ہوئے) بہت پرانی پرانی باتیں یاد دلا رہی ہو یمنیٰ...... میری صحیح شناخت جو ہوئی تھی وہ فلم آئینہ کے گانوں سے ہوئی تھی پھر لوگوں کو پتا چلا تھا کہ ہاں مہناز بھی کوئی ہے۔ میں نے اور مہدی حسن صاحب نے گایا تھا مجھے دل سے نہ بھلانا، وعدہ کرو ساجنا وغیرہ میں نے گائے اور اس فلم کا میوزک سپر ہٹ ہوا۔

یمنیٰ احمد: خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیں؟

مہناز: خاندانی پس منظر کے حوالے سے یہ کہوں گی کہ ہمارے خاندان کی یہ ساتویں پیڑی یا نسل ہے جو ذاکر ہے...... یعنی مرثیہ خوانی اور ذکر کرنا اور یہ بھی ایک پوری صنف ہے اپنے اندر جس میں میر انیس، میر دبیر جیسے لوگوں کا کلام شامل ہوتا ہے جو میرے پاس بڑی بڑی جلدوں میں محفوظ ہے...... اور بہت کچھ تو چوری ہو گیا۔

یمنیٰ احمد: اس فیلڈ میں آپ کو کس نے باقاعدہ متعارف کروایا؟

مہناز: میں نے بتایا ناں کہ میرے خالو میری حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ریڈیو پاکستان کراچی کے ڈائریکٹر جنرل سلیم گیلانی صاحب نے مجھے آگے بڑھایا کیونکہ وہ امی کو بہت مانتے تھے بڑی آپا کہتے تھے اور مجھے بہت پیار کرتے تھے اپنے بچوں کی طرح مجھے ٹریٹ کرتے تھے۔ مجھے تو کچھ آتا ہی نہیں تھا ناں ان لوگوں نے مجھے سکھایا اور پھر مشکل یہ تھی کہ ان دنوں ایجوکیشن بھی میری چل رہی تھی ابو نے کہا تھا کہ تم اپنی ایجوکیشن مکمل کرو اس کے بعد جو جی چاہے



کرو...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ایجوکیشن کے دوران ہی میں انڈسٹری میں چلی گئی اور میرا گریجویشن ادھورا رہ گیا جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔

یمنیٰ احمد: یہ کیا پرابلم ہے کہ جو بھی شوبز میں انٹری دیتا ہے ایجوکیشن کو ایک طرف اٹھا کر رکھ دیتا ہے کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟

مہناز: نہیں، یہ طریقہ ہرگز درست نہیں ہے...... پھر میری طرح افسوس کرتے رہ جاتے ہیں لہٰذا میری نصیحت تو یہ ہے کہ پہلے نئے آنے والے اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کریں پھر اس طرف آئیں کیونکہ تعلیم بہت ضروری ہے، ہر فیلڈ میں تعلیم سے الگ ہی نکھار آتا ہے جیسے مثال کے طور پر امیتابھ بچن بے شک اچھے ایکٹر ہیں مگر کون بنے گا کروڑ پتی جیسے پروگرام کے لیے ان کی ایجوکیشن نے بنیادی کردار ادا کیا تو تعلیم کہیں بھی ضائع نہیں جاتی۔ آپ کی شخصیت کو ایک الگ ہی اسٹرکچر میں ابھارتی ہے۔ آپ کی قابلیت ہی آپ کو آگے بڑھاتی ہے۔ پیسہ تو آپ زندگی میں کما ہی لیتے ہیں لیکن تعلیم کا ایک خاص وقت ہوتا ہے موڈ ہوتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ عمر کی کوئی قید نہیں مگر اس کے باوجود ہم ایک بار چھوڑ دینے کے بعد دوبارہ ایجوکیشن جاری نہیں رکھ پاتے۔

یمنیٰ احمد: جہاں آپ آج کھڑی ہیں کبھی اس مقام کے بارے میں آپ نے سوچا تھا؟

مہناز: یہ سفر تو آنکھیں بند کر کے کیا جاتا ہے کب کسے کیا مقام مل جائے کوئی نہیں سوچ سکتا۔ میں نے بھی نہیں سوچا تھا یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ میں نے اپنی محنت جاری رکھی اور اللہ نے مجھے کامیاب کیا۔ اس سفر میں مشکل یہ ہے کہ شارٹ کٹ کوئی نہیں پڑتا۔ فائن آرٹس میں کوئی بھی شعبہ ہو ان کٹھنائیوں ان مشکلات سے گزر کر ہی جانا پڑتا ہے تب آپ کو منزل ملے گی جس کے آپ درست حقدار ہوں گے۔

یمنیٰ احمد: آج کل جو کچھ گایا جا رہا ہے آپ اس سے مطمئن ہیں؟

مہناز: سچ کہوں گی کہ اگر سنوں تو کوئی بات سوچوں بھی...... میں شکر ادا کرتی ہوں ان لوگوں کا جنہوں نے ریموٹ ایجاد کیا۔

یمنیٰ احمد: لیکن آپ انہیں گائڈ کرنے کے بجائے اُن سے اتنی متنفر کیوں ہیں؟

مہناز: (جارحانہ انداز میں) ارے بی بی اس میں سننے کے لیے ہے ہی کیا جو میں سنوں...... صرف دیکھنے کی چیز ہیں۔ اب کیا حدیقہ کیانی کے لال رنگ کے بال دیکھوں...... گانے کیا گائے جاتے ہیں انسانوں کے روپ میں عجیب، عجیب حرکتیں ہو رہی ہیں۔ اب یہ سب کچھ میں تو نہیں دیکھ سکتی بیٹھ کر...... جس طرح کے لباس پہنے جاتے ہیں گاتے ہوئے جو

اسٹائل اختیار کیا جاتا ہے وہ ہمارا کلچر نہیں ہے...... ہم نقل کرتے ہیں تو میں اصل کیوں نہ دیکھوں نقل کیوں دیکھوں...... میں تو حیران ہوتی ہوں جب میں پاکستانی چینلز دیکھتی ہوں کہ جو کمپیئر ہیں ہوسٹ ہیں تو بالکل انڈین اسٹائل کے کپڑے پہنے ہوتی ہیں اُن کے لہجے میں بولتی ہیں...... ہم کہاں ہیں پھر...... ہماری تہذیب، ہماری ثقافت کہاں ہے...... کہیں بھی نہیں ہے...... مگر یہ سوچ کر میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ سب ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ ان کا حق ہے جو چاہیں اختیار کریں۔ میری رائے مجھ تک محدود ہے۔ بس میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں ان کا میوزک اس وجہ سے نہیں سنتی کہ مجھے پسند نہیں آتا۔ گائیکی کسی بھی شکل میں ہو کسی بھی زبان میں ہو سُر میں ہو تو وہ موسیقی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ دنیا میں پروردگار نے اس شعبے کے تین فنکار پیدا کیے ہیں بس ایک مہدی حسن دوسری نورجہاں اور تیسری لتا...... کیا سُر ہے کیا کہنے...... خود پروردگار بھی حیران ہوں گے انہیں بنا کر۔ نئے لوگوں میں صرف سجاد علی، شفقت اور میکال ایک میوزیکل بینڈ ہے اس میں جو لڑکا گاتا ہے کیا آواز ہے اس کی۔ ہم سی ڈی پر سنتے ہیں اس کو...... تو جو سُر میں گائے گا وہ اچھل کود پر توجہ نہیں دے گا۔ رحیم شاہ، احمد جہانزیب بھی اچھا گاتے ہیں۔

یمنیٰ احمد: پاکستان میں کلاسیکل موسیقی کے مستقبل کے حوالے سے آپ کیا دیکھتی ہیں؟

مہناز: جاوید بشیر، سجاد، جہانزیب کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ مستقبل بھی اچھا ہے۔ لڑکیوں میں شازیہ منظور، شبنم مجید۔ حمیرا چنا کی آواز اچھی لگتی ہے تو اگر یہ لوگ کام کریں گے تو بہر حال مجھے امید ہے اچھے مستقبل کی۔

یمنیٰ احمد: اب تک شادی نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ آئیڈیل یا آپ کی مصروفیات؟

مہناز: دیکھو بھئی یمنیٰ آئیڈیل وائیڈیل پر میرا تو ایمان ہی نہیں ہے۔ رہا سوال شادی کا تو شادی کی نہیں جاتی...... شادی ہو جاتی ہے اور جو چیز ہو جائے وہ آپ کے مقدر میں ہے اور جو چیز نہ ہو اس کا مطلب ہے کہ وہ آپ کی قسمت میں نہیں ہے۔ لاکھ کوشش کی جائے جب مقدر میں ہے ہی نہیں تو کوئی کام کیسے ممکن ہو سکتا ہے اور اس کے علاوہ یہ وجوہات بھی شامل رہیں کہ چھوٹی عمر میں ہی کچھ گھر کی ذمے داریاں میرے کاندھوں پر آ گئیں پھر میری شوبز کی مصروفیات نے مجھے اس طرف سوچنے نہیں دیا...... یہ بھی سچ ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کے پروپوزل آئے میرے لیے، میں نے ایک دو کے بارے میں سوچا بھی مگر پھر کوئی نہ کوئی وجہ ایسی ہو گئی کہ بات نہیں بن سکی۔

یمنیٰ احمد: کیا اس کی وجہ آپ کی گائیکی تو نہیں؟

مہناز: صاف گوئی سے کہوں تو کئی جگہوں پر ایسا بھی ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ شادی کے بعد آپ گانا چھوڑ دیں گی...... میں نے سوچا بھی کہ چلو ٹھیک ہے میں گانا گانا چھوڑ دوں گی لیکن پھر میری انا کو ٹھیس پہنچائی ان کے لہجوں نے...... جو اس طرح کہتے تھے کہ گانا گانا چھوڑ دوں جیسے یہ کوئی حقیر کام ہو...... انہوں نے میوزک کے لیے توہین آمیز لہجہ اختیار کیا تو یہ مجھے گوارا نہ ہوا جیسے میں کوئی گندا کام کر رہی ہوں...... میں اللہ سے توبہ کر کے کہتی ہوں کہ میں نے شوبز میں بھی تیس سال رہ کر دکھا دیا ہے کہ انسان کے اندر برا انسان ہوتا ہے۔ انسان کے باہر برا انسان نہیں ہوتا۔ ماحول کسی کو کچھ نہیں کہتا اندر کا انسان سب کچھ کہتا ہے۔ ہم فلم انڈسٹری سے بالکل سوتیلی ماؤں جیسا سلوک کرتے ہیں کہ جی فلم انڈسٹری بہت بری ہے۔ مجھے یہاں بھی بہت عزت ملی۔ میں تو کہتی ہوں کہ مجھے کراچی میں رہتے ہوئے کوئی یاد نہیں کرتا بہت بے مروت شہر ہے، مہدی حسن صاحب کو رئیس احمد خاں صاحب کو یہاں کون پوچھتا



ہے۔ جو اچھے سنگر ہیں یہاں کے وہ انڈیا ...یں جا کر گا گا کر آ رہے ہیں۔ یہاں قدر ...ی نہیں ہے یہاں تو گھر کی مرغی دال برابر ہے۔ میں بہت ناراض ہو کر بیٹھی ہوئی ...ہوں کہ جب انڈیا سے آرٹسٹ آتے ہیں ...غضب خدا کا یہاں کے لوگ اپنے ...وں کو کہتے ہیں کہ آئیں آپ لوگ ...ئیں مگر ہم آپ کو ایک پیسہ نہیں دیں ...ے اور ان کو پچیس پچیس لاکھ روپیہ دیتے ...یں۔ کیوں...... یہ کتنا بڑا ظلم ہے ہمارے ...وں کے ساتھ...... آپ اپنے ہی گھر ...ے ممبر کو اتنا گرا رہے ہیں...... مجھ سے خود ...ہا گیا کہ آپ بیس بائیس ہزار لے لیجیے ...ر سونو نگم آ رہے ہیں آپ ان کے ساتھ ...یے، میں نے صاف کہہ دیا کہ اس کے ساتھ گانا ...رے لیے کوئی فخر کی بات نہیں...... میرے لیے فخر ...ی بات ہمیشہ یہ رہے گی کہ میں نے مہدی حسن ...احب کے ساتھ گایا...... مسعود رانا کے ساتھ گایا۔ ...ر جہاں جی کے ساتھ گایا۔ ناہید اختر کے ساتھ گایا۔ ...ے نیّر کے ساتھ گایا...... غلام علی کے ساتھ گایا۔ ...ھے ان پر فخر ہے۔ مجھے سونو نگم کے ساتھ گانے پر کوئی ...ز نہیں ہے۔ (ہم حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے کہ ...ہوں نے مسکراتے ہوئے کہا) دیکھیں مجھے اس لیے ...ز نہیں ہے کہ وہ ایسے ملک کے آرٹسٹ ہیں جو اپنے ...ک کے آرٹسٹ کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اسے آل ...یڈی اتنی عزت ملی ہوئی ہے اتنا پیسہ ملا ہوا ہے کہ ...ے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اسے ان باتوں سے کوئی ...ق نہیں پڑتا کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ گا رہا ہے۔ کہاوت ہے کہ اپنا مارتا ہے تو چھاؤں میں ڈالتا ہے مگر اب ہمارے یہاں ہو گیا ہے کہ اپنا مار کے ...ب میں ڈالتا ہے تا کہ ساری عمر یہ جلتا ہی رہے۔ ...ں سمجھتی ہوں کہ میرے ساتھ یہ معجزہ ہے کہ پروردگار عالم نے مجھے ان بدخبروں کے ملک میں زندہ رکھا ہے جہاں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔

یمنیٰ احمد: آپ کو کن لوگوں سے شکوہ ہے؟

مہناز: مجھے اپنے ملک کے بااختیار لوگوں سے شکوہ ہے جو آرٹسٹوں کی بدحالی دیکھ کر بھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ (انتہائی جارحانہ انداز میں) ہمیں پرائڈ آف پرفارمنس ملا...... کیوں ملا؟ ہم کہیں بھی سفر کریں...... ہمارا علاج معالجہ ہو۔ ہمیں کہیں سے بھی کوئی رعایت نہیں دی جاتی...... ہم کیا کریں گے یہ پرائڈ آف پرفارمنس لے کر بھی...... پڑا ہوا ہے پتا نہیں کہاں۔ میں اسی لیے کسی ایوارڈ تقریب میں نہیں جاتی۔ ہمارے یہاں آرٹسٹ کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ میں کتنا روئی ہوں ریشماں باجی کا جو انٹرویو آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جا کر کیا بھیک مانگیں، ہم کیا بھیک مانگنے والے ہیں۔ ہمارے لوگ کہاں ہیں۔ یہ ہمارا خیال کیوں نہیں کرتے۔ انہیں ہم کھڑے ہوئے نظر نہیں آتے تو بیٹھے ہوئے کیا خاک نظر آئیں گے...... کیا بات کی

ہے انہوں نے ایک ان پڑھ خاتون ہونے کے باوجود کتنی بڑی بات کہہ دی...... آج وہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہیں اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں۔ ہماری گورنمنٹ کو ضرور اس طرف دھیان دینا چاہیے۔ ہاں میں یہاں عشرت العباد کا نام ضرور لوں گی کہ انہوں نے اپنے دور میں اب آرٹسٹوں کی خبر گیری کا کام شروع کیا ہے، اللہ کرے یہ جاری رہے...... وہ بہت پیارے آدمی ہیں بہت ''میاں'' آدمی ہیں۔ میاں کا مطلب ہوتا ہے کہ بہت شریف انسان جو ہر ایک کو اپنی ماں، بہن سمجھنے والا ہوتا ہے۔ وہ مریضوں کا، بیمار آرٹسٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس دور میں وہ ایک فرشتہ صفت انسان ہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو انہوں نے بالخصوص میری خیریت دریافت کی۔ ہم اپنے ملک کے سفیر ہیں مگر میں دیکھتی ہوں کہ جس آرٹسٹ کو دیکھو وہ کسمپرسی میں مر رہا ہے۔ صدر صاحب کو چاہیے کہ فوری اعلان کریں کہ آرٹسٹوں کا علاج معالجہ اور آمدورفت کے ٹکٹ فری ہوں یا کم از کم آدھا تو کردیں...... بس کیا کہیں اس ملک میں یمنیٰ خاک ہمیں مل گیا مقام یا نام۔

یمنیٰ احمد: آج کل کام آپ کم کم کررہی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

مہناز: ہاں میں خود ہی سلیکٹو کام کررہی ہوں اب میں وہیں جاتی ہوں جہاں لوگ اچھے میوزک کو سننا پسند کرتے ہیں۔ فلم انڈسٹری میں بھی برائے نام ہوں...... کیونکہ اب میں کچھ چینج چاہتی ہوں۔

یمنیٰ احمد: انڈیا سے گانے کی آفرز تو آئیں ہوں گی تو آپ نے کیا سوچا تھا؟

مہناز: نہیں، نہیں بھئی، مجھے وہاں جا کر گانے کا کوئی شوق نہیں بے شمار آفرز تھیں مگر میرا اپنا نہ تو ارادہ تھا نہ ہوگا۔ ہمارا اپنا ملک ہمیں بہت پیارا ہے۔

یمنیٰ احمد: ایک اچھے گلوکار میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟

مہناز: وہ ہی باتیں آجاتی ہیں جو میں کہہ چکی ہوں۔ محنت، ریاضت کے علاوہ کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے اور تھوڑا سا خلوص بھی ضروری ہے اس فن کے ساتھ...... زیادہ نہیں...... کیونکہ زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگا (قہقہہ) اسی لیے تھوڑا سا کافی ہے لیکن خلوص ہو۔

یمنیٰ احمد: مرثیہ خوانی آپ نے کب شروع کی؟

مہناز: (انگلی سے جتاتے ہوئے) سات سال کی عمر سے...... نانی کے ساتھ مرثیہ پڑھتی تھی۔ میری نانی بالکل کھری سیدانی تھیں۔ ان کا کسی نے بال تک نہیں دیکھا آج تک...... تو ان کے ساتھ پڑھتی تھی جہاں غلطی ہوتی وہ مجھے ٹوکتی تھیں پھر والدہ کجن بیگم کو سب جانتے ہیں اس حوالے سے تو انہوں نے میری راہ نمائی کی...... مرثیہ خوانی، ذکر حسینؑ ہوتا ہے، ذکرِ اہل بیت ہوتا ہے، ذکرِ آل رسول ﷺ ہوتا ہے۔ اس کے حساب سے ہمارے خاندان میں ذاکر اور ذاکرہ بنتے آئے ہیں اور یہ کہ ہم حسینؑ کا غم کرنے والے لوگ ہیں۔

یمنیٰ احمد: والدہ کے حوالے سے کیا کہنا چاہیں گی؟

مہناز: (جذباتی انداز میں) اماں کا کیا کہنا...... بہت بڑا نام ہے ان کا، میں یہ کہنا چاہوں گی کہ اگر میری والدہ مجھے اتنی اچھی تربیت نہ دیتیں تو میں شاید ان حالات میں اور اس مصیبت کی گھڑی میں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی...... اب تو میں بالکل تنہا ہوں کیونکہ پہلے والد کی وفات ہوئی پھر والدہ کی اور بھائی تو میرے امریکا میں سیٹلڈ ہیں۔ بہرحال اب بھی میرے بہت سے خیر خواہ میرے ساتھ ہیں۔ میرے چاہنے والوں کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ میرے بھائی اکثر آتے رہتے ہیں، میں ان کے پاس جاتی رہتی ہوں انہوں نے مجھے بہت کہا وہاں سیٹ ہوجانے کے لیے مگر میں نے کہہ دیا تھا کہ نہیں میں اپنے وطن میں کام کررہی ہوں، میرے کاندھوں





پر ذمے داری ہے میں اسے پورا کرنا چاہتی ہوں...... تو یہ حوصلہ مجھے کس نے دیا ظاہر ہے میری والدہ کی بہترین تربیت نے مگر اب جو حالات ہیں تو اب میں بھی سوچ رہی ہوں کہ میں بھی چلی جاؤں ان کے پاس...... کیونکہ میں نے بہت کام کرلیا ہے یمنیٰ۔ اپنے کام کی وجہ سے مجھے لگتا ہے کہ میں بہت کم سوئی ہوں...... میری نیندیں میرے کام کی نذر ہوگئیں اب میں کچھ آرام کرنا چاہتی ہوں۔

(قارئین! مہناز بہت تھکنے کے بعد اب ابدی نیند سوگئیں۔ پروردگار ان کی مغفرت کرے)

یمنیٰ احمد: اچھا آپ کے دیگر شوق کیا ہیں؟

مہناز: گانا تو میرا شوق...... میرا سب کچھ تھا مگر اس کے علاوہ مجھے لکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے۔ اب بہت پڑھتی ہوں جو اچھا لگتا ہے مختلف کتابیں پڑھتی ہوں۔

یمنیٰ احمد: آپ کے بہن بھائیوں کی تعداد؟

مہناز: میں اکلوتی بہن ہوں اور میرے چار بھائی ہیں ماشاء اللہ اور چاروں امریکا میں ہیں شادی شدہ ہیں۔ بچے ہیں ان کے۔ مجھ سے چھوٹے ہیں لیکن میں ان سے چھوٹی لگتی ہوں۔ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مجھے ان پر فخر بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہماری بہن نے ہمارے لیے بہت قربانی دی ہے۔ ہمارے درمیان بہت زیادہ فرینڈ شپ ہے۔ بڑا مزہ آتا ہے جب ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں۔

یمنیٰ احمد: آپ کے بھائیوں میں کسی کو شوق ہے گانے کا؟

مہناز: ہاں میرے سب سے چھوٹے بھائی احسن مہدی کو بے حد شوق ہے گانے کا اور امریکا میں کافی مقبول بھی ہیں۔ وہ انگلش سنگنگ کرتے ہیں۔ ان سے بڑے کمال مہدی ہیں ان کی بھی بہت حسین آواز ہے۔ مجھے بہت پسند ہے اور آپ کو شاید یقین نہ آئے یمنیٰ کہ کشور کمار صاحب کی قریب ترین آواز ہے۔ غلام علی صاحب کی چیزیں وہ بہت بہترین انداز میں گاتے ہیں امریکا میں کافی پسند کیے

جاتے ہیں۔

یمنیٰ احمد﴾ موجودہ دور میں کلاسیکی موسیقی کو کس طرح رواج دیا جاسکتا ہے؟

مہناز﴾ کلاسیکی موسیقی کو رواج شفقت نے بھی دیا اور نئے بینڈز میکال حسن گروپ بھی اچھی کلاسیکل موسیقی گا رہا ہے۔ بڑے غلام علی صاحب کا سا انداز ہے۔ بہرحال اس طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے ہمارے بااختیار طبقے کو اس طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

یمنیٰ احمد﴾ بچپن کے واقعات، کچھ یادیں شیئر کرنا چاہیں گی؟

مہناز﴾ ارے بچپن میں، میں بہت شیطان تھی۔ بڑی بڑی شرارتیں کرتی تھی۔ جتنی اب سیدھی سادی ہوں بچپن میں اتنی ہی شرارتی تھی پورا محلہ مجھ سے تنگ تھا......تنگ بلکہ اتنا عاجز تھا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ کسی کے درخت کے امرود سلامت نہیں تھے۔ کچی کیریاں میرے ہاتھوں سے محفوظ نہیں تھیں توڑ تاڑ اجاڑ دیا کرتی تھی۔ (اوہ اتنی شرارتی تھیں آپ......یقین نہیں آتا) اُف بہت شرارتی تھی یمنیٰ میں اور اس وقت پٹتی بھی بہت تھی۔ ماموں، خالہ، امی وغیرہ سے بڑی مار کھائی ہے۔

یمنیٰ احمد﴾ فارغ وقت ملتا ہے تو کیا کرتی ہیں؟

مہناز﴾ اب تو کافی فارغ وقت ملتا ہے تو لکھتی ہوں، مختلف کتابیں پڑھتی ہوں......اب تو پنج گانہ نماز میں بڑی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ جب سے اس طرف میرا رجحان ہوا ہے یقین کرو دل کو بڑا سکون ملتا ہے۔ اس سے میں مزید سادہ مزاج ہوگئی ہوں......جس کی شوبز میں مشکل ہے۔ آج کل لوگ مادہ پرست ہوگئے ہیں، مقابلے کی فضا ہے شہرت بھی ہے اور گلیمر کے پیچھے لوگ بھاگ رہے ہیں مگر مجھے گلیمر سے ہمیشہ سے ہی نفرت رہی ہے۔ گلیمر کیونکہ ایک فریب ہے جس کا دور بڑا مختصر ہوتا ہے اور ہاں......آج کل ایک بات سے مجھے بڑا دکھ ہو رہا ہے نہ جانے یہ کیسا خبط ہے کہ ثانیِ نور جہاں چل نکلا ہے...... بتائیے ذرا جن کا کچھ سُر میں نہیں ہے آستائی یا انترا کہہ دو تو گا نہیں سکتیں یہ ثانی نور جہاں بن گئی ہیں......اُف توبہ۔ انہوں نے تو کیسے کیسے گانے گائے ہیں کیا کہنے ہیں ان کے۔ وہ بہت بڑی آرٹسٹ تھیں میں explain نہیں کرسکتی کہ وہ میری نظر میں کتنی بڑی آرٹسٹ تھیں۔ کوئی بتائے تو ثانیِ نور جہاں کہاں سے کوئی آسکتی ہے مجھے تو خلا نظر آرہا ہے ان کی جگہ۔ جب وہ بیمار تھیں تو آغا خان اسپتال میں جب میں انہیں دیکھنے گئی تو میڈم نے کہا کہ مجھے بہت افسوس ہے کہ فلاں کوئی لڑکی آئی ہے تو لاہور اسٹوڈیو والے کہہ رہے ہیں کہ یہ ثانیِ نور جہاں ہے تو کیا نور جہاں کا یہ معیار ہے؟

یمنیٰ احمد﴾ آپ کے پسندیدہ ادیب، شاعر کون ہیں چونکہ آپ کو پڑھنے کا بے حد شوق ہے اس لیے پوچھ رہے ہیں؟

مہناز﴾ نثر میں بھی میں نے بہت کچھ پڑھا ہے لیکن شاعری میں مجھے غالبؔ، فیض احمد فیض اور احمد فراز بے حد پسند ہیں انہیں میں نے گایا بھی ہے۔

یمنیٰ احمد﴾ کس موسیقار کے ساتھ گانے میں مزہ آیا؟

مہناز﴾ روبن گھوش کی موسیقی کی میں بے حد مداح ہوں، فلم انڈسٹری کا میوزک روبن گھوش یا نثار بزمی صاحب جیسا کوئی نہیں دے گا، ایک دور آیا فلم خوشبو کا جس کا میوزک ایم اشرف نے دیا بڑا لاجواب میوزک تھا۔ جنہوں نے میرے اسٹائل کو سمجھ کر موسیقی ترتیب۔ مٹھی بھر چاول کا میوزک بے حد کامیاب رہا جس کے سارے گانے میں نے گائے مگر مجھے شکایت ہے سنگیتا بیگم سے کہ وہ اپنی فلم کا ذکر ہر جگہ کرتی ہیں مگر اس میں گانے کس نے گائے اس کا ذکر وہ بالکل نہیں کرتیں جس کے میوزک کے بارے

میں انڈیا سے سنجے خان اور فیروز خان کے تعریفی خطوط آئے تھے۔ ہاں سید نور نے مجھے بہت زیادہ سراہا ہے۔ اب بھی کہتے ہیں کہ مہناز تمہاری بہت ضرورت ہے انڈسٹری کو آپ جیسا اسٹائل نہ ابھی تک آیا ہے اور نہ آئے گا۔

یمنیٰ احمد﴾ ہر کام ہم کسی نہ کسی سے سیکھتے ہیں تو گائیکی میں آپ کا استاد کون ہے؟

مہناز﴾ ارے میرے تو سب ہی استاد ہیں بھائی (ہنستے ہوئے) میں نے سب سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔

یمنیٰ احمد﴾ اچھا آپ کون سا ساز بجالیتی ہیں؟

مہناز﴾ میں تان پورہ، ہارمونیم بجالیتی ہوں۔

یمنیٰ احمد﴾ آپ اکثر اپنا کون سا گیت گنگناتی ہیں یا جو زیادہ پسند ہے؟

مہناز﴾ مجھے تو اپنا ہر گانا ہی پسند ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر گانا ہمارے لیے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ہماری ہی کوئی چیز ہے ہماری ہی اولاد ہے۔

یمنیٰ احمد﴾ لیکن اولاد میں بھی تو کوئی ایک زیادہ پیارا ہوتا ہے؟

مہناز﴾ (قہقہہ) ہاں ایک فلم تھی صائمہ، نثار بزمی صاحب کا میوزک تھا اس کے علاوہ فلم آئینہ اور فلم خوشبو کے میرے گائے ہوئے گانے مجھے بے حد پسند ہیں۔

یمنیٰ احمد﴾ آپ کی زندگی کا کوئی خوشگوار واقعہ؟

مہناز﴾ (آنکھوں میں یادوں کے دیپ جلائے) میری زندگی کے خوشگوار لمحات یا واقعات وہ ہی ہیں جب میں نے پہلی بار میڈم نور جہاں یا مہدی حسن کے ساتھ گانا گایا...... میں نے بتایا ناں کہ میں کبھی خواب دیکھا کرتی تھی اور پھر میرے یہ خواب سچے ہوگئے۔ غلام علی کے ساتھ بھی گایا......ان تینوں کے ساتھ گانا میرے لیے بڑا قیمتی تھا۔

یمنیٰ احمد﴾ کوئی ایسی خواہش جو اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟

مہناز﴾ اللہ کا کرم ہے مجھ پر اس نے میرے دل کی تمام خواہشیں پوری کی ہیں۔ کوئی حسرت نہیں رہی بس اب یہ خواہش رہ گئی ہے کہ خانہ کعبہ جاؤں، زیارتوں پر جاؤں اور کربلا جانا میری خواہش رہ گئی ہے۔

یمنیٰ احمد﴾ زندگی میں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہوئی ہے؟

مہناز﴾ (نم آنکھوں سے) ہاں ماں کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ چار سال ہوگئے انہیں مجھ سے جدا ہوئے۔ اس گھر کے کونے کونے سے اُن کی مہک آتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے بغیر بہت تنہا ہوگئی ہوں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب ان کی یاد نہ آتی ہو۔

یمنیٰ احمد﴾ (موضوع بدلتے ہوئے) اچھا موسم بتائیے کون سا پسند ہے؟

مہناز﴾ سردی کا......گلابی جاڑوں کا موسم اچھا لگتا ہے۔

یمنیٰ احمد﴾ کھانے میں کیا پسند ہے؟

مہناز﴾ ارے کھانے کی پسند کا کیا پوچھتی ہو یمنیٰ ہماری صحت دیکھ لو......سب کچھ پسند ہے۔

یمنیٰ احمد﴾ کوئی ایسی غلطی جس کا احساس آج بھی آپ کو بے چین کردے؟

مہناز﴾ ارے بے وقوف بہت ہوں میں، آپ مجھے زیادہ عقلمند نہ سمجھیں (قہقہہ) میں بے وقوفی کی حد تک ہمدرد بہت ہوں لوگوں کی اور اکثر اسی سلسلے میں کئی غلطیاں بھی ہوئیں جن پر پچھتاوا بھی ہوا مگر بھول جاتی ہوں۔

یمنیٰ احمد﴾ آپ نے نئے آنے والوں کے لیے کوئی اکیڈمی یا پلیٹ فارم مہیا کرنے کے سلسلے میں کچھ سوچا؟

مہناز﴾ میں خود کو اس مقام پر نہیں سمجھتی جب میرے سینئرز موجود ہیں اگر وہ قدم اٹھائیں تو ہم بھی اس میں شامل ہوجائیں۔

یمنیٰ احمد﴾ شاعری سے کتنا شغف ہے گائی تو

بہت ہے کبھی کی بھی ہے؟

مہناز ﴿ میرا تو سارا خاندان ہی شاعر ہے مگر مجھے سننے کی حد تک شوق ہے۔ لکھتی نہیں ہوں۔

یمنیٰ احمد ﴿ سفر کہاں کہاں کا کیا؟

مہناز ﴿ ارے میرے پاؤں میں تل ہے، زندگی سفر میں ہی گزری ہے۔ پوری دنیا گھوم چکی ہوں...... مگر مجھے سکون اپنے بھائیوں کے پاس ملتا ہے یا پھر امی کے گھر میں۔

یمنیٰ احمد ﴿ کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟

مہناز ﴿ میں اپنے وطن کے لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ جنہوں نے مجھے اتنی عزت دی اتنا پیار دیا...... میں نے بھی اپنے وطن کی عزت کا بے حد خیال رکھا ہے میرا پیغام یہی ہے کہ جو کام بھی کریں ایمانداری سے کریں اور مکمل شمولیت سے کریں تو کامیابی ملے گی ورنہ تشنگی ہمیشہ رہے گی...... سکون نہیں مل پائے گا۔ اپنی طرف سے پوری محنت کریں نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں پھر دیکھیں آپ کے راستے کس طرح کھلتے ہیں۔

☆☆☆

قارئینِ کرام! مہناز کی یہ باتیں ہمارے لیے واقعی ایک سرمایہ ہیں آج بھی ایسا ہی لگا کہ وہ یہیں کہیں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ سچ ہے یہ دنیا ایک اسٹیج ہے آدمی آتا ہے، اپنا رول ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ کوشش اس بات کی کرنی چاہیے ایسا یادگار کردار نبھائے جو صدیوں یاد رہے۔ مہناز بیگم کو اہلِ فن ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

☆☆☆

مہناز کے انتقال پر چند گلوکاروں اور فنکاروں کے تاثرات۔

☆ مجھے اعزاز حاصل ہے کہ میں نے مہناز کے ساتھ دوگانے گائے۔ (گلوکار شوکت علی)

☆ ہم انہیں مدتوں بھلا نہیں پائیں گے۔ (استاد رفاقت علی خان)

☆ ان میں وہ ساری صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک بڑی گلوکارہ میں ہونی چاہئیں۔ (سائرہ نسیم)

☆ مہناز کی زندگی اسم با مسمیٰ ہے۔ (لوک گلوکار عارف لوہار)

☆ مہناز ایک منفرد آواز کی مالک تھیں انہیں عوام کے ساتھ خواص نے بھی پسند کیا۔ (گلوکارہ فریحہ پرویز)

☆ ان کی آواز ایک مکمل ہیروئن کی آواز تھی، ان کی موت نے مجھے اداس کر دیا۔ وہ میری پسندیدہ گلوکارہ تھیں۔ (اداکار ندیم)

☆ مہناز ایک بڑی گلوکارہ تھیں۔ ان کی موت کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ خدا تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ (اداکارہ بابرہ شریف)

☆ مہناز جیسی شائستہ گلوکارہ اب ہمارے ہاں نہیں۔ وہ ایک روایت کا نام ہیں۔ ان کی وفات سے ہمارے ہاں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ (اداکارہ زیبا)

اس کے علاوہ گلوکارہ صائمہ جہاں، انور رفیع، شاہدہ منی، علی ظفر، جواد احمد، ابرار الحق، استاد بدر الزماں، استاد غلام قادر شکن و دیگر نے مہناز کی وفات پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

آخر میں ہم صرف اتنا ہی کہیں گے کہ مہناز بیگم جیسے فنکار برسوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے شعبے میں بلاشبہ ناموری کے عروج پر تھیں مگر اس کے ساتھ ساتھ بحیثیت انسان وہ ایک بہترین شخصیت کی مالک تھیں۔ پروردگارِ عالم سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے اور عالمِ بالا میں ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

مقدور ہوں تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے





بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا ہے۔

☆ بہار نمبر کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو ہمیشہ شاداب اور مسرور رکھے اور آپ کی زندگی ینی اور دنیاوی لحاظ سے ہمیشہ پُر بہار رہے، آمین۔

☆ عزیز قارئین آج پھر میں اپنی بار بار دُہرائی ہوئی ایک بات آپ سے کہنا چاہتی ہوں کہ اپنی بیٹیوں سے محبت کیجیے بلکہ اپنے بیٹوں سے زیادہ ان کا خیال رکھیے۔ لڑکیاں، لڑکوں سے زیادہ حساس ہوتی ہیں اور آپ کی معمولی سی بے پروائی بھی ان کے کسی بڑے قصان کا سبب بن سکتی ہے۔ اس ماہ میرے پاس دو خط ایسے بھی آئے ہیں جس سے میں ان لڑکیوں کے وہ دکھ بجھ سکتی ہوں جو حقیقت یں دکھ ہیں ہی نہیں۔ ایک لڑکی کا دکھ یہ ہے کہ ان کے خاندان کا کوئی لڑکا انہیں پسند نہیں کرتا۔ پاس پڑوس کا کوئی لڑکا بھی انہیں رغبت ے نہیں دیکھتا۔ اس دفعہ کا ویلنٹائن بھی روکھا سوکھا سا گزر گیا۔ نہ چاہے جانے کا دکھ اتنا شدید ہے کہ جینے تک کو دل نہیں چاہتا۔ میں کیزہ کی ان سطور سے اس لڑکی ...... فرضی نام ایس سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر کوئی لڑکا آپ سے محبت کا اظہار نہیں کرتا تو اس کی ب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کو ایک اچھی لڑکی سمجھتا ہے۔ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں آپ اس کی طبیعت صاف نہ کردیں۔ چھچھوری اور آوٹ لڑکیوں سے اظہارِ محبت کرنا کسی بھی لڑکے کے لیے مشکل نہیں ہوتا اور کیا آپ یہ بات نہیں جانتیں کہ سٹریٹ کرائمز کی طرح اسٹریٹ لو بھی خسارے کے سودے کی طرح ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بات پریشانی کی نہیں بلکہ طمانیت کا باعث ہے کہ کسی لفنگے نے آپ سے رابطہ نہیں کیا۔ دوسرا خط کراچی سے ایک لڑکی نے لکھا ہے فرضی نام الف، وہ جس لڑکے سے محبت کرتی یں اس لڑکے کے والدین اپنے لڑکے کی شادی اس سے ہر گز نہیں کرنا چاہتے۔ میں یہ بھی واضح کر دوں کہ لڑکے کی عمر اکیس سال ہے ور لڑکی کی عمر چوبیس سال ہے لڑکا کم تعلیم یافتہ اور بے حد معمولی سی جاب پر فائز ہے اور یہ محترمہ اس لڑکے کی محبت میں پاگل ہیں اور لڑکے کی ماں اپنے بیٹے کی شادی کسی پیسے والے گھر میں کرنے کی خواہش مند ہے جو اسے گھر داماد بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس ناسمجھ لڑکی نے اپنی والدہ سے یہ کہہ دیا ہے کہ اگر اس کی شادی اس لڑکے سے نہیں ہوئی تو وہ خودکشی کر لے گی۔ بیٹی الف...... یا اور بھی ایسے مسائل کا شکار بچیوں سے میں صرف یہی کہوں گی کہ اگر آپ کسی دکان سے کوئی سوٹ خریدنا چاہیں اور دکان دار یہ کہہ دے کہ میں اسے بیچوں گا نہیں تو کیا آپ نے کبھی یہ دیکھا ہے کہ کوئی گاہک کسی دکان دار سے سوٹ لے کر بھاگ جائے یا دکان دار کے قدموں میں گر جائے کہ چونکہ مجھے یہ پسند ہے اس لیے تمہیں لازمی دینا پڑے گا۔ اسی طرح شادی بھی زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ آپ میری یہ بات یاد رکھیے کہ شادی کے بعد آپ یہ باتیں سوچ کر خود ہی خفت ہوا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ سب کی بچیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین ثم آمین۔ پیاری بہنو! صرف آٹھ مارچ کا دن آپ کا نہیں ہے بلکہ ہر دن کا ہر پل آپ کا ہے۔ جس میں اپنی عزت و توقیر کا سب سے پہلے خیال رکھنا ہے اور اب آئیں رنگا رنگ اور تازہ بہ تازہ سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے درود ابراہیمی پڑھتے ہیں۔ جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا کریں۔ (ابھی پڑھ لیں)

آیت کریمہ یہ ہے۔

لا اله الا انت سبحانك انی كنت من الظالمين

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ گزشتہ دنوں نسرین اور کرنل کلیم اختر کی لاڈلی اور پیاری بیٹی حرا کی شادی میجر سعد کے ساتھ راول پنڈی میں خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ اس شادی میں کراچی اور شکاگو سے خاص طور پر مہمان آئے۔ (دلی دعائیں اور مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز آرزو شاہد، کراچی کی بھتیجی کی شادی ہوئی۔ (آپ کو بے حد مبارک باد)
☆ معروف مصنفہ ساجدہ حبیب کی لاڈلی بھتیجی عالیہ سعید کی شادی ساجد کیانی کے ساتھ میرپور، آزاد کشمیر میں خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ (مبارک باد) مزے کی بات یہ ہے کہ دولھا والوں اور لڑکی والوں دونوں کے ہاں پاکیزہ بڑی باقاعدگی سے پڑھا جاتا ہے۔
☆ اس وقت ہماری دو مصنفات شدید علیل ہیں ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔
☆ شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور کے پہلے مجموعۂ کلام، پانچواں موسم کو فیصل آباد آرٹ کونسل تقیبی کاروانِ ادب سے آل پاکستان مقابلہ میں پہلا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ (مبارکاں)
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری رافعہ شاہ کی بیٹی ایمن شاہ نے لاہور اسکول آف اکنامکس سے ایم بی اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا ہے۔ (مبارکاں)
☆ پروفیسر شیریں سلیم، لاہور کے حوالے سے اس ماہ دو نیوز ہیں۔ پہلی یہ کہ ان کے نواسے مصطفیٰ فرخ نے قرآن پاک حفظ کرلیا ہے اور دوسری یہ کہ شیریں سلیم اپنے شوہر، بیٹی اور داماد کے ساتھ بہت جلد عمرے کی سعادت حاصل کرنے جارہی ہیں۔ (مبارکاں)
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر ندا نوید سیٹھی ایک پیارے سے بیٹی کی امی بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)
☆ پاکیزہ کی قاری عارفہ عمران، پنجاب کے ہاں پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ (مبارک باد)
☆ پاکیزہ کی قاری رابعہ سہیل، کراچی کے ہاں بیٹا ہوا ہے جس کا نام سعد رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سمیرا مجاہد کے بیٹے کی طبیعت قدرے ناساز ہے۔ اس کی کلی صحت کے لیے آپ دعا کریں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلانوالی ان دنوں شدید بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔
☆ معروف شاعرہ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا اپنا دوسرا مجموعۂ کلام ترتیب دے رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)
☆ مصنفہ مدیحہ عدنان، لاہور ایک پیاری سی بیٹی کی امی جان بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)
☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار رابعہ وقار، راولپنڈی کے ہاں ایک پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ (مبارک باد)
☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ نگینہ ضیا بنگش، کراچی کے ہاں بیٹا ہوا ہے جس کا نام محمد عیان رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)
☆ مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد کی دوسری کتاب بہت جلد آنے والی ہے۔ (ماشاء اللہ)
☆ ہماری پیاری سی شاعرہ شگفتہ شفیق نے اپنے بڑے بیٹے کا رشتہ طے کردیا ہے۔ ان کی ہونے والی بہو ڈاکٹر ہے۔ (ماشاء اللہ)
☆ معروف مصنفہ سدرۃ المنتہیٰ ٹنڈو محمد خاں کی پہلی کتاب آئندہ ماہ تک آجائے گی۔ (مبارک باد)
☆ معروف شاعرہ، افسانہ نگار اور اینکر سیمار ضاردا، کراچی اپنے نئے بنگلے میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ (مبارک باد)
☆ شاعرہ، مصنفہ ناہید فاطمہ حسنین کا ٹی وی ڈراما کوئلہ ہوگئی میں ایک نجی ٹی وی چینل پر دکھایا جارہا ہے۔ جسے بہت پسند کیا جارہا ہے۔ (مبارک باد)
☆ معروف پبلشر مولانا عبدالستار عاصم عمرے کی سعادت حاصل کرکے لاہور آگئے ہیں۔ (مبارک باد)
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری رخسانہ قدسیہ، مانسہرہ سے کراچی آئیں تو ہم سے ملنے کے لیے بھی آئیں۔ (خوش آمدید)
☆ ہماری قاری بہن مونا وقار، لاہور ان دنوں بے حد پریشان ہیں ان کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تمام پریشانیاں کو رفع کردے، آمین۔
☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار ثمینہ وحید، پنجاب اپنے بیٹے کے پاس سعودی عرب جارہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)
☆ پاکیزہ کی قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی کی طبیعت اب بہت بہتر ہے۔ (ماشاء اللہ)
☆ پاکیزہ کی قاری انجم گلزار، کراچی کی صحتِ کاملہ کے لیے دعا کریں۔
☆ پاکیزہ کی قاری عبیر فاطمہ، سندھ کی گزشتہ دنوں نکاح کی تقریب ہوئی۔ (مبارکاں)

٭٭٭

انتقالِ پُرملال

☆ معروف اور سُریلی گلوکارہ مہناز چل بسیں۔

☆ معروف مصنف اور نقاد محمد علی صدیقی انتقال کر گئے۔
☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار مسرت رانی خلیل، کراچی کی والدہ نفیسہ بیگم انتقال کر گئیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مونا وقار، لاہور کے والد چل بسے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مبشرہ ناز، کراچی کی والدہ کی پہلی برسی ہے۔
☆ مصنفہ مدیحہ عدنان، لاہور کے والد انتقال کر گئے۔
☆ مصنفہ سلمیٰ غزل، کراچی کی کزن شمیمہ زاہد انتقال کر گئیں۔
نوٹ: تمام مرحومین کے لیے صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔

٭٭٭

☜ مسز عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔ ''عکس کا خوب صورت اختتام اور ہمارے سوالات کے بہت خوب صورت جوابات دیے ہیں۔ انجم ہمیں جیسی محبت عمیرہ احمد سے ہے اتنی ہی محبت تم سے ہے اور ہم پاکیزہ سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ جب دل چاہا تمھیں فون کرکے کوئی بات پوچھ لی تمھیں کبھی ناگوار نہیں گزرتا۔ رفعت سراج کا ناول اچھا جارہا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ اس ماہ قیصرہ حیات کا تفصیلی خط اچھا لگا۔ قیصرہ ہمیں تمہاری تحریریں بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔'' (نوازش)
☜ رخسانہ قدسیہ، مانسہرہ سے۔ ''عرصہ دراز سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں اور اس کے شمارے سنبھال کر رکھتی ہوں۔ میری فرینڈز مجھ سے پاکیزہ لے کر پڑھتی ہیں۔ مجھے پاکیزہ میں لکھنے والی تمام مصنفات سے محبت ہے۔ کبھی اس میں شائع کوئی بھی تحریر بری نہیں لگی مگر مجھے میڈم انجم انصار سے بے پناہ محبت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا گائیڈ کرنے کا انداز بہت نرم اور مقناطیسی ہے۔'' (اس محفل میں خوش آمدید، پیاری رخسانہ محبت کا جواب محبت ہی ہوا کرتا ہے۔ جتنی محبت آپ اپنی رائٹرز اور مجھ سے کرتی ہیں۔ اتنی محبت ہماری رائٹرز اور میں اپنے قارئین سے کرتے ہیں)
☜ پروفیسر شیریں سلیم، لاہور سے۔ ''ناہید سلطانہ اختر کا ناول اس وقت ٹاپ پر ہے۔ میں جب پاکیزہ کھولتی ہوں تو سب سے پہلے انجم آپ کی بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں پھر جلترنگ اس کے بعد ناول...... اور سب کہانیاں اچھی لگیں۔ میری مبارک باد پہنچا دیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)
☜ شہزادی، پنجاب سے۔ ''باجی لکھنے کے حوالے سے بھی اور دیگر باتوں کے حوالے سے بھی آپ سے براہِ راست بات کرنا چاہتی ہوں پلیز اپنا فون نمبر مجھے بتادیں۔'' (گڑیا! آپ مجھے صبح دس بجے سے شام چار بجے کے دوران اس نمبر پر فون کرسکتی ہیں۔ 021-36981952)
☜ افشین شاہد، جدہ سے۔ ''انجم باجی آپ اور عذرا باجی سے دلی محبت ہے میں جب بھی عمرہ ادا کرنے جاتی ہوں، آپ لوگوں کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں۔ کبھی آپ عمرے پر آئیں تو میں آپ سے ضرور ملوں گی۔'' (پیاری افشین آپ کی دعاؤں کے لیے احسان مند ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آمین)
☜ رُخ چوہدری، کراچی سے۔ ''پاکیزہ کی پہلی بات میں مجھے کچھ کہنا ہے میں جو انجم نے کہا ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ انجم کی طرف سے سالِ نو کا بہترین تحفہ ہے۔ شکر کے متعلق واقعہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ ہم واقعی بے حد ناشکرے ہیں بے شمار نعمتوں پر ربِ عظیم کا شکر ادا نہیں کرتے اور ذرا سی بات پوری نہ ہونے پر مجسم ناشکرے بن جاتے ہیں۔ اللہ ہم سب کو شکر کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ عینی جعفری کا تفصیلی انٹرویو اچھا لگا۔ بیادِ علامہ اقبال بین المدارس مقابلہ تحت اللفظ کی مختصر رپورٹ پڑھ کر خوشی اسی لیے بھی ہوئی کہ ابھی ہم اتنے تو زندہ ہیں کہ اپنے محسنوں کے دن مناتے ہیں اور نئی نسل کو ان کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ حسبِ سابق اپنا پسندیدہ سلسلہ بہنوں کی محفل پڑھا تو خود کو بھی اسی محفل میں کہیں کونے میں بیٹھا ہوا پایا۔ سیما مناف جی بے حد مبارک باد میرا یقین ہے آپ بہت کامیاب ہوں گی، انشاء اللہ۔ شگفتہ شفیق کے ساتھ جو جو بہن بیماری سے صحت کی طرف آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو زندگی اور صحت عطا فرمائے، آمین۔ اس ماہ میں تشریف لانے والوں کو سالگرہ مبارک ویسے ہمارا نزول بھی تو 25 دسمبر کو ہوا اور یہ تو 25 دسمبر میرے لیے... یادگار رہے گی کیونکہ ریحانہ کی شادی کے سلسلے میں آئے ملکی اور غیر ملکی مہمان موجود تھے۔ بھابیوں اور بھائیوں نے بڑے سے کیک کے ساتھ اور سب پیارے رشتوں نے میرے لیے یہ 25 دسمبر یادگار بنادی۔ (مبارکاں) سعدیہ ہما شیخ کو بیٹے کی بہت بہت مبارک ہو نام تو بے حد پیارا رکھا ہے۔ سرورق پر رفعت سراج کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی اور رفعت کا نام ہی تحریر کی کامیابی اور معیاری ہونے کی ضمانت

ہے۔ رفعت سراج کی تحریر رفعت کے پاس قارئین کی امانت ہے اور امید کرتے ہیں کہ حسبِ سابق رفعت یہ امانت اپنے قارئین تک بہت خوب صورت اور پُراثر انداز میں پہنچائیں گی۔ دوسرا شروع ہونے والا ناول عنیقہ محمد بیگ کا ہے جانِ جاں کی چند سطور نے مجھے مزید پڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ محترمہ کا انداز سادہ ہے مگر خوب صورت لگا۔ چند ایک خامیوں کے ساتھ تحریر اچھی لگی۔ لوڈ شیڈنگ نے رضوانہ پرنس کو کیا تحفہ دیا.. پڑھ کر بتاؤں گی قیصرہ حیات تو چھا جاتی ہیں۔ ڈائجسٹ ہو یا ٹی وی اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، آمین۔ لفظوں کی بساط سمیٹتے ہوئے یہ کہوں گی کہ پاکیزہ ایسا ڈائجسٹ ہے جو ہر گھر کی بیٹی کو پڑھنا چاہیے۔ پاکیزہ کی ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے کہ جن کی ان تھک محنت...... ایک خوب صورت بھرپور ڈائجسٹ قارئین کو پڑھنے کے لیے دیتی ہے۔" (نوازش)

✍ تسنیم ماہ پارہ، کراچی سے۔ "عذرا رسول کا بہت شکریہ جن سے اچانک ملاقات ہوئی اور اس کے بعد انجم تم سے مسلسل رابطے میں رہتی ہوں۔ رفعت سراج تم واقعی ہماری جان ہو۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا مگر میں معذرت کے ساتھ یہ کہوں گی کہ اس دفعہ تمہارے ناول میں بالکل مزہ نہیں آیا بلکہ مجھے یہ لگ ہی نہیں رہا کہ اسے ہماری رفعت نے لکھا ہے۔ شاہکار، دل، دیا دہلیز کھول کر پڑھتی ہوں تو ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی ہوں۔ ناہید سلطانہ اختر سے کہنا کہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ کورٹ کچہری بھی ہوگئی ہے اب وہ اسے وائنڈ اپ کریں کہ اب طویل ناول پڑھنے کے بجائے ہم جلدی جلدی ناول پڑھنا چاہتے ہیں۔ (اس ماہ آخری قسط پڑھیے) عمیرہ احمد کا انٹرویو تو کہیں نظر نہیں آیا۔ ہاں سوالات کے جوابات ایک بار پھر ان کے ناول کی دنیا میں لے گئے اور بہت لطف آیا۔ جلترنگ کی تو میں تعریف ہی نہیں کر سکتی مگر بہنوں کی محفل پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ آپ دین اور دنیا دونوں ہی بتا رہی ہیں لوگوں کو درود شریف پڑھنے کی طرف مائل کرنا بہت خوب صورت اور دل موہ لینے والا انداز ہے۔" (نوازش، ہاں رفعت کے ناول کی چند قسطیں پڑھ کر آپ کی رائے یقیناً تبدیل ہو جائے گی)

✍ انیلا ناہید، لیہ سے۔ "فروری کے شمارے کی خوب صورت تحریر عمیرہ احمد کے جواب تھے مگر سوال بھی شائع ہونے چاہیے تھے۔ ہاں ان کا انٹرویو کیوں نہیں شائع کیا گیا۔ خیر ہمیں عمیرہ احمد سے بہت پیار ہے پھر کبھی سہی۔ (انشاء اللہ یہ فرمائش بھی پوری کی جائے گی)۔ ہمارا خیال تھا باجی آپ اپنا نیا ناول شروع کریں گی۔ جلترنگ اس ماہ کا زبردست رہا مجھے یاد ہے کئی رسائل میں جلترنگ کی نقالی میں مزاحیہ مضامین لکھنے شروع کیے گئے مگر چند ماہ بعد ہی وہ... غائب ہو گئے۔ قیصرہ حیات بہت پیارا لکھ رہی ہیں۔ رفعت سراج کا بھی ٹھیک ہی ہے۔ ہاں اس ماہ کا ٹائٹل بھی بہت اچھا تھا اور فہرست بھی۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ مریم، لاہور سے۔ "مجھے بے حد خوشی ہوئی عمیرہ احمد نے میری امی کے نام سے سوالات کے جوابات دینے شروع کیے۔ میں اور میری امی یعنی مسز عظمیٰ خورشید، عمیرہ جی کی بہت فین ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آرہا کہ عمیرہ جی کے ناول کے بعد پاکیزہ میں کیا پڑھیں۔ آنٹی آپ نے بھی نہ تو اپنا ناول شروع کیا ہے اور نہ ہی کوئی افسانہ دیا ہے۔ اس دفعہ روحانی مشورے اتنے اچھے تھے کہ میں نے فوٹو اسٹیٹ کر کے بانٹے ہیں۔ ہاں جلترنگ اے ون رہا اور میں نے جن خاکوں کی فرمائش کی ہے انہیں دوبارہ ضرور شائع کریں۔" (جی ضرور...... ہاں عمیرہ احمد شکریہ کہتی ہیں)

✍ نزہت اشفاق، کراچی سے۔ "عمیرہ احمد نے اپنے جوابات میں بتایا ہے کہ آج کل پاپولر فکشن الجھا ہوا ہے مگر ہمیں تو عمیرہ کے ڈرامے کبھی الجھے ہوئے نظر نہیں آئے۔ سیما مناف کا یقین تو اتنا سیدھا سادہ سا تھا... لگتا تھا کہ پورا ڈراما دو گھروں کے سیٹ پر چل رہا ہو اور ہم اسے بے حد دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میری اس بات کا مطلب یہ ہے کہ کیا ہمارا ادب پاپولر فکشن میں شامل نہیں ہے یا ہم ان سے آگے ہیں۔ اس ماہ قیصرہ حیات کا خط بھی پسند آیا اور ان کے ناول کی قسط بھی۔ عنیقہ محمد تم کو ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔ میمونہ خورشید علی، رخ چوہدری، نمرہ احمد، شمیم فضل خالق اور رفاقت جاوید کی تحریریں پسند آئیں۔" (نوازش)

✍ مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ "بہنوں کی محفل سے حسبِ عادت پڑھنا شروع کیا اور جلترنگ پر اختتام ہوا۔ اس وقت ناہید سلطانہ اختر کا ناول ٹاپ پر جا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ رفعت سراج کا ناول بھی اپنی جگہ ضرور بنائے گا مگر ابھی کھل کر سامنے نہیں آیا ہے۔ دیگر افسانوں میں نمرہ احمد نے ہمارے دل کی بات کی ہے۔ رخ چوہدری نے بھی اچھا لکھا۔ رفاقت جاوید کی یہ تحریر ان کی دیگر تحریروں سے بہت اچھی لگی۔ جانِ جاں کے بارے میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ آپ لوگ نئی مصنفات کی واقعی بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔" (جی ہاں، یہ بات تو ہے۔ ہماری نئی مصنفات ہمارا آنے والا کل ہیں.... جب ہر جگہ ان کا طوطی بول رہا ہوگا)

✉ ناہید بنتِ نور، واہ سیمنٹ ورکس۔ آپ کے خط میں پوچھے گئے تمام سوالات کے جوابات حاضر ہیں۔ (1) ترکی ڈرامے جو ان دنوں مختلف ٹی وی چینلز پر دکھائے جا رہے ہیں وہ اپنے اثرات دیرپا چھوڑیں گے۔ اب ہمارے ڈراموں میں بھی

ہیروئن فراکوں اور شارٹس میں نظر آئیں گی۔ دوپٹا تو عرصہ ہوا غائب ہو چکا ہے۔ صبح کی نشریات کی ایک آدھ ہی ٹی وی اینکر مجبوراً دوپٹا پہنتی ہوں گی یا خاص خاص مواقع پر پہنتی ہیں۔ ترکی ڈرامے میں دادی، پوتی سے کہتی ہیں کہ جا بھاگ جا گھر سے اپنی محبت کو پالے۔ اب دیکھنے والیاں دادیاں اور نانیاں بھی اپنی نگرانی میں کمی لائیں گی۔ (2) رحمان ملک نے کہا ہے کہ جو لوگ اس الیکشن میں ووٹ نہیں ڈالیں گے ان کے گھر کی بجلی اور گیس کاٹ دی جائے گی لیکن جو لوگ ایک سے زیادہ ووٹ بھگتائیں انہیں کیا انعام ملے، اس بارے میں انہوں نے کچھ بتایا نہیں۔ (3) کراچی میں تو ہنگاموں کی وجہ سے تقاریب تباہ ہو جاتی ہیں۔ ایک ہزار مہمان والا شادی کا پنڈال پچاس مہمانوں کو لیے بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ مشورہ ہے کہ اب شادی، ویسے میں صرف گھر کے لوگ مدعو ہونے چاہئیں۔ کہیں پچاس تو کہیں پچیس اور لڑکی کو اس کے گھر سے رخصت کروالیں۔ جو پیسہ بچے وہ دولھا کو دے دیں۔

✍ ارم احتشام، ملتان سے۔ "اس ماہ سب سے پہلے قیصرہ حیات کا تفصیلی خط پڑھا اور مجھے ایسا لگا جیسے انہوں نے مجھے ہی مخاطب کر کے لکھا ہے۔ آپ بہت اچھی رائٹر ہیں اور میں آپ کی تحریریں بے حد شوق سے بھی پڑھتی ہوں مگر جیسے کہ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ کہانی ابھی کھلے گی تو میں یہ کہنا چاہوں گی جس تحریر نے پانچ قسطوں تک کلک نہیں کیا ہو تو وہ بعد میں کیسے کرے گی۔ مجھے عمیرہ احمد کی یہ بات پسند آئی کہ ان کا آنے والا ناول چار یا پانچ قسطوں پر محیط ہوگا۔ تیز رفتار زندگی نے آج کے قاری کو بھی جلد باز بنا دیا ہے۔ بہرحال رفعت سراج میری پسندیدہ رائٹر ہیں اور مجھے ان کا طرزِ تحریر بہت پسند ہے۔ بہنوں کی محفل بھی بہت اچھی لگتی ہے اور سب سے پہلے میں اسے ہی پڑھتی ہوں۔ ہاں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا صفحات بچانے کے چکر میں آپ لوگوں نے سوالات کے بجائے عمیرہ احمد کے صرف جوابات شائع کیے؟" (سوالات بھی شائع ہونے تھے جو لگنے سے رہ گئے)

✍ مہوش مشعل، پنجاب سے۔ "مجھے اور میری بہن مہتاب کو فروری کا پاکیزہ بہت پسند آیا۔ تمام تحریریں اے ون تھیں۔ قیصرہ حیات بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ انجم باجی کیا آپ فیس بک پر ہیں اور آپ کی کوئی ویب سائٹ بھی ہے؟" (تبصرے کا شکریہ۔ جی ہاں میں فیس بک پر موجود ہوں۔ ہاں ابھی میری اپنی کوئی ویب سائٹ نہیں بنی ہے)

✍ آصفہ پروین، امریکا سے۔ "باجی پاکیزہ تاخیر سے ملتا ہے مگر پڑھتی ضرور ہوں۔ مجھے پاکیزہ کی رائٹرز کے وہ تمام ناول پڑھنے ہیں جو پاکیزہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ مجھے کہاں سے ملیں گے۔ آپ میری اس سلسلے میں مدد کریں۔" (آصفہ بہن، آپ www.novel pk.com پر تمام مصنفات کے ناول پڑھ سکتی ہیں بلکہ اس ویب سائٹ پر ہماری روحانی مشورے کی کتاب تک موجود ہے۔ جس سے بہنیں مستفید ہو سکتی ہیں)

✉ بہن الف الف، سندھ۔ آپ کے خط کے جواب میں صرف اتنا کہوں گی کہ تمام گناہوں کو معاف کروانے کا نبوی نسخہ موجود ہے۔ جو آپ ہر نماز کے بعد تین مرتبہ پڑھیں۔ ترجمہ: اے اللہ! تیری مغفرت میرے گناہوں سے زیادہ وسعت والی ہے اور مجھے اپنے عمل سے زیادہ تیری رحمت کی امید ہے۔ دیگر بہنیں بھی یہ دعا مانگا کریں اس کی بڑی فضیلت ہے۔

✉ ذوالنورین، ہری پور ہزارہ۔ آپ کی محبتوں کی احسان مند ہوں۔ آپ اپنی نثر اور شاعری باقاعدگی سے بھیجیں۔

✍ ہادیہ انعم، سیالکوٹ سے۔ "ٹائٹل بہت زبردست لگا بالکل موسم کے مطابق تھا۔ عمیرہ احمد کا عکس نہ ہونے کی وجہ سے دل اداس تو ہے مگر یقین ہے کہ وہ بہت جلد ہمارے لیے کچھ نیا لے کر آئیں گی۔ رفعت سراج کا ناول مجھے متاثر نہ کر سکا۔ پلاٹ پرانا محسوس ہوا۔ قیصرہ حیات اچھا لکھ رہی ہیں۔ اس کے برعکس نگہت سیما نے متاثر نہیں کیا۔ عنیقہ محمد بیگ کا ناول دلچسپ لگا۔ رحما اور اکرم کی کہانی دل کو چھو گئی۔ رحما کے خطوط کا سلسلہ اچھا لگا۔ عنیقہ محمد بیگ، بہت منفرد لکھتی ہیں۔" (اس محفل میں خوش آمدید، پسندیدگی کا شکریہ)

✍ تحریم خان، سیالکوٹ سے۔ "سب سے پہلے رفعت سراج کا ناول پڑھا۔ مہر جان اور ستارہ کا کردار اچھا لگا۔ اگلی قسط کی منتظر ہوں مگر عمیرہ احمد کی کمی بہت محسوس کی۔ عمیرہ جی جلدی سے کوئی نئی تحریر ہماری نذر کریں۔ نگہت سیما جی کا افسانہ متاثر نہ کر سکا۔ عنیزہ سید نے خوب لکھا اور عنیقہ محمد بیگ نے کمال کر دیا۔ خطوط کا سلسلہ رحما اور اکرم کی محبت پاکیزہ سی لگی۔ میں نے کافی رائٹرز کو دیکھا ہے کہ وہ محبت کا بیان کرتے وقت لحاظ بھول جاتی ہیں مگر عنیقہ محمد بیگ کی تحریر نے محبت کو بہت پیارے الفاظ دیے۔ اگلی تحریر کی منتظر ہوں۔ عنیقہ جی مزید منفرد لکھتی رہیں۔ قیصرہ حیات میری پسندیدہ رائٹر ہیں لیکن ان کا ناول بہت آہستہ چل رہا ہے۔" (اس محفل میں خوش آمدید اور تبصرے کا شکریہ)

✍ ثانیہ حیدر، سیالکوٹ سے۔ "ٹائٹل موسم کے مطابق اچھا لگا۔ افسانوں میں سب کے افسانے اچھے تھے۔ رفعت سراج جی کا ناول امانت اتنا دل کو بھا نہیں سکا جتنا عنیقہ محمد بیگ جی بازی لے گئیں۔ مجھے اکرم کا کردار بہت اچھا لگا۔ بہت حساس کردار تھا۔ جو

رحما کی جان بچاتے بچاتے اپنی جان ان کے نام کر بیٹھے۔ اگلی قسط کی شدت سے منتظر ہوں۔ ویل ڈن عنیقہ جی۔ قیصرہ حیات کا ناول بھی محبت سے پڑھ رہی ہوں مگر اس دفعہ قیصرہ جی سے زیادہ امیدیں باندھ لی ہیں کہانی اچھی تو ہے مگر دلچسپ نہیں ہو رہی۔ نگہت سیما جی میری فیورٹ رائٹر ہیں اس دفعہ کا افسانہ سو سو لگا۔ نگہت جی آپ کو مزید پڑھنا چاہتی ہوں، مائنڈ مت کیجیے گا۔" (اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ "کچھ تھوڑا سا جنوری کے شمارے کے بارے میں۔ مجموعی طور پر اچھا تھا تم نے شکر کے لیے ترغیب بہت اچھے انداز میں دی۔ امانت پر تبصرہ چند قسطوں کے بعد۔ رضوانہ پرنس نے اچھا لکھا۔ نزہت نے عینی جعفری سے بہت اچھے انداز میں ملوایا۔ فروری کا شمارہ ذرا تاخیر سے آیا مگر طمطراق سے آیا۔ بہت اچھی دعا دی تم نے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سنت رسول ﷺ پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے، آمین۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ علم اور ایمان میں سلامتی کا ذریعہ ہیں۔ آنچل میں جڑے رشتے ایک اچھی کاوش ہے۔ قیصرہ حیات بھی اچھا لکھ رہی ہیں اب تحریر میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے لگتا ہے ردا کے ساتھ کچھ برا ہونے جا رہا ہے۔ سرگوشیِ بہار اور میرا ہرجائی گوارا تھیں۔ زندگی اچھی تحریر ہے حجاب کی نجات معجزاتی طور پر ہوئی اللہ تعالیٰ جس پر چاہے کرم کر دے اس نے الطاف جیسے بندے کو بھی ہدایت دی اور مونس پر بھی کرم کیا بلکہ اس کے والدین پر۔ غزالہ فرخ نے اپنی تحریر کے ذریعے ایک اچھا پیغام دیا ہے جو کئی گھروں کو بچا سکتا ہے۔ محبت کے سوا کے لیے یہ کہنا چاہوں گی کہ صہیب جیسے لوگ ہمارے یہاں بہت ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہاں محبت کے سوا سب کچھ ہے ان کی محبت کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ شمیم فضل خالق اور فرحانہ ناز ملک نے اچھا لکھا۔ بساطِ زندگی میں علیزے جتنی آسانی سے دوستوں کے راستے پر چل پڑی عجیب لگا اور ایسی لڑکیوں سے علیزے کی دوستی بھی عجیب لگی۔ خزاں کے بعد میں بھی یہی کچھ ہے۔ جانِ جاں زیادہ متاثر نہیں کر رہا۔ انجم جی آپ نے عمیرہ احمد کے لیے اچھی میٹھی گولی دی، ہمیں تو انٹرویو کا بے صبری سے انتظار تھا۔ خیر عکس کے بارے میں ان کے جوابات بھی بہت اچھے لگے ان کے ناول کا موضوع بلاشبہ بہت حساس اور اہم ہے اور متاثرہ لوگوں کو جو انہوں نے پیغام دیا ہے وہ بے حد قابلِ قدر ہے۔ دکھی بہن سے بھی میں یہ کہوں گی کہ جو ان کے ساتھ ہو گیا اسے بھول جائیں۔ عکس کی طرح اٹھ کر اپنے کو آگے بڑھائیں اور خود کو مظلوم نہ خیال کریں۔ عکس کی ڈرامائی تشکیل کا انتظار ہے۔ جس میں غالباً کافی رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ سرورق میں کوئی تبدیلی آنی چاہیے خواتین کے چہروں کے علاوہ کچھ ہو کیا؟ بہنوں کی محفل اپنے مخصوص رنگ میں سجی ہے۔ یاسمین رشید کو سالگرہ مبارک۔ دیگر تمام بہنوں کو بھی جنہیں خوشیاں ملی ہیں بے حد مبارک۔ رفعت سراج بہت اچھی خاتون ہیں اور بہت اچھی رائٹر بھی۔ ویسے میں نے جو بھی لکھا تھا پورے خلوص اور نیک نیتی سے لکھا تھا۔ عذرا بہت شکریہ ڈائری کا صفحہ مہیا کرنے کا بہت سی بہنیں اس سے مستفید ہو رہی ہوں گی ہم نے بھی فوراً آواز کھولنے کا نسخہ اپنی ایک مریض کو دے دیا۔ جنوری اور فروری کے جلترنگ نے خوب مزہ دیا خاص کر سرپرائز اور چھوٹے بڑے خواب پاکیزہ ڈائری، میرا انتخاب اور دیگر سلسلے بھی اچھے لگے، انجم پلیز تم ایک کام تو کرو عظمیٰ پیاری کے سر میں جوئیں ڈال دو جب وہ ان کے کان میں رینگیں گی تو یہ قارئین کی فرمائش پوری کرنے کا سوچیں گی۔" (بہت خوب)

پروفیسر فرزانہ عزیز ہاشمی، پنجاب سے۔ "فرزانہ تسنیم سیالکوٹ کا خط پڑھا جو انہوں نے اگست میں لکھا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلی ہیں ان کے لیے میں کہتی ہوں کہ مجھے اپنی بہن، دوست بنائیں خوشی ہوگی۔ میں نے آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ محترمہ یاسمین نشاط اختر وہی ہیں جنہوں نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے اکنامکس میں ایم ایس سی .... کیا تھا۔ ان دنوں میں نے بھی ایم ایس سی کیمسٹری کیا تھا وہ اب کیا کر رہی ہیں؟ افسانے بہت اچھے لکھتی ہیں۔ ہم ایک ہاسٹل میں تھے۔ اگر وہی ہیں تو انہیں میری طرف سے بہت بہت سلام اور بیٹے کی مبارک باد ہو۔ کیا وہ سروس بھی کر رہی ہیں؟ (اس بارے میں مجھے علم نہیں ہے یہ تو یاسمین نشاط خود ہی بتائیں گی) پاکیزہ کے لیے چند مشورے۔ تین عورتیں تین کہانیاں دوبارہ شروع کر دیں۔ مہربانی ہوگی۔ فیشن کے کپڑے کا ڈیزائن جو اِن ہو اگر وہ بھی شروع کریں تو خوشی ہوگی۔ جولائی 2012ء کا پاکیزہ مجھے نہیں ملا۔ اس میں دل کی بند شریانیں کھولنے کا وظیفہ تھا۔ دوبارہ شائع کر دیں تو شکر گزار رہوں گی۔ آپ اپنی پوری فیملی کی تصویر، آپ کا اپنا انٹرویو بھی پاکیزہ کی زینت بنائیے، انتظار رہے گا۔" (مشورے اور فرمائشیں نوٹ کر لی گئی ہیں۔ دل کی بند شریانوں کو کھولنے کا نسخہ جنوری یا فروری کی بہنوں کی محفل میں بھی دیا تھا اگر نہ ملے تو مجھ سے فون پر پوچھ لیجیے گا، میرا نمبر ہے 021-3698195)

نجمہ، نیو یارک سے۔ "پاکیزہ ماشاءاللہ روز بروز نکھرتا جا رہا ہے یہ سب آپ کی محنتوں کا ثمر ہے اور ہم سب بہنوں کی دعائیں اسی کے ساتھ ہیں۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے، افسانے، ناول سب ہی تعریف کے قابل ہیں لیکن مجھے انجم بہن اس کی سب سے

اچھی بات ہمیشہ سے یہ لگی ہے کہ آپ بہنوں کی محفل میں جو درود شریف اور آیتِ کریمہ پڑھنے کی جو تلقین کرتی ہیں وہ بہت بڑا صدقۂ جاریہ ہے آپ کی اس نیکی اور کاوش سے ہزاروں درود شریف اور آیتِ کریمہ پڑھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزائے خیر دے اور ہم سب کے پڑھنے کو قبول فرمائے، آمین۔ پچھلے دنوں آپ کی شکرانے کے نوافل کی بات بہت ہی اچھی لگی تھی اور امید ہے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہنوں کے عمل میں بھی آئی ہوگی۔ ایک بات میں سب پیاری بہنوں سے کہنا چاہوں گی کہ جس طرح ہم شکرانے کے نوافل پڑھتے ہیں اسی طرح ہمیں روزانہ دو نفل توبہ کی نیت سے بھی پڑھنے چاہئیں ہم سب گناہگار ہیں جانے انجانے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کتنی کمی کوتاہی ہوتی ہوگی تو ہم کیوں نہ روزانہ دو رکعت توبہ کی نیت سے پڑھ کر اپنا اعمال نامہ پاک صاف کرتے رہیں، وہ غفور ہے، وہ رحیم ہے، وہ کریم ہے اس کی ذات سے پوری امید اور وعدہ ہے کہ وہ معاف کر دے گا۔ نہ صرف اپنے گناہوں کی بلکہ اپنے گھر والوں کی، پوری امت کے گناہوں کی اور ہمارے مرحومین کے گناہوں کی بھی معافی مانگیں کیونکہ میں نے سنا ہے کہ گناہوں کے اثرات سات پشتوں تک آتے ہیں اور اس طرح نیکیوں کی خوشبو بھی اور اثرات سات پشتوں تک ہوتے ہیں۔" (پیاری نجمہ، بہت پیاری بات بتائی ہے، جزاک اللہ)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ "فروری کا شمارہ ہر لحاظ سے مکمل رہا۔ قیصرہ حیات نے بڑے تفصیلی انداز میں بتایا ہے، بہت خوشی ہوئی۔ قیصرہ کی وضاحت پسند بھی آئی ہے۔ رفعت سراج نے بھی اپنے تمام چاہنے والوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے مگر رفعت کے ناول پر ہمارا تبصرہ ابھی محفوظ ہے۔ عمیرہ نے میرے سوال کا بھی بڑی تفصیل سے جواب دیا ہے دیگر جوابات بھی پسند آئے۔ پاکیزہ کے ٹائٹل کے بارے میں عمیرہ کے مشورے پسند آئے۔ زندگی میں حجاب کو تو سکون مل گیا ہے مگر عائزہ نے مونس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بہر حال زندگی اتار چڑھاؤ کا ہی نام ہے۔ رخ چوہدری کا افسانہ اور اس کا نام بھی اچھا لگا۔ شبانہ شوکت کا سرگوشیِ بہار سو سو لگا۔ میمونہ خورشید نے اچھا لکھا۔ شمیم فضل خالق کی بھی ہلکی پھلکی کہانی رہی۔ فرحانہ ناز ملک کا ناولٹ ہنستا مسکراتا رہا۔ ویسے فرحانہ نے تیسری بیوی کا نام مردانہ کیوں رکھا؟ رفاقت جاوید اور قرۃ العین شکیل کی کہانیاں کم عمر لڑکیوں کے لیے بہترین ہیں اگر وہ سبق سیکھ لیں تو۔ صائمہ حیدر نے بھی بس ٹھیک لکھا۔ نمرہ احمد کا افسانہ سوچ کے دروازے کھول گیا۔ ہم دوسروں کی خامیاں تلاش کرتے ہیں۔ یہ روش عام ہو گئی ہے۔ عنیقہ محمد بیگ کا جانِ جاں میں آگے تجسس تو ضرور ہے مگر رحما کی ماں کی سوچ کچھ عجیب سی لگی۔ اب طویل ناولوں کے بجائے مختصر ناول اچھے لگ رہے ہیں۔ جلترنگ پڑھ کر ہنسی آئی۔ میرا شوق میں زبردست شوق نظر آئے۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

اُمِ ایمان، ڈیرہ غازی خان سے۔ "بہنوں کی محفل میں شرکت کیے بغیر رسالہ پڑھنا دشوار لگتا ہے۔ سو وہاں حاضری دے کر زندگی تک فاصلہ طے کیا۔ زندگی کی ہر ہر سطر زندگی کے حوالے سے کوئی نہ کوئی سبق پڑھاتی معلوم ہو رہی ہے۔ اس کے بعد موسٹ فیورٹ رفعت سراج کا امانت پڑھا۔ اگرچہ کہانی کی گتھی صحیح سلجھی نہیں ہے پھر بھی دلچسپی اور تجسس کا عنصر قائم ہے کہ کس چیز نے مہر جان کو اتنا سخت اور غیر روایتی بننے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سگے رشتوں سے بھی ایسی بے رحمی سے پیش آتی ہیں یقیناً اس سب کے پیچھے کوئی دلچسپ اسٹوری ہوگی۔ رخ چوہدری کا ہلکا پھلکا افسانہ پسند آیا۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل اب زیادہ واضح ہو کر سامنے آ رہا ہے۔ نمرہ احمد کا اپنی انگلی پسند آیا۔ بساطِ زندگی میں مصنفہ نے اچھی طرح اپنا موقف واضح کیا اور موضوع سے انصاف کیا۔ آپا آپ کے جلترنگ میں چھوٹے بڑے نواب کی خوش فہمیوں پر بہت ہنسی آئی اور چہرے پڑھنے کا شوق بہت دلچسپ لگا۔ آپا میرا ڈیڑھ سال کا بیٹا سیمنٹ، مٹی اور چونا بہت کھاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس یا کسی قاری بہن کے پاس اس کا کوئی حل تو بتائیں۔" (پسندیدگی کا شکریہ۔ بچے کے سامنے کھلونے رکھیں اس کی پسند کے رنگین بلاکس۔ باقی جو مشورے ہماری قارئین بہنیں دیں گی)

ثنا کنول، لودھراں سے۔ "اس بار سب کہانیاں اچھی تھیں۔ مجھے انجم انصار اور عذرا رسول پر حیرت ہوتی ہے کہ آج کل کے دور میں اتنے اچھے اور محبت کرنے والے لوگ بھی ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا آپ دونوں کی تعریف کرنے کا میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کی خوشامد کر رہی ہوں۔ ویسے میں اپنی حیرت کا اظہار کر رہی ہوں۔" (گڑیا! اس میں حیرت کی کیا بات ہے، مجھے تو آپ کی حیرت پر حیرت ہو رہی ہے)

تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ "آپ نے بالکل درست کہا کہ ہم زیادہ وقت رو کر یا سو کر برباد کرتے ہیں۔ رفعت سراج کی امانت میں دو مختلف گھروں میں سخت ماحول میں پرورش پاتی لڑکیاں دکھائیں، ایک تو سختی سے دب کر رہنے والی بہن اور دوسری...... اب خدا جانے یا رفعت صاحبہ جانے کہ ان میں سے کس نے ماحول کو اپنے تابع کرنا ہے۔ شکیلہ رفیق کی کچی مٹی کے راہبر تھی تو بچوں کی کہانی مگر اردو سیکھتے سیکھتے انجانے میں بچہ باپ کو بڑی بات سکھا گیا۔ صائمہ قیصر کی سفرِ زیست کہاں پر ٹھہرے۔ میں

وجیہ عثمانی نے بہت دیر کی مہرباں آتے آتے کے مصداق اپنی محبت کا اظہار کیا۔ رضوانہ پرنس کی تحفہ لوڈشیڈنگ کا محبت بھرا تحفہ لگا۔ چیئر لیڈر پڑھ کر ہنسی بھی آئی مگر زبیدہ کی بے بسی پر دکھ ہوا۔ اجالوں کا سفر میں مائیکل سے حارث تک کا سفر بہت اچھا لگا۔ بہر حال آپ تو نیک کام کر رہی ہیں جلترنگ لکھ کر کہ سب چہروں پر مسکراہٹ بکھیر رہی ہیں جو کہ بہت بڑی نیکی ہے۔'' (نوازش)

☜ صوبیہ بتول، شیخوپورہ سے۔ ''انجم صاحبہ ہم جو یہ تحریریں پڑھتے ہیں یہ ہمارے معاشرے کی، ہمارے گھروں کی جیتی جاگتی، سانس لیتی کہانیاں ہیں اور آپ جو ہر بار مجھے کچھ کہنا ہے میں لکھتی ہیں یہ ہماری اصلاح ہے وہ سبق، وہ نصیحت ہے ہم پڑھنے کی حد تک نہیں بلکہ قول و عمل کو اپنی زندگی میں شامل کریں تو ہم بہتر سے بہترین انسان بن سکتے ہیں اور اس سے ان کہانیوں میں نظر آنے والے منفی رویے اور منفی باتوں میں کمی آسکتی ہے اور یہ ہر انسان کا انسانیت پر ہی نہیں بلکہ خود پر بھی احسان ہوگا آج ہمیں آپ کی ان باتوں کی بہت ضرورت ہے۔'' (گڑیا! اصل کام عمل کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ مثبت عمل کرنے کی توفیق دے)

☜ عاصمہ ملک، کراچی سے۔ ''بالکل سچ کہا آپ نے کہ ہم کس قدر ناشکرے ہیں۔ یہ تو کہتے ہیں کہ یہ نہیں ملا وہ نہیں ملا یہ نظر میں نہیں رکھتے کہ کیا کچھ ملا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ذاتِ برحق نے ہمیں مسلمان بنا کر دنیا میں پیدا کیا ہے۔ وہ کسی اور مذہب میں پیدا کرتا تو ہم تباہ ہو جاتے۔ کتنا احسان ہے اس ذاتِ برحق کا۔ امانت پڑھا ابھی تو الجھا ہوا سا ہے۔ شناسائی بڑھے گی تو بات کریں گے۔ شکیلہ رفیق کا افسانہ پسند آیا۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل میں شمیلہ کا انداز خود اسے نقصان پہنچائے گا۔ یمنیٰ کا انداز کچھ زیادہ ہی اوور سا لگا۔ یوں ہر کسی کو تھپڑ ہی مار دینا ردا کا جوڑ روحیل سے نہ بننے کی وجہ تو تیر ہوگا یقیناً۔ انارکلی اداس سا افسانہ بلکہ دکھ سے شروع ہوا اور غم پر ختم ہوا۔ کہانی میں اچھے وقت کی امید ہونی چاہیے تھی مایوسی کفر ہے۔ سفرِ زیست کہاں پر ٹھہرے میں روما کا انداز پسند نہیں آیا۔ وجیہ کی سچی محبت کا اسے خود سے پتا چل جانا چاہیے تھا۔ ویسے اتنی سمجھ اس میں ہوتی تو وہ احسن اور اس کی ماں کو بھی پہچان جاتی۔ تحفہ لوڈشیڈنگ کا رضوانہ پرنس کے افسانے سے پتا چلا کہ بجلی نہ ہونے کا کوئی فائدہ بھی ہو سکتا ہے۔ زندگی زبردست چل رہا ہے مگر تسنیم سے مدثر کا رابطہ کرنا اچھا نہیں لگا۔ اس کے ناراض ہونے کی فکر اور یہ کہنا کہ کبھی کبھی فون تو کر سکتا ہوں بالکل غلط بات ہے۔ ہاں بچہ ہو جائے تو بچے سے تعلق رکھنا الگ بات ہے اور الطاف نے معافی مانگی ٹھیک مگر مزہ تو جب آتا کہ وہ اخبار میں تردید کرواتا کہ اس کے وکیل نے جو جھوٹے الزام لگائے تھے وہ بے بنیاد تھے۔ ٹوٹل لاس پسند نہیں آیا۔ سائرہ یا تو صبر کر لیتی یا فیصلہ اور پھر مزید عرفان اس کی بے عزتی کرتا ہے یہ اینڈ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ چیئر لیڈر سمجھ سے بالاتر۔ حق حلال پر پلنے والے ہرگز حرام پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اس کو پڑھ کر دکھ ہوا۔ زبیدہ کی خون پسینے پر پلنے والی اولاد ایسی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اجالوں کا سفر میدان مار گیا۔ زبردست امتحان اچھی تحریر رہی مگر امتحان میں کامیاب وہی ہوتا ہے جو رب کی رضا میں راضی رہے اور جو یہ دیکھے کہ گلاس آدھا خالی ہے یہ نہ دیکھے کہ آدھا خالی ہے تو آدھا بھرا ہوا بھی ہے ناکام ہی ہوتا ہے۔ جانِ جاں پڑھی کوئی مقصد نہ ہو تو تحریر میں مزہ نہیں آتا پھر ماہم کو کس جرم کی سزا ملی۔ یہ تو بالکل ہی اچھا نہیں لگا۔ جلترنگ میں سرپرائز میں خودغرض دیورانی زہر لگی۔'' تبصرے کا شکریہ)

☜ شبیہ زہرا، کراچی سے۔ ''جنوری 2013ء کا سرورق کن من سردیوں کا خوشگوار سندیسہ دیتے ہوئے نگاہوں میں سمجھیں بس ہی گیا۔ مجھے کچھ کہنا ہے کہ شکر کے حوالے سے کہی گئی بات نے سچ میں دل کو چھوا۔ ذرا ذرا سی بات پر دکھڑے رونا لگتا ہے ہماری زندگی کا المیہ بنتا جا رہا ہے۔ رفعت سراج صاحبہ کے ناول امانت کا بہت ہی شاندار انداز میں آغاز ہوا ہے۔ سچ عمیرہ احمد کے بلاک بسٹر عکس کے زبردست اختتام پر شدت سے کسی ایسی ہی کہنہ مشق لکھاری کی اجالا بکھیرتی تحریر کا انتظار تھا جو آغاز سے اختتام تک قاری کی دلچسپی کم نہ ہونے دے اور بلاشبہ رفعت سراج اس فن سے بہ خوبی واقف ہیں۔ شکیلہ رفیق کی کچی مٹی کے راہبر اچھی لگی۔ واقعی ایمانداری و نیک نیتی جیسے اچھے خصائل معاشی مجبوریوں کی چکی میں پستے انسانوں کے ہاتھوں سے چھوٹتے ہی جا رہے ہیں لیکن آسیہ جیسی بلند ہمت مائیں، بہنیں اور بیٹیاں صبر و برداشت و ایثار و خلوص جیسے مضبوط اوصاف کی مالک بن کر اپنی نسلوں کو بگڑنے سے بچا سکتی ہیں۔ قیصرہ حیات کی کہیں دیپ جلے کہیں دل کی درمیانی دو قسطوں نے بور کیا لیکن شکر ہے پہلی قسط والا ٹیمپو چوتھی قسط میں لوٹ آیا ہے۔ مدیحہ عدنان کی انارکلی نے دل کو عجیب سے انداز میں بوجھل کیا تو صائمہ قیصر کے سفرِ زیست کہاں پر ٹھہرے نے دل پر پڑے بوجھ کو خوشگواریت کے ساتھ سرکا دیا کہ اچھے لوگوں سے دنیا ابھی خالی نہیں۔ دیر آید درست آید کے مصداق روبی کو وجیہ کی صورت میں ایک محبت کرنے والا پُرخلوص جیون ساتھی دے کر اس کی زندگی کے دو بڑے ناخوشگوار حادثات سے اسے نجات دی۔ رضوانہ پرنس تو ویسے ہی میری ہارٹ فیورٹ رائٹر ہیں ان کا لکھا ہوا تحفہ لوڈشیڈنگ کا بہت اچھا لگا۔ زندگی تو شاید میری زندگی ہی بنتا جا رہا ہے۔ شکر ہے حجاب کے غم و غصے اور نفرت کی انتہا میں کہے گئے جملے اور آئی ہیٹ یو کی گردان نے الطاف کے ضمیر کو جھنجوڑ

ڈالا۔ سکینہ فرخ کا ٹوٹل لاس اور عنیزہ سید کا چیئر لیڈر معاشرے کے مرکزی جز یا نیوکلیس یعنی عورت کے گرد گھومتی ہوئی دو ایسی کہانیاں ہیں جس میں مشرقی اور مغربی معاشرے میں بننے والی عورت کے افکار کردار کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ نسرین خالد کا اجالوں کا سفر اچھی کوشش تھی لیکن پتا نہیں کیوں کہانی میں غیر اسلامی نام کے کردار اور کرداروں کے رہائشی علاقے کے نام نہ دینے سے کہانی میں کچھ عجیب بے ڈھنگا پن یا یوں کہیں ذرا تشنگی سی محسوس ہوئی۔ نگہت سیما امتحان تو ماروی اور اس جیسی ہزاروں لڑکیوں کے لیے امتحان کی خوب صورت ترجمانی تھی۔ عنیقہ محمد بیگ کا جانِ جاں بھی سالِ نو کا بہترین آغاز ثابت ہوا۔ پہلی ہی قسط بڑی جاندار ہے۔ عینی جعفری سے ملاقات واقعی بڑی دلچسپ ثابت ہوئی۔ بین المدارس مقابلہ تحت اللفظ میں آپ کی تصاویر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سچ آپی آپ کی تحریر پڑھ کر نرم سا تاثر پیدا ہوتا تھا ذہن میں آپ کی تصویر دیکھ کر تو آپ کے نرم خو اور ملیح ہونے کا یقین ہو گیا اس لیے ہی اتنا بے تکلف ہو کر لکھ سکی ہوں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

☜ ثمینہ طاہر بٹ، لاہور سے۔ ''آپ مجھے نہیں جانتی کیونکہ آج سے پہلے میں نے کبھی اس محفل میں شرکت نہیں کی مگر ایسا بھی نہیں کہ میں بھی آپ کو نہیں جانتی کیونکہ میں پاکیزہ، جاسوسی، سسپنس ڈائجسٹ گاہے بگاہے پڑھتی رہتی ہوں بلکہ مجھے تو لکھنے پڑھنے کا چسکا اس وقت سے ہے جب شاید الفاظ اپنا مفہوم بھی پوری طرح مجھ پر واضح نہ کر پائے تھے۔ میں شاید اب بھی آپ کو خط نہ لکھتی اور خاموش قاری بنی رہتی مگر اس ماہ کے پاکیزہ کی محفل میں پاکیزہ بہن نزہت اشفاق نے نئی مصنفین کی تحاریر کے بارے میں سخت تنقید کی ہے۔ مجھے افسوس ہے، بہت افسوس۔ آخر ہماری تمام پرانی اور پسندیدہ رائٹرز بھی تو کبھی نئی ہوں گی ناں اور ایک عرصہ لکھنے اور لکھتے رہنے کے باعث وہ آج اس مقام پر ہیں کہ ماشاء اللہ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ سیدھا دلوں میں گھر کرتا ہے تو اگر انہیں بھی شروع میں ایسے ہی روکا جاتا، ان کا راستہ کاٹا جاتا یا انہیں تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تو شاید وہ بھی دلبرداشتہ ہو جاتیں اور ویسے بھی تخلیق کا عمل اتنا آسان نہیں۔ کبھی جان پر کھیلنا پڑتا ہے تو کبھی راتوں کی نیندوں کی قربانی دینی پڑتی ہے، کبھی بہ مشکل وقت نکالنا پڑتا ہے اور کبھی فرصت کے لمحوں کو اس شوق پر تخلیق کے وارنا پڑتا ہے۔ کئی دن لگا کر کئی صفحات کالے کر کے ایک کہانی سامنے آتی ہے اور ہم کتنے آرام سے اس کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ لکھنے والے کے جگر کا لہو بھی اس میں شامل ہو سکتا ہے۔ میں تو جتنی بھی کہانیاں، ناولز، داستانیں پڑھوں کبھی ان کی درجہ بندی نہیں کر پاتی۔ ہر تحریر کو ہمیشہ یہ سوچ کر ہی پڑھا ہے کہ ضرور اس میں لکھنے والے نے کوئی نہ کوئی پیغام تو دیا ہی ہوگا۔ اس لیے مجھے تو پرانی رائٹرز کے ساتھ ساتھ تمام نئی لکھنے والی بہنوں سے بھی بہت پیار ہے۔'' (اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

☜ عیشہ مریم، لاہور سے۔ ''اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ پاکیزہ سے میرا کیا رشتہ ہے تو آنکھ کھولی اور پاکیزہ کے سرورق کو تکنے لگی۔ ماہ و سال گزر گئے اسکول لائف میں سیلیبریٹی کے انٹرویوز اور کالج سے کہانیاں پڑھنا شروع کر دیں۔ بہت ساری کہانیاں یاد ہیں جب پاکیزہ میں رنگین صفحات چھپنے لگے تو...... جی ہاں آپ کی کہانی چاندنی یاد ہے۔ وقت کی گردش میں انسان گھوم جاتا ہے گزشتہ دس سالوں میں برائے نام ہی پاکیزہ سے تعلق رہا۔ عمیرہ احمد کا نام پاکیزہ میں اچھا لگا۔ اب پاکیزہ کی کہانیاں زیادہ سنجیدگی سے معاشرتی مسائل کی طرف روشنی ڈالتی ہیں۔'' (اس محفل میں خوش آمدید۔ پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں)

☜ مہناز کرن، پشاور سے۔ ''عکس کا سحر پہلی قسط سے گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ ناہید سلطانہ اختر کے ہر لفظ میں زندگی دھڑکتی ہے۔ بہت کمال کا لکھتی ہیں وہ۔ نگہت سیما کے ناولٹ کی ہر قسط نے بہت رُلایا ہے۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ بقیلہ کی تحریر جیسی تحریر ہر ماہ ہونی چاہیے کیونکہ آج کے دور میں تو مسکراتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ میری شاعری کو شامل کرنے کا بے حد شکریہ حالانکہ میں تقریباً مایوس ہو چکی تھی۔ حالات تو یہاں بھی بہتر نہیں مگر کراچی کے احوال سن کر آپ لوگوں کی حفاظت کی دعا کرتے ہیں اللہ سے۔'' (اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ آپ کی غزلیں انشاء اللہ آئندہ بھی شامل ہوتی رہیں گی)

☜ مدیحہ عدنان، لاہور سے۔ ''علالت کے باعث چند ماہ پاکیزہ سے غیر حاضر رہی لیکن پاکیزہ ہمارے دل سے ہمیشہ کی طرح قریب ہی رہا۔ ان تمام قارئین کا شکریہ جنہوں نے میرے افسانے انارکلی کو پسند کیا۔ یہ انجم باجی کی محبت اور حوصلہ افزائی ہے کہ ہم خدا کے فضل سے پاکیزہ سے جڑے ہوئے ہیں۔ انجم باجی آپ جیسے لوگ دنیا میں کم کم ہی ملتے ہیں۔'' (پیاری گڑیا! آپ بہنوں کی وجہ سے اس محفل میں بھی رونق ہے اور آپ ہی سب کی تحریریں پاکیزہ کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں)

☜ حمیرا ایوب چغتائی، لاہور سے۔ ''میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ پاکیزہ مجھے بہت پسند ہے۔ زندگی حقیقتاً زندگی جیسی تلخ ہے۔ اندازِ بیاں رواں، شستہ اور معلومات زبردست۔ امانت میں ڈاکٹر مہرجان جیسے کردار میں نے حقیقی زندگی میں بھی دیکھے

ہیں۔" (خوش آمدید، پسندیدگی کا شکریہ)

بشریٰ تبسم، کراچی سے۔ "انجم آنٹی، ایک بات کہنی ہے۔ مجھے افسانے، کہانیاں وغیرہ لکھنے کا بہت شوق ہے۔ رائٹر بنا میرا بچپن کا خواب ہے مگر مجھے نہیں معلوم کہ رائٹر کیسے بنتے ہیں۔ میں نے انٹر کیا ہے اور بی اے کرنے کا ارادہ ہے۔ میں ایک باقاعدہ رائٹر بنا چاہتی ہوں۔ ایک لڑکی ہوتے ہوئے بھی میں اپنے ماں باپ کا نام روشن کرنا چاہتی ہوں۔ میرے گھر والے میرے اس شوق کی قدر کرتے ہیں مگر میری ان لاحاصل کوششوں سے کبھی کبھی وہ چڑتے ہیں مگر مجھے رائٹر بننے کا بچپن سے جنون ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں آپ مجھے بہتر مشورہ دے سکتی ہیں۔" (گڑیا لکھنے سے پہلے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ آپ پہلے پڑھیے پھر لکھیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مرادوں کو پورا کرے کہ جب اللہ کا کرم ہوتا ہے تو سب کچھ اچھا ہی اچھا ہوتا ہے)

فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ "نئے سال پر پاکیزہ کا سرورق موسم کی ساری مستیوں سمیت حاضر ہوا۔ آپ کی سحر انگیز باتیں حسبِ معمول عروج پر تھیں۔ سمجھانے کا انداز جب اس قدر مسحور کن ہوگا تو کون نہ دل میں اترتا محسوس کرے گا۔ پاک پروردگار کی نصیحتوں اور آپ کی خدمت میں قصیدہ کرتی قیصرہ حیات بہت کامیابی سے ہمیں بتاتی دکھائی دیں۔ اس کا انہیں اجرِ عظیم ملے۔ تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا امانت کی پہلی قسط نے ہی ہمیں اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ مہر جان کا کردار بظاہر پاورفل لگ رہا ہے جبکہ اندر سے وہ ایک بُھربُھری دیوار ثابت ہوگی۔ ابھی کردار واضح نہیں ہوئے تاہم تحریر کی چاشنی نے دل موہ لیا ہے۔ شکریہ رفعت جی۔ پلیز عالیہ بخاری صاحبہ کو بھی کہیے کہ وہ بھی جلد آئیں۔ بہت مدت بعد سینئر لکھاری محترمہ شکیلہ رفیق صاحبہ مٹی کے راہبر لے کر آئیں۔ سبق آموز اور آخرت سنوارنے کی تحریر رہی۔ قیصرہ حیات کا ناول بس سو سو جا رہا ہے۔ صائمہ قیصر کی سفرِ زیست کہاں پر ٹھہرے... دلفریب تحریر لگی۔ ایسے گھٹے ہوئے ماحول میں رہنے سے بہتر ہے کہ انسان کوئی فیصلہ ہی کرلے سو رومائیسہ نے درست فیصلہ کیا اور وجیہ کی زندگی میں بہار آ گئی۔ بہرحال تحریر میں کچھ باتیں ایسی بھی تھیں جو ہمارے معاشرے اور ماحول کی نفی کرتی دکھائی دیں۔ رضوانہ پرنس نے قناعت پسندی کو سامنے رکھتے ہوئے خواتین کو بہت اچھا سبق دیا۔ زندگی پاکیزہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ بہت لطف آتا ہے ناہید صاحب کا قوتِ مشاہدہ بھی زبردست ہے ہر کردار پر بہت محنت کر رہی ہیں۔ بس ابھی اتنا ہی پڑھ سکی ہوں آپ کی تصاویر بہت اچھی لگیں۔" (نوازش)

بنتِ عزیز الرحمن، راولپنڈی سے۔ "پہلی دفعہ آپ سے مخاطب ہونے کی جسارت کر رہی ہوں۔ پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں۔ آپ کا جلترنگ بہت ہی پسند ہے۔ دیگر سلسلے جو پاکیزہ کی زینت ہوتے ہیں بہت خوب ہیں کبھی کبھی میں کچھ لکھ لیتی ہوں۔" (اس محفل میں خوش آمدید، اس دفعہ آپ نے خط میں ہی اپنی نظم لکھ دی آئندہ الگ صفحے پر لکھ کر بھیجیں تاکہ ہم آپ کی حوصلہ افزائی کر سکیں)

فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ "فروری کا پاکیزہ ملا ٹائٹل بے حد پیارا لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے بہت اچھی باتیں بتائیں۔ یوں تو سبھی افسانے بہترین تھے مگر میمونہ خورشید کا محبت کے سوا نے تو کمال کر دیا یہ افسانہ پاکیزہ کی جان تھا پڑھ کر مزہ آ گیا ویلڈن میمونہ جی اور شمیم فضل خالق کا افسانہ بھی بہترین تحریر تھی وہ تو ہمیشہ سے بہت ہی اچھا لکھتی ہیں۔ شمیم جی ہر ماہ پاکیزہ میں لکھا کریں شکریہ۔ انجم جی آپ نے لکھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان نہ ہوا کریں۔ پاکیزہ میں نام ہی آ جائے تو بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ہے کہ اس نے مجھے بے حد نوازا ہے۔ میں روزانہ عشا کی نماز کے بعد دو نفل شکرانے کے اور دو نفل حاجت کے پڑھتی ہوں یہ میرا آزمودہ عمل ہے کہ تمام بہنیں ایسا ہی کیا کریں پھر دیکھیں کہ ان کی پریشانیاں کس طرح دور ہوتی ہیں۔ میں صرف پاکیزہ کے لیے پریشان ہوتی ہوں یہ میگزین میری جان ہے اب میں بہت خوش ہوں۔" (ہم آپ کو ہمیشہ خوش و خرم اور صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں۔ بروقت اپنا تبصرہ پوسٹ کیا کریں تاکہ ہر ماہ جگہ پا سکے)

زینب منظور علی خان، کراچی سے۔ "مجھے آپ کے مخاطب کرنے کا انداز بہت پسند ہے۔ آپ اتنے پیار سے بولتی ہیں کہ حد نہیں۔ میں تمام مصنفین کا بہت بہت شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ سب میرے لیے ایک ناصح ہیں۔ مجھے اپنی زندگی ان کتابوں کے درمیان ہی قید لگتی ہے۔ میں ہر کہانی سے ضرور کوئی سبق حاصل کرتی ہوں اور اپنی زندگی میں عمل بھی کرتی ہوں اور ایک بات اور پلیز انجم، عمیرہ احمد سے پوچھ کر بتائیے گا کہ آبِ حیات کب شائع ہوگا مجھے بہت بے صبری سے انتظار ہے اس ناول کا۔" (عمیرہ احمد فیس بک پر موجود ہیں آپ ان سے رابطہ کر سکتی ہیں اور ان کا ناول جب شائع ہوگا عمیرہ احمد ضرور بتائیں گی)

سیدہ علیشاہ، بہاولپور سے۔ "اس بار ٹائٹل بہت اچھا تھا اینڈ ٹائٹل گرل بھی۔ عکس ہمیشہ یاد رہے گا۔ آنٹی اب آپ کوئی ناول لکھیں اے ون سا۔ قیصرہ حیات کا کہیں دیپ جلے کہیں دل اچھا جا رہا ہے۔ کچی مٹی کے راہبر ایک اچھی تحریر تھی۔ عنیزہ سید

نے ایک بار پھر نئے موضوع پر بہت اچھا لکھا۔ رضوانہ پرنس کا افسانہ تحفہ لوڈشیڈنگ کا اور سکینہ فرخ کا ٹوٹل لاس بھی اچھے تھے۔ عینی جعفری کا انٹرویو پسند آیا۔ پاکیزہ ڈائری بہت شارٹ ہو گئی ہے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں سمیت باقی تمام سلسلے عمدہ رہے۔ جلترنگ میں نئے سال کا ہر ہفتہ کیسا رہے گا پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ آنٹی جی آپ سے کچھ پوچھنا تھا پلیز مجھے جواب ضرور دیجیے گا۔ میں آج کل تھوڑی سی مشکل میں ہوں اور آپ میری یہ مشکل دور کر سکتی ہیں۔ آنٹی بات یہ ہے کہ میں پاکیزہ کے ٹائٹل پر آنا چاہتی ہوں مگر اس کے لیے کیا کرنا ہوگا مجھے یہ نہیں پتا۔ پاکیزہ کے ٹائٹل پر آنا میرا خواب ہے اور مجھے یہ بتا دیں کہ پاکیزہ کے ٹائٹل پر آنے کے لیے کراچی ہی آنا پڑے گا یا لاہور میں بھی فوٹو شوٹ ہو سکتا ہے؟ میں اپنی تصویر آپ کو کیسے بھیج سکتی ہوں؟" (گڑیا! پہلے آپ اپنے دو کلوز اپ بھجوا دیں تاکہ اندازہ کر لیا جائے کہ آپ سرورق پر آ سکتی ہیں یا نہیں)

صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ "سرورق کی حسینہ مہ جبیں گرم کافی کا مگ پکڑے کمبل اور اونی ٹوپی اوڑھے کافی دلکش نظر آ رہی تھی بیک پر پہاڑوں پر برف دکھا کر آپ نے پورا پاکیزہ کا سیزن ہی چینج کر دیا۔ سردیاں بھی واقعی نعمت ہیں گرمیوں میں واپڈا والے سونے نہیں دیتے اور سردیوں میں واپڈا والے جاگنے نہیں دیتے بس دل کرتا ہے رضائی میں گھس کر بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے۔ عنیزہ سید نے چیئر لیڈر بہت اچھا لکھا۔ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں بدیسی تہذیبیں وقتی طور پر اسیر کر لیتی ہیں لیکن... انسان کو اسی تہذیب کو اپنانا پڑے تو بہت مشکلات درپیش ہوتی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ بندہ خود کو امتحان میں نہ ڈالے۔ رضوانہ پرنس کا تحفہ لوڈشیڈنگ مزے کا تھا وہ بھی ہماری طرح واپڈا سے شاکی لگتی ہیں۔ عتیقہ محمد بیگ اچھا لکھ رہی ہیں۔ نگہت سیما نے بھی اچھے موضوع پر لکھا۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

روحی صبا، کراچی سے۔ "باجی پاکیزہ کے کئی سلسلے مجھے بہت پسند ہیں خاص کر شاعری کا سلسلہ میں اکثر گنگناتی ہوں ہاں پلیز بزمِ پاکیزہ کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں اور سندیسے ختم کر دیں۔ ناول عکس میری بیٹیوں کو بہت پسند تھا اور مجھے تو زندگی بہت زیادہ پسند ہے۔ حجاب کی آزمائشیں بہت بڑی ہیں خاص کر جب بندہ حق بات پر ڈٹ جائے اور اپنے ہی گھر والے اس کا ساتھ نہ دیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے ناہید باجی کا ناول سطر سطر پڑھنے کے لائق ہوتا ہے میری مبارک باد ان تک پہنچا دیں۔ عطیہ عمر میری پسندیدہ لکھاری ہیں۔ اب بات کرتی ہوں اس کہانی کی جس نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ ہے اس ماہ یعنی جنوری کے شمارے میں مکمل ناول جانِ جاں جو کہ عتیقہ محمد بیگ کی تحریر ہے۔ محترمہ نے مزاح کی کوشش میں اپنے پیارے مذہب اسلام کا مذاق اڑایا ہے کہانی میں نورین اور رحما دونوں ارمغان کے لیے بے ایمان کا لقب استعمال کرتی ہیں جو کہ گناہ ہے کیسے کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ماننے والے کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ان کا منکر ہے اور یاد رہے کہ ایسی بات مذاق میں بھی کہنا گناہ ہے اسی طرح صفحہ 247 پر اکرم اپنی ماں سے رحما کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ مسلم نہیں ہے اور بعد میں ہنستا ہے کہ میں مذاق کر رہا تھا وہ معاف کیجیے گا باجی یہ کون سا مذاق یا مزاح ہے۔ اپنی مصنفات کو پابند کریں کہ مزاح ضرور لکھیں مگر مذہب کو درمیان میں نہ لائیں اور آپ بھی کہانی منتخب کرتے وقت ایسے حصے ہٹا دیا کریں۔ اس کہانی کے بارے میں ایک اور بات بہت عجیب لگی کہ جب ارمغان نے جانے کے بعد نہ فون کیا نہ میسج کیا تو رحما اسے خطوط لندن کیسے بھیجتی رہی اس کے پاس اس کا ایڈریس کہاں سے آ گیا۔ مجھے جو سب سے زیادہ پسند آئی وہ نسرین خالد کی تحریر اجالوں کا سفر تھی۔ ایک بہت ہی متاثر کن کہانی تھی نسرین کو بہت مبارک باد۔ صائمہ قیصر کی تحریر سفرِ زیست کہاں پر ٹھہرے بھی بور تھی ایک تو اس کا اینڈ بالکل پسند نہیں آیا کہ جب رومائیسہ اور وجیہ کی شادی طاہر بھائی نے کروائی تھی تو اتنا عرصہ کیا وہ سو رہا تھا بغیر کسی وجہ کے اتنے سال ضائع کرنے کی کیا تک تھی پھر اس میں بے شک شہزاد صاحب آزاد خیال تھے مگر اس کا اپنی غیر شادی شدہ بیٹی سے یہ کہنا کہ سکینہ کے آنے والے بچے کے لیے شاپنگ کرو اور بیٹی بھی ویسا ہی جواب دیتی ہے بہت نامناسب سا لگا کیونکہ اس سے کیا بیٹی نے یہ کہا تھا کہ میرے ہاں بچہ آنے والا ہے جبکہ ان بہنوں کی ماں بھی نہیں تھی۔ ایک اور خوب صورت اور ہلکی پھلکی تحریر تحفہ لوڈشیڈنگ کا تھی رضوانہ پرنس نے جانے کتنی ماؤں کے مسئلے کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ باقی تحریریں بھی ٹھیک تھیں رفعت سراج کا ناول ابھی نہیں پڑھا کیونکہ میں آرام سے پڑھتی ہوں۔ جلترنگ کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ میرے جیسے لوگ بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو ہنسنا بھول چکے ہیں اللہ کریم آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور پاکیزہ کو بہت بہت ترقی دے اور پورے اسٹاف کو دین و دنیا کی کامیابی عطا فرمائے، آمین۔" (تبصرے کا شکریہ۔ ہم مزید محتاط رہیں گے)

ثمر احمد، کراچی سے۔ "میں نے پاکیزہ کئی بار پڑھا ہے پر آپ کی شاندار محفل میں پہلی بار شریک ہو رہی ہوں اپنی شاعری کے ساتھ۔ معیاری ہو تو جلد شائع کیجیے گا۔" (اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی حوصلہ افزائی کی جائے گی)

کوثر حیات، ڈسکہ سے۔ ''مجھے عمیرہ احمد کی ہر تحریر اچھی لگتی ہے اور عکس کے لیے، دو تین دفعہ خط لکھا مگر آپ نے شامل نہیں کیا۔ جنوری کا شمارہ ملا تو سب سے پہلے قیصرہ حیات کی قسط پڑھی اچھی لگی کہانی نے ابھی زور نہیں پکڑا۔ جانِ جاں عقیقہ محمد بیگ کا مکمل ناول پڑھا بہت زبردست تحریر لگی شروع سے لے کر آخر تک رحما کے متعلق اور اکرم کی محبت نے جکڑ کر رکھا، ویل ڈن عقیقہ محمد اگلی قسط کے لیے منتظر ہوں۔ رضوانہ پرنس نے بھی خوب لکھا۔ نگہت سیماجی کا افسانہ دل کو نہ چھو سکا البتہ عنیزہ سید نے اچھا لکھا۔'' (اس محفل میں خوش آمدید، تبصرے کا شکریہ)

مبشرہ ناز، کراچی سے۔ ''پاکیزہ سے پہلا تعارف آنی آپ کے ناول محبت ہم سفر میری کے ذریعے ہوا جو آج تک قائم ہے اور اس کے قائم رہنے میں جہاں آپ کی محبت اور اسٹاف کی محنت شامل ہے وہیں ہماری ان رائٹرز کا بھی ہاتھ ہے جو پاکستان کے ہر کونے میں رہنے کے باوجود ہمارے دلوں پر راج کر رہی ہیں اور اپنے قلم کے ذریعے شہرت کی بلندیوں کے ساتھ ہماری محبتوں کو بھی ہر ماہ سمیٹتی ہیں۔ پاکیزہ کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نئے لکھنے والوں کے لیے اکیڈمی کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ تمام رائٹرز جو پاکیزہ کے علاوہ دیگر ماہناموں کے ساتھ ساتھ اب ٹی وی ڈراموں کی ضرورت اور پسندیدگی کی فہرست میں شامل ہیں پاکیزہ یقیناً ان کے لیے ماں کی گود کی طرح پہلی درس گاہ ثابت ہوا جن میں سرِفہرست عمیرہ احمد، ثمرہ بخاری، عنیزہ سید، نمرہ احمد، شیریں حیدر، عالیہ حرا، عالیہ بخاری، راحت وفا اور دیگر نام جو تحریر نہ ہو سکے پاکیزہ ان کے لیے یقیناً شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے اور محبتوں کی دنیا حاصل کرنے کے لیے پہلا قدم، پہلی سیڑھی ثابت ہوا اور آج تک نئے لکھنے والوں کے لیے اکیڈمی کا کام کر رہا ہے۔ دعا ہے کہ قلم کے مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچنے کے لیے روشنی کا کام کرنے والوں کو خدائے عزوجل مزید کامیابیوں اور بلندیوں سے نوازے، آمین۔ اب تبصرہ کروں گی اس ماہ کے شمارے پر اس ماہ بھی ٹائٹل بے حد خوب صورت تھا۔ ویسے آپس کی بات ہے پاکیزہ کا ٹائٹل ہمیشہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ کی خوب صورت باتوں سے مستفید ہونے کے بعد تفسیر وحدیث پڑھی جو ہمیشہ کی طرح بہترین تھی۔ عمیرہ احمد کے عکس سے متعلق جواب پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی اور اس خوشی کے مارے چیخیں نکل گئیں کیونکہ عمیرہ احمد کی کہانیاں مجھے دیوانگی کی حد تک پسند ہیں اور قلم کی دنیا میں قدم رکھنے کا کریڈٹ بھی میں عمیرہ آپی اور ان کی تحریروں کو ہی دیتی ہوں۔ زندگی ناول تو اب بہت اچھا ہوتا جا رہا ہے۔ قیصرہ حیات کا ناولٹ بھی اب تک اپنی توجہ دلانے کا باعث رہا ہے۔ دوسرا سلسلے وار ناول امانت بھی یقیناً اچھا ہوگا کیونکہ کہانی ابھی کافی گنجلک ہے۔ کردار ابھی تک کھل کر سامنے نہیں آئے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ ناول رفعت سراج صاحبہ کے دیگر ناولز کی طرح بہترین ہی ہوگا۔ باقی پورا رسالہ ہی بہترین تھا۔ مستقل سلسلوں میں جلترنگ کے تو کیا کہنے ہیں۔ جلترنگ واقعی ہر طرف مسکراہٹوں کے جلترنگ بکھیر دیتا ہے۔'' (گڑیا، اس محفل میں خوش آمدید بھرپور تبصرے کے لیے نوازش)

انیس جبار خان، آزاد کشمیر سے۔ ''دسمبر کا پاکیزہ ملا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ مجھے کچھ کہنا ہے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ دیا۔ شکر کے ایک نئے پہلو سے روشناس کروایا۔ امانت کی پہلی قسط نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ بہت ہی درد بھری تحریر ہے۔ زندگی کے تو کیا ہی کہنے۔ زندگی میرا فیورٹ ناول ہے۔ عزت کی حفاظت ہو یا اپنی بقا کی جنگ یا پھر اپنے پیاروں کے لیے قربانی ہو کتنے ہی ایسے اسباق ہیں جو اس ناول میں پوشیدہ ہیں۔ باقی تمام سلسلے بھی اپنی مثال آپ تھے ہمیشہ کی طرح۔ ماہ جنوری کی بہنوں کی محفل میں اپنا خط دیکھ کر جو خوشی ہوئی وہ ناقابلِ بیان ہے اور آپ کی حوصلہ افزائی نے مجھے پھر سے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔'' (آپ کی محبت اور رسالے پر تبصرے کا شکریہ)

☆ پاکیزہ کے اپریل اور مئی کے شمارے سالگرہ نمبر ہوں گے۔ ان خصوصی شماروں کے لیے اپنے خوب صورت مراسلات اپنے انٹرویوز اور اپنے کھٹے میٹھے اور تیکھے خطوط کے ساتھ فوری رابطہ کیجیے۔ ہمارا ایڈریس یہ ہے مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ، 63-c، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی۔ 75500 اور اب آیئے ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔

یا ارحم الراحمین میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرمانا اور جب تک زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح، شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ آمین ثم آمین۔ یا مجیب، یا مجیب، یا مجیب

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمدِ باری تعالیٰ

حالِ دل اپنا بِنا تجھ کو سنائے نہ بنے
حمد لکھوں تو قلم قابو میں آئے نہ بنے
تجھ کو چاہوں ترے محبوب سے الفت رکھوں
زندگی بِن تیرے محبوب کو پائے نہ بنے
تو جو دیتا ہے تو بن مانگے بھی دے دیتا ہے
تیرے آگے مجھے بن ہاتھ اٹھائے نہ بنے
تیرے در پر تیرے محبوب کے در پر یارب
کچھ سکوں دل کا بِنا خود کو رُلائے نہ بنے
مغفرت کا ہوں میں طالب کہ تیری الفت کو
میں نبھانا بھی جو چاہوں تو نبھائے نہ بنے
میں بشر ہوں میں کہاں تک تجھے لکھ سکتا ہوں
تُو تو دنیا کی کسی شے میں سمائے نہ بنے
تُو تو سامع ہے مری بات کو سن لے یارب
کیا کروں کچھ بھی بِنا تجھ کو سنائے نہ بنے
میری امید کا محور ہے تو تو ہے یارب
بن ترے تو کہیں امید لگائے نہ بنے
دل جو چاہے کہ دعائیں کرے مولا مقبول
لب درودوں سے بنا انؐ کے سجائے نہ بنے
اس کی رحمت کے سہارے ہی کھڑا ہوں محسنؔ
اس کے آگے تو بِنا سر کو جھکائے نہ بنے

شاعر: محسنؔ علوی مرسلہ: ناہید بنت نور رحواہ سیمنٹ ورکس

نعتِ رسول مقبول ﷺ

مقامِ شکر ہے گر دل میں یہ خیال رہے
قلم میں آپؐ کی نسبت سے ہر کمال رہے
کوئی کہاں سے کرے آپؐ کی صفات رقم
کہ آپؐ وہ ہیں جو محبوبِ ذوالجلال رہے
قدم خدا کی اطاعت میں لڑکھڑا نہ سکیں
اگر نظر میں فقط آپؐ کی مثال رہے
سکوں نواز تھے لمحے اثر پزیر تھا وقت
درِ نبیؐ پہ یہ رحمت کے خدوخال رہے
اذاں سنی تو سماعت پہ اس طرح تھا اثر
کہ جیسے لحن میں خود حضرت بلالؓ رہے
درود جب ہو لبوں پر سلام جب بھی کہو
نبیؐ کے ساتھ نبیؐ کی تمام آل رہے
خدا کی حمد ہو پیہم نبیؐ ہوں دل میں مقیم
میرے خدا میرے معبود بس یہ حال رہے
کسی کے حسن کی محسنؔ میں کیا کروں تعریف
مری نظر میں نبیؐ کا فقط جمال رہے

شاعر: محسنؔ علوی مرسلہ: ایشل شادیان، گولارچی

سفر کا ثواب

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ روزانہ انسان کے ایک ایک جوڑ پر صدقہ واجب ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کی سواری میں مدد کرتا ہے کہ اس کی سواری پر اس کو سوار کرا دے یا اس کا سامان اس پر اٹھا کر رکھ دے تو یہ بھی صدقہ ہے۔ اچھا اور پاک کلمہ (زبان سے نکالنا) صدقہ ہے۔ ہر قدم جو نماز کے لیے اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے اور کسی مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔

(بخاری شریف) مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

لفظوں کے پھول

اچھے الفاظ اس پھول کے مانند ہیں جو انسان

کی زبان سے ادا ہو کر سننے والے کے کان اور دل میں مٹھاس بھر دیں۔ انسان ایک درخت ہی کے مانند تو ہے اگر تم اس کی شاخوں میں اُگنے والے لفظوں میں مٹھاس بھر دو گے تو لوگ تمہیں سایہ دار اور پھول دار درخت سمجھ کر ہرگز نہیں کاٹیں گے بلکہ چلچلاتی دوپہروں میں اس درخت کے سائے میں بیٹھ کر تمہاری نیکیوں کو شمار کریں گے۔

مرسلہ: طلعت رانا، چیچہ وطنی

تمہارے ساتھ

بیوی غصے سے۔ ''دیکھ لینا تمہیں دوزخ میں بھی جگہ نہیں ملے گی۔''

شوہر۔ ''ٹھیک ہے میں ہر جگہ تمہارے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتا ہوں۔''

وجہ

شوہر بیوی سے۔ ''میری ٹی شرٹ اُلٹی کر کے استری کرنا۔'' ایک گھنٹے کے بعد شوہر نے بیوی سے پوچھا۔ ''ٹی شرٹ استری کر لی؟''

بیوی۔ ''کوشش کر رہی ہوں مگر مجھے اُلٹی نہیں آ رہی۔''

مرسلہ: زرین زبیر کوٹھاری، کراچی

بہار کی آمد

بہار کی ہے آمد آمد
خزاں کا موسم گزر رہا ہے
نہ جانے کیوں دل ملول سا ہے
سوکھے شجر اور زرد پتے
ٹھٹھرتی ہوائیں
اور اداس راتیں
سبھی ہیں میرے گہرے ساتھی
ہے جبھی تو کہنا بہت یہ مشکل
الوداع اے خزاں کے موسم
الوداع اے خزاں کے موسم

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

ڈراپ سین

پہلے دن وہ میرے کمرے میں آئے تو سب ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا مگر میری جبیں نہ جانے کیوں پسینے سے تر ہو گئی تھی۔ وہ میرے پاس آئے اور بغور مجھے دیکھنے لگے۔ میں گھبرانے لگی اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرا سر نیچے جھک گیا، اُن کی نظر میرے بالوں پر پڑی۔ وہ قریب آئے...... اور قریب آئے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بالوں میں چھپی نقل کی پرچیاں زمین پر گر پڑیں اور یوں ظالم چیکر نے میرا پرچہ کینسل کر دیا۔ جب سے میں اپنے ہر امتحان میں نقل کی تمام پرچیاں اپنی جرابوں میں چھپایا کرتی ہوں۔

مرسلہ: مسز فرح امجد، لاہور

پھولوں کی ادا

تم جو ہنستی ہو تو پھولوں کی ادا لگتی ہو
اور چلتی ہو تو اِک بادِ صبا لگتی ہو
دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتی ہو اپنا چہرہ
مشرقی حور ہو دلہن کی حیا لگتی ہو
کچھ نہ کہنا میرے کاندھے پہ جھکا کے سر کو
کتنی معصوم ہو تصویرِ وفا لگتی ہو
بات کرتی ہو تو ساگر سے کھنک جاتے ہیں
لہر کا گیت ہو کوئل کی صدا لگتی ہو
کس طرف جاؤ گی زلفوں کا یہ بادل لے کر
تم مچلتی ہوئی ساون کی گھٹا لگتی ہو
میں نے محسوس کیا تم سے دو باتیں کر کے
تم زمانے میں زمانے سے جُدا لگتی ہو

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاولنگر

مجھ سے ملیے

بدولت کو عنبر نوشین کہا جاتا تھا جو کہ نکاح کے بعد عنبر وسیم ہو گیا۔ اب یہ مرحلہ کتنا جاں فزا تھا نہ پوچھیں۔ اپنے شہر گوجرانوالہ سے ہمیں بہت پیار ہے۔ ایم اے فرسٹ ڈویژن میں کرنے کے بعد تشنگی نہ مٹی تو بی ایڈ میں ٹانگ اُڑالی۔ اب ایم اے مزید کسی اور سبجیکٹ میں کرنے کا ارادہ ہے مگر چھوٹے چھوٹے بچے کسی بات کی فی الحال اجازت نہیں دیتے۔ خیر امید پر دنیا قائم است۔ قرآنِ حکیم کو باترجمہ بھی مکمل کر چکی ہوں۔ آج کل قوم کے معماروں کو سنوارنے کا بار سر پر اٹھا رکھا ہے۔ مشغلے بے تحاشا ہیں جن میں سب سے نمبر ون ریڈنگ کرنا اور کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا۔ ادب کو پڑھنا خواہ کوئی سا بھی ہو۔ اب بچوں اور روٹین کے امور میں بہت کم وقت ملتا ہے کہ میں کچھ اچھا سا پڑھ پاؤں۔ ہاں البتہ پاکیزہ اور چند ایک رسائل میں چھوڑ دے بھی نہیں چھوڑ سکتی کہ ان میں میری جان ہے۔ اپنی نیند قربان کر کے انہیں نہ صرف پڑھتی ہوں بلکہ تبصرے کرنے کی کوشش بھی کرتی ہوں۔ پسندیدہ چیزوں میں سب سے پہلے قرآن الحکیم پڑھنا پسند ہے بارش جنون کی حد تک پسند ہے اور اس میں بھیگنا واؤ آمیزنگ۔ رائٹرز میں اشفاق احمد، بانو آپا، ڈاکٹر یونس بٹ، امجد اسلام امجد، واصف علی واصف، عمیرہ احمد اور ون اینڈ اونلی انجو آنٹی پسند ہیں۔ انگلش ادب میں کیٹس اور وڈز ورتھ کی شاعری اٹریکٹ کرتی ہے فقہ بھی بہت پسند ہے۔ اسلامک لٹریچر میں آنحضور کا دورِ تاریخ۔ دل کرتا ہے اس دور میں پیدا ہوتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ ون مین شو اور... اٹرنیٹی' بروٹ میرے فیورٹ پرفیومز ہیں۔ دہی بڑے، چاول۔ الیف ایم فیورٹ چیزوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ مجھے ڈپلومیٹک لوگ پسند نہیں اور بزدل اور سڑیل لوگ کوفت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ناشکری اور مایوسی سے مجھے نفرت ہے۔ علاوہ ازیں جب میں مطالعہ کر رہی ہوتی ہوں تو مجھے ڈسٹربنس پسند نہیں کیونکہ میں ہر کام سنجیدہ ہو کر کرتی ہوں۔ دلکش کے بڑھنے سے پہلے ہی اس کے خاتمے پر دلی دکھ ہوتا ہے۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اپنے والدین کی دعاؤں کے بعد ان ادبی رسائل کی مرہونِ منت ہوں کہ انہوں نے تاریک اندھیروں میں مجھے شمع ہدایت تھمائے رکھی اور مجھے زمانے میں سروائیو کرنا سکھایا۔ مستقبل میں میرا ارادہ اسلامک اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی کرنے کا ہے۔ دوسرے علوم کے بجائے اگر ہم دین کو سمجھ کر پڑھیں تو یہ آخرت میں بھی ہمارے کام آئے گا۔ قرأت سے قرآن پاک سیکھنا بھی میرے aims میں ہے۔ بچے تھوڑے بڑے ہوں تو انشاءاللہ العزیز میں اپنی تمام خواہشیں پوری کروں گی بشرطِ مدد خدا۔ چوڑیاں اور مہندی مجھے بہت پسند ہیں جو کلائی اور ہاتھ میں سج جائیں تو اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ پھولوں میں موتیا اور پنک روز پسند ہیں۔ تحائف لینا اور دینا مجھے بہت پسند ہیں اور اگر ادبی بکس ہوں تو کیا کہنے۔ شبانہ ندیم فرام کراچی سے میری دوستی دلکش کے تھرو ہوئی۔ پلیز شبانہ بہنوں کی محفل میں آؤ۔ انکل معراج، آنٹی عذرا اور انجو آنٹی، نزہت اپیا، یمنیٰ اور ریحانہ ان لوگوں کی شفقت و محبت کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان لوگوں نے ظلمت کی تاریکیوں میں میری رہبری کی اور حوصلہ افزائی کی۔ خدا ان کو اجرِ عظیم دے جو ہم جیسے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لے کر چل رہے ہیں۔

تحریر: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

تازہ گلاب

وہ میرے ہجر کے غم کا حساب رکھتا تو
کتابِ دل میں وہ میرا بھی باب رکھتا تو
اسی کی نظریں بچا کے میں چوم لیتی اُسے
میری کتاب میں تازہ گلاب رکھتا تو
بدل نہ سکتا کبھی موسموں کی صورت وہ
رخِ جبیں پہ نہ اتنے نقاب رکھتا تو
طلب کے بحر میں قطرہ ہی بن کے رہ لیتی
نگاہ مجھ پہ وہ مثلِ حباب رکھتا تو
کبھی کبھی ہی سہی تشنہ لب بھگو سکتی
میرے لیے بھی بچا کے وہ آب رکھتا تو

شاعرہ: پروین عذرا تشنہ، کراچی

☆☆☆

جلترنگ

انجم انصار



محبت کے اس خوشگوار موسم میں

کراچی کے موسم کو اگر غریب غربا کا موسم کہہ دیا جائے تو اس وجہ سے غلط نہیں ہے کہ ایک طرح کے کپڑے بنا کر انہیں سارا سال پہنا جا سکتا ہے۔ پنجاب میں جیسے سردیوں کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ گرم کپڑے بنتے ہیں، سوئٹرز بنائے جاتے ہیں، گھروں میں ہیٹر اور ہیٹنگ سسٹم کا انتظام ہوتا ہے۔ ایسا کچھ کراچی میں نہیں ہوتا یہاں سردیاں مذاق کی طرح آتی ہیں اور مذاق کر کے چلی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب نہ ٹی وی پر اون کے اشتہارات آتے ہیں نہ یہاں بہت زیادہ سوئٹرز کی ماڈلنگ دکھائی جاتی ہے۔ تھوڑی بہت ہوتی ہوگی اور اس کا ہمیں علم نہیں۔

کراچی کی ہلکی پھلکی سی سردی کو یہاں لوگ خوب انجوائے کرتے ہیں۔ عشا کے بعد بائیک پر جاتے ہوئے خواتین گرم شالیں اسٹائل سے لپیٹتی ہیں اب خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم نے یہاں کی سردیوں میں خواتین کو لو گلے اور سلیولیس سوئٹر پہنے دیکھا ہے جو آگے سے بھی کھلے ہوتے ہیں اور پیچھے سے بھی۔ بس پورے سوئٹر میں ایک اون کے گولے کا جال اس طرح بنایا ہوتا ہے جیسے چڑیوں کو پکڑنے والے جال بنائے جاتے ہیں۔ یہاں لوگ اس مٹھی بھر سردی میں سی سی کرنا بھی جانتے ہیں۔ فون پر ہائے ری سردی ہائے ری سردی کے بول بچن بھی خوب ہوتے ہیں۔

''آج بڑی سردی ہے۔'' خبروں تک میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔ اب چموبی تو ہمیشہ اکہری قمیص میں پھری مگر یہ سال اس قدر سردی والا سال شروع ہوا تھا کہ سردی پر ہی ختم ہو رہا تھا کہ اسے کراچی میں بھی سردی لگ رہی تھی پنکھا چلا کر لحاف اوڑھ کر لیٹا کرتی تو لحاف ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد آئس کریم کھانے سے ہونٹ لرز سے جاتے تھے۔

''کیا واقعی سردی بہت ہے؟'' ایک دن اس نے اپنے بھاری سر کو جھٹکا۔ یہ حقیقت تھی کہ سال بھر کے فاسد خیالات دماغ میں یوں جم گئے تھے کہ وہ لوگوں کی تعریفیں بلاوجہ ہی کرنے لگتی تھی۔

''ارے بڑی بھابی آپ کتنا خوب صورت سوٹ خرید کر لائی ہیں اور آپ پر سجا بھی خوب ہے۔''

''ارے شزو چاچی یہ بالوں کا نیا اسٹائل کیا زبردست ہے آپ تو اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگ رہی ہیں۔''

''ممانی جان آپ نے تو اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے چاندنی والے ڈرامے جیسے لے لیے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ نازک سی چاندنی بڑے سے صوفے پر بیٹھی کتنی اچھی لگتی۔''

''ارے بقر عید پر آپ کا بکرا تو بڑا صحت مند تھا ہمارا ناتواں بکرا آ کر جو بیٹھا تو کھڑا ہو کر نہیں دیا شاید بیمار تھا یا اسے سردی لگ رہی تھی۔'' وغیرہ وغیرہ چمو کو خود اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے منہ سے تعریفی جملے کیسے اور کیوں کر نکل رہے ہیں۔ ایک دن شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے فلمی انداز میں اپنے آپ کو سمجھایا۔

''چمن آرا بیگم تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ دوسروں کی تعریف کرنے کا مطلب اپنے سینے پر دو ہنٹر مارنے کے برابر ہوتا ہے۔'' اس کی بات سن کر آئینہ بھی بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور وہ تاسف سے نظریں جھکا کر رہ گئی۔ یہ سچ ہے کہ بعض مرتبہ اپنی زبان پر اختیار نہیں رہتا اور آواز خود پرائی ہو جاتی ہے۔

''کیا واقعی سردی بہت ہے؟'' چمو نے اپنے بھاری سر کو جھٹکا۔

اسی دن شاہدہ باجی کی نند جو چمو کی نند کی نند تھی اپنے منہ کی بساند نکالنے چمو کے گھر چلی آئی۔ وہ شاہدہ باجی کی اتنی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ بھی مارے غصے کے لال پیلی سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''ارے چمن آرا کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' انہوں نے اسے غیرت دلائی۔ ''جب میں پہلے تمہارے گھر آئی تھی تو تم شاہدہ میں خوب کیڑے نکال رہی تھیں۔'' وہ کلس کر جانے کے لیے ہوگئی۔ اب چمو بے چاری کیا کہتی۔

''پہلے آپ 21 جون کو آئی تھیں اس دن نہ صرف سخت گرمی تھی بلکہ لو بھی چل رہی تھی۔ موسم کا اثر تھا کہ میرے سارے خیالات اپنی تمام تر دماغی آسودگی کے ساتھ زبان سے بہہ گئے تھے۔ آج آپ 20 جنوری کو آئی ہیں۔ موسم بھی اچھا ہے اور میڈیا اور نئی نسل نے چار سو سرخ گلابوں کی خوشبو بھی پھیلا دی ہے۔ محبت کے اس ٹھنڈے خوشبوؤں کے موسم میں زبان سے برے لفظ کیسے نکال سکتی ہوں۔ وہ تو سب فریز ہو کر مردہ خلیوں کی طرح ساکت ہو گئے ہیں۔ آج تو کسی کو بھی بری یا نفرت انگیز بات نہیں کرنی چاہیے کہ مسلسل بارش کی بوندا باندی نے کراچی کی گرمی کم کر دی ہے اور شاید اچھے موسم کی وجہ سے بھی ہم کبھی اچھی اچھی باتیں بھی کر لیا کریں...... بری اور دکھ دینے اور دوسروں کی تذلیل کرنے والی باتوں سے ہمیں کبھی تو باز آ جانا چاہیے۔ کبھی تو...... کیا خیال ہے آپ کا؟

نیک کام

ہمارا گروپ کیا گاتا تھا، کیسا گاتا تھا، ہمیں خود نہیں معلوم تھا مگر دیکھنے والے ہمارا پروگرام دیکھ کر خاصی تالیاں بجاتے تھے، بغلیں بجاتے تھے، سیٹیاں بجاتے

لڑکیاں معاشرے میں کامیاب زندگی نہیں گزارتے۔ آنکھوں کے ڈاکٹر سے ضرور ملیں تا کہ پتا چلے کہ یہ کتنی کمزور ہو چکی ہیں۔ اگر وہ چشمہ لگانے کا مشورہ دے تو ضرور لگائیں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو آنکھوں پر اور زیادہ خراب اثر پڑے گا۔ بیٹی کے معاملے میں عینک سے کچھ نہیں ہوتا۔ دودھ میں بادام، مصری، سونف کو پیس کر صبح و شام دیں۔ اس کے علاوہ گاجر کا استعمال زیادہ سے زیادہ کروائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calabar 200 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں صبح دیں اور دن میں تین مرتبہ Calc Flour-6، Calc Phos-30 Cina 30 کے 5، 5 قطرے ایک کپ پانی میں دیں۔ تین ماہ بعد حالت بتائیں۔

چھینکیں

والدہ احمد..........کوہاٹ

سوال: ڈاکٹر صاحب میرا بیٹا احمد 20 سال کا ہے اور انجینئرنگ یونیورسٹی Nust میں پڑھتا ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ چھینکیں آتی ہیں اور صبح کے وقت تو بے تحاشا۔ اُس کا کہنا ہے کہ چھینک کی وجہ سے گلے میں بھی شدید درد ہو جاتا ہے۔ تھکاوٹ بہت زیادہ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کبھی کبھار بخار بھی ہو جاتا ہے۔ ناک سے پانی بھی بہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کی صبح کی کلاس تقریباً چار گھنٹے کی ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لیکچر پر اس طرح توجہ نہیں دے پاتا جتنی اس کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب میرا بچہ پوزیشن ہولڈر ہے اور اسکالر شپ لیتا ہے مگر ان چھینکوں اور الرجی کے ہاتھوں نہایت تنگ اور پریشان ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے ایسی دوا تجویز کر دیں کہ وہ آسانی سے کھا لے اور اسے افاقہ بھی ہو جائے۔ میرا مطلب آسانی کا یہ ہے کہ اوقات آسان ہوں کیونکہ وہ ہوسٹل میں ہوتا ہے۔

جواب: نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر اس کو جب موقع ملے ناک میں چڑھائیں۔ ٹھنڈا، گرم اور گرم، ٹھنڈا نہ کریں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ گرم چیز پینے یا کھانے کے بعد کوئی ٹھنڈی چیز استعمال نہ کریں اسی طرح نہانے کے بعد فوراً ہوا میں نہ آئیں۔ ٹھنڈک سے گرمی میں اور دھوپ سے ٹھنڈی جگہ فوراً نہ جائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ تک استعمال کرنے کے بعد دوبارہ حالت سے مطلع کریں۔ Belladona 30 اور Nat. mur 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر چار مرتبہ لیں۔

☆☆☆

خود سے علاج/سیلف میڈیکیشن

جب کوئی معالج بنتا ہے تو اس کو لازمی طور پر انسانی جسم کی ساخت / بناوٹ (کہ وہ کس طرح بنی ہے) افعال (یعنی جسمانی اعضا کس طرح کام کرتے ہیں) اور ان میں (علم الامراض) ہونے والی تبدیلیوں (بیماریوں) کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ان بیماریوں کو کس طرح اور کیسے تشخیص کرنا ہے اور ان کا علاج کیسے جاسکتا ہے (علم العلاج) کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جب کوئی مریض اس معالج کے پاس آتا ہے تو وہ نہ صرف اس کے مرض کی تشخیص کرتا ہے بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کرتا ہے۔ اور یہ کسی بھی طور ضروری نہیں کہ ایک مرض کے مریضوں کو ایک جیسی دوا... ہی تجویز کی جائے اور بالخصوص ہومیو پیتھی میں ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے کہ ایک مرض کے دو مریضوں کو ایک جیسی دوا تجویز کی جائے۔ بلکہ اکثر اوقات ایک دوا دو مختلف امراض میں استعمال ہوتی ہے۔ وجہ مریض کی اپنی انفرادیت اور دوا سے مریض کی علامات کی مماثلت ہے۔

لہٰذا کوئی بھی دوا ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے مشورہ کیے بغیر استعمال نہ کریں کیونکہ ڈاکٹر ہی بہتر فیصلہ کر سکتا ہے کہ آپ کے لیے کون سی دوا بہتر ہے۔